ماہنامہ
پیامِ تعلیم نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۰ شمارہ ۱

جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت
۷۰ پیسے
سالانہ چندہ ------ چھ روپے

فہرست مضامین

[illegible]

جناب ڈاکٹر امانت واڈیا کالج پونہ

نیا سال

نیا سال آیا نیا سال آیا !

مسرت بھرے کتنے پیغام لایا

سُہانا سماں ہے سُہانی فضا ہے

بزرگوں کے لب پہ دعا ہی دعا ہے

نئی ہیں اُمنگیں، نیا جوش ہے اب

فضائیں خوشی کی، کیسے ہوش ہے اب

اچھلتے ہیں، گاتے ہیں، ہم ناچتے ہیں

نئے سال کی یوں خوشی بانٹتے ہیں

مسرت کے پرچم کو لہرا رہے ہیں۔

ہر اک عہد[1] ہم اپنا دہرا رہے ہیں !

[1] قول و قرار

محبت سے پیش آئیں گے ہر کسی سے
مدد بے کسوں کی کریں گے خوشی سے
بڑوں کا کہا ہم نہ ٹالیں گے ہرگز
بری کوئی عادت نہ ڈالیں گے ہرگز
ہم اپنا ہر اک فرض انجام دیں گے
بڑوں کی دعاؤں سے جھولی بھریں گے
بڑے شوق سے ہم لکھیں گے پڑھیں گے
سدا اپنی منزل کی جانب بڑھیں گے
کسی کو بھی ہم سے شکایت نہ ہوگی
ہمیں بھی کسی سے خجالت[1] نہ ہو گی
خدایا! کسی کو نہ کوئی ستائے
سبھوں کو نیا سال یہ راس آئے

[1] شرمندگی

آر۔ ایم ۔ بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ:۔ خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ

شارک سے مقابلہ

اس سفر کے بعد، جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ہم کئی روز
پنے گھر سے زیادہ دُور نہ گئے۔ زیادہ وقت آیندہ کے لیے
یے بنانے اور اپنے موجودہ گھر کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے
رف کرتے رہے۔ کئی باتیں تھیں، جن کی وجہ سے ہم نے
یا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے آس پاس کا ماحول بڑا دل کش
ت پیارا تھا۔ آرام کی سبھی چیزیں بغیر کسی خاص وقت کے
ں ہو سکتی تھیں، پھر بھی اپنے گھر والوں، عزیزوں اور
توں سے بچھڑ کر دُور ایک گمنام جزیرے پر زندگی گزار دینے
نے ہمیں کبھی اچھا نہ لگا۔ دوسرے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ہم گھومتے
ں اور جزیرے پر رہنے والے وحشی ہمیں دیکھ لیں۔ تیسرے
موہوم سی اُمید کہ شاید کسی روز کوئی جہاز بھولا بھٹکا اس طرف
ہمیں اپنوں میں پہنچا دے۔ لیکن جب دن پر دن گزرتے
نہ کوئی وحشی نظر آیا نہ کوئی جہاز اِدھر آتا دکھائی دیا تو
یہی وطن واپس پہنچ جانے کی ساری امیدیں ختم
دن رات اپنا گھر بنانے میں لگ گئے۔

نہیں کہ اس کے پہلے ہم بیکار پڑے
لے کام کیے۔ ناریل کو مختلف طریقوں
جو اس کے مزے میں کوئی نئی بات

نہ پیدا ہو سکی۔ پھر ایک دن ہم نے اپنی چیزیں غار سے نکال کر
اس غار ہی کو اپنا مکان بنایا مگر یہ تبدیلی اتنی تکلیف دہ ثابت
ہوئی کہ دوسرے ہی دن اپنے پہلے مکان کو لوٹ آئے۔ اس
کے علاوہ اکثر سمندر میں تیرتے بھی رہے اور خوب باتیں بھی
کیں کم سے کم جیک اور پیٹرکن نے ——— میں زیادہ ترسنتا
ہی رہا۔

دوسری مفید چیزوں کے علاوہ ایک چیز اور ———
آپ جانیں ——— جیک تو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں لگا ہی رہتا
تھا، اس نے چپّو، سے نکلے ہوئے تین اِنچ لمبے لوہے کو
بہت عمدہ چاقو میں بدل دیا۔ پہلے تو اس نے لوہے کو پیٹ
پاٹ کر چپٹا کر دیا۔ پھر لکڑی کا ایک کھردرا سا ہینڈل (دستہ)
بنا کر رسی کے اس ٹکڑے سے جو ہمارے پاس تھی، اس
لوہے کے چپٹے ٹکڑے کو باندھ دیا اور پتھر کے ایک
ٹکڑے پر گھس گھس کر اس کی دھار بنائی۔ اب اس دھار
کی مدد سے اس نے ایک بہت عمدہ سا دستہ بنایا اور اپنے
رومال سے ایک دھجّی پھاڑ کر اس کی مدد سے چاقو کو اس میں
فٹ کر دیا۔ رسی خالی ہوئی تو میاں پیٹرکن نے اس سے
مچھلی پکڑنے کی ڈور کا کام لینا شروع کر دیا۔ یہ عجیب ترین

ڈور تھی اس میں سرے سے کوئی کانٹا ہی نہیں تھا۔ بس اس
کے ایک سرے پر ایک گھونگھا مچھلی باندھ دی جاتی۔ مچھلیاں آکر
اسے نگل لیتیں اور ہم انھیں کھینچ لیتے۔
لیکہ … انی چھوٹی تھی اور ہمارے پاس کوئی کشتی نہ تھی
بن … وہ گہرے پانی میں جا سکتے اس لیے ہم نے
… یں وہ بہت ننھی ننھی سی تھیں۔
گ …
ا … ل سے، جہاں وہ مچھلیاں پکڑنے
تے یہ … تے ہی چیخ چیخ کر کہنے لگا۔
… تو پر بٹھا کر سمندر میں تیرتا کر
ہتا ہوں۔
ہرے پانی میں
"پیارے پیٹرکن … اسے بولا" مجھے
خیال بھی نہ تھا کہ تم اتنی سی با … اہمیت دوگے۔
ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو میں نے بہت پہلے تمھاری اس پریشانی
کا خاتمہ کردیا ہوتا۔ اچھا مجھے دیکھنے دو۔"

اور یہ کہہ کر جیک لکڑی کے اس ٹکڑے کو غور سے
دیکھنے لگا جس پر وہ کئی روز سے کام کر رہا تھا۔

"کیوں نہ ایک کشتی بنائی جائے پیٹرکن! کیا خیال ہے؟"
چند لمحے کے بعد اس نے نظریں اٹھا کر تیزی سے پوچھا۔

"بڑا وقت لگے گا"، جواب ملا "میں اب انتظار نہیں
کرسکتا اور فوراً شکار شروع کرنا چاہتا ہوں"

جیک نے پھر کچھ سوچا "آہا! آگیا سمجھ میں!! جیک ایک
دم چلایا "کیوں نہ ہم ایک درخت کاٹ کر اس کا تنا سمندر میں
ڈال دیں! اور جب بھی تم مچھلیاں پکڑنا چاہو تمھیں بس تیر کر اس
پر سوار ہو جانے کے علاوہ کچھ نہ کرنا پڑے گا۔"

پیٹرکن مان گیا اور ہم پاس ہی ایسی جگہ چل دیے جس
کے بارے میں ہمیں یاد آتا تھا کہ ہم نے پانی کے قریب ہی ایک
بڑا درخت اُگا دیکھا ہے۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے، جیک نے
کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور پل پڑا اس درخت پر کلہاڑی
لے کر اور پندرہ منٹ تک دم لیے بغیر مسلسل اس پر کلہاڑی
برساتا رہا۔ پھر وہ تھک کر آرام کرنے کو بیٹھا تو میں نے کام سنبھالا
پھر پیٹرکن نے اس پر وار کرنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ
جب جیک نے دوبارہ اس پر کلہاڑی برسانی شروع کی
تو وہ ہی تین حملوں کے بعد وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ
نیچے آرہا۔

"ہرّا"، جیک خوشی سے چلایا "اب ہمیں اس کا سر
بھی تو کاٹنا ہے"، اور یہ کہتے ہوئے اس نے تنے کے
اوپری حصے کی طرف سے پھر کاٹنا شروع کیا۔ یہ کام ختم ہوا
تو اس نے درخت کی شاخوں سے تین مضبوط اور موٹے
ٹکڑے کاٹ لیے تاکہ ان کی مدد سے تنے کو ساحل پر لڑھکا
کر پانی میں ڈالا جا سکے۔ تنے کی گولائی کوئی دو فٹ رہی ہوگی
اور ان ٹکڑوں کی مدد کے بغیر ہم اسے سمندر میں نہیں ڈال
سکتے تھے۔ ان ٹکڑوں کی مدد سے ہم نے آہستہ آہستہ
لڑھکا کر اسے سمندر میں ڈال دیا۔

اس طرح اپنی "کشتی"، پانی میں ڈال کر ہم نے اب لکڑی
کے ان تینوں ٹکڑوں کو چھیل چھال کر بھدّے اور الٹے گھڑ
کام چلاؤ چپّو بنا لیے پھر اسے کھینے کی کوشش کی۔ اب یہ
کام تو بڑا آسان تھا۔ لیکن اس تنے پر دونوں طرف
ٹانگیں لٹکا کر جو بیٹھے تو ہمیں اسے الٹنے سے بچانے میں بڑی
مشکل پیش آئی۔ وہ گھومتا تو ساتھ ہی ہم تینوں بھی پانی
میں پہنچ جاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں پانی میں گرنے
سے ڈر لگتا تھا۔ پھر بھی ہم نے سوچا کہ ممکن ہو تو خشک کپڑوں
ہی میں کیوں نہ مچھلی کا شکار کریں۔ یہ ضرور تھا کہ پانی
میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے کی وجہ سے ہماری پتلونیں گیلی ہوگئی
تھیں لیکن وہ آسانی سے سوکھ سکتی تھیں۔ اس لیے ہم

ان کی زیادہ پروا نہیں تھی۔

آدھ گھنٹے کی مشق کے بعد ہم تختے پر آسانی سے جم کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگئے تب پیٹرکن نے اپنا چپّو، گود میں رکھا اور ڈور کے سرے پر ایک پوری گھونگھا مچھلی لگا کر اسے گہرے پانی میں ڈال دیا۔

"اب جیک" اس نے کہا۔ "محتاط رہو۔ ذرا اس سمندری گھاس سے بچ کر چلنا ——— وہاں! وہ رہی ——— آہستہ، میرے بھائی، آہستہ ——— میں ایک 'مخزمہ' کو صرف ایک فٹ کی گہرائی میں اِدھر آتے دیکھ رہا ہوں ——— آہا ——— وہ رہی، ذرا آگے بڑھاؤ یار ——— اوہ! دھت تری کی ——— چلی گئی ....."

"کیا اس نے چارہ منہ میں لیا تھا؟" جیک نے چپّو کے اشارے سے تختے کو ذرا آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"چارہ؟ ہاں اس نے منہ میں لیا تو تھا لیکن جیسے ہی میں نے کھینچنا شروع کیا اس نے منہ کھول دیا اور چارہ چھوڑ کر چل دی۔"

"خیر اسے اگلی بار نگلنے کا موقع دو" جیک ہنستے ہوئے بولا۔

"وہ آئی دوبارہ!" پیٹرکن چلّایا۔ اس کی آنکھیں جوش اور خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "وہ دیکھو اُدھر! ہاں اب! نہیں! ہاں! نہیں! ارے! مچھلی نے نگلا نہیں کیا؟"

"اسے منہ کی طرف سے کھینچنے کی کوشش کرو تب۔" جیک چلّایا۔ "ذرا دھیرے دھیرے۔"

ایک ٹھنڈی سانس، اور پیٹرکن کے افسردہ چہرہ نے بتا دیا کہ بے چارے پیٹرکن کی پوری کوشش کے باوجود مچھلی پھر بھاگ گئی تھی۔

"غم نہ کرو میرے دوست" جیک نے تسلّی دی "ہم ذرا اور آگے بڑھ کر کسی اور مچھلی کو یہ چارہ پیش کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے جیک نے چپّو پھر چلانا شروع کر دیا لیکن ابھی وہ اس جگہ سے ذرا سا ہی آگے بڑھا ہوگا کہ اچانک ایک بڑے منہ اور چھوٹے جسم والی مچھلی ایک چٹان کے نیچے سے نکلی اور اس نے جھپٹ کر چارہ نگل لیا۔

"اس بار پالیا میں نے اسے ——— سچ مچ!" پیٹرکن ڈور کھینچتے ہوئے خوشی سے چلّایا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ اس نے دُم تک نگل لیا ہے چارے کو ——— اوہ! کتنی بڑی ہے!

جیسے ہی شکار سطح تک آیا مارے شوق کے ہم تینوں اسے دیکھنے کے لیے جھک پڑے اور بس ——— تختا گھوم گیا۔ پیٹرکن نے دونوں بازو مچھلی کی گردن میں ڈال دیے اور دوسرے ہی لمحے ہم سب پانی میں تھے۔

سطح پر ابھر کر تختے کو پکڑا تو ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹا کیونکہ تینوں بالکل بھیگے ہوئے چوہے معلوم ہو رہے تھے۔ ہم جلد ہی تختے پر اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پیٹرکن نے اس مچھلی کو جو ہماری اس جدو جہد کے دوران بھاگ نکلنے میں تقریباً کامیاب ہوگئی تھی، اور زور سے [illegible] یہ مچھلی شکار کہلانے کے قابل نہ تھی پھر بھی [illegible] پیٹرکن نے کہا کہ پچھلے دو تین روز سے ہم جیسی ننھی منی مچھلیاں پکڑ رہے تھے ان سے تو یہ بہتر ہی ہے تو ہم نے اسے تختے پر اپنے سامنے رکھ لیا اور ڈوری میں دوسری گھونگا مچھلی لگا کر اسے دوسرے شکار کے لیے پانی میں ڈال دیا۔

ہم جس وقت اس دل چسپ کھیل میں مشغول تھے، پیٹرکن نے اچانک ہماری توجہ سمندر کی سطح پر چند گز دور ہونے والی ہلچل کی طرف دلائی۔ اس نے چلّا کر ہم سے تختے کو اسی سمت میں لے جانے کو کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی بڑی مچھلی ہے اور شاید ہم اسے پکڑنے میں کامیاب

ہو جائیں لیکن جیک نے چپّو چلاتے رہنے کے باوجود، ایک گہری اور مضبوط آواز میں جیسی میں نے اس کے منہ سے پہلے کبھی نہ سنی تھی، کہا، "ڈور کھینچ لو پیٹرکن اور اپنا چپو چلانا شروع کردو —— جلدی کرو —— یہ شارک[1] ہے!"

جس دہشت اور خوف کے ساتھ ہم نے یہ الفاظ سنے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری ٹانگیں پانی میں لٹک رہی تھیں اور تنے کے گھوم جانے کا خطرہ مول لیے بغیر ہم انھیں اٹھا بھی نہیں سکتے تھے۔ پیٹرکن نے ایک جھٹکے سے ڈور کھینچ لی اور اپنا چپّو سنبھال کر پوری قوّت سے چلانا شروع کردیا۔ ادھر ہم دونوں بھی اپنا پورا زور ساحل سے قریب تر پہنچنے میں صرف کر رہے تھے۔ لیکن ہم ساحل سے خاصی دور تھے یہ تنا (جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں)، بہت بھاری تھا اور بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب شارک ہمیں بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تیرتی ہوئی ہماری ہی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی تیز اور بے چین حرکتوں سے جیک نے اندازہ لگایا کہ وہ ہم پر حملے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے جتنی تیزی سے چپّو چلا سکتے ہوں، چلائیں اور خود بھی جان توڑ کوشش کرنے لگا۔ اچانک وہ چلایا "وہ دیکھو۔ وہ آرہی ہے وہ" اور ایک لمحہ ہی میں ہم نے دیکھا کہ وہ بڑی مچھلی ہمارے نزدیک ہی غوطہ لگا رہی ہے اور... لیکن ہم سب نے پانی کو اپنے چپوؤں سے زور زور سے کھنگالنا شروع کردیا۔ اس آواز نے اسے ایک لمحہ کے لیے تو خوف زدہ کردیا لیکن تھوڑی دیر ہی میں وہ پھر پہلے ہی کی طرح ہمارے گرد چکر لگا رہی تھی۔

"مچھلی پھینکو۔ پھینک دو اس کی طرف!" جیک تیز مگر نیچی آواز میں پکارا۔

"اگر ہم اسے چند منٹ بھی دور رکھ سکیں تو جیسے تیسے ساحل تک پہنچ جائیں گے۔"

پیٹرکن ایک سکینڈ کو جیک کے حکم کی تعمیل کے لیے رکا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے پھر پوری قوت سے چپو چلانا شروع کردیا۔ مچھلی ابھی پانی کی سطح تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ہم نے شارک کو پانی میں غائب ہوتے دیکھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس کی ناک پانی کی سطح سے ابھری، پھر اس کا چوڑا منہ اور اس میں چمکدار نوکیلے دانتوں کی خوفناک دہری قطاریں نظر آئیں۔ مردہ مچھلی نگل کر شارک پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن جیک کا یہ اندازہ غلط تھا کہ وہ یہ مچھلی کھا کر مطمئن ہو جائے گی۔ چند ہی منٹ بعد وہ پھر ہمارے پیچھے تھی اور اس بار اس کی تیز تیز حرکتوں نے اور بھی خوف زدہ کردیا اور ہم نے سمجھا کہ بس اب یہ حملہ کرنے ہی والی ہے۔

"چپو چلانا بند کردو!" اچانک جیک چلایا "میں اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ رہا ہوں۔ اب تم دونوں میرے حکم کی فوری تعمیل کرو۔ ہماری زندگیوں کا انحصار اسی پر ہے۔ شارک کی طرف مت دیکھو۔ اپنے پیچھے نہ دیکھو۔ کچھ نہ کرو بس تنے کو الٹنے سے بچاؤ۔"

میں نے اور پیٹرکن نے وہی کیا جس کا حکم ملا تھا۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہم کچھ ایسا کام تو کر رہے ہیں جس سے ہمیں بچنے کا موقع مل جائے گا یا کم از کم اس کی امید تو بندھ ہی رہی ہے کیونکہ ہم دونوں کو جیک کی عقل مندی اور ہمّت پر پورا پورا بھروسا تھا۔ چند سکنڈ تک جو مجھے تو بڑے

---

[1] سمندر میں پائی جانے والی بڑی اور خطرناک مچھلی۔

طویل معلوم ہوئے، ہم خاموشی سے تنا پکڑے بیٹھے رہے۔ حالانکہ جیک نے ہمیں منع کیا تھا لیکن میں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے خود کو نہ روک سکا۔ میں نے جیک کو بالکل ساکت بیٹھے دیکھا اس نے ہاتھ میں چپو اٹھا رکھا تھا، منہ سختی سے بند تھا اور بھویں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں جو غصے سے پانی کے اندر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے شارک کو بھی دیکھا جو ہمارے تنے کے بالکل قریب جیک کے پیر پر جھپٹنے کو بالکل تیار تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں بڑی مشکل سے اپنی چیخ روک سکا۔ دوسرے ہی لمحہ شارک جھپٹی۔ جیک نے فوراً اپنی ٹانگ پانی سے کھینچ لی اور تنے پر زور سے ماری۔ شارک کا سر تنے سے ٹکرایا اور ہم نے شارک کا خوفناک منہ کھلا دیکھا جس میں جیک نے بڑی پھرتی سے اپنا چپو گھسیڑ دیا اور زور لگا کر حلق تک پہنچا دیا۔ جیک نے چپو اتنے زور سے مارا تھا کہ وہ خود پنجوں کے بل اٹھ گیا اور تنا بالکل ہی گھوم گیا۔ ہم ایک بار پھر پانی میں گر پڑے لیکن دوسرے ہی لمحہ پھر سطح پر تھے۔

"اب بس ساحل کی طرف تیز چلو" جیک چلایا "اِدھر پیٹرکن۔ تم مضبوطی سے میرا کالر پکڑ لو اور جتنی تیزی سے تیر سکتے ہو، تیرو۔"

پیٹرکن نے ویسا ہی کیا جیسا جیک نے کہا تھا اور جیک اتنی تیزی اور قوت سے پانی کو کاٹتا ہوا تیرنے لگا گویا کوئی کشتی ہو مجھے تو صرف اپنے آپ کو ساحل تک پہنچانا تھا میں بھی کسی طرح اس کے ساتھ ساتھ تیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم اب ساحل کے خاصے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور چند ہی منٹ میں ہم ایسے اتھلے پانی میں تھے جہاں شارک کے لیے تیرنا بہت مشکل تھا اور آخرکار ہم بالکل محفوظ ساحل پر پہنچ گئے ـــ گو تھکن سے بالکل چور تھے لیکن اس خوفناک واقع سے ذرا بھی خوف زدہ نہ تھے۔

(بہت ہی دلچسپ کہانی اگلے مہینے میں)

لو آرہا ہے یارو! پھر مارچ کا مہینہ

امتحان کے موقع پر محنت کرنے کے بارے میں کئی اچھی اچھی نظمیں اردو زبان میں موجود ہیں۔ یہ دسمبر کا مہینہ ہے اور امتحان مارچ میں ہوگا۔ اس لیے محترم نیرؔ صاحب کی یہ نظم بروقت مشورہ سمجھیے۔ تین مہینہ کا وقفہ اتنا ہے کہ آپ کوشش اور محنت پر آمادہ ہوں تو آپ کامیاب ہو سکتے ہیں — نیرؔ صاحب کا یہ مشورہ بھی توجہ کے قابل ہے کہ بچیاں اور بچے اپنی ہی کوشش پر تکیہ کریں کسی قسم کی بے جا رعایت کے طالب نہ ہوں۔ ایسا ہوا تو ان کی کامیابی اگلی بہت سی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوگی۔ ہماری دعا ہے کہ بچے محنت سے پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ تاکہ اپنی زندگی میں کچھ کر سکنے کی لیاقت ان میں پیدا ہو۔ امید ہے کہ بچے اس نظم کا مطلب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اور جس جذبہ سے یہ نظم لکھی گئی ہے۔ اس پر عمل کر کے فائدہ اٹھائیں گے۔ ——— ایڈیٹر۔

لو آرہا ہے یارو! پھر مارچ کا مہینہ — پڑھنا ہے امتحاں کا ہم کو اک اور زینہ
سوچیں تو اپنے دل میں کیا سال بھر کیا ہے — مضمون جو لیے ہیں، ہر اک میں کیا پڑھا ہے
جو کچھ ہوا ہوا وہ، اب دل میں ہے یہ آئی — اچھی طرح کریں گے دن رات ہم پڑھائی
تیار اب کریں گے مضمون اپنے اپنے — دیکھیں گے نیند میں بھی اب امتحاں کے سپنے
اپنی ہی کوششوں سے بس پاس ہوں گے ہم سب — بے جا رعایتوں سے ہوگا نہ ہم کو مطلب
محنت میں ایک ہوگا اب خون اور پسینہ
طے ہوگا امتحاں کا اس طور سے یہ زینہ

راتوں کو جاگ کر ہم مل کر پڑھیں گے سارے　　اپنے گواہ ہوں گے یہ چاند اور ستارے
مضمون اپنا اک اک دُہرا کے دیکھ لیں گے　　آپس میں سب سمجھ کر سمجھا کے دیکھ لیں گے
غفلت میں وقت اپنا جو بھی گزر چکا ہے　　نقصان جو ہوا ہے دل اپنا جانتا ہے
ہمت سے کام لے کر محنت کریں گے کافی　　غفلت کی اس طرح سے ہو جائے گی تلافی

کرنے ہیں کام اپنے سب خاص و عام پورے
کرنے ہی سے جہاں میں ہوتے ہیں کام پورے

پڑھتے جو روز مشکل کوئی نہ پیش آتی　　ناکامیوں کی بھتنی کیوں آ کے یوں ڈراتی
ہے امتحاں کا دریا اب ہم کو پار کرنا　　محنت کی کشتیوں سے ساحل پہ ہے اترنا
نکلے گا جب نتیجہ ہم کامیاب ہوں گے　　وا[1] اپنی زندگی میں، راحت کے باب ہوں گے

محنت سے کامیابی ہر ایک کو ملی ہے
محنت ہی کے چمن میں ہر ہر کلی کھلی ہے

یعنی کھلا۔ راحت یعنی آرام۔ باب یعنی دروازہ۔ مطلب یہ کہ آرام کے دروازے کھل جائیں گے۔

حروف کا جادو

(رشید حسن خاں صاحب)

پچھلی دفعہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا تھا؛ اس کی معذرت۔ بات یہ ہوئی تھی کہ میں اور آپ کے رسالے کے اڈیٹر حسین صاحب، [جن کو میں پیر و مرشد بھی کہتا ہوں] ہم دونوں، کاتب صاحب سے ہار گئے تھے۔ مگر دُنیا تو امّید پر قائم ہے، اس لیے میں بھی اُمیّد باندھے لیتا ہوں کہ آیندہ.. کاتب صاحب ہم دونوں کے حال پر کرم کریں گے اور مضمون کی اس طرح کتابت نہ کریں گے کہ اسلامی صحت، پچھاڑیں کھاتی پھرے اور میں اس دن کچھ اور کھانے کے بجائے، صرف غم کھاتا رہوں۔ اور بھائی! دن بھر غم کھانے کے بعد مضمون لکھنا تو بڑی بات ہے، ٹھیک سے مسکرایا بھی نہیں جاتا۔ آپ بھی آمین کہہ لیجیے۔ آہستہ سے نہیں، ذرا بلند آواز سے۔

آدمی کے پاس فالتو پیسے بہت سے ہوں اور سلیقہ بالکل نہ ہو تو وہ ان کو وقت بے وقت اور جگہ بے جگہ اُن کو اس طرح خرچ کرتا ہے کہ بگڑے رئیس اور بچھے ہوئے رئیس کی بہترین مثالیں سامنے آجایا کرتی ہیں۔ اس طرح کے لوگ دُور ہی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ اور بھلا کیوں نہ پہچانے جائیں؛ ایسے کرتب یا کرتوت کہیں چھپا کرتے ہیں!

اور دولت ہی کی بات کیا ہے، جو چیز بھی فالتو خرچ کی جائے گی، اس کی یہی صورت ہوگی۔ اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں، ایسی ہی ایک مثال پر کچھ آج بات چیت کی جائے گی۔

ہمزہ ایک ایسا حرف ہے جس کو بڑی بے پروائی بلکہ بے دردی کے ساتھ حرفوں پر چھڑک دیا جاتا ہے۔ اور اکثر صورتوں میں یہ فالتو ہوتا ہے۔ فالتو ہونے کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ پورے لفظ کی لکھاوٹ چوپٹ ہو گئی۔ بات چیت شروع کرنے سے پہلے دو باتیں آپ سے خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ اِس بیان کو غور سے پڑھیے، احتیاط سے نقل کر لیجیے۔ اور شوق کے ساتھ ذہن میں بٹھا لیجیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات چیت ذرا لمبی ہے، بلکہ اچھی خاصی رام کہانی ہے؛ اس لیے یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ میں بات کو بیچ میں سے توڑوں مروڑوں نہیں پوری کہہ سُنا کے دم لوں۔ اور آپ گھبرائیں نہیں۔ میری طرف سے وعدہ رہا آپ کیا فرماتے ہیں؟ منظور ہے! بہت خوب۔ اچھا تو پھر بسم اللہ:

(۱) کرنا مصدر ہے اس کا ماضی ہوا: کیا۔ اس کا جمع کا صیغہ ہو گا کیے۔ اس میں ہمزہ کی گنجائش نہیں۔ خوب اچھی طرح یاد کر لیجیے کہ فعل کی اس شکل میں ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ کچھ فعل مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

دیے، کیے، پیے، سیے، لیے، جیے،

ان کے مصدر ہیں۔ دینا، کرنا، پینا، سینا، لینا، جینا۔

ایک گُر یاد کر لیجیے: یہ جو اوپر فعل لکھے گئے ہیں۔ ایسے فعلوں میں اگر یے سے پہلے والے حرف پر زیر ہوگا تو اس حرف کے بعد ہمیشہ یے آئے گی۔ جیسے: لیے، کیے اور اگر اس حرف پر زبر ہے، تو ہمزہ آئے گا، جیسے: گئے۔

ان فعلوں کے اور صیغوں میں بھی ہمزہ نہیں آئے گا، دو یے آئیں گی۔ جیسے: پییں، جییں، سییں۔

اب ایک بار ایسے کچھ فعلوں کی مشق کر ڈالیے:

پیا، پیے، پییں، پیے گا، پییں گے، پیا تھا، جیا، جیے، جییں، جیے گا، جییں گے، جیا تھا، سیا، سیے گا، سییں گے، سیا تھا۔ لیا۔ لیے، لیا تھا۔ لیے تھے۔ لیے ہیں۔ کیا، کیے، کیا تھا۔ کیے تھے، کیے ہیں۔

(۲) آپ کھانا کھا لیجیے۔ آپ تشریف رکھیے۔ آپ حکم دیجیے، ان جملوں میں معمولی بات کو کیسے سلیقے اور تہذیب کے ساتھ کہا گیا ہے۔ بات کہنے کا یہ انداز، اردو زبان کی خصوصیت ہے۔ ایسے ہی جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا کس قدر مہذب ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان کس قدر شائستہ ہے سینکڑوں برس کی تہذیبی ترقی نے اردو میں یہ پاکیزگی اور نفاست پیدا کی ہے ــــ قریب قریب ہر مصدر سے ایسے فعل بنتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے فعلوں کے آخر میں دو یے ہوتی ہیں۔ جیسے رکھنا ایک مصدر ہے۔ اسی سے رکھ بنے گا۔ یہ بھی فعل ہے۔ اسی سے رکھو بنے گا۔ اور رکھیے بھی اسی سے بنا ہے۔ یعنی اصل فعل رکھ کے آگے دو یے بڑھا دی گئیں [رکھ + یے = رکھیے] ایسے فعلوں میں ہمزہ ہرگز ہرگز نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر کچھ فعل لکھے جاتے ہیں۔ باقی اور فعلوں کو بھی قیاس کر لیجیے گا:

اُبالیے، اُبھریے، اُبھاریے، اُتریے، اُتاریے، اُٹھیے، اُجاڑیے، اُچکیے، اُچھلیے، اُچھالیے، اُدھیڑیے، اکڑیے، اُکھڑیے، الاپیے، اُلجھیے، اُلٹیے، اُگلیے، اینٹھیے،

بیٹھیے، بھریے، بھٹکیے، برسیے، برتیے، بڑھیے، بانٹیے۔ بلیے، بچیے، بگڑیے، بگاڑیے، بگھاریے، بٹیے، بیٹھیے، بھاگیے، بچیے، بکھریے، بھٹکیے، بکھانیے،

پھریے، پوچھیے، پلٹیے، پیچیے، پالیے، پڑھیے۔

تراشیے، تاپیے، تاکیے، تلیے، تڑپیے، تھوکیے، تولیے

جانیے، جیتیے، چلیے، چکھیے، چھانٹیے، چھینٹیے، دوڑیے، دیکھیے، دیجیے، ڈالیے، ڈانٹیے، سونگھیے، سوچیے، سنواریے سنبھالیے، سنبھلیے، سمیٹیے، سمٹیے، سرکیے، کھیلیے، کھولیے، کھینچیے کاڑھیے، کاٹیے، گاڑیے، گریے، گزریے، گزاریے،

لیجیے، لڑیے، لوٹیے، لپٹیے، لیٹیے، پیٹیے، لکھیے، ماریے، مریے، مٹیے، مکریے، مڑیے، مچلیے، مانیے، مانگیے، ملیے، ناچیے، نوچیے، نکالیے، نکلیے، ناپیے، نکھاریے، نپٹیے، ہاریے، ہٹیے، ہلیے، ہانکیے، ہانپیے،

---

(۳) اس سلسلے میں ایک بات خاص طور پر یاد کر لیجیے:

جن مصدروں میں نا سے پہلے الف ہوتا ہے یا واؤ، جیسے: جانا، آنا، پلانا، مٹانا، بھگونا، رونا، دھونا، وغیرہ؛ ایسے مصدروں سے، اس طرح کے جو فعل بنیں گے، ان میں بھی آخر میں دو یے آئیں گی، مگر ان دو یے سے پہلے ایک ہمزہ بھی آتا ہے جیسے مصدر ہے: جانا۔ اس سے ایک فعل تو بنے گا: جا اور اس جا سے بنے گا: جائیے، اس لفظ میں پانچ حرف ہیں: جیم، الف، ہمزہ اور دو یے۔ [جا + ء + یے = جائیے]

ایسے کچھ فعل بھی مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

آئیے، اُٹھائیے، اُڑائیے، اُلجھائیے، اُگائیے، اترائیے، لوٹائیے، بڑھائیے، بھگوئیے، بٹھائیے، بھرائیے برسائیے، بجھائیے، بھڑکائیے، بہلائیے، بہائیے، بنائیے۔ بچائیے، بھڑکائیے، بھرائیے، پڑھائیے، پکائیے، پردئیے

بِلائیے، گھسائیے، پھیلائیے، بِسرجائیے، پکوائیے، پڑھائیے، گھمائیے، تڑپائیے، ترسائیے، ٹکرائیے،

جتائیے، جلائیے، چلائیے، چکھائیے، دوڑائیے، دکھائیے، دلائیے، دبائیے، ڈھائیے، رُلائیے، سُلجھائیے، سُنگھائیے، سرکائیے، سُنوائیے، شرمائیے،

کھلوائیے، کٹوائیے، گرائیے، گھبرائیے، لڑائیے، لوٹائیے، پٹائیے، لکھائیے، مٹائیے، ملائیے، سجائیے، نکلوائیے، نہلائیے، ہرائیے، ہٹائیے، ہلائیے، ہنسائیے،

اب بات یہ ہوئی کہ کہیے، لیے اور کیجیے، لیجیے، اور لائیے اور کھائیے، اور کھوئیے، دھوئیے، جیسے فعلوں میں ہمیشہ آخر میں دو ی ہوتی ہیں۔ ان کو اگر "کیے"، "لیے"، یا "کیجیے"، "لیجیے" لکھا جائے گا تو یہ لکھاوٹ غلط ہوگی۔

ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ جن مصدروں میں "نا" سے پہلے الف یا واؤ ہوتا ہے جیسے لانا اور دھونا؛ ان سے جب بعض فعل بنتے ہیں تو ان میں "ئے" آتا ہے۔ جیسے: لائے، دھوئے، پائے، لیئے، جائے، کھوئے ——— ان مصدروں میں جب تعظیمی فعل بنیں گے، تو اس آخری ی کے آگے ایک یے اور بڑھا دی جائے گی جیسے، لایئے (لاء ی یے)، پایئے (پاء ی یے)، جایئے (جاء ی یے)، دھویئے (دھوء ی یے)، سویئے (سوء ی یے)

جن مصدروں میں "نا" سے پہلے الف یا واؤ کے بجائے کوئی اور حرف ہوتا ہے: جیسے: چلنا، لکھنا، دینا، سُننا؛ ان مصدروں سے جب ایسے فعل بنتے ہیں تو آخر میں بس ایک ی ہوتی ہے، ہمزہ نہیں ہوتا جیسے چلے، لکھے، دے، سُنے ——— جب ان سے تعظیمی فعل بنیں گے، تو اس آخری یے کے آگے ایک یے اور بڑھ جائے گی، جس طرح اوپر والے فعلوں میں بڑھی تھی، جیسے: چلیے، لکھیے، دیجیے، سُنیے،

---

(۴) فعلوں کا بیان تو ختم ہوا اب کچھ اور لفظوں کا ذکر چھیڑا جاتا ہے، جن میں کچھ لوگ خواہ مخواہ ہمزہ بڑھا دیا کرتے ہیں۔ یہ ہمزہ بالکل فالتو ہوتا ہے اور اس سے اس لفظ کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ بلکہ چوپٹ ہو جاتی ہے۔ فالتو کام کرنے کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

جمع بنانے کے بہت سے قاعدے ہیں۔ ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جن واحد لفظوں کے آخر میں "ہ" ہوتی ہے، تو جمع بنانے کے لیے اس "ہ" کو ہٹا کر، اس کی جگہ ایک یے بڑھا دیتے ہیں جیسے واحد لفظ ہے: ذرّہ اس کے آخر میں "ہ" ہے اس کی جمع ہوئی: ذرّے، یعنی "ہ" کی جگہ یے آ گئی، یا جیسے پرتہ سے پرتے۔

یہ بالکل صاف اور سیدھا طریقہ ہے۔ ایسے لفظوں میں کوئی بھی غلطی نہیں کرتا۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ جن لفظوں میں آخر کی "ہ" سے پہلے ہمزہ ہوتی ہے، جیسے سایہ، تو ان کی جمع جب بنائی جاتی ہے۔ تو کچھ لوگ یے کے اوپر ایک فالتو ہمزہ بھی لکھ دیا کرتے ہیں۔ جیسے سایہ واحد لفظ ہے۔ اس کی جمع قاعدے سے سایے ہوتی ہے۔ مگر اس کو سائے بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ تو بالکل اوٹ پٹانگ بات ہوئی۔

ہمزہ یہاں کہاں سے آئے گا اس کا تو دور دور تک نشان نہیں تھا۔

یا جیسے ایک لفظ ہے: بخیہ۔ اس میں چار حرف ہیں: ب، خ، ی، ہ ـــ آخری حرف "ہ" ہے جمع بنانے کے لیے اس "ہ" کو ہٹا کر ایک یے بڑھائی جائے گی تو اب اس کی صورت یہ ہوئی: ب، خ، ی، یے [بخیے] اس میں ہمزہ کہاں سے آئے گا؟۔

کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جن میں آخر میں الف ہوتا ہے اور

اس سے پہلے یے ہوتی ہے، جیسے: ہنسیا، لہریا، پہیا، بہروپیا، دیا، (چراغ کے معنی ہیں)، تبتیا؛ ان کی جمع بھی اسی طرح بنے گی کہ آخر کا الف نکال کر، اس کی جگہ قاعدے کے مطابق یے بڑھا دی جائے گی۔ جیسے ہنسیے، بہروپیے، لہریے، دیے پہیے — ایسے لفظوں میں بھی ہمزہ نہیں آئے گا۔ اگر ان کو ہنسئے، بہروپئے، پہئے، لہرئے، لکھا جائے گا تو سو فیصدی غلط لکھاوٹ ہوگی۔ قاعدے کے بالکل خلاف۔

ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ یہ سیدھا سا قاعدہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہ یا الف ہوتا ہے اور اُن کی جمع بنانے کے لیے ان کی جگہ یے لائی جاتی ہے تو وہاں ہمزہ نہیں آسکتا جیسے ایک لفظ ہے: لڑکا۔ اس کے آخر میں الف ہے۔ جمع بنانے کے لیے اس آخری حرف کو ہٹا کر اس کی جگہ یے رکھ دی جاتی ہے، لڑکے، جمع ہو گئی۔ کوئی اور حرف تو نہیں آیا۔

یا جیسے ایک لفظ ہے: پیمانہ — اس کے آخر میں ہ ہے۔ جمع بنانے کے لیے اس ہ کو ہٹا کر، اس کی جگہ یے بڑھا دی۔ پیمانہ، واحد — پیمانے، جمع — کوئی اور حرف نہیں آیا۔

یا جیسے ایک لفظ ہے: بڑھا — اس کی جمع بنی بڑھے یعنی الف ہٹا اور یے آ گئی، بس۔

ایسا ہی ایک لفظ ہے: سایہ — اس میں بھی وہی ہوگا۔ آخری حرف کی جگہ یے آجائے گی۔ اس لفظ میں چار حروف ہیں: س۔ ا۔ ی۔ ہ — آخری حرف ہ ہے۔ وہ ہٹ گئی تو اب تین حرف بچے: س۔ الف۔ ی۔ آخری حرف ہے: ی۔ جمع کے لیے اس کے آگے یے بڑھائی تو ہوا سایے — ہمزہ کا اس میں کہیں سے گزر نہیں ہو سکتا۔

یا ایک لفظ ہے: لہریا۔ آخر کا الف ہٹے گا اور اس کی جگہ یے بڑھے گی، تب جمع بنے گی۔ اس طرح اس کی جمع ہوئی۔ لہریے۔ ہمزہ کا یہاں کہاں گزر ہوگا۔

اب اگر کوئی صاحب سائے، لہرئے، بہروپئے، پہئے لکھیں تو یہ بالکل بے تکی لکھاوٹ ہوگی۔ اوٹ پٹانگ بے قاعدہ اور غلط۔

جب بڑھا سے جمع بنے گی بڑھے، تو اسی قاعدے سے سایہ سے جمع بنے گی سایے۔ ہمزہ نہ وہاں۔ نہ یہاں

ایسے لفظوں کو ایک بار پھر دیکھ لیجیے اور اس طرح کے باقی لفظوں کو آپ خود ڈھونڈ کر اس فہرست میں بڑھا لیجیے آپ کی آسانی کے لیے نیچے جو لفظ لکھے جا رہے ہیں۔ تو ہر لفظ کے آگے بریکٹ میں اس کا واحد بھی لکھ دیا ہے پہلے وہ لفظ دیکھیے۔ جن کے واحد کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور اس سے پہلے یے ہوتی ہے۔

سایے [سایہ] - پایے [پایہ] - ہمسایے [ہمسایہ] - چوپایے [چوپایہ] - تکیے [تکیہ] - قافیے [قافیہ] - مرثیے [مرثیہ] - تعزیے [تعزیہ] - دہریے [دہریہ] المیے [المیہ] - انشائیے [انشائیہ] - بخیے [بخیہ]۔

یہ بخیے وہی لفظ ہے، جسے آپ نے زبانی لڑائی کے درمیان میں کبھی نہ کبھی ضرور سنا ہوگا۔ بعض خواتین دانت پیس کے کہتی ہیں کہ "بس بس، زیادہ باتیں نہ بناؤ، نہیں تو سارے بخیے ادھیڑ کے رکھ دوں گی" ویسے بخیہ کے معنی ہیں۔ سلائی۔

اب وہ لفظ لکھے جا رہے ہیں جن کے آخر میں الف ہے اور اس سے پہلے یے ہے۔

لہریے [لہریا] - کیاریے [کیاریا] - پہیے [پہیا] - بہروپیے [بہروپیا] دیے [دیا] بہ معنی چراغ] تولیے - [تولیا] - بھیڑیے [بھیڑیا] - ہنسیے [ہنسیا] - کباڑیے [کباڑیا] لباڑیے [لباڑیا]۔

اب یہاں پر ایک مزے کی بات سُن لیجیے. جو لوگ ایسے لفظوں پر ہمزہ جوڑ دیا کرتے ہیں، ان کو اس وقت یہ دھیان نہیں رہتا کہ انھوں نے اچھے خاصے لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے جیسے کوئی صاحب پایہ کی جگہ جمع پائے ہمزہ کے ساتھ لکھیں تو اُن کی سمجھ میں یہ سیدھی سی بات نہیں آتی کہ یہ تو پانا مصدر سے بنا ہوا ایک فعل ہو گیا یعنی مصدر ہے : پانا۔ اس سے بنا : پائے جیسے جانا سے جائے اور کھانا سے کھائے اور آنا سے آئے ـــ پایہ کی جمع ہوگی : پایے

وہ جو کہتے ہیں نا کہ بات میں بات نکل آتی ہے، سو وہی ہوا۔ اس بات کو بھی سُن لیجیے۔

ایک غلطی بہت عام ہے اچھے خاصے آدمی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ بڑوں کو غلطی کرتے دیکھیے، آپ کیوں اس کے پھیر میں پڑیں. غلط کام کوئی بھی کرے، وہ غلط ہے۔

کچھ لفظ ایسے ہیں کہ اُن کے آخر میں الف ہوتا ہے. مگر میں، سے، پر، نے، تک، کا، کے، دار، والا کی طرح کا کوئی ٹکڑا ان کے بعد آتا ہے تو وہ آخر کا الف، یے سے بدل جاتا ہے جیسے ایک لفظ ہے : گھڑا، یہ گھڑے بن جائے گا. مثلاً کوئی شخص کہے : گھڑے میں پانی رہا ہی نہیں. یا جیسے ایک لفظ ہے : پودا، یہ پودے بن جائے گا. جیسے : پھولوں کے پودے سب سوکھ گئے.

یہ سیدھا سا قاعدہ ہے اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں، عام طور سے اس میں کوئی غلطی بھی نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ بھی قاعدہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہ ہو، تو جب میں سے جیسے ٹکڑے (جن کو اوپر لکھا جا چکا ہے) ان کے بعد آئیں گے تو ان سب لفظوں کی ہ بھی یے سے بدل جائے گی. جیسے کعبہ، پردہ، چشمہ، سرمایہ، مزہ، لفافہ، حقہ، بت کدہ، ۔۔۔ خانہ، پیمانہ، ان کو لکھا جائے گا :

لفافے پر. بت کدے میں ـــ پیمانے سے ـــ پردے دار ـــ مزے دار ـــ خیمے دار ـــ چشمے سے ـــ سرمایے سے. ۔۔۔ خانے میں کعبے تک. حقے والا.

غلطی کب ہوتی ہے؟ غلطی اس وقت ہوتی ہے جب کچھ لوگ اس قاعدے کو بھول جاتے ہیں اور کعبہ کا ـ پردہ والا. چشمہ سے. بُت کدہ تک. لفافہ پر وغیرہ لکھتے ہیں۔

دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور اس ہ سے پہلے ایک یے بھی ہوتی ہے، جیسے : سایہ، تعزیہ مرثیہ، تکیہ، وغیرہ؛ تو جب ان لفظوں کے بعد وہ ٹکڑے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے. آتے ہیں اور ہ کو یے سے بدل دیا جاتا ہے. تو کچھ لوگ اس یے کے اوپر ایک ہمزہ بھی جما دیا کرتے ہیں. جیسے سائے میں، تعزیئے پر. مرثئے کو، تکئے پر.

یہ بھی بالکل غلط ہے. ہمزہ کا یہاں کیا کام! مرثیے کو، تکیے پر تعزیے پر، سایے میں. لکھا جائےگا.

اب یہ تین طرح کے لفظ ہوئے: ایک تو وہ جن کے آخر میں الف ہوتا ہے. اور وہ الف یے سے بدل جاتا ہے دوسرے لفظ وہ جن کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور اس سے پہلے یے کے علاوہ کوئی اور حرف ہوتا ہے. اس حرف کو بھی یے سے بدل جانا چاہیئے. تیسرے وہ لفظ جن کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور اس سے پہلے یے ہوتی ہے. اس ہ کو بھی یے سے بدل جانا چاہیے. ہمزہ ان تینوں صورتوں میں کہیں نہیں آئے گا.

اب ان تینوں قسموں کے کچھ لفظوں کی مشق بھی کر ڈالیے. کام آئے گی. قلم کی ان سے اچھی طرح جان پہچان ہو جائے گی اور یادداشت میں ان کی صورت نقش ہو جائے گی.

پہلی قسم کے لفظ.

پہیا :- گاڑی کے دونوں پہیے بیکار ہو گئے.

لہریا:۔ لہریے دار دوپٹا کیسا اچھا ہے
ہنسیا:۔ کسان اپنے ہنسیے سے بہت کام لیتا ہے۔
بھیڑیا:۔ بھیڑیے کا بچہ بھی بھیڑیا ہوتا ہے۔
بہروپیا:۔ بہروپیے نے کیا بھیس بھرا ہے۔

دوسری قسم کے لفظ۔

کعبہ:۔ کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی۔
مے خانہ:۔ مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
پردہ:۔ اب تو پردے سے باہر آجاؤ۔
مزہ:۔ ہم نے تو خوب مزے اڑائے۔
ذمہ:۔ ان کے ذمے ہمارے دس روپے نکلتے ہیں۔

تیسری قسم کے الفاظ۔

سایہ:۔ برے آدمی کے سایے سے بچنا چاہیے۔
مرثیہ:۔ اس مرثیے میں گرمی کا بیان بہت عمدہ ہے۔
تکیہ:۔ یہ سر تکیے پہ ہم دم جس طرح رکھوں، نہ ٹھہرے گا۔
قافیہ:۔ اس قافیے کو غالب نے خوب باندھا ہے۔
سرمایہ:۔ سرمایے کے بغیر کوئی بڑا کارخانہ نہیں چل سکتا۔

اسی سلسلے کی ایک چھوٹی سی بات اور سن لیجیے۔
مرثیہ واحد ہے اس کی جمع ہوئی مرثیے۔ اور مرثیوں بھی اسی کی جمع ہے ہمزہ نہ اس جمع میں آئے گا۔ نہ اس جمع میں ان کی مشق بھی کروا لیجیے۔

مرثیہ - مرثیے - مرثیوں
تکیہ - تکیے - تکیوں
تعزیہ - تعزیے - تعزیوں
قافیہ - قافیے - قافیوں
سایہ - سایے - سایوں
ہمسایہ - ہمسایے - ہمسایوں

دہریہ - دہریے - دہریوں

ہنسیا - ہنسیے - ہنسیوں
بھیڑیا - بھیڑیے - بھیڑیوں
تولیا - تولیے - تولیوں
کیاریا - کیاریے - کیاریوں
لہریا - لہریے - لہریوں
پہیا - پہیے - پہیوں
بہروپیا - بہروپیے - بہروپیوں

جناب حسرت فہیم جانوی

سالِ نو

نیا سال آیا مرے ساتھیو اب
بکھیرو فضا میں محبت کے نغمے
ہنسیں پھول ہر اک کلی مسکرا دے
کچھ ایسے کہ ہر زندگی مسکرا دے
نیا سال لایا مسرت کا تحفہ
عزیزو! تمھیں سالِ نو ہو مبارک

مسلسل جو غم ہی اٹھاتے رہے ہیں
ہنسی آج ان کے لبوں تک بھی آئے
زمیں بھی مسرت سے اب جھوم اُٹھے
کہ شاداں ہیں آج آسماں پر ستارے
نئے حوصلوں نے جمایا ہے نقشہ
عزیزو! تمھیں سالِ نو ہو مبارک

ہر اک دل میں اُٹھنے لگی ہے یہ خواہش
اخوت کا چرچا ہو ہر انجمن میں
یہ ہندو یہ مسلم یہ سکھ یہ عیسائی
رہیں بن کے بھائی پھر اپنے وطن میں
سحر کی پیامی ہوا اے کاش دُنیا
عزیزو! تمھیں سالِ نو ہو مبارک

ہمارے قدم چومتی ہیں بہاریں
بہاروں میں گم ہوگئی ہے خزاں اب
برستے ہیں ہر سمت راحت کے بادل
فضا اب مکدّر نہ ہوگی یہاں اب
کھڑا اب نہ ہوگا یہاں کوئی فتنہ
عزیزو! تمھیں سالِ نو ہو مبارک

مولانا بدرالدین

باپ نے بیٹے کو نہیں پہچانا

امام ربیعۃ الرائے دوسری صدی ہجری میں ایک بہت بڑے عالم اور امام گزرے ہیں۔ ان کی قابلیت اور علمی مرتبہ کی یہ شان تھی کہ مسلمانوں کے مشہور امام اور عالم امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصری کے استاد تھے۔

امام ربیعہ کے والد فروخ فوج میں ملازم تھے اور بڑے اچھے بہادر سپہ سالار تھے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں اسلامی سلطنت بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور وہ اسلامی فتوحات کا سنہرا دور سمجھا جاتا تھا۔

امام ربیعہ کے پیدا ہونے میں کچھ دن باقی تھے کہ ان کے والد فروخ کو ایک فوج کے ساتھ دمشق کی طرف جانے کا حکم ملا اور وہ فوراً فوج لے کر روانہ ہو گئے فروخ اسلامی لشکر لے کر گئے تو ایک کے بعد دوسری جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور خراسانی فتوحات میں ان کو لگاتار ۲۷ سال لگ گئے۔ اس درمیان ان کو گھر واپس آنے کا بالکل موقع نہ ملا۔

ان کے جانے کے کچھ دن بعد ان کے صاحبزادے ربیعہ پیدا ہوئے اور باپ کو ان کی پیدائش کی خبر بھی نہ مل سکی۔ امام ربیعہ کی والدہ نے بیٹے کی بہت اچھی طرح تربیت کی اور تعلیم کا معقول انتظام کیا۔ اس زمانے میں قرآن پاک اور حدیث کا علم حاصل کرنا ہی سب سے بڑی دولت تھی چنانچہ امام ربیعہ ماں کی تربیت میں پروان چڑھے اور اچھے قابل استادوں کے ساتھ رہ کر قابل عالم بنے۔

مکمل ۲۷ سال کے بعد جب فروخ اپنے وطن مدینے واپس آئے تو گھوڑے پر سوار اپنے گھر کے دروازہ پر پہنچے۔ گھر کے دروازے کو نیزے کی نوک سے کھٹکھٹایا، اندر سے ان کے ۲۷ سال کی عمر کے صاحبزادے ربیعہ آئے۔ دروازہ کھولا۔

باپ نے بیٹے کو نہیں پہچانا اور بے تکلف گھر میں داخل ہونے لگے۔ ربیعہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی غصہ بھی آیا۔ کہ ایک غیر آدمی بغیر پوچھے گھر میں چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے للکار کر فروخ سے کہا "اے دشمن خدا تو کس طرح میرے گھر میں بغیر اجازت گھسا جاتا ہے"۔

فروخ کو یہ سن کر طیش آگیا۔ کہنے لگے "یہ میرا گھر ہے میں جا رہا ہوں مگر حرم سرا میں تیرا کیا کام تو یہاں کیوں ہے؟" اس پر بات بڑھ گئی اور تیز کلامی ہونے لگی پاس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اتنے میں امام مالک بھی اپنے استاد ربیعہ کا معاملہ سمجھ کر آ گئے۔ انھوں نے آتے ہی نرم لہجے میں فروخ سے کہا "بڑے میاں آپ کو ٹھہرنا ہی ہے تو دوسرا مکان موجود ہے۔ اس میں ٹھہر جائیے۔ ربیعہ کے گھر میں کیوں گھسے جاتے ہیں۔

امام مالک کی نرم گفتگو کا فروخ پر اثر ہوا اور کہنے لگے "جناب میرا نام فروخ ہے یہ تو میرا گھر ہے۔ میں کیوں کسی دوسرے مکان میں ٹھہروں"۔ یہ بات اندر ربیعہ کی والدہ نے سُنی تو انھوں نے آواز پہچانی اور کہنے لگیں ارے یہ تو ربیعہ کے والد ہیں۔ انھیں گھر میں آنے دو۔ ربیعہ نے جب ماں کی بات سُنی تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا۔ اور جوشِ محبت میں بہت دیر تک روئے۔

گھر میں آئے تو ربیعہ کی والدہ سے پوچھا کیا یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ ماں نے کہا ہاں۔ پھر جب اطمینان ہو گیا تو فروخ نے اپنی بیوی سے پوچھا "میں چلتے وقت تیس ہزار اشرفیاں تمھیں دے گیا تھا۔ ان کا کیا ہوا۔ بیوی نے کہا" بالکل محفوظ ہیں ——؟"

اس عرصے میں امام ربیعہ باقاعدہ مسجد میں علم حدیث کا درس دینے لگے تھے اور ان کی جماعت یا حلقۂ درس میں امام مالک اور حسن بصری جیسے عالم شاگرد کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔

ایک دن فروخ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گئے۔ تو دیکھا کہ ایک طرف شیخ (استاد) بیٹھے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف عالم جمع ہیں سبق پڑھ رہے ہیں۔

امام ربیعہ کے سر پر اس وقت اونچی ٹوپی تھی۔ فروخ کو پھر ایک دفعہ ان کو پہچاننے میں دھوکا ہوا۔ انھوں نے دوسرے نمازیوں سے معلوم کیا۔ یہ کون عالم ہیں جن کے حلقۂ درس میں اتنے لوگ شریک ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا یہ ربیعہ ابن عبدالرحمٰن فروخ ہیں"۔ فروخ یہ سُن کر کس قدر خوش ہوئے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ فروخ کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا بے شک اللہ پاک نے میرے بیٹے کے رتبے کو بہت بلند کیا۔

اس کے بعد خوشی خوشی گھر آئے۔ اور بی بی سے سارا قصہ بیان کیا۔

بیوی نے کہا آپ کو اپنے پیارے بیٹے کی یہ شان زیادہ پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں"۔

شوہر نے کہا "خدا کی قسم میں بیٹے کی اس شان کو زیادہ پسند کرتا ہوں"۔

بیوی نے کہا میں نے وہ تیس ہزار اشرفیاں جو آپ رکھ گئے تھے۔ بیٹے کی تعلیم میں خرچ کر دیں۔ زندہ دل شوہر نے یہ سن کر کہا۔ خدا کی قسم تم نے وہ مال ضائع نہیں کیا۔ صحیح خرچ کیا"۔

جناب راج نرائن راز

گھڑیوں کی دلچسپ کہانی

ٹِک، ٹک، ٹک،

جی ہاں، یہ گھڑی کی آواز ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ گھڑی ایک سیکنڈ میں اور ایک دن میں کتنی بار ٹِک ٹک کرتی ہے۔ ایک سیکنڈ میں پانچ بار اور ایک دن میں چار لاکھ چھتیس ہزار بار۔ شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس ٹِک ٹک کے درمیان آپ کی گھڑی کے بیلنس وہیل کا گھیرا سات میل کے برابر چکر لگا لیتا ہے۔ یہ پانچ لاکھ، ۴۰ ہزار بار آگے پیچھے چلتا ہے۔ ایک موٹر کار کا پہیہ اتنی بار گھومے تو ایک برس میں یہ ڈھائی لاکھ میل کی مسافت طے کر لے گا۔

اتنے لمبے سفر کے بعد موٹر بے چاری تو شاید بیٹھ ہی جائے گی۔ لیکن آپ کی گھڑی بدستور چلتی رہتی ہے مرمت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

ہے نا انوکھی بات! لیکن گھڑی کے بارے میں کچھ دوسری باتیں اور بھی عجیب و غریب ہیں مثلاً یہ کہ گھڑی کے سفر کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ یہ ہزاروں برس پر پھیلی ہوئی ہے اور یہ کہ اس کا تعلق آگ، سورج اور پانی سے ہے۔ آپ پوچھیں گے، کیسے؟ تو سنیے۔ بات آگ سے شروع کریں۔

کہتے ہیں چین میں، بہت زمانہ پہلے، وقت کا حساب آگ اور رسّی کی مدد سے رکھا جاتا تھا۔ بھیگی ہوئی رسی پر گرہیں ڈال دی جاتی تھیں۔ یہ ایک دوسرے سے ایک سی دوری پر ہوتی تھیں۔ رسی کے ایک سرے کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ رسّی سُلگتی اور آگ ٹھیک برابر وقفہ کے ساتھ ایک کے بعد ایک گرہ سلگتی۔ انھی جلی ہوئی گرہوں سے وقت کا اندازہ کر لیا جاتا۔

ایسی ہی ایک گھڑی انگلستان میں الفریڈ اعظم نے ۸۷۰ء میں موم بتیوں سے بنائی تھی۔ ان موم بتیوں پر چار گھنٹوں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ ایک اور دوسرے گھنٹے کے درمیان تین تین نشان اور تھے۔ ایک موم بتی چار گھنٹے تک جلتی رہتی تھی۔ اور جب جل چکتی تو دوسری جلا دی جاتی۔ اور اس طرح وقت کا حساب لگایا جاتا۔

اس سلسلے میں "تیل چراغ گھڑی" کا ذکر ضروری ہے اس کا تیل دان شیشے کا اور بوتل کی شکل والا ہوتا تھا۔ اس پر وقت ظاہر کرنے کے لیے نشان بنے ہوتے تھے۔ لیمپ کی بتی جلتی رہتی تیل دان میں تیل گھٹتا۔ اور اس سے

وقت اور گزرے ہوئے وقت کا پتہ چلتا۔

لیکن یہ گھڑیاں خاص ضرورت سے بنیں اور بعد میں بنیں۔ ان سے پہلے سورج گھڑیوں کا رواج تھا۔ ان گھڑیوں کا رواج کب پڑا۔ اس بارے میں کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ان گھڑیوں کی تاریخ چار ہزار برس پرانی ہے۔ یہ پہلے پہل بابل میں بنیں اور استعمال ہوئیں سورج گھڑیوں کا رواج اٹھارہویں صدی تک رہا ہے۔ بعض سورج گھڑیاں بڑی بھدی ہوتی تھیں۔ اور ٹھیک وقت نہیں دیتی تھیں بعض بہت صحیح وقت بتاتی تھیں۔ یہ گھڑیاں مختلف سائزوں میں اور شکلوں میں ہوتی تھیں۔

بھارت کے گلابی شہر جے پور کے جنتر منتر کی سورج گھڑی بہت بڑی ہے۔ اس کے ڈائل کا قطر ایک سو فٹ اور وقت بتانے والے بازو کی لمبائی ۷۰ فٹ ہے لیکن یورپ کی ایک سورج گھڑی اور بھی انوکھی ہے۔ یہ گھڑی سولہویں صدی کی ہے۔ اس گھڑی کے ڈائل پر بتانے والے بازو کے علاوہ ایک توپ بنی ہوئی ہے توپ سے ذرا اوپر ایک آتشی شیشہ لگا ہوا ہے۔ یہ توپ چلتی بھی ہے۔ اس چھوٹی سی توپ میں تھوڑا سا بارود بھر دیا جاتا تھا۔ آتشی شیشے سے سورج کی کرنیں بارود پر پڑتیں اور عین ایک وقفہ کے بعد جل اٹھتا اور توپ چل جاتی۔ گویا توپ کا چلنا ایک طرح سے وقت کا سگنل ہوتا۔

خیر یہ سورج گھڑیاں صرف دن میں وقت بتاتی تھیں رات میں وقت کا اندازہ کیسے ہو۔ شاید یہی ضرورت موم بتی گھڑی، تیل چراغ گھڑی وغیرہ کی ایجاد کا سبب بنی۔ ابتدائی زمانہ کی دو اور گھڑیاں۔ ریت گھڑی اور پن گھڑی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پرانی گھڑیوں میں پن گھڑی کا ذکر یوں بھی ضروری ہے کہ وہی موجودہ گھڑی کی ایجاد کا سیدھا سبب بنی ہے۔

شروع شروع میں پن گھڑی بہت سادہ ہوا کرتی تھی۔ مثال رومی و یونانی پن گھڑی کی لیں۔ یہ گھڑی کیا تھی، ایک برتن تھا۔ اس برتن کے اندر گھنٹوں کے نشان کھدے ہوئے تھے۔ پیندے کے قریب ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا تھا۔ بھر جانے پر، پانی اس سوراخ سے دھیرے دھیرے گر تا رہتا تھا۔ اور اندر رہتے ہوئے نشانوں اور پانی کی سطح سے وقت دیکھا جاتا تھا۔

اس پن گھڑی کے برعکس ہندوستانی اور چینی پن گھڑیوں میں پانی پیندے کے چھید سے کٹورے میں بھرتا تھا۔ اور جب اندازہ کیے ہوئے وقفے کے بعد کٹورا بھر کر پانی میں ڈوب جاتا تو جو شخص وقت بتانے کی خدمت پر مقرر ہوتا، گھڑیال بجا دیتا۔

بعد میں پن گھڑی میں ایسا انتظام کر دیا گیا کہ گھنٹا پورا ہونے پر گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ ڈھول یا بگل بج اٹھتے۔ یا چھوٹے چھوٹے مجسمے حرکت کرنے لگتے پن گھڑی میں گیئر، ڈائل اور دوسرے پرزے لگائے جانے سے وقت کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے علم کو ترقی ملی۔ پھر بوجھ وغیرہ سے کام لینے کی تدبیر مشینی گھڑی کی تیاری کا باعث بنی۔

پہلے پہل جو مشینی گھڑیاں بنیں، وہ بہت بڑی اور کئی ٹن وزنی تھیں۔ ان میں کوئی ڈائل نہیں تھا۔ سوئیاں نہیں تھیں۔ جو تھائی گھنٹہ یا گھنٹہ پورا ہونے پر گھنٹیاں بجنے لگتیں یا پھر گھنٹے کے آس پاس بنے ہوئے دو مجسمے گھنٹا بجاتے۔ گھنٹے بیلن جیسے بڑے پرزے پر لپٹے رسے کے ساتھ بندھے ہوئے بوجھ کے نیچے گرنے یعنی رسّے کے کھلنے سے چلتے۔ اس زمانے کے ایک گھنٹے کو جدید مشینی گھڑی کی ابتدائی شکل سمجھا جاتا ہے۔ یہ مشینی گھنٹہ ہنری ڈیوک نے ۱۳۶۰ء

میں فرانس کے شاہ چارلس پنجم کے لیے بنایا تھا۔ یہ گھنٹہ پیرس میں آج بھی موجود ہے۔

ڈوک کے گھنٹے سے لے کر اب تک کی یعنی موجودہ زمانے کی گھڑیوں اور گھنٹوں میں چار بنیادی خصوصیتیں ایک جیسی ہیں۔ پہلی خصوصیت پرزوں کی ترتیب و انتظام ہے۔ اس سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو گھڑی یا گھنٹے کو چلاتی ہے۔ خواہ یہ قوت وزن سے حاصل ہو، یا کسے ہوئے اسپرنگ سے اور یا پھر بجلی سے۔

دوسری بات قوت پہنچانے والا آلہ، قوت کو دندانے دار پہیوں یعنی گیروں کے ایک سلسلے کے ذریعہ تقسیم کرتا ہے۔ اس سے گھڑی کی سوئیاں وغیرہ گھومتی ہیں تیسرا ساتھی پرزہ روک لگانے والا ہے۔ یہ سب پرزوں کو ایک خاص انداز سے چلاتا ہے۔

پرزوں کو قوت دھیرے دھیرے ملتی ہے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے چلتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں گھنٹے کی سوئیاں بارہ گھنٹوں میں ایک بار، منٹوں والی سوئی ۶۰ منٹوں میں ایک بار اور سیکنڈوں والی سوئی ۶۰ سیکنڈوں میں ایک بار چکر پورا کر لیتی تھی۔ چوتھی ساتھی خصوصیت ڈائل ہے۔

منتی گھڑی یا گھنٹے میں اگلی ترقی، اسپرنگ اور پنڈولم کا اضافہ ہے۔ پندرہ سو صدی عیسوی میں ایک جرمن تالا ساز پیٹر مین لین نے وزن کی جگہ فیتے کی طرح لپٹا ہوا لوہے کا اسپرنگ لگایا۔

پہلی جیبی گھڑی ایسی ہی جرمن تالہ ساز نے ۱۵۱۰ء میں بنائی۔ سولھویں صدی میں گھڑیاں، گھنٹے وغیرہ انگلستان، فرانس، جرمنی وغیرہ میں تیار ہونے لگے تھے۔

گھڑی میں اسپرنگ لگائے جانے کے کوئی ڈیڑھ صدی بعد ایک ولندیزی سائنس دان نے ایک ایسا گھنٹہ تیار کیا جس میں سب پرزوں کو ضبط میں رکھنے یعنی ایک خاص انداز سے چلانے کے آلے کے طور پر پنڈولم استعمال کیا۔ پنڈولم والی گھڑیاں موجودہ زمانہ میں بھی بنتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ بہت صحیح وقت دیتی ہیں۔

بیٹری کے چلنے اور رات کے اندھیرے میں چمکنے والی گھڑیاں آج عام ہیں۔ اب تو بے حد صحیح وقت کے لیے گھڑیوں میں کوارٹز یعنی صوان جیسے شفاف پتھر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ایٹمی گھڑیاں بھی بننے لگی ہیں۔ جو بے حد صحیح وقت دیتی ہیں۔ یقین ہے ان گھڑیوں کی صحیح صحیح وقت بتانے کی صلاحیت میں تین سو برس کے عرصہ میں بھی ایک سیکنڈ کا فرق نہ پڑے گا۔ اور ٹھیک بھی ہے۔

ماضی کی طرح اب گھڑیاں سجاوٹ کے لیے نہیں ہوتیں۔ خیر یہ عجیب بات سہی۔ لیکن موجودہ زمانے اور پرانے زمانے میں بھی بڑی عجیب و غریب گھڑیاں تیار ہوتی ہیں۔ مثلاً۔۔ چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ کے ٹاؤن ہال میں لگی ہوئی انوکھی گھڑی کا ذکر آپ کو یقیناً دلچسپ معلوم ہوگا۔ گھڑی کیا ہے عجیب و غریب کھلونا ہے۔ اس گھڑی میں جب گھنٹہ بجنے کا وقت قریب آتا ہے تو ایک نیلی کھڑکی کھلتی ہے۔ اس میں سے ایک ایک کر کے بارہ درویش نکلتے ہیں۔ سامنے آتے ہیں اور الوداع کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک کنجوس سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی تھیلی کو ٹٹولتا ہے پھر واپس چلا جاتا ہے۔ اس پر ایک مغرور شخص ہاتھ میں آئینہ لیے سامنے آتا ہے اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھتا ہے۔ اس کے بعد گھنٹہ بجتا ہے اس کی لے ماتمی ہوتی ہے پھر ایک مرغا بانگ دیتا ہے۔ اور وہ نیلی کھڑکی بند ہو جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک انوکھی گھڑی حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں ہے۔ اس میں جب گھنٹہ پورا ہونے کو آتا ہے

تو ایک شخص ایک کھڑکی سے نکلتا ہے اور گھنٹہ بجاتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے شہر انٹرلیکن اور لبنان کے شہر بیروت کے پھول گھڑیاں بھی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان گھڑیوں کے ڈائلوں کے لیے ہر برس ہزاروں نئے پھول پودے اگائے جاتے ہیں۔

آج کل دنیا بھر کے سبھی ملکوں میں طرح طرح کی گھڑیاں بنتی ہیں اور ہندوستان میں بھی، ہمارے ملک میں گھڑی تیار کرنے کا ایک بڑا کارخانہ ہندوستان مشین ٹولز بنگلور میں ہے۔ یہ کارخانہ ہر برس تین لاکھ ساٹھ ہزار گھڑیاں تیار کر سکتا ہے۔ بھارت سرکار ایسا ہی ایک کارخانہ کشمیر میں لگانے والی ہے۔ یہ کارخانہ تین لاکھ گھڑیاں سالانہ تیار کیا کرے گا۔ بھارت میں بنی ہوئی گھڑیوں کی مانگ باہری ملکوں میں بھی بہت ہے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس کارخانہ نے تقریباً پورے تین لاکھ روپے کی گھڑیاں مغربی جرمنی امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ کو برآمد کیں

صنعت کے اس میدان میں بھی ہماری ترقی رشک کے قابل ہے اور سچ پوچھیے تو ہندوستان گھڑیاں ہندوستانی خوشحالی کی کڑیاں ہیں۔

جناب منیر صاحب

نیا سال

نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے　　　جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے
ارادے جن کے پختہ ہیں انھیں راہیں دکھاتا ہے　　　جو باہمت ہیں بس ان کا ستارا جگمگاتا ہے
زمانہ پھر انھی کی راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے　　　نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے
جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے

خدا نے تم کو جو نعمت عطا کی کام لو اس سے　　　خدا نے تم کو جو ہمت عطا کی کام لو اس سے
خدا نے تم کو جو قدرت عطا کی کام لو اس سے　　　نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے
جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے

اٹھو اور بڑھ کے اب پیدا کرو تم بھی نئی ہمت　　　قدم آگے بڑھاؤ اور بنالو اپنی کچھ قسمت
کسی کی رائیگاں ہم نے نہیں دیکھی کبھی محنت　　　نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے
جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے

یہی اک عمر ہے تم اس میں حاصل مدعا کر لو　　　یہی موقع ہے علم و فن سے اپنی جھولیاں بھر لو
ترقی کا یہ اک میدان ہے تم اس کو سر کر لو　　　نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے
جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے

ارادہ دل میں ہو پکا تو ہوتا ہے عمل پیدا　　　کہ پانی میں بھی ہو جاتا ہے محنت سے کنول پیدا!
منیرؔ اب مشکلوں کا کرنی ہمت سے حل پیدا　　　نیا ہر سال اک پیغام نو لے کر کے آتا ہے

جو کچھ کرتے ہیں ان کا حوصلہ ہر دم بڑھاتا ہے

اتھوپیا کی سرزمین سے

جناب محمد امین۔ ام۔ اے

پہاڑ پر آگ جلی!

دوسری کہانی

پرانے زمانے میں عدلیس ابابا میں ایک جوان رہتا تھا
اس کا نام ارحا تھا۔ وہ رہنے والا گیورنح کے علاقے کا تھا۔
لڑکپن ہی میں وہ شہر آگیا تھا اور یہاں ہاتیم حبیبی نام کے
ایک امیر سوداگر کے یہاں اس نے نوکری کر لی تھی۔

ہاتیم حبیبی بہت امیر تھا اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں
تھی۔ اس کے گھر میں ضرورت کی سبھی چیزیں موجود تھیں۔ اکثر
وہ سوچتا اب کیا کرے۔ کوئی ایسی نئی چیز نہیں رہ گئی تھی
جسے خرید کر وہ جی بہلائے کبھی کبھی اسے بڑی کوفت ہوتی۔

ایک رات سردی کافی تھی اور سرد ہوا کے جھونکے
پلیٹو کی بلندی پر چل رہے تھے ہاتیم نے ارحا کو آواز دی
اور اس سے کہا کہ لکڑی لاکر آتش دان میں آگ جلادے
ارحا نے یہ کام ختم کر لیا۔ تو ہاتیم نے کہا "انسان میں کتنی
قوت برداشت ہوتی ہے! آج سردی بہت ہے۔
اور کیا ماؤنٹ سوکولتا پر جو پہاڑ کے سب سے اونچی چوٹی
ہے اور جہاں برفیلی ہوائیں چل رہی ہیں بغیر کمبل اور کپڑا
کے کوئی شخص رات بھر گزارہ سکتا ہے میرا خیال ہے
کہ یہ ناممکن ہے کوئی ایسا کرے گا تو وہ زندہ نہیں
بچے گا۔"

ارحا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا: "مجھے اس کا
اندازہ نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا محض حماقت ہے۔"

"لیکن یہ بات میں یونہی نہیں کہہ رہا ہوں" میرا دعوی ہے
کہ کسی میں ہمت نہیں کہ وہ ایسا کر سکے اور اس کے لیے میں ہر
طرح کی شرط لگانے کو تیار ہوں"۔ ہاتیم نے ارحا کو اکسایا۔
"یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمت والا آدمی رات بھر ماؤنٹ
سوکولتا پر ننگ دھڑنگ گزارہ سکتا ہے" ارحا نے دبی دبی
آواز میں کہا۔ "البتہ میں اپنی بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مجھے بھلا
اس سے کیا سروکار حضور میں شرط لگاؤں، وہ بھی بھلا آپ سے؟
نہیں ہرگز نہیں"۔

ہاتیم نے کہا: "دیکھو تم میری بات غور سے سنو۔ تم کہہ رہے
ہو کہ ایسا ممکن ہے اس لیے میں تم ہی سے شرط لگانے کو تیار
ہوں۔ اگر تم ماؤنٹ سوکولتا پر رات بھر بغیر کھانا کھائے، پانی
پیئے کمبل کپڑے یا آگ سے سہارا لیے بغیر کھڑے رہو اور زندہ
بچ جاؤ تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو دس ایکڑ زمین کھیتی
کے لیے دوں گا ساتھ ہی ساتھ ایک گھر اور بہت سی گائیں
بھی"۔

ارحا کو یقین نہیں آیا۔ اطمینان کرنے کے لیے اس نے
پوچھا "کیا حضور واقعی آپ جو کچھ فرما رہے ہیں سچ ہے؟"
"میں اپنی بات کا پکا ہوں۔ وعدہ خلافی کرنے کا سوال
ہی نہیں"، ہاتیم نے جواب دیا۔
"بہت اچھا" ارحا نے کہا، "رات کو میں اس کے لیے کوشش کروں گا۔"

ارحا نے کہا" اور اگر میں شرط جیت گیا تو زمین ساری عمر میرے قبضے میں رہے گی۔ اور میں اپنی مرضی کے مطابق فصل بوؤں گا اور کاٹوں گا"

لیکن اندر ہی اندر اسے بڑی فکر اور برابر یہ ڈر رہا کہ سرد ہوا کے تیر کی طرح چبھنے والے جھونکوں کو وہ کیسے برداشت کر سکے گا۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے گیورنج قبیلے کی طرف واپس گیا۔ وہاں اس نے ایک بزرگ اور عقل مند آدمی سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔

انھوں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں تمھیں ترکیب بتاتا ہوں، سولونا کی چوٹی تو بہت اونچی ہے۔ اور دن میں یہاں نشیبی علاقے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ کل یہاں سورج غروب ہونے کے بعد وادی میں ایک جگہ میں آگ جلائے ہوں گا۔ چوٹی پر پہنچ کر تم اس آگ کو دیکھتے رہنا۔ ایک منٹ کے لیے اپنی نظر اس آگ سے نہ ہٹانا مسلسل آگ کی روشنی کو ٹکٹکی باندھے رات بھر دیکھتے رہنا۔ اور یہ سوچنا کہ آگ کتنی گرم گرم ہے۔ میرے بارے میں سوچنا کہ میں تمھارا ہی خواہ ہوں وہاں بیٹھا ہوں اور محض تمھاری خاطر آگ جلائے بیٹھا ہوں۔ اگر تم نے اپنی نظر اس طرح جمائے رکھی تو تم پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ ہوا کتنی ہی ٹھنڈی اور تیز ہو تم صاف بچ جاؤ گے۔"

ارحا بہت خوش ہوا۔ اور اس نے بزرگ کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ وہ ہاپتم کے گھر لوٹ آیا۔ اور اب اس کا دل مضبوط تھا۔ آتے ہی اس نے ہاپتم سے کہا کہ میں تیار ہوں اور آج ہی شرط باندھنا مجھے منظور ہے۔

شام ہوتے ہی ہاپتم نے اسے ماؤنٹ سولونا کی چوٹی پر بھیج دیا۔ ساتھ میں کئی دوسرے ملازم کر دیے کہ اس پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ وہ شرط کو ٹھیک سے نبھائے۔

رات ہوتے ہی ارحا نے اپنے کپڑے اتار دیے۔ ننگا ہو گیا اور ہمت کر کے سرد ہوا کے جھونکوں میں کھڑا ہو گیا۔ نیچے وادی کی طرف جو اس نے نگاہ اٹھائی تو میلوں دور اسے اپنے دوست کی آگ دکھائی دی۔ آگ کی روشنی اندھیرے میں اس طرح چمک رہی تھی گویا کہ کالے آسمان پر ایک ستارہ ٹمٹما رہا ہو۔

ہوا سرد ہوتی گئی۔ اس کی نس نس میں گھسنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا ہڈیوں میں گھس جائے گی۔ چٹان کی تہ جس پر وہ کھڑا تھا۔ برف جیسی محسوس ہوئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اعضا ٹھنڈے پڑنے لگے کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس کا بچنا آسان نہیں لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ آگ کی روشنی پر اس نے ٹکٹکی باندھے رکھی اور سوچتا رہا کہ وہ بزرگ شخصیت وادی میں محض اس کی خاطر آگ جلائے بیٹھی ہے۔ کبھی کبھی کہرے سے آگ چھپ جاتی۔ وہ گھبرا اٹھتا لیکن کہرے کی تہہ سے چیر کر اس کی نظر آگ کو پھر ڈھونڈ لیتی۔ سردی برداشت سے باہر تھی اسے جھپک پر جھپک آتی۔ کھانسی نے تنگ کیا اور کپکپی سی بندھ گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ اب خیر نہیں اور ہاتھ پیر سرد پڑ جائیں گے لیکن واہ ری ہمت کہ ڈٹا رہا۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ ساری رات اس نے جیسے تیسے گذار دی۔ آخر مشرق کی طرف پو پھٹی۔ اس کی جان میں جان آئی۔ صبح ہوتے ہی اس نے کپڑے پہن لیے۔ اور کمبل اور گرم کپڑے لپیٹ کر پہاڑ سے نیچے اترا اور شہر کی طرف لوٹا۔

ہاپتم نے دیکھا کہ ارحا بھلا چنگا چلا آ رہا ہے اس نے اپنے ملازمین سے ساری تفصیلات دریافت کیں اور کچھ سوالات پوچھے۔

"کیا وہ رات بھر ننگا دھڑنگا بھوکا پیاسا کھڑا رہا؟"
"جی حضور یہ سچ ہے"۔ اس کے ملازمین نے جواب دیا۔
"اس نے کسی چیز سے کوئی سہارا نہیں لیا"
"تم تو واقعی بڑے مضبوط نکلے" ھاتم نے ارحا سے کہا
"آخر تم بچے کیسے؟"
"دور ایک جگہ آگ جل رہی تھی۔ اسی کی روشنی کے سہارے میں نے ساری رات گزار دی" ارحا نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"کیا! آگ دیکھتے رہے؟ پھر تو تم شرط ہار گئے اور زمین وغیرہ دینے کا سوال ہی نہیں۔ البتہ ملازمت سے میں تمھیں برخاست نہیں کروں گا۔ اور تم یہیں پڑے رہو۔"

"لیکن حضور سنیے تو! یہ آگ میرے پاس تھوڑے ہی تھی کہ میں اس سے گرمی حاصل کرتا رہا۔ وہ تو میلوں دور وادی میں جل رہی تھی۔"

"بہر حال اب تم کو زمین دینے کا سوال ہی نہیں۔ تم نے شرطیں پوری نہیں کیں۔ آگ نے تمھیں سہارا دیا۔ اور اسی کی وجہ سے تم بچ گئے۔" ہاتم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ارحا کا جی کھٹا ہو گیا۔ اسے بہت ہی غم اور افسوس ہوا کہ اب کرے تو کیا کرے۔ وہ قبیلے کے بزرگ دوست کے پاس پھر گیا۔ اور ان سے سارا قصہ کہہ سنایا۔

"یہ معاملہ جج کے پاس لے جاؤ" بزرگ نے مشورہ دیا ارحا نے کچہری میں جاکر دعویٰ کیا اور جج کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ ہاتم کو کچہری میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا جب ہاتم نے تفصیلات بتائیں اور اس کے نوکروں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ارحا نے وادی میں آگ دیکھی تھی۔ تو جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم شرط ہار گئے ہو۔ تم نے ہاتم جیسی کی یہ بات کہاں مانی کہ تم کسی آگ سے سہارا نہیں لوگے۔"

مایوس ہو کر ارحا ایک بار پھر اپنے بزرگ دوست کے پاس مشورہ لینے کے لیے گیا۔ بزرگ نے کہا "ہمت نہ ہارو امید قائم رکھو کوشش پہ کوشش کرتے رہو۔ تم حق پر ہو اور تمہاری جیت ہو کر رہے گی۔"

ارحا کو اطمینان نہیں ہوا۔ مشورے کے لیے وہ ایک دوسرے جہاندیدہ اور مخلص آدمی کے پاس گیا۔ ان کا نام ہیلو تھا۔ بچپن میں ارحا ان کے گھر کام کر چکا تھا۔ اس نے ان سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔ اور ان سے گزارش کی کہ ممکن ہو تو اس کی وہ کچھ مدد کریں۔

"گھبراؤ نہیں" ہیلو نے سوچ کر کہا "میں کوئی نہ کوئی اس کا حل نکالوں گا۔"

کچھ دنوں بعد ہیلو نے شہر کے شرفا اور معززین کی دعوت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں ہاتم صاحب بھی تشریف لائے جج صاحب بھی آئے۔ سارے مہمان قالینوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پاس ہی .. باورچی خانے سے اچھے اچھے کھانوں کی خوشبو آرہی تھی۔ اس خوشبو سے مہمانوں کی بھوک بھڑک کر اور تیز ہوتی رہی۔ وقت کافی ہو گیا۔ دسترخوان لگنا چاہیئے تھا۔ لیکن انتظار انتظار میں گھنٹوں گذر گئے۔ خوشبو سونگھ سونگھ کر بھلا کوئی کب تک چپ رہتا۔ بارہ بجنے کو آ گئے کھانے کا اب بھی پتہ نہیں۔ بھوک کے مارے مہمانوں کا برا حال۔ انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھنے لگیں۔ کھا نا کھسر پھسر ہونے لگی اور کھلم کھلا لوگ کہنے لگے۔ کہ جب کھانا نہیں تو پھر ہیلو نے دعوت پر سب کو کیوں بلایا؟ آخر ش ایک مہمان سے ضبط نہ ہو سکا انہوں نے بے تکلفی سے دریافت کیا کہ کھانا نہیں کھلانا ہے

سب کو بلایا کیوں؟

ہیلو، اسی موقعہ کا منتظر تھا۔ "کیوں، خوشبو آرہی ہے یا یہ کافی نہیں؟"

"خوشبو تو آرہی ہے لیکن جب تک کھانا نہ کھایا جائے محض خوشبو سے کہیں پیٹ بھرتا ہے؟"

ہیلو نے جواب دیا کہ "میلوں دور جو آگ جلتی ہے کیا اس سے گرمی مل سکتی ہے؟ اگر ارحا کو اس سے گرمی مل ہوتی تو محض خوشبو سے آپ لوگوں کا پیٹ بھر جانا چاہیے تھا؟"

اس دلیل سے سب لوگ قائل ہو گئے۔ جج صاحب بھی لاجواب ہو گئے۔ اور ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہیم صاحب نے بھی شرم کے مارے اپنی گردن جھکالی۔

انھوں نے ہیلو کا شکریہ ادا کیا اور کہا ہم سب قائل کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہو سکتا تھا۔

وہیں بھرے مجمعے میں انہوں نے اعلان کیا کہ ابھی یہ وہ ارحا کو زمین، گھر اور مویشی سب کچھ دے رہے ہیں۔

اس کے بعد ہیلو نے حکم دیا کہ دسترخوان پر فوراً چن دیے جائیں۔ اور مہمانوں کو انواع اقسام کے کھانے پیش کیے جائیں۔

سب نے ہیلو کا شکریہ ادا کیا اور جی کھول کر مبارکباد پیش کی۔

اگلی کہانی "گنہگار خنجر" آئندہ کے شمارے میں پیش ہوگی۔

جناب محمد ارمغاں ساحل سہسرامی

صبح

رات اب تو گزرنے لگی
روشنی سی بکھرنے لگی!
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جب چلی
باغ میں کھِل گئی ہر کلی!
سب پرندے چہکنے لگے
حسنِ گلشن پہ یہ جھوم اٹھے
یہ سویرے کی پیاری بہار
دیکھیے کتنا لائی نکھار
صبح کو آدمی جب اٹھے
کتنا اچھا سا منظر لگے
صبح اتنی سہانی سی ہے
ہر طرف اک جوانی سی ہے
ارمغاں کا یہ کہنا سنو!
تم ہمیشہ سویرے اٹھو!

ایک بچے کی التجا

جناب شوق فاروقی

چندا پہ جانے والو
راکٹ اڑانے والو
میری یہ بات سن لو
گوہر ہیں ان کو چن لو
جنگوں سے باز آؤ
انسانیت جگاؤ
پھولوں سے پیار کر لو
دل پُر بہار کر لو
دکھیوں کو تم خوشی دو
دنیا کو روشنی دو
ایٹم کا ڈر مٹا دو
فتنوں کا گھر مٹا دو
سائنس میرے بھائی
لائے گی سکھ بھلائی
میری یہ بات مانو
اس کو نہ کھیل جانو
بن جاؤ آدمی تم!
بانٹو ہمیں تبسم!

جناب رضا برنی

(بڑے لڑکوں کے لئے)

مشعلِ علم و ہنر ہاتھوں میں لے کر اٹھو
دور تک باقی نہ رہ جائے اندھیروں کا گماں
کامیابی کو گلے اپنے لگا لو بڑھ کر
عہدِ طفلی میں بھی پیدا کرو اندازِ جواں
دیش کی شان بڑھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچمِ علم سجاؤ تو کوئی بات بنے

نئی نسلوں کو نئی راہ دکھانے کے لیے
خود ہی کرنی ہے نئے طور سے اپنی تنظیم
اپنا ہے راج شکایت کی کوئی بات نہیں
وقت کے ساتھ ہر اک شئے میں ہے ممکن ترمیم
نئی تدبیر سُجھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچمِ علم سجاؤ تو کوئی بات بنے

امن کے راستے منزل پہ پہنچنے کے لیے
کوئی الجھن نہ رہے کوئی تعطل نہ رہے
صاف دل ہوں تو بدل جاتا ہے حالات کا رخ
کچھ کدورت نہ رہے سینے میں ہلچل نہ رہے
اجڑے ویرانے بساؤ تو کوئی بات بنے
پرچمِ علم سجاؤ تو کوئی بات بنے

دور اندیشی کے اسباب رہیں پیشِ نظر
اپنی املاک کو برباد نہ ہونے دینا
سب تمہارا ہے نہیں غیر کا کچھ سود و زیاں
یہی ہے آپ سے درخواست یہی ہے کہنا
اپنی خود شان بڑھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچمِ علم سجاؤ تو کوئی بات بنے

کتابوں کی باتیں

محترم شفیع الدین نیّر صاحب کی بچوں کی کتابیں

محترم نیّر صاحب نے بچوں کے ادب میں کیا کچھ نام پیدا کیا ہے۔ یہ بات اب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے چھ سات برس کے بچوں کے لیے آسان اور دلچسپ کہانیوں کی چھ کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کتابیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے لیے اس قدر مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کہ اس سے قبل ان کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔

گلگلے کی دوڑ ـ ڈھول کا بول ـ میں گھر جاؤں تو کیسے، آٹے کا چیتا ـ مکھن کا ڈبا ـ ہوشیار حسن۔

ان کتابوں کی زبان ان کا اندازِ بیان اس عمر کے بچوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اب حال ہی میں ہر کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ان کہانیوں کو آپ نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ نثر کے ساتھ اسی معیار کی نظمیں بھی اس میں شامل کی ہیں اور اب یہ بچوں کے لیے اور بھی زیادہ دلکش ہو گئی ہیں۔ اس طرح نیّر صاحب نے ننھے منے بچوں کی کہانیوں میں ایک نئی راہ نکالی ہے۔ جو یقین ہے کہ اردو دنیا میں پسند کی جائے گی۔ اور ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کہانیاں بھی اور زیادہ مقبولیت حاصل کریں گی۔

یہ کتابیں ایسی ہیں کہ اردو کی پہلی کتاب کے ساتھ پڑھائی جائیں تو پڑھنے میں بچوں کا دل زیادہ لگے گا۔ اور وہ ذوق شوق سے جلد اردو پڑھنا سیکھ جائیں گے۔

کتابیں باتصویر ہیں۔ خط جلی ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ کاغذ نفیس اور سفید قیمتیں واجبی ہیں۔

پہلی دو کتابوں کی قیمت پچیس پچیس پیسے اور باقی ہر کتاب کی قیمت پچاس پیسے ہے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

یہ سب کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی ۲۵ سے بھی مل سکتی ہیں۔

بقیہ شیر کے بدلے میں گدھا۔ صفحہ ۲۴ سے

اور ساری دنیا میں صرف ایک ہزار۔ ہمارے ملک ملک میں یہ کچھ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ باہر سے اور منگوا لیا ہیں۔ ان گدھوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ایک گھنٹے میں پچاس کلو میٹر تک دوڑ سکتے ہیں۔

آدھی ملاقات

آپ کی روانہ کردہ کہانی نمبر کی دو کتابیں موصول ہوئیں۔ جسے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔

محمد فاروقی سندر گڑھ

۴۔ دسمبر ۷۲ء کہانی نمبر مل گیا۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ حسن ترتیب پر بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ ادارے نے بڑی لگن اور بڑے جتن سے اسے تیار کیا ہے۔

مقصود، کوٹوی

پیام تعلیم کا سالانہ نمبر (کہانی نمبر) ملا۔ پڑھ کر بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ بہت ہی پیارا اور خوبصورت جریدہ ہے۔

جناب غلام حیدر۔ ایم۔ اے۔ جناب حاجی عبدالملک، اقبال امروہوی اور محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کے مضامین مجھے بہت پسند آئے۔

ستیہ پرکاش بلا سیجاپور

کہانی نمبر ہم کو پسند آیا ایسے ہی مضمون ہر پرچہ میں چھاپا کریں تو پرچہ بہت عمدہ ہوگا اور آپ کے خریدار بھی زیادہ ہو جائیں گے۔

ابو العاصم املو

جے جگت! پرسوں روز سعید عید میں نے اپنے قصبہ اور نزدیک دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ رمضان شریف کے بعد بڑی مسرت سے منائی اور گاندھی سیوا سنٹر کی طرف سے سب کو عید مبارک پیش کی ایسے نیک موقع پر میں نے پیام تعلیم کہانی نمبر میں شائع شدہ جناب راغب نعیم ہزاری باغ کی نظم عید آئی ہے، ترنم کے ساتھ سنا کر سب کو محظوظ کیا اور سب سے رابطہ پیدا کرنے کی نیت سے زکوٰۃ کے طور پر کم از کم دو تین پیسے فی کس نکالنے کی اپیل کی۔ یہ جمع شدہ رقم خصوصاً لائبریری کے لیے مکتبہ جامعہ ملیہ کی کتب خریدنے ہی خرچ کی جائے گی۔

پیام تعلیم کہانی نمبر کا بڑے ہی شوق سے حرف بحرف، لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا ہے اور میری رائے میں یہ قابل تعریف، واقعی پھولوں کا مہکتا ہوا دل خوش کن سبق آموز گلدستہ ہے۔

امرناتھ بھاردواج سیالکوٹی

کہانی نمبر ملا بہت خوب ہے جب کاتب ہی کے سلسلے میں آپ کو اس قدر دشواری ہوئی تو "مصور" کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا زیادتی ہوگی "آرٹ کے نمونوں" کے سوا ہر چیز بہت اچھی ہے۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ خلیق انجم صاحب نے بہت ساتھ دیا۔ انشاءاللہ آئندہ شمارے اس سے بھی بہتر ہوں گے۔ اس قدر کامیاب نمبر نکالنے پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

حمید عثمانی الہ آباد

پیام تعلیم کا کہانی نمبر باصرہ نواز ہوا۔ سیرت کے اعتبار سے بہت خوب ہے۔ اس کی تیاری میں جو دقتیں آپ کو اٹھانی پڑیں وہ کوہ کنی سے کم نہیں۔ اس مہم کی کامیابی پر دلی مبارک قبول کیجیے۔

یوں تو اس کی سب ہی سوغاتیں دلچسپ ہیں۔ لیکن "کہانی کی بات" جو تعارفی مضمون ہے بہت خوب ہے۔ روسی اور چینی کہانیاں نئے افق دکھاتی ہیں۔ خلیق انجم صاحب زبان دانی کے بادشاہ معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کتنی زبانیں جانتے ہیں۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اس کو پورا پڑھ بھی نہ پایا تھا کہ ایک صاحب اسے چرا لے گئے۔ کاش وہ اس کو پڑھیں اور سیکھیں۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے۔

اسرار شیدا سیوہاروی

کہانی نمبر کا (سرورق کے سوا) باقی تمام مواد قابلِ تعریف ہے۔ اچھا مواد حاصل کرنے کے لیے کافی محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ جب کہیں تسلی بخش نمبر نکل سکتا ہے۔

عبدالمجید آنیکل ضلع بنگلور

کہانی نمبر —— دس غیر ملکی۔ نو ملکی۔ پانچ منظوم اور سات نثری کہانیوں اور تین مفید معلوماتی مضامین کا رنگارنگ گلدستہ نظر نواز ہوا۔ ذہن و روح کو تو اس نے سرور بخشا ہاں نظروں کے لیے فرحت بخش نہیں ثابت ہوا۔

کتابت کی غلطیاں جا بجا ہیں تصویریں محض چند ہیں جو شاید کاتب صاحب کے جادو اثر موقلم کا نتیجہ ہیں یہ اگر نہ ہوتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے بہت جیسا ہے اور آپ کے حسنِ انتخاب کا آئینہ دار۔

کہانیوں میں "ستارے کہاں" (محترمہ رضیہ سجاد ظہیر) "دعدہ" (خالد عرفان صاحب) "عقلِ سلیم" (فرحت قمر صاحب) "سچ اور جھوٹ کی کہانی" (محمد امین صاحب) اور "تحفہ" (سلام بن رزاق صاحب) نے بہت متاثر کیا۔ "ادھنی کا راجہ" (اقبال امروہی صاحب) "آئینہ والا بندر" (مناظر عاشق صاحب) "سر کی قیمت" (اقبال امروہوی صاحب) "خوب چھٹی منائی" (جناب شاہد عظیم) "انصاف" (ناظم سیوانی صاحب) اور "دو دوست" (غلام حیدر انی صاحب) بہت دلچسپ کہانیاں ہیں۔ غلام حیدر صاحب کا مضمون "کہانی کی بات" مضمون کا مضمون اور کہانی کی کہانی ہے۔ یہ مضمون سبھی کو پسند آئے گا۔ اقبال امروہوی صاحب نے بھی کہانی لکھنے کے اچھے گر بتائے ہیں۔

منظوم کہانیاں سبھی اچھی ہیں۔ محترم عبدالملک صاحب کا مضمون عید کے موقع پر مزا دے گیا۔ کہانی نمبر میں اسے جگہ دے کر آپ نے بہت خوب کام کیا۔ اپنی ترجمہ شدہ کہانیوں اور مضمون کے بارے میں کیا عرض کروں۔ بزرگوں اور کرم فرماؤں کی گراں قدر رایوں کا منتظر رہوں گا۔ ہاں ان میں "دیا سلائی کی لو" بہترین کہانی ہے اور "چوہے کا کرتا" دلچسپ ترین۔

یوں کہانی نمبر میں ہر عمر کے بچوں کے مطلب کی کہانیاں آگئی ہیں۔

مجموعی طور پر کہانی نمبر ایسے پھولوں کا گلدستہ ہے جن کی خوشبو مشام جان کو معطر تو کرتی ہے لیکن ان کا حسن نگاہوں کے لیے سرور کن نہیں ثابت ہوتا۔ میری مراد کہانی نمبر کی سادگی اور تصویروں کی عدم موجودگی ہے۔ بہر حال موجودہ دور اور آپ کی مشکلات اور محدود وسائل کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو کہانی نمبر ایک کارنامہ ہے جس کے لیے آپ۔ محترم ولی صاحب اور پیام تعلیم کے کہانی نمبر کے سبھی لکھنے والے قابلِ مبارک باد ہیں۔

خلیق انجم اشرفی

کہانی نمبر —— تمام کہانیاں دلچسپ ہر ایک کہانی میں کوئی نہ کوئی درس ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ کئی دلیسوں اور بھارت کی ہر زبان کی کئی کہانیاں ہیں۔ اس پہل کا سہرا بھی آپ کے سر ہے۔ مبارک ہو۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ پرچہ مہینہ کے شروع میں مل گیا۔

"بچوں کے کہانی کار"، "کہانی کی بات" اور "آؤ کہانی لکھیں" ضرورت کی چیزیں ہیں —— بنگلہ کہانی "پیچو اور سونالی" مجھے اور میرے بچوں کو زیادہ پسند آئیں۔ بنگلہ افسانہ کا مقام تو ویسے بھی اونچا ہے، پر بچوں کی کہانیوں میں بھی بنگلہ ادب ایسا اونچا مقام رکھتا ہے پہلی بار اندازہ ہوا۔ سب سے اچھی بات یہ کہ پرچہ ابتدائے نومبر میں دستیاب ہوا۔ تہوار کا اچھا تحفہ صحیح وقت پر ہم تک پہنچایا۔ مبارک باد۔ کہانی نمبر کے سرورق کی درویشانہ سادگی۔ اس سے زیادہ سادگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی خوبصورتی دل کو چھوتی ہے اس کی بھی تعریف کرتا ہوں۔

محمد احسان کرانہ [illegible]

کہانی نمبر مجھے بہت پسند آیا، اس لیے کہ اس میں آپ نے صرف بچوں کے لیے کہانیاں جمع کی ہیں، ان کی زبان، معیار، پیشکش ہر نقطۂ نظر سے یہ بچوں کے لیے ہیں اور ان کا تعلق دنیا بھر سے ہے۔

سادگی یقیناً اس کا حسن ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر ضرور گراں قدر ہے۔ یوں آج عکسی تصویروں سے مزین رسالے اور کتابیں بے حد مقبول ہیں، ان کی افادیت مسلم، لیکن محض تصویروں کے بل بوتے پر مقبولیت حاصل کرنے سے کیا حاصل!

"کہانی کی بات" بے حد دلچسپ اور مفید مضمون ہے، کہانی کے بارے میں کہانی کہانی میں کتنی پتہ کی باتیں کہی گئی ہیں "آؤ کہانی لکھیں" بھی مفید مضمون ہے۔

کہانیوں کے تعلق سے عرض ہے کہ ہر کہانی دلچسپ ہے کئی ایک کہانیوں سے اس زبان میں بچوں کے ادب کے دھارے کے رُخ کا اندازہ بھی لگ سکتا ہے۔

"رانی کی مرغی" بڑی پیاری نظم اور کہانی ہے۔ یوں مجھے تمام کہانیاں پسند آئیں لیکن خاص طور سے "دیا سلائی کی لو" "علم اور سچائی کی بدولت" "سچوگن کا پل" "سچ اور جھوٹ کی کہانی" "ہرن اور چڑیاں" اور "سردار کا سر" بہت پسند آئیں۔ اس نمبر کی معنوی خوبیوں کا اعتراف ہر کوئی کرے گا ہی، البتہ ایک خامی رہ گئی۔ اس کا تعلق کتابت سے ہے، یا تو کاتب صاحب نے الفاظ غلط لکھے ہیں یا انھوں نے وقفہ نیم وقفہ وغیرہ حرکات غلط جگہ لگائی ہیں جس سے پڑھنے میں سلسلہ ٹوٹتا ہے اور تحریر کا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ خاص کر بچوں کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی خامی ہے۔ یہ کمزوری خصوصاً میری کہانی میں زیادہ ابھر کر آئی ہے۔ میں نے جس انداز سے کہانی لکھی تھی اس سے پڑھنے کا لطف صحیح مقام؟ پر ٹھہرنے اور آگے بڑھنے ہی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

بہر طور جہاں تک انتخاب، ترتیب اور طباعت کا تعلق ہے بہت دنوں کے بعد اس قدر معیاری مجموعہ پڑھنے کو ملا ہے۔

خالد عرفان

کہانی نمبر موصول ہوا۔ شکریہ۔ بھئی واقعی بچوں کے لیے آپ نے بڑی اچھی اچھی کہانیاں فراہم کی ہیں اور یہ آپ ہی کا دل گردہ ہے جو اس کمر توڑ گرانی کے زمانے میں بھی بچوں کی قوتِ خرید کے پیش نظر پے در پے ضخیم شمارے نکال رہے ہیں۔ ہماری طرف سے اس کامیابی پر مبارک باد قبول فرمائیے

شفیع تمنا۔ کلکتہ

نوازش نامہ نیز پیام تعلیم کا کہانی نمبر موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ! کہانی نمبر پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔ بچوں۔ خصوصاً طالب علموں کے لیے بے حد مفید ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

اگر کہانیوں کے ساتھ موزوں و مناسب تصویریں ہوتیں تو رسالے کی افادیت بڑھ جاتی۔

ریاض آفندی

پیام تعلیم کا کہانی نمبر نظر نواز ہوا۔ آپ کی کوششوں اور حسنِ انتخاب کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ مختلف زبانوں کی دلچسپ اور معیاری کہانیاں جمع کرنا آسان نہیں۔ مجھے آپ کی مشکلات کا پورا پورا احساس ہے۔ حصۂ نظم بھی خوب ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے پھر بھی مزید توجہ درکار ہے۔

ڈاکٹر شمانت دلپوتا،

JANUARY 197[illegible]

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-25


پیام تعلیم



ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

فہرست مضامین

جلد ۱۰

شمارہ ۲

فروری ۱۹۷۳ء

قیمت
۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
چھ روپے



پرنٹر پبلشر ... نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جمال پرنٹنگ پریس ... میں چھپوا کر ... نئی دہلی

بچوں سے باتیں

یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ دلّی بلکہ سارے ہندوستان میں یوم آزادی کا جشن منایا جا رہا ہوگا۔ جلسے، جلوس۔ فوجی پریڈ۔ مشاعرے، کوی سمیلن اور کیا اور کیا۔

اور ہاں ۱۴ جنوری کو آپ نے بڑی عید بھی بہت اہتمام سے منائی ہوگی گویا ۱۹۷۳ء کے پہلے ہی مہینے میں آپ کو دو خوشیاں نصیب ہوئیں۔ ہے نا نیک شگون!

شکر ہے کہ جنوری کا پیام تعلیم آپ کو بہت اچھا لگا۔ نظمیں ہیں، مضمون بھی کہانیاں بھی۔ سب سے بڑی بات تو بھئی یہ ہے۔ اس کی تو سبھی نے تعریف کی ہے۔ ہمارے چھوٹے خاص کر ٹائیٹل کے معاملے میں ہمارے جنرل منیجر صاحب تے ہی ہیں۔ تعجب اور خوشی کی بات یہ ہے کہ خاں صاحب کو بھی اتنی ہی دلچسپی، شوق اور لگن پیدا ہوگئی انھی کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ محترمہ کو پیام تعلیم لگاؤ ہو گیا ہے کہ اب خدا نے چاہا تو آیندہ ہر شمارے نکل نیا ہوگا۔

کچھ چھوٹے پیامیوں نے شکایت کی ہے کہ اس ری نمبر میں) کہانیاں تھوڑی سی تھیں۔ بس تین چار۔

اچھا تو لیجیے اس پرچے میں آپ کہانیاں ہی پڑھیے۔ یہ سب کہانی نمبر کی بچی ہوئی کہانیاں ہیں اور کوئی کوئی کہانی تو بہت سے مضمونوں پر بھاری ہے مثلاً ہمت اور مستقل مزاجی کی جیت وغیرہ۔ اس طرح کی کہانیاں خاص طور سے پڑھیے اور پھر بتائیے کہ انھیں پڑھنے کے بعد آپ پر کیا اثر ہوا۔

پچھلے پرچے میں ہم نے پروفیسر احتشام حسین کے انتقال کا ذکر کیا تھا یہ دسمبر کے پہلے ہفتے کی بات ہے۔ اس کے بعد تو دو اور سخت حادثے ہوئے۔ ہمارے آپ کے سب کے بزرگ محترم راج گوپال اچاری اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

اچاریہ جی شروع زندگی سے آزادی کی لڑائی میں شریک رہے ہیں، ہمارے باپو گاندھی جی کے بہت سمجھدار، معتبر اور معتمد ساتھیوں میں تھے۔ آزادی کے بعد پہلے گورنر جنرل تھے اپنے صوبے (مدراس) کے وزیر اعظم بھی رہے۔ بہت سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ سوراجیہ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالتے تھے۔ یہ اخبار ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں اچاریہ جی کے مضمون اور رائیں شائع ہوتی تھیں۔

بڑے بڑے پڑھے لکھے اور سوجھ بوجھ کے لوگ بہت توجہ اور غور سے ان مضمونوں کو پڑھتے تھے۔ راجہ جی کی عمر کافی تھی ۹۴ سال کے ہو گئے تھے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ بزرگوں

کا سایہ بھی بڑی چیز ہے۔ تو ہم اس سایے سے محروم ہو گئے۔ یہی نہیں اُن کی جچی تلی رایوں سے ان کے سُلجھے ہوئے خیالات سے بھی ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔

اور اسی مہینے (دسمبر ۷۲ء) جامعہ کے پُرانے مخلص اور ہمدرد، سابق امیرِ جامعہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے قریبی عزیز ڈاکٹر سید شوکت اللہ انصاری بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری نے اپنو بچپی میں فرانس سے ڈاکٹری کی ڈگری لی تھی — ہندوستان واپس آکر دلی میں کچھ دنوں مطب بھی کیا۔ مگر دلچسپی سیاست سے تھی۔ آزادی کے بعد مختلف ملکوں میں سفیر رہے۔ اڑیسہ کے گورنر بھی رہے۔ جامعہ نگر میں ڈاکٹر انصاری کی قبر کے قریب آپ کو دفنایا گیا ہے۔

دسمبر ہی میں ہمارے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر محمد مجیب اچانک بیمار ہو گئے۔ نوبت آپریشن تک پہنچی خطرناک آپریشن تھا۔ خدا کا شکر ہے کامیاب ہوا۔ اب اچھے ہیں — یادداشت یا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے معمول پر آئے گا۔

مکتبہ پیامِ تعلیم کی کتابوں نے ہماری امید سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اب اور نئی کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔ ہمارے محترم جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب باوجود دوسری اہم مصروفیتوں کے اس طرف متوجہ ہیں اور ان کتابوں کو جلد سے جلد شائع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چلتے چلتے ایک افسوسناک خبر اور سن لیجیے۔

غلام احمد صاحب فرقتؔ کاکوروی اُردو کے مشہور ادیب، مزاحیہ نگار اور شاعر تھے۔ عربک ہائر سکنڈری اسکول میں پُرانے استاد تھے۔ بڑوں کے لیے تو لکھتے ہی تھے بچوں کے لیے بھی اچھی اچھی مزے مزے کی چیزیں لکھتے تھے۔ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے بنارس تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر ریل ہی میں دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مرحوم کی بڑی صاحبزادی کالج میں پڑھتی ہیں دوسرے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ فرقتؔ صاحب کے اچانک انتقال کا سب کو صدمہ ہے۔ خدا ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔ آمین!

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ جامعہ نگر میں مخدوم و محترم قبلہ ذاکر صاحب کا مقبرہ مکمل ہو گیا ہے۔ مقبرے کے ایک پہلو میں جامعہ کی بہت ہی خوبصورت اور شان دار جامع مسجد ہے یہ بھی انشاء اللہ بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔ مقبرے کے دوسرے پہلو میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی عمارت بن رہی ہے۔ یہ بھی بہت شان دار ہو گی۔

اس مرتبہ سرکاری طور پر قبلہ ذاکر صاحب کا یومِ پیدائش بھی منایا جا رہا ہے۔ بہت شان دار طریقے پر منایا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ اطلاع اس وقت ملی جب فروری کی کاپیاں پریس جا چکی تھیں۔

خیر! ممکن ہوا تو انشاء اللہ اگلے پرچے میں ذاکر صاحب پر ایک دو مضمون پڑھئے گا۔

از: آزاد قومی ٹونکوی

حمد

کریں تعریف کیا اے مالکِ کون و مکاں تیری
جہاں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے داستاں تیری

ترے جلوے ہمیں نیرنگیاں اپنی دکھاتے ہیں
سحر لیتی ہے انگڑائی ستارے منہ چھپاتے ہیں

شعاعیں مہر کی سوتی ہیں جب آغوشِ فطرت میں
تو شب کہتی ہے تیری داستاں تاروں سے خلوت میں

ادھر تو لالہ و گل میں جھلک اپنی دکھاتا ہے
اُدھر شبنم کے موتی حسن پر اپنے لٹاتا ہے

ہمیں اے رونقِ دیر و حرم ذوقِ عبادت دے
سروں میں اپنا سودا دے دلوں میں اپنی الفت دے

خُدا وندا ہمیں دونوں جہاں میں سرخرو کر دے
ہمارے جیب و دامن دولتِ ایماں سے بھر دے

الٰہی ہر طرف حسنِ عمل کی روشنی پھیلے
مئے الفت سے دنیا میں سرورِ زندگی پھیلے

گرا دیں قصرِ باطل دست و بازو میں وہ قوت دے
صداقت کا علم ہر سمت لہرائیں وہ ہمت دے

"بھروسا ہے نہ طاعت پر نہ تکیہ ہے عبادت پر"
"گناہوں پر ندامت ہے نظر ہے شانِ رحمت پر"

ساتویں قسط

مونگے کا جزیرہ

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ۔ خلیق انجم اشرفی



آبی باغ اور دوسری چیزیں

شارک سے لڑائی وہ پہلا بڑا خطرہ تھا جو اس جزیرہ پر اترنے کے بعد ہمیں پیش آیا اس سے متاثر ہو جانا بالکل فطری بات تھی اور یہ سوچ سوچ کر تو ہمیں کئی بار خوف سے جھرجھری سی آ گئی کہ اس سے پہلے سمندر میں تیرتے وقت ہم نہ جانے کتنی بار انجانے ہی میں اس خطرہ سے دوچار ہوئے ہونگے

اس لڑائی کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہم نے پھر سے ساحل کے قریب ہی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہمیں اس فیصلہ پر اس وقت تک عمل کرنا تھا جب تک ہم ایک عمدہ سی کشتی بنانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

سب سے زیادہ دکھ ہمیں اپنی صبح کی تیراکی بند ہو جانے کا ہوا۔ اب بھی ہم ساحل کے قریب نہاتے تھے لیکن اس میں وہ خوشی اور لطف کہاں جو گہرے پانیوں میں غوطہ خوری میں آتا ہے شارک کے خطرے نے میری اور جیک کی ایک بہت بڑی خوشی چھین لی تھی۔ اب ہم غوطہ لگا کر لیگون کی تہہ میں بسی رنگ برنگے حسین مونگوں اور ننھی منی خوش رنگ مچھلیوں کی جنت کا نظارہ نہیں کر سکتے تھے کیا پتہ کب کس طرف سے کوئی خون کی پیاسی شارک آ نکلے

ہم روزانہ اس لیگون کی سیر کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ اب

اس کے بغیر ہمیں اپنی زندگی میں ایک عجیب سا خلا نظر آتا اپنی تفریحات میں ایک کمی سی محسوس ہوتی۔

روزانہ کی اس غوطہ خوری سے ہم بڑے اچھے اور ماہر غوطہ خور بن گئے تھے۔ کبھی کبھی جب جیک کو مذاق سوجھتا تھا تو وہ لیگون میں مونگے کی کسی بڑی چٹان پر بیٹھ جاتا اور طرح طرح کے منہ بناتا۔ مقصد صرف یہ ہوتا کہ میں کسی طرح ہنس پڑوں۔ پہلی بار جب اس نے یہ حرکت کی تو میں خود کو کسی طرح نہ روک سکا اور ہنسنے کے لیے مجھے تیزی سے سطح پر آنا پڑا تھا لیکن اس کے بعد جب مجھے اس کی شرارت کا اندازہ ہو گیا تو پھر مجھے اپنی سنجیدہ فطرت کے باعث ہنسی روکنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔

کبھی کبھی میں سوچتا کہ بے چارہ پیٹرکن ہمارا ساتھ نہ دے سکنے پر کیسا کچھ کڑھتا ہوگا۔ وہ خود بھی اکثر اس بات پر افسوس ظاہر کرتا کہ وہ اتنا اچھا غوطہ خور نہیں کہ ہمارے ساتھ جھیلوں کی سیر کر سکے۔ میں کوشش کرتا کہ کم از کم لیگون کی حیرت انگیز خوبصورت دنیا کے تذکرے ہی سنا کر اس کے دل کو مطمئن کر دوں لیکن ان تذکروں نے اس پر الٹا اثر کیا وہ مطمئن ہونے کے بجائے اب اس عجیب و غریب دنیا کی سیر کرنے کے لیے زیادہ بے چین نظر آنے لگا۔ آخر وہ ایک دن ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا لیکن مشکل یہ تھی کہ یوں تو پیٹرکن بڑا بہادر اور دلیر تھا لیکن پانی کے اندر اترنے سے اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم گھسیٹ کر پانی میں ایک گز تک لے گئے ہوں گے کہ اس نے چلانا شروع کر دیا۔ مجبوراً ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پانی سے ابھرا تو اس نے ایک لمبی چیخ ماری اور ساحل کی سمت اس تیزی سے بھاگا گویا کوئی شارک اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ یوں تو یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ اور اس پر پیٹرکن کا مذاق اڑایا جا سکتا تھا لیکن جب میں نے اور جیک نے اس پر غور کیا تو ہمیں افسوس ہوا اور تو اور خود پیٹرکن کے سامنے اس واقعے کا ذکر آیا تو اس پر کوئی دلچسپ جملہ چست کرنے کے لیے اپنی عادت کے برعکس وہ اداس سا ہو گیا۔

انسان پر مصیبتیں پڑتی ہی رہتی ہیں اور نئی نئی مشکلیں اس کا راستہ روکتی ہیں لیکن خدا ان مصیبتوں کو دور کرنے اور مشکلوں کو حل کرنے کا راستہ بھی سجھا دیتا ہے۔ ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد ارادہ کیا کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں پانی تو اتنا گہرا ہو کہ آسانی سے غوطہ لگایا جا سکے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ جگہ چٹانوں سے اس طرح گھری ہو کہ آسانی سے شارک مچھلیاں وہاں نہ پہنچ سکیں۔ اور جوئندہ یابندہ کے مصداق کافی تلاش کے بعد ہمیں ایک ایسی جگہ مل بھی گئی یہ ہمارے گھر سے کوئی چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ اس کی شکل ایک چھوٹی مگر گہری خلیج جیسی تھی اور اس میں داخلہ کا راستہ تنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا گہرا نہ تھا کہ شارک جیسی بڑی مچھلی اس میں سے اندر داخل ہو سکے۔

یہ خلیج جس کا نام بعد میں ہم نے "آبی باغ" رکھ دیا لیگون سے زیادہ حیرت انگیز مونگوں اور اس سے زیادہ خوبصورت اور چمکدار رنگوں والی سمندری گھاس کے پودوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کا پانی ـــ وہ تو اتنا ساکن اور شفاف تھا کہ باوجود اتنی گہرائی کے اس کی تہہ میں پڑا ہوا چھوٹا سا کنکر بھی آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ان سب خوبیوں کے علاوہ اس کے اوپر ایک چٹان اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ خلیج میں غوطہ لگانے کے لیے ہم اس پر چڑھ کر آسانی سے کود سکتے تھے اور پیٹرکن اس پر بیٹھ کر نہ صرف وہ تمام عجیب و غریب اور دلچسپ چیزیں دیکھ سکتا تھا جن کا ذکر میں اور جیک اس سے اکثر کیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ ہم دونوں کو جھک کر

سمندری گھاس میں چلتے پھرتے بھی دیکھ سکتا تھا بقول اس کے اس وقت ہم لوگ دو بڑے سفید آبی جانور لگ رہے تھے۔

اپنے ان نئے غوطوں کے دوران ہم نے جانوروں کی عادتوں اور طریقوں کو جاننے کی کوشش بھی شروع کر دی اور ساتھ ہی ساتھ ایسی عجیب و غریب چیزوں کی دریافت بھی جن کا کبھی پہلے ہمارے ذہن میں خیال تک نہ آیا تھا دوسری چیزوں کے ساتھ ہم مونگے نامی اس ننھے کیڑے کے کام میں بڑی دلچسپی لیتے تھے جس نے جیک کے بیان کے مطابق بحرالکاہل میں زیادہ تر جزیرے بنائے تھے جس وقت ہم اس بڑی چٹان پر نظر ڈالتے جس نے ہمارے جزیرہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اور اس مسلسل اور انتھک محنت کو دیکھتے جس سے یہ ننھے سے کیڑے اپنے مکان بناتے ہوئے تو ہمیں جیک کی بات ماننی ہی پڑتی۔

میں پانی کے دوسرے کیڑوں اور جانوروں کی ظاہری شکل و صورت اور ان کے طور طریقوں میں بڑی دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اب محض غوطوں کے دوران آبی باغ میں انھیں دیکھ کر تسکین نہیں ہوتی تھی۔ میں نے نزدیک ہی ایک مونگے کی بنائی چٹان میں ایک بڑا سا سوراخ کیا اور اسے سمندر کے پانی سے بھرنے کے بعد اس میں طرح طرح کی گھونگھا مچھلیاں اور دوسرے کیڑے لا کر رکھ دیے تاکہ زیادہ قریب سے دیکھ سکوں کہ یہ اپنا وقت کیسے گزارتے ہیں۔ ہماری دوربین میں لگے شیشے نے اس مشاہدہ میں مجھے بڑی مدد دی۔

اس سے دیکھنے پر جانور اور کیڑے خوب بڑے بڑے نظر آتے ہیں اور میں بڑی آسانی سے سمندر کے ان عجیب و غریب باشندوں کی شکل و صورت کی ذرا ذرا سی تفصیل اور ان کی ہلکی سے ہلکی حرکت دیکھ لیتا تھا۔

آبی باغ کی دریافت سے ایک بار پھر ہم بہت خوش اور مطمئن ہو گئے تھے اور اپنی اس الجھن سے نجات پا کر ہم نے ایک بار پھر اس منصوبہ پر بات چیت شروع کی جس پر عمل کرنے کا پروگرام بہت دن سے تھا۔ اور وہ منصوبہ تھا۔ پورے جزیرہ کا سفر۔ اس سفر یا سیر کے دو مقصد تھے: ایک تو اس طرح ہم یہ پتہ لگانا چاہتے تھے۔ کہ آیا اس جزیرہ پر کچھ اور ایسی چیزیں بھی ہیں۔ جو کسی طرح ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکیں اور دوسرے کسی ایسی جگہ کی تلاش جو اس جگہ سے بہتر ہو۔ جہاں ہمارا موجودہ گھر تھا۔ کچھ یہ بات نہیں تھی کہ ہمیں اپنا موجودہ گھر پسند نہیں تھا۔ نہیں! اُسے تو ہم بالکل اپنے گھر کی طرح سمجھتے تھے۔ لیکن ہمارا خیال تھا۔ کہ اگر جزیرہ پر اس سے بہتر جگہ موجود ہو تو اس کا استعمال کیوں نہ کیا جائے۔ کم سے کم اس کے بارے میں جاننا تو مفید ہی ثابت ہوگا۔

ہم نے اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے بحث کی جیک کا کہنا تھا کہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ روانہ ہونے سے پہلے ہم اچھے قسم کے ہتھیاروں سے خود کو مسلح کر لیں۔ کیونکہ ہمارا ارادہ نہ صرف پورے ساحل کا چکر کاٹنے کا تھا بلکہ ہم نے وادیوں کی سیر کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اور اس پورے سفر کے دوران ہمارا واسطہ انجانے خطرات یا غیر معمولی حالات سے پڑ سکتا ہے۔" اس کے علاوہ" جیک نے کہا "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہم مستقل طور پر ناریل اور گھونگھا مچھلیوں ہی پر گزارا کرتے رہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ عمدہ خوراک نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ کبھی کبھار اگر جانوروں کا گوشت بھی ہماری غذا میں شامل ہو جائے تو یہ تبدیلی بڑی خوشگوار ثابت ہوگی اس جزیرے کے درختوں پر بہتیرے چھوٹے موٹے پرندے ہیں اور ان میں کچھ کا گوشت تو بہت ہی لذیذ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم تیر کمان بنائیں تو آسانی سے ان پرندوں

ساشکار کر سکتے ہیں

"فرسٹ کلاس" پیٹرکن چلایا "تم کمانیں بناؤ جیک اور میں تیر بناؤں گا۔ میں خود بھی پرندوں پر تیر چلا چلا کر تنگ آ چکا ہوں۔ یہ کام میں نے جزیرہ پر اترنے کے پہلے ہی دن سے شروع کر دیا تھا۔ اور آج تک شاید ہی کسی دن ناغہ ہوا ہو لیکن ابھی تک تو میں کسی چیز کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوا نہیں۔"

"تم کچھ بھول رہے ہو مسٹر پیٹرکن" میں ایک دم بول پڑا۔ "ایک دن تم نے میری ٹانگ کو کامیاب نشانہ بنایا تھا۔"

"اوہ! ٹھیک ہے! ۔۔۔ اور تم نے بھی ۔ اودھم مچا ڈالا تھا اس ذرا سی بات پر، تم اس تنے سے جو میرا نشانہ تھا کچھ نہیں تو کوئی چار گز دور تو رہے ہی ہو گے۔ اب اسی سے اندازہ لگا لو کہ میرا نشانہ کتنا خراب ہے!"

"لیکن جیک" میں نے کہا "تم کل صبح سے پہلے تین کمانیں اور تیر نہیں بنا سکتے۔ اور کیا اب جبکہ ہم اس سفر کے لیے بالکل تیار ہیں، اس طرح وقت ضائع کرنا حماقت نہ ہو گی! میرا خیال ہے کہ تم صرف اپنے لیے ایک کمان اور تیر بنا لو۔ رہے ہم دونوں تو ہمارا کام لاٹھیوں سے چل جائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے رالف" جیک نے سر ہلا کر کہا، "کافی دیر ہو چکی ہے اور مجھے تو اب اس میں بھی شبہ ہے کہ اندھیرا چھانے سے پہلے میں ایک کمان بھی بنا پاؤں گا۔ اس لیے شاید کیا بلکہ یقیناً مجھے سورج ڈوبنے کے بعد آگ کی روشنی میں کام کرنا پڑے گا۔"

اس وقت تک ہم سورج ڈوبتے ہی سونے کی تیاری شروع کر دیتے تھے کیونکہ اس وقت تک ہمیں رات میں جاگنے یا کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی۔ اور ویسے دن کا کام ہی کافی تھا دینے والا ہوتا تھا مچھلی کا شکار، مکان کی مرمت، آبی باغ میں غوطہ خوری اور پھر ادھر ادھر کی سیر اسی لیے جب سورج ڈوبتا تو ہم خوش ہو جاتے کہ چلو آرام کا وقت آ گیا اور بستر پر پڑ جاتے لیکن اب چونکہ رات میں کام کرنا تھا۔ اس لیے لازمی طور پر روشنی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"کیا تیز آگ سے تمھیں کافی روشنی نہیں مل جائے گی؟" پیٹرکن نے سوال کیا۔

"بالکل مل جائے گی" جیک نے جواب دیا "لیکن ساتھ ہی ضرورت سے زیادہ گرمی بھی تو پیدا کر دے گی۔"

"بالکل ٹھیک" پیٹرکن بولا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اتنی آگ تو ہمیں بھون کر رکھ دے گی۔"

"اچھا سنو" جیک بولا۔ "میں اس مسئلہ پر بہت پہلے سے غور کرتا رہا ہوں۔ ان جزیروں میں ایک خاص قسم کا پھل اگتا ہے جسے یہاں کے باسی روشنی کے لیے کام میں لاتے ہیں مجھے اس پھل کے بارے میں پوری جانکاری ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے جلانے کے لائق کیسے بنایا جاتا ہے۔"

"تو پھر تم یہ کرتے کیوں نہیں؟" پیٹرکن بولا۔ "تم نے ہمیں اتنی دیر تک اندھیرے میں کیوں رکھا؟ بدتمیز کہیں کے!۔۔۔"

"اس لیے کہ" جیک نے جواب دیا۔ "میں نے وہ درخت ابھی تک نہیں دیکھا۔ اور مجھے اس کا بھی یقین نہیں کہ اگر میں اس پھل یا درخت کو دیکھوں تو پہچان ہی لوں گا۔ ہاں اتنا میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پھل کافی چھوٹا ہوتا ہے اور میرا خیال ہے اس پیڑ کی پتیاں سفید ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا

"اوہ — ہاں — ہم" پیٹرکن چلایا "ایسا تو ایک پیڑ میں نے آج ہی دیکھا ہے!"

"سچ مچ!" جیک چلایا۔ "کیا بہت دور ہے وہ جگہ یہاں سے؟"

"نہیں تو! آدھ میل بھی نہیں!"

"تب مجھے لے چلو وہاں فوراً" جیک نے اپنی کلہاڑی سنبھالتے ہوئے کہا۔ چند ہی منٹوں میں ہم تینوں جھاڑیوں میں راستہ بناتے تیزی سے چلے جا رہے تھے پیٹرکن ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ جلد ہی ہم اس درخت کے پاس پہنچ گئے جس کا تذکرہ پیٹرکن نے کیا تھا۔ بڑے غور سے اس کا معائنہ کرنے کے بعد جیک نے فیصلہ کیا کہ یہ وہی درخت ہے اس کی پتیاں بڑی خوبصورت اور چاندی جیسے چمکدار سفید رنگ کی تھیں اور آس پاس کے درختوں کی گہری سبز رنگ کی پتیوں میں بڑی نمایاں لگ رہی تھیں۔ ہم نے جلدی جلدی اپنی جیبیں اس کے پھلوں سے بھر لیں۔ اس کے بعد جیک بولا "اچھا پیٹرکن، اب تم ذرا اس ناریل کے پیڑ پر چڑھ کر اس کی ایک لمبی شاخ توڑ لاؤ" پیٹرکن نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ حالانکہ اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس سے پہلے وہ عام طور پر چھوٹے چھوٹے پیڑوں سے ناریل توڑا کرتا تھا۔ اور یہ پیڑ بہت اونچا تھا۔

جیک نے شاخ لے لی اور اس کی ایک ایک پتی کے بیچ کا سخت حصہ کاٹ لینے کے بعد اسے پھینک کر گھر کا رخ کیا۔ بڑی تیزی سے ہم گھر کو لوٹے اور جھٹ پٹ آگ سلگا کر جیک نے ان پھلوں کو ہلکا سا پکا ڈالا اور پھر ان کا اوپر کی چھلکا اتار دیا۔ اس کے بعد اس نے ان پھلوں کے بیچ میں سوراخ کرنے چاہے اور کسی اور نوکیلی چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے اس نے یہ کام ہمارے پنسل کیس سے لیا۔ اب اس نے ہر پھل کے سوراخ میں ناریل کی پتی کا سخت حصہ ڈال دیا اور پھر اسے جلا دیا۔ یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ناریل کی پتی کا وہ سخت حصہ کسی چراغ کی بتی کی طرح جلنے لگا۔ اس کا شعلہ بڑا خوبصورت اور صاف تھا۔ پیٹرکن تو یہ دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے ایک قلقاری ماری اور ناچنا شروع کر دیا۔ اور کوئی پانچ منٹ تک مسلسل اس شعلے کے گرد ناچتا رہا۔

"اچھا لڑکو،" پیٹرکن کا ناچ ختم ہوا تو شعلہ کو بجھاتے ہوئے جیک بولا۔ "کوئی ایک گھنٹہ میں سورج ڈوب جائیگا اس لیے اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں چلتا ہوں تاکہ کسی پودے سے کمان بنانے کے لیے ایک نرم شاخ کاٹ لاؤں۔ اور تم دونوں جا کر سخت قسم کی لکڑی کاٹ لاؤ تاکہ اندھیرا ہونے کے بعد ہم اپنے دھندے سے لگ جائیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کلہاڑی کندھے پر رکھی اور ایک طرف چل دیا۔ پیچھے پیچھے پیٹرکن بھی تھا۔ میں نے ناریل کے کپڑے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کا معائنہ شروع کر دیا میں ابھی اسی میں مشغول تھا کہ میرے ساتھی لوٹ آئے اور مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر پیٹرکن نے ایک زور کا قہقہہ مارا اور چیخ کر بولا، "دیکھو میں نے کیا کہا تھا۔ اوہ رالف تم بالکل بے کار آدمی ہو۔ دیکھو میں تمہارے لیے بھی ایک لاٹھی لے آیا۔ جاتے وقت مجھے یقین تھا کہ جس طرح ہم ٹکڑے کا معائنہ کرتے ہوئے تمہیں چھوڑ گئے ہیں۔ ویسے ہی پائیں گے۔ اسی لیے میں نے اپنے علاوہ تمہارے لیے بھی ایک لکڑی کا ٹکڑا کاٹ لیا۔"

"شکریہ پیٹرکن!" میں بولا "یہ تمہاری مہربانی ہے کہ تم

کاہلی پر ناراض ہونے کے بجائے تم نے میرے حصہ کا کام بھی کر ڈالا۔"

"اوہ! جہاں تک ناراضگی کا سوال ہے" پیٹرکن بولا "میں تم سے ناراض بھی ہو جاؤں گا۔ اگر تمہاری خواہش یہی ہے۔ مگر سوچتا ہوں اس سے فائدہ بھی کیا؟ تم اس کی پرواہ کئے بغیر وہی کروگے جو تمہارے دل میں آئے گا۔"

اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ہم نے روشنی جلائی اور اسے دوشاخوں سے بنائے ہوئے ایک "چراغ دان" میں رکھ کر آرام سے اپنے بستروں میں بیٹھ گئے اور کام شروع کر دیا۔

"میرا ارادہ ہے کہ کمان میں اپنے پاس ہی رکھوں" جیک لکڑی کے اس ٹکڑے کو (جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا) کاٹتے ہوئے بولا۔ "ایک زمانے میں میں بڑا اچھا تیر انداز تھا۔ لیکن یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے اچانک چونک کر پیٹرکن سے پوچھا، جو لکڑی کے ایک لمبے اور گول لٹھے کو جھونپڑی میں گھسیٹ کر اس کے سرے پر لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تم دیکھ ہی رہے ہو جیک" پیٹرکن نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ میں بھالا اپنے پاس ہی رکھوں۔"

"اچھا!" جیک سر ہلا کر بولا "اگر تمہارے نزدیک لمبائی ہی طاقت کا پیمانہ ہے تو پھر تو کوئی بھی تمھیں نہیں ہرا سکے گا۔"

لکڑی کا وہ لٹھا جسے پیٹرکن بھالا بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کوئی بارہ فٹ لمبا ہوگا۔ یہ کسی مضبوط مگر ہلکے درخت کا تنا تھا اور اسے ایک عمدہ بھالے میں بدلنے کے لیے بس اس کے ایک سرے کو چھیل کر نوکیلا بنانے کی ضرورت تھی۔

"خیال تو اچھا ہے" میں نے تعریف کی۔

"کیوں؟ یہ" پیٹرکن نے چونک کر بھالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"ہم" وہ سر ہلا کر بولا "خیال کی اچھائی اور مضبوطی کا اندازہ تو تمہیں اسی وقت ہوگا بڑے میاں جب تم اسے اپنے جسم میں چبھو کر دیکھوگے۔"

"میرا مطلب ہے کہ اسے بنانے کا خیال بہت اچھا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور اب میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اپنا خیال بدل دوں۔ اور لاٹھی کے بجائے اس ناریل کے ٹکڑے سے ایک غلیل بنالوں۔ ایک زمانے میں مجھے غلیل چلانے کا بہت شوق تھا۔ اور میں ایک اچھا غلیل باز رہ چکا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر میں غلیل بنانے میں لگ گیا۔ بہت دیر تک ہم لوگ خاموشی سے اپنے اپنے کام میں جتے رہے۔

ہم سر جھکائے اپنے کام میں اسی تندہی سے لگے تھے کہ اچانک ایک بہت عجیب اور ڈراونی سی چیخ سن کر چونک پڑے۔ یہ آواز سمندر کی طرف سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اتنی دور سے آرہی تھی کہ اس کی صحیح سمت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکلے اور ساحل پر رک کر دوبارہ اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگے۔

آواز دوبارہ آئی۔ اس بار پہلے سے تیز اور ڈراونی۔ چاند نکل آیا تھا۔ اور اس کی زرد اور پراسرار روشنی میں لیگون کے اندر اور اس سے دور واقع جزیرے صاف دکھا

دے رہے تھے لیکن دور دور تک کوئی ایسی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی جس پر یہ آواز نکالنے کا شبہ ہو۔ بس ناریل کے بڑے بڑے درخت بھوتوں کی طرح سر جھکائے ضرور کھڑے تھے۔ اور چاند کی اس روشنی میں عجیب ہیبت ناک سے لگ رہے تھے۔ ایک ہوا بھی اس آواز کے ساتھ سمندر کی طرف سے آئی تھی۔ لیکن جب ہم سمندر کی طرف دیکھ رہے تھے تو یہ بھی رک گئی تھی۔

"یہ کیا ہو سکتی ہے؟" پیٹرکن نے دھیرے سے پوچھا اور ہم تینوں ایک دوسرے کے اور قریب کھسک آئے۔

"نہیں معلوم ہے" جیک بولا۔ "میں نے آج سے پہلے بھی یہ آواز دو بار سنی تھی۔ لیکن آج رات جیسی تیز اور بھیانک نہیں۔ اس وقت تو یہ اتنی ہلکی تھی، کہ میں نے سوچا تھا کہ میرے کان بج رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے اس کا تذکرہ تم لوگوں سے نہیں کیا تھا کہ خواہ مخواہ تمہیں ڈرانے یا فکرمند کرنے سے کیا فائدہ؟"

ہم کافی دیر تک کھڑے انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ خوفناک آواز پھر آئے لیکن جب وہ پھر سنائی نہیں دی تو ہم لوٹ آئے اور اپنے کام میں لگ گئے۔

"بڑی عجیب آواز تھی!" پیٹرکن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "رالف تم بھوتوں میں یقین رکھتے ہو؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس طرح کی عجیب آوازیں جن کی کوئی وجہ نہ بتائی جا سکے جیسی کہ ابھی ہم نے سنی ہیں۔ مجھے بے چین ضرور کر دیتی ہیں۔ اور تم کیا کہتے ہو جیک؟"

"میں نہ تو بھوت پریت کو مانتا ہوں اور نہ ہی بے چینی محسوس کرتا ہوں" اس نے جواب دیا۔ "میں نے آج تک کوئی بھوت دیکھا نہ کسی ایسے آدمی سے ملا جو [illegible] خود بھوت دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔ اور عموماً میں نے دیکھا ہے کہ عجیب چیزوں کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اور معائنہ اور مشاہدہ کے بعد تو وہ بالکل معمولی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ثابت ہوتی ہیں۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، کہ عجیب آواز جو ابھی ہم نے سنی ہے کیا ہے لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد اس کا سراغ نکال لوں گا۔ اور اگر یہ کوئی بھوت ہے تو میں .... تو میں .... ؟"

"...... اسے کچا کھا جاؤں گا" پیٹرکن نے بیچ ہی میں اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"ہاں میں اسے کچا ہی کھا جاؤں گا!" جیک مسکرا کر بولا۔ "اچھا تو اب میری کمان اور دو تیر تیار ہیں، اور اگر تم لوگ بھی اپنا اپنا کام ختم کر چکے ہو تو اب ہم سونے کی تیاری کریں۔"

اس وقت تک پیٹرکن بھی اپنے بھالے کی نوک خوب تیلی کر کے اس میں بڑے ماہرانہ انداز میں ایک لوہے کا حلقہ فٹ کر چکا تھا۔ میں نے بھی اپنی غلیل تیار کر لی تھی جس کے دونوں حلقے ناریل کے ریشوں سے تیار کیے گئے تھے۔ اور جیک نے جو کمان بنائی تھی وہ کوئی پانچ فٹ کی ہوگی۔ دونوں تیروں میں کسی پرندے کے بڑے بڑے پر لگائے گئے تھے۔ جیک نے بتایا کہ اگر تیروں میں پچھلی طرف پر لگائے جائیں تو پھر ان میں نوک بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس پھر انھیں اگلے سرے کی طرف سے پتلا کر دیا جاتا ہے اور وہ آسانی سے دور تک چلے جاتے ہیں۔ یہ بات مجھے اس سے پہلے معلوم نہیں تھی۔

اب یوں تو ہمارے سفر کا انتظام بالکل مکمل تھا پھر بھی ہم نے سوچا کہ عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ روانہ ہونے سے پہلے ہم اپنے اپنے ہتھیار چلانے کی تھوڑی سی

مشق کرلیں اور ہمارا یہ خیال بڑا مفید ثابت ہوا مشق سے پتہ چلا کہ ہمارے ہتھیار اچھے نہیں بنے تھے۔ اور یہ کہ ہمیں ان کا اچھی طرح استعمال بھی نہیں آتا۔ جیک نے دیکھا کہ اس کی کمان کافی وزنی اور مضبوط بنی تھی اس لیے اسے چھیل کر تیلا کرنا پڑا۔ رہی اس کی لمبائی تو اسے کم کرنے کو پیٹرکن کسی قیمت پر بھی راضی نہ ہوا۔ میری غلیل بنی تو بہت عمدہ تھی لیکن میرا نشانہ اس قدر خراب ہو چکا تھا۔ کہ میرے پہلے غلے نے پیٹرکن کا ہیٹ اڑا دیا۔ اور وہ شہید ہوتے ہوتے بچا۔ بہرحال دن بھر کی مشق کے بعد شام ہوتے ہوتے ہم نے محسوس کیا کہ ہماری مشاقی خاصی حد تک لوٹ آئی ہے۔ کم سے کم میری اور جیک کی۔ رہا پیٹرکن تو وہ کافی پھرتیلا ہونے کے باعث جلد ہی اپنا بھالا اچھی طرح چلانے لگا۔ اور اب وہ تیز دوڑ کر پانچ دفعہ میں ایک بار تو ناریل کے درخت کے بیچوں بیچ میں نشانہ لگانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ہماری یہ کامیابی بہت کچھ جیک کی مرہونِ منت تھی۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ چونکہ ہم دونوں نے اسے اپنا کپتان مان لیا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے اس کا حکم ماننا بھی ضروری ہے۔ اسی نے حکم دے دے کر ہم سے صبح سے شام تک یہ مشق کرائی تھی۔ پیٹرکن کا جی چاہتا تھا۔ کہ وہ راستہ کے ہر درخت اور ہر پودے کو اپنے بھالے کی نوک سے چھید ڈالے لیکن جیک نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اور صرف ناریل کے ایک مخصوص درخت پر دوڑ دوڑ کر نشانہ لگانے کی اجازت دی تاکہ اسے صرف تھوڑی دیر آرام کرنے کی اجازت ملتی ورنہ باقی وقت بے چارہ دوڑ دوڑ کر ناریل کے درخت پر ہی اپنا غصہ اتارتا رہا۔ ہم دونوں نے اس سختی پر جیک کا مذاق بھی اڑایا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس سختی نے ہمیں بہت فائدہ پہنچایا۔

اس رات حالانکہ ہم تھک کر چور ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سونے سے پہلے ہم نے اپنے ہتھیاروں کا معائنہ کرکے ان کی مرمت کی تاکہ دوسری صبح بغیر کسی دقت کے ہم اپنے سفر پر روانہ ہو سکے۔"

(باقی آئندہ)

کیف احمد صدیقی

نئے سال کی مبارک باد

یہ نئی صبح، نئی رات مبارک بچو
یہ نئے سال کے لمحات مبارک بچو

مسکراتے ہوئے لمحوں کے فسانے چھیڑو
جھوم کر عیش و مسرت کے ترانے چھیڑو
سازِ عشرت کے یہ نغمات مبارک بچو
یہ نئے سال کے لمحات مبارک بچو

شہر در شہر بہاروں سے بھری ہیں گلیاں
شاخ در شاخ گلستاں میں کھلی ہیں کلیاں
نکہت و نور کی برسات مبارک بچو
یہ نئے سال کے لمحات مبارک بچو

درد مندوں کے سبھی زخم تمہیں بھرنے ہیں
اس برس سارے بھلے کام تمہیں کرنے ہیں
سالِ نو کے یہ پیامات مبارک بچو
یہ نئے سال کے لمحات مبارک بچو

ایک شاعر کے لیے اس سے بڑی شے کیا ہے
یہ مری نظم مرا سب سے بڑا تحفہ ہے
کیفؔ صاحب کی یہ سوغات مبارک بچو
یہ نئے سال کے لمحات مبارک بچو
یہ نئی صبح، نئی رات مبارک بچو

ہمّت اور مستقل مزاجی کی جیت

ایک سچّی کہانی

فاروق شہاب

"بھئی! میں وعدہ نہیں کرتا کہ آپ کی بچّی کا دماغ کبھی بھی عام بچّوں جیسا ہو سکے گا۔" ڈاکٹر نے بچّی کو اچھّی طرح دیکھ بھال کے بعد کہا۔ "اسے بڑی توجّہ کی ضرورت ہے۔ اسے کم زور دماغ والے بچّوں کے خاص اسکول میں داخل کرنا ہوگا۔"

بچّی کی ماں نے کہا: "جی نہیں ڈاکٹر صاحب خدا کو منظور ہے تو میری بچّی بھی عام بچّوں جیسی ہو جائے گی نہ ہو جائے گی اس پر جتنی توجّہ کی ضرورت ہوگی میں اس سے زیادہ توجّہ کروں گی۔" بچّی کی ماں نے جوش میں یہ بات کہنے کو کہہ دی پر وہ کچھ ناامید ضرور تھی اور اداس بھی۔

یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ دوسری لڑائی زوروں پر تھی۔ اس کا شوہر گارڈن رائل ایرفورس (R.A.F.) میں ملازم تھا اور اپنی ڈیوٹی پر تھا۔

وہ اپنی دو سال کی بچّی (ڈیبری) کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ اسے خوشی کا وہ وقت یاد آ رہا تھا جو اس نے گارڈن کے ساتھ گزارا تھا۔ بچّی کی پیدائش کے وقت ماں باپ دونوں کتنے خوش تھے۔ اُن کا خیال تھا اُن کی بچّی بھی عام بچّوں کی طرح ہوگی۔

مگر جب ڈیبری میں وہ باتیں نہ پائی گئیں جو اس کی عمر کے عام بچّوں میں پائی جاتی ہیں تو انھوں نے ڈاکٹر کو دکھایا اور ڈاکٹر نے ڈیبری کے بارے میں جو بات بتائی وہ بہت پریشان کرنے والی تھی اس نے بتایا کہ "بچّی کے دماغ کے ایک حصّے میں گڑبڑ ہے" اس نے بتایا کہ "اس عارضے کی مثال ایسی ہے جیسے بجلی کے سوئچ بورڈ کے تار الجھ گئے ہوں اگر اس کا اثر ہلکا ہوا تو بچّی کے بعض عضو جھٹکے کے ساتھ کام کریں گے زیادہ ہوا تو بس مکمل فالج سمجھ لیجیے۔"

بچّی کے ہاتھ پیر اس کے قابو میں نہیں تھے، اپنے پیر آگے بڑھانا چاہتی تو وہ دائیں یا بائیں اٹھ جاتے۔ ہاتھ منھ تک لے جانا چاہتی تو وہ سر کے اوپر چلے جاتے۔ رہا اس کا بولنا تو یوں سمجھو کہ غرّاہٹ کی آواز سے کچھ ہی مختلف ہوتا۔

مگر ماں کی ڈھارس دو چیزوں سے بندھی تھی ایک تو یہ کہ بچّی دیکھنے میں بڑی بھولی لڑنیز معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے سائنسداں علاج معالجے کے سلسلے میں بھی نت نئی تحقیقیں کر رہے تھے اور اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک ایسی دریافت ضرور

ہو جائے گی جس سے بچّی کے علاج میں مدد ملے گی۔

وہ امریکہ کے ڈاکٹروں کی کتابیں (اس وقت امریکن ڈاکٹر ہی اس علم میں آگے تھے) برابر پڑھتی رہتی کچھ تو ان کتابوں کی معلومات سے مدد لے کر اور کچھ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر وہ روزانہ ڈیبری کے ہاتھ پیروں کی ورزش کراتی۔ بڑی دلچسپ بات یہ کہ وہ گانوں کے بولوں میں ڈیبری کو ہدایت دیتی مثلاً اس طرح ہم پیر بڑھاتے ہیں۔ پیر بڑھاتے ہیں آگے بڑھتے ہیں۔ اس طرح ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں ہاتھ اٹھاتے ہیں کام کرتے ہیں۔

دوسرے ضروری کاموں کے بعد جو وقت بچتا وہ ورزش اور گانوں کی نذر ہو جاتا۔ نہ جانے کتنی بار وہ ڈیبری کے ہاتھوں میں چمچہ پکڑواتی پھر ہاتھ کو اس کے منھ تک لے جاتی۔ ڈیبری کھانے لگتی تو پھر اس کی ماں دوسرا چمچہ بھرتی مگر جوں ہی وہ ڈیبری کا ہاتھ چھوڑتی وہ پھر جھٹکنے لگتا۔

آپ جانتے کسی کام کے لیے مستقل کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ کچھ نہ کچھ ضرور نکلتا ہے۔ ڈیبری کی اور اس کی ماں کی کوششیں بھی پھل لائیں۔ پانچ برس کی عمر میں ڈیبری نے تین پہیوں والی سائیکل چلانا سیکھ لی۔ ڈیبری جب سائیکل چلاتی۔ اِدھر اُدھر گھومتی تو ماں اپنے اوپر جبر کرتی اور بڑی مشکل سے ڈیبری کا پیچھا کرنے سے اپنے کو روکتی۔ سوچتی اگر میں ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہوں گی تو وہ کوئی کام اپنے آپ کبھی نہ کر پائے گی۔ اسی لیے دل پہ پتھر رکھ کر ڈیبری کو زیادہ سے زیادہ اپنے سے الگ رکھتی۔

ڈیبری دھیرے دھیرے اب تیز لڑکی بنتی جا رہی تھی اس کا قد بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں سے زیادہ تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ برابر کوشش کیے جا رہی تھی۔ جب وہ چھ سال کی تھی تو ایک رات بغیر کسی مدد کے وہ ڈولتی ڈولتی گھر میں گھومنے لگی۔

اس کی ماں نے اپنی کوششوں میں کمی نہ کی تھی پر وہ اب کچھ تنگ آ گئی تھی یہ تو وہ جانتی تھی کہ دماغی خرابی والے بچّوں کی ٹھیک ٹھیک تربیت بچپن ہی میں ہو سکتی تھی مگر اس ٹھیک یا مناسب تربیت کا طریقہ کیا تھا اور ایسی تربیت کا انتظام کہاں تھا اس کا پتہ نہ چلتا تھا۔

مگر اگلے سال ایک نئی بات ہوئی۔ سینٹ مارگریٹ کے نام پر ایک اسکول کرائڈن (دسرے) میں کھول دیا گیا۔ ایک بڑے مکان میں جو گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ استاد بہت ہی قابل تھے بہت ہمدرد تھے اسکول میں بورڈنگ بھی تھا اور بچّوں کے لیے بورڈنگ میں رہنا لازمی تھا۔ ماں کو ڈیبری کی جدائی بہت اکھری پر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ڈیبری کو بورڈنگ ہاؤس پہنچا دیا۔

غرض ڈیبری اسکول کی زندگی میں داخل ہو گئی یہاں جو پہلی بات اس نے سیکھی وہ آگے گرنے کی عادت تھی۔ پیچھے گرنے کی عادت اس سے آہستہ آہستہ چھوٹ گئی۔ پیچھے گرنے میں بڑا خطرہ یہ تھا کہ نہ جانے کس چیز پر گر پڑے۔ آگے گرتے وقت ہاتھوں سے مدد لے کر چوٹ کی شدت کو کم کیا جا سکتا تھا پھر اس نے ٹخنوں کو چوٹ سے بچانے کے لیے گدّے باندھنے کی عادت بھی ڈال لی تھی۔

اسکول میں سارے معمولی کام چلنا پھرنا، کھانا پینا بٹن لگانا وغیرہ بچّے خود بخود سیکھ جاتے تھے مگر لیری کو یہ سب باتیں سیکھنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔

اس کے ہاتھ قابو میں نہیں تھے چاقو، اور کانٹا اٹھانے، پیالی منھ تک لے جانے، یا بٹن لگانے کے لیے اُسے گھنٹوں مشق کرنی پڑتی۔ اس وقت وہ اکیلی نہ ہوتی اس کے استاد کبھی برابر مدد کرتے رہتے ایک بٹن لگانے میں اُسے پانچ منٹ لگ جاتے۔ ٹھیک طرح سے بات کرنے کے لیے وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے مشق کرتی۔

بس ایک سبق میں وہ اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جاتی اور وہ تھا سواری کا گھنٹہ یہ گھنٹہ اسے بہت پسند تھا۔ وہ ایک تیز گھوڑے رومن کو پسند کرتی تھی۔ اُسے گھوڑے سے گرنے کا ذرا اندیشہ نہ تھا وہ اسے سرپٹ دوڑاتی دوسروں سے آگے نکل جاتی۔ ایک بار تو کافی چوٹ بھی آئی ایک بار تیزی سے گھوڑا اچھل رہی تھی کہ گر پڑی اور بغیر کسی سے شکایت کیے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر گھوڑے پر چڑھ گئی، سواری کا گھنٹہ ختم ہوا اور سب کا طبی معائنہ کیا گیا تو اس کے گلے کی ہڈی ٹوٹی پائی گئی

سینٹ مارگریٹ اسکول میں سات سال گزارنے کے بعد لیری بہت کچھ عام لڑکیوں جیسی ہو گئی۔ پھر بھی چلتے چلتے ایک طرف کو جھک جاتی۔ بولنے میں اب پہلے کی طرح "بُد بُداتی" تو نہ تھی۔ پھر بھی بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتی تھی۔

وہ اب کپڑے بدلنا بھی سیکھ گئی تھی اور عجیب بے ڈھنگے طریقے پر کھانا بھی خود کھا لیتی تھی۔ چائے کا پیالہ دودھ کی آدھی پیالی اٹھاتی تھی کہ کہیں چھلک کر گر نہ پڑے۔

وہ خوب سمجھ گئی تھی کہ ایسی ذہنی اور جسمانی محنت ہی سے وہ دوسروں کے برابر ہو سکتی ہے اس کی لکھائی پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اب وہ سیدھی لکیر پر پہلے سے دوگنی تیزی سے لکھ سکتی تھی۔

چودہ برس کی عمر میں وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ بغیر کسی دیکھ بھال کے عام لڑکیوں کی طرح گھر میں زندگی گزار سکے مگر اس کے ماں باپ مطمئن نہ تھے۔

۱۸۵۴ء کی گرمیوں میں کرائڈن اسکول چھوڑ کر وہ ویبرن ہائی اسکول میں داخل ہو گئی تھی۔ یہ اسکول پارکس شائر میں تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ لیری اور کچھ اور لڑکے اسکول کا کام عام لڑکوں کی طرح کر سکتے تھے۔

اپنے ہیڈ ماسٹر کی بات رکھنے کے لیے اُس کے خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُسے بہت محنت کرنا پڑی۔ پہلے اسکول میں صرف و نحو اور دوسری بنیادی باتیں ٹھیک سے نہیں بتائی گئی تھیں مگر اس نے دل تھوڑا نہیں کیا۔ اپنے سے بھی خراب لڑکوں کی مثال سامنے رکھ کر وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر رہی تھی ۱۷۔ سال کی عمر میں اُس نے تاریخ کا عام امتحان پاس کر لیا۔

اس کامیابی سے اس کی ہمت اور بڑھی اور وہ کینٹ کے ایک میکنکل اسکول میں داخل ہوئی۔ اُس کے باپ بھی کینٹ ہی میں آ گئے تھے، اگلے دو سالوں میں اس نے چار اور امتحان پاس کر لیے یہ انگریزی زبان، انگریزی ادب، جغرافیہ اور فرانسیسی زبان

کے امتحان تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں وہ اور لڑکوں لڑکیوں کی طرح سکنڈری اسکول کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

پر کیا وہ اور آگے بڑھ سکتی تھی یہ خیال برابر اس کے ذہن میں چکر لگا رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنی ماں کے ساتھ وارٹ فورٹ کے ٹیکنالوجی کالج کے ایک شعبے کے انچارج جان نیری سے ملنے گئی۔ جان نیری صاحب بہت ہی سمجھدار اور رحمدل آدمی تھے انھوں نے اپنے شعبے کے اونچے کورس میں اُسے داخل کر لیا۔

ویری اور اس کی ماں کے لیے یہ بات امید کے خلاف تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ یہ تمنا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں تعلیم پائے پوری ہوتی نظر آتی تھی۔

ویری ابھی تک مکمل صحت کے لیے لگاتار جدوجہد کر رہی تھی۔ مگر وارٹ فورڈ اسکول میں اُسے اندازہ ہوا کہ چند کام ایسے ہیں جنھیں وہ تنہا نہ کر سکے گی۔ یہاں اُسے اپنی ماں کی بات یاد آئی: "آخر ہر ایک کسی نہ کسی سے کچھ نہ کچھ مدد اور سہارا تو لیتا ہی ہے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔"

اس نئے خیال نے اُس کی ہمت بندھائی اور اب وہ بلا جھجک دوسروں سے بھی مدد مانگ لیتی مثلاً وہ کالج کے کینٹن میں اپنے پاس والے لڑکے یا لڑکی سے کہتی: "میں ٹرے لے جانے میں ہوشیار نہیں ہوں مہربانی کر کے میری ٹرے میز تک پہنچا دیجیے۔"

بینک یا سینما میں وہ اپنا بٹوا دکاندار یا کلرک کو دے دیتی اور اس سے کہتی: "میں پیسے نکال کر گننے میں ذرا سست ہوں مہربانی فرما کر آپ صحیح رقم لے لیجیے۔"

اس طرح ویری کی بہتوں سے جان پہچان اور دوستی ہو گئی اور اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ لوگ اسے ٹھکرا دیں گے۔ مگر وارٹ فورٹ کی تعلیم ویری کے لیے سب سے مشکل ثابت ہوئی گیا۔ کلویڈر کا بس کا سفر اُسے تھکا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ پڑھائی بھی پہلے سے مشکل تھی وہ تین چیزوں میں اونچی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ حالانکہ عام طور پر طالبعلم اونچی تعلیم کے لیے دو ہی سبجکٹ چنتے ہیں۔

بڑی مشکل یہ تھی کہ استاد کے لکچر کے نوٹ وہ تیزی سے نہیں لکھ پاتی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہر رات وہ لیکچر کا مضمون اور اپنی ضروری باتیں اپنی ماں کو لکھا دیتی اور اس کی ماں فوراً اُسے ٹائپ کر دیتی۔

مگر امتحان کا وقت آیا تو ویری کو اس بات کی پریشانی ہوئی کہ امتحان ہال میں مقررہ وقت میں وہ اپنا پورا جواب نہ لکھ پائے گی۔ مگر خدا نے اس کی یہ مشکل بھی حل کر دی۔ امتحان سے کچھ دن پہلے اُسے اجازت مل گئی کہ وہ اپنا جواب میری رائٹ کو املا کرا دے گی۔ اور وہ اُسے ٹائپ کر دے گی۔

مگر باوجود اس مدد کے امتحان اُس کے لیے بہت سخت ثابت ہوا بولنے میں اُسے اب بھی دقت ہوتی تھی اسی لیے وہ جتنا لکھنا چاہتی تھی اس کا آدھا ہی لکھ سکی لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ کم لفظوں میں پوری بات کہنے کی اس نے عادت ڈال لی تھی اسی لیے بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی اور اس

جماعت میں اوّل آنے پر اُسے انعام بھی ملا۔

اب وہ بیس برس کی ہوگئی تھی اور اُس نے لندن یونیورسٹی کے مشہور اسکول "اسکول آف اکنامکس" (معاشیات) میں داخلہ لے لیا۔ پہلے تو وہ طالب علموں کی اتنی بھیڑ کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ طالب علموں کے دھکے سے وہ کہیں گر نہ پڑے۔ مگر ایسی نوبت نہ آئی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ بھیڑ اتنی ہوتی تھی کہ گرنے کی جگہ ہی نہ ہوتی تھی۔

اسکول کے ہیڈ چپراسی لیونارڈ کیری نے اس کی بہت مدد کی۔ ویری جس دن اسکول پہنچی لیونارڈ کیری آگے بڑھ کر اس سے بولا:۔

"میری بچی! ایک لڑکی شہزادی کی طرح ہے۔ تم گھبراؤ نہیں میں ہر وقت تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں"

ویری جب کبھی غلام گردش (کوریڈور) میں گر پڑتی۔ کیری لپک کر اٹھا لیتا۔ اس کے زخموں پر دوا لگاتا اور اسے آرام کی جگہ لے جا کر بٹھا دیتا۔ کیری نے اس کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ بھی ڈھونڈ نکالا۔ یہاں وہ بھیڑ سے الگ تنہائی میں پڑھ سکتی تھی۔

لندن اسکول آف اکنامکس کی تیز پڑھائی کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے ویری دو ٹیپ ریکارڈر استعمال کرتی۔ ایک میں دن کے لکچر نوٹ کرتی دوسرے میں وہ رات کے وقت اپنی باتیں ریکارڈ کرتی۔ اس کی ماں اس کے لیے لمبے نوٹ ٹائپ کرتی رہتی۔

امتحان کے وقت امیری رائٹ اس کے جواب ٹائپ کرتی۔ آخر ویری نے الکٹرک (بجلی کے) ٹائپ رائٹر پر اپنے نوٹ اور مضمون خود ٹائپ کرنا سیکھ لیے۔

وہ اپنی چال اور اپنی بول چال کو برابر سدھارتی رہی۔ یونیورسٹی کے کلبوں اور سوسائٹیوں میں بھی حصّہ لیتی۔ سینما، تھیٹر اور اوپیرا دیکھنے جاتی۔ ایک بار جرمنی اور اسکاٹ لینڈ کی سیر بھی تنہا کر آئی۔ آخری سال کے شروع میں وہ ہوسٹل میں آگئی تاکہ یونیورسٹی کی زندگی سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

اس طرح چار سال گزر گئے اور وہ مبارک دن آگیا جب ویری نے ہمت اور امید کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کو طالب علموں کے بڑے ہجوم میں پایا۔ یہ سب اپنا نتیجہ دیکھ رہے تھے۔ اور اس کا نام کامیاب طالب علموں میں تھا۔

۲ ار مئی ۱۹۶۵ء کی سہ پہر کو ویری چودہ سو ساتھیوں کے ساتھ شاہی البرٹ ہال میں گئی۔ یہاں وہ ملکہ الزبتھ کی ماں (سابق ملکہ الزبتھ) کے سامنے پیش کی جانے والی تھی۔

جوں جوں اس کے ساتھی پکارے جاتے، ویری کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔ اسے بڑا دبدھا تھا۔ آیا وہ چند سکنڈ کے مختصر وقفے میں اسٹیج پر جا کر واپس آسکے گی

آخر اس کا نام پکارا گیا "ویری نیگ"۔ اور ویری اپنا سانس روکے ہوئے ہوشیاری سے ۲۰ فٹ کا راستہ تیزی سے طے کرنے لگی اور ملکہ الزبتھ کے سامنے آکر آدھے سکنڈ کے لیے کھڑی ہوگئی۔ سلام کے لیے جھکی اور پھر بائیں طرف چل کر جلدی سے آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دو ہی منٹ میں تھک تو گئی مگر بہت خوش تھی اس نے یہ فاصلہ بہت کامیابی سے طے کیا تھا۔

(باقی ص۳۹ پر)

سالِ نو مُبارک

ہر بچّہ سچّے دل سے یہ اب التجا کرے
ہم سب کو سالِ نو ہو مُبارک خدا کرے

اُٹھے نئی امید نئی آرزو کے ساتھ
ہر ایک سالِ نو سے نئی ابتدا کرے

ہوگا وہ کامیاب جبھی امتحان میں
اسکول کی کتابیں لگن سے پڑھا کرے

آئے گی پھر زبان پہ ہرگز نہ جھوٹ بات
سچ بولنے کا دھیان جو دل میں رہا کرے

کھائے نہ اور خوف کسی کا جہان میں
اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرا کرے

ہو جائے فیل بھی تو نہ مایوس ہو کبھی
پیدا نیا ارادہ۔ نیا حوصلہ کرے

ہوگا ارادہ ٹھیک تو گزریں گے دن بھی ٹھیک
ہم سب کو سالِ نو ہو مُبارک خدا کرے

—

مفتون کوٹوی

شاکر حسن چاند

لالچ بُری بلا!

کسی جنگل میں دو خرگوش رہتے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ رٹو بڑا تھا۔ چھوٹے بھائی کا نام کٹو تھا۔ ان کے ماں باپ بڑے عقل مند ہوشیار اور نیک تھے۔ چاہتے تھے کہ اُن کی اولاد بھی بڑی ہو کر انھی کی طرح نیک نام ہو۔ اسی لیے وہ ہمیشہ رٹو اور کٹو کو اچھی اچھی باتیں سمجھاتے رہتے۔ چھوٹا بھائی کٹو اپنے بڑے بھائی سے زیادہ عقل مند تھا۔ وہ اپنے بڑوں کی ہر بات غور سے سنتا اور اُس پر عمل بھی کرتا۔ بڑا بھائی رٹو، کٹو کی دیکھا دیکھی ہر بات سن تو لیتا مگر اُس پر عمل مشکل ہی سے کرتا۔

جب یہ دونوں بڑے ہوئے تو ان کا داخلہ اسکول میں کرا دیا گیا۔ ان کے باپ یا کبھی کبھی ان کی ماں ان دونوں کو اسکول تک پہنچا آتی تھیں اور کٹو سے ماں باپ کی یہ روز روز کی پریشانی نہ دیکھی جاتی۔ آخر ایک دن اسکول جاتے وقت کٹو نے باپ سے کہا "ابّا آپ لوگ روز روز پریشان ہوتے ہیں ہم اب راستہ دیکھ چکے ہیں، خود ہی جایا کریں گے اور اکیلے ہی لوٹ آئیں گے۔"

"نہیں بیٹے! راستے میں ہمارے کئی دشمن رہتے ہیں۔ وہ تم دونوں کو بہلا پھسلا کر تمھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" باپ نے جواب دیا۔

"ابّا ان لوگوں کے بہکائے میں آنے والا نہیں ہوں۔ انشاء اللہ وہ میرا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ آپ اطمینان سے گھر کے کام دیکھیے ہم خود ہی اسکول چلے جائیں گے۔" کٹو نے اطمینان دلایا۔

"اچھا بیٹے! جب تم کہتے ہو تو میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے تم پر بھروسا ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ چھٹی ہوتے ہی سیدھے گھر آنا۔ اور ہاں! رٹو کا خاص خیال رکھنا۔"

رٹو اور کٹو اب روزانہ اکیلے ہی اسکول جاتے

اب رٹو کی سنیے ویسے تو بہت اچھا تھا پر ذرا لالچی تھا۔ ماں باپ اور استاد برابر سمجھاتے رہتے کہ لالچ بری بلا ہے۔ پر رٹو کی یہ عادت چھوٹنا تھی نہ چھوٹی۔ معمولی معمولی چیزوں کے لالچ میں اپنی اچھی اچھی چیزیں اپنے ساتھیوں کو دے دیا کرتا۔ گھر پر پوچھ گچھ ہوتی تو طرح طرح کے بہانے بنا دیتا اس طرح وہ جھوٹ بھی بولنے لگا تھا آپ جانیں ایک غلط کام کو چھپانے کے لیے سو غلط کام کرنا پڑتے ہیں۔

جھوٹ بولنے کی وجہ سے رٹو پر اکثر استاد کی اور گھر میں ماں باپ کی ڈانٹ اور کبھی کبھی سزا بھی برداشت کرنی پڑتی۔ اس کے مقابلے میں کٹو کو انکی

اچھی عادتوں کی وجہ سے سب پیار کرتے۔

ایک دن یہ دونوں بھائی اسکول سے واپس آرہے تھے۔ اتفاق سے گیدڑ میاں کی نظران پر پڑ گئی منہ میں پانی بھر آیا۔ سوچنے لگے اگر موقع مل جائے تو دونوں کو نوالہ بنائے اور پھر تو ان کی تاک میں رہنے لگا۔

اس نے ایک دن دونوں بھائیوں کو اسکول جاتے دیکھا اور اپنے منصوبے کو عمل میں لانے کے خیال سے ان دونوں کے پاس آیا۔ اور بڑے پیار سے پوچھا "کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

"چچا میاں! ہم دونوں اسکول جا رہے ہیں" رٹو نے جواب دیا۔

"ارے تم لوگ اسکول بھی جاتے ہو۔ بڑی خوشی کی بات ہے مگر میں تو پھل کھانے جا رہا ہوں۔ آؤ چلو تم بھی میرے ساتھ چلے چلو۔ گیدڑ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں! گیدڑ چچا، ہمیں اسکول پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ ہم اس وقت آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے" کٹو نے انکار کر دیا۔

ابھی تو کافی وقت ہے ہم پھل کھانے کے بعد بھی ٹھیک وقت پر اسکول پہنچ سکتے ہیں"۔ رٹو لالچ میں آگیا۔

"ہاں! ہاں! میں تمہیں ٹھیک وقت پر اسکول پہنچا دوں گا" گیدڑ نے کٹو کی ہاں میں ہاں ملائی

"نہیں! میں تو اسکول جاؤں گا امی نے سیدھے اسکول جانے کو کہا ہے" یہ کہہ کر کٹو وہاں سے چل دیا۔

امی کا نام سن کر رٹو کو بھی ماں کی بات یاد آگئی اور وہ بھی مجبوراً کٹو کے ساتھ ہو لیا۔ گھر آکر کٹو نے ماں سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے رٹو کو بہت سمجھایا "دیکھو بیٹا! گیدڑ تمہیں بے وقوف بناتا ہے دراصل وہ تمہیں اپنا شکار بنانا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

رٹو کو کچھ دنوں تک ماں کی بات یاد رہی مگر گیدڑ نے ہمت نہ ہاری اور کچھ دنوں کے بعد جب رٹو اور کٹو اسکول سے واپس آرہے تھے پھر ان کے پاس پہنچا اور رٹو سے پوچھا "اسکول میں چھٹی ہو گئی کیا؟"

"جی ہاں!" رٹو نے مختصر سا جواب دیا۔

"آج پھر میں پھل کھانے جا رہا ہوں۔ بہت کم پھل باقی رہ گئے ہیں۔ چلو گے؟" گیدڑ نے لالچ دیا۔

"نہیں چچا! ہم نہیں جائیں گے۔ گھر پر امی اور ابا راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ دیر ہو جائے گی تو پریشان ہو جائیں گے" کٹو نے مجبوری ظاہر کی۔

مگر گیدڑ بھی آج سنتا چھوڑنے والا نہیں تھا اس نے کہا "بہت جلد میں تم کو گھر پہنچا دوں گا۔ گھر یہ کہہ دینا کہ اسکول میں دیر ہو گئی۔"

"ایک تو غلط کام! اور پھر اس کے ساتھ جھوٹ بھی بولوں۔ نہیں نہیں یہ مجھ سے نہ ہوگا" کٹو نے کہا۔ رٹو اب تک خاموش تھا۔ پھل کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی آرہا تھا۔ اس سے خاموش نہ رہا گیا۔ آخر بول پڑا "معمولی جھوٹ بولنے سے اگر ہم پھل کھائیں گے تو سودا مہنگا نہیں۔ چلو کٹو کوئی بہانہ کر دیں گے۔"

"خوب! جھوٹ کو تم معمولی بات سمجھتے ہو

تم جاؤ، میں نہیں جاؤں گا مگر بعد میں تمہیں پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔" یہ کہتے ہوئے کٹو گھر کی جانب چل پڑا اور رٹو گیدڑ کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے دونوں کافی دور نکل آئے۔ مگر پھل کا درخت نہ ملا۔ اب تو رٹو دل میں ڈرا۔ اس نے گیدڑ سے پوچھا۔ "پھل کا درخت کب آئے گا چچا؟ میں تو تھک گیا ہوں۔"

"کبھی نہ آئے گا" گیدڑ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ تم نے تو کہا تھا کہ بہت جلد واپس آئیں گے" رٹو پریشان ہو کر بولا۔

"وہ تو تمہیں بے وقوف بنانے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ دراصل میں تم دونوں کو اپنا شکار بنانا چاہتا تھا مگر کٹو عقلمند نکلا۔ بچ گیا اور تم لالچ میں آکر پھنس گئے۔" گیدڑ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ بولا۔

"گیدڑ چچا! مجھے چھوڑ دیں اب کبھی کچھ لالچ نہ کروں گا۔" رٹو رونے لگا۔

"ہونہہ کتنے دنوں کی محنت کے بعد تو جال میں پھنسے ہو۔ اور اب میں تمھیں چھوڑ دوں۔ کیا خوب! لالچی لوگوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں" گیدڑ ہنستے ہوئے بولا۔

رٹو نے جب دیکھا کہ گیدڑ کے اتنا گڑ گڑانے پر بھی نہ پسیجا تو خدا کے حضور میں گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگا۔ "یا اللہ میاں مجھے بچا لے۔ میں اب ہمیشہ بڑوں کی بات مانوں گا۔ کبھی بھی لالچ نہیں کروں گا جھوٹ بھی نہ بولوں گا۔ اللہ میاں مجھے بچا لیجئے۔"

ابھی وہ اپنی دعا ختم بھی نہیں کر پایا تھا کہ گیدڑ اس پر جھپٹا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی اور رک گیا۔ کٹو اپنے ماں باپ کے ساتھ رٹو کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ گیدڑ اُن کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ خدا نے رٹو کی سن لی تھی۔ اس واقعے کے بعد رٹو نے کبھی بزرگوں کا کہنا نہ ٹالا اور نہ کبھی لالچ کیا۔

بشیر احمد عرسی

بھوتوں کا مسکن

رنگا پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے لوگ بڑے خوشحال تھے۔ گاؤں تینوں طرف سے جن زمینوں سے گھرا ہوا تھا بالکل بے کار اور بنجر تھیں اُن پر کسی بھی قسم کی کاشت نہیں کی جا سکتی تھی لیکن جو زمین شمال کی طرف تھی کافی زرخیز تھی۔ گاؤں والے اس سے خوب پیداوار حاصل کرتے۔ یہ زمین چاول گنے اور دالوں کے لیے بہت موزوں تھی۔

لیکن چند سالوں سے اس زرخیز زمین پر کاشت کاری بند ہو گئی۔ گاؤں والے اُس زمین کی طرف رُخ کرنے سے بھی ڈرنے لگے۔ اب اس زمین پر بھوتوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے گزشتہ پچھلے سال ایک دیہاتی ان کھیتوں میں مُردہ پایا گیا تھا پھر اس کے بعد کوئی بھی اُدھر سے گزرنے کی کوشش کرتا تو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا غرض وہ زمین "بھوتوں کا مسکن" کے نام سے مشہور ہو گئی ہر کوئی اُدھر جانے سے ڈرنے لگا۔

ان ہی دنوں سیودھ بنارس سے اپنی قانون کی تعلیم ختم کر کے اپنے گاؤں رنگا پور واپس ہوا۔ اُس نے اپنے خوشحال گاؤں کا یہ حال دیکھا تو اس کو بڑا رنج ہوا۔ بستی کے سارے لوگ ہراساں، پریشان، بھوکوں مر رہے تھے یہ حالت اس سے نہ دیکھی گئی۔ اُس نے گاؤں کے بڑے لوگوں سے پوچھا آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ گاؤں کی ہنستی کھیلتی بہار خزاں کا شکار کیسے ہو گئی۔ لہلہاتے کھیتوں کی بہار کو کس نے چھینا؟

"میرے بچے" ایک بوڑھے آدمی نے سر کو ہلاتے ہوئے کہا "ہم اب زیادہ دنوں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہم آہستہ آہستہ مر رہے ہیں .... ہمارے لہلہاتے سرسبز کھیت اب ہمارے نہیں رہے۔ اب وہ سوکھ چلے ہیں۔ ان زرخیز کھیتوں پر اب بھوتوں کا قبضہ ہے۔" "بھوتوں کا قبضہ" سیودھ اپنے کانوں پر اعتبار نہ کر سکا۔ "بیوقوفی" اس نے جواب دیا۔ "آپ سب لوگ جاہل ہیں بھوت پریت نام کی کسی چیز کا اس دنیا میں سرے سے وجود ہی نہیں ہے"

لیکن سیودھ کی کون سنتا۔ گاؤں والوں نے سیودھ کو وہ تمام واقعات بتائے جو اب تک اُن کھیتوں میں ہوئے تھے۔ یہ بھی بتایا کہ اب بھی ان کھیتوں میں رات گئے کیسی کیسی روشنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کتنی خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ "اور بھوت پریت کے سوا بھلا یہ کسی اور کے کرتوت نہیں۔"

بھوتوں نے گاؤں والوں کو سچ مچ بڑا پریشان کر رکھا تھا۔ شام ہوتے ہی ہر شخص بستر میں دبک جاتا

اور خوف سے سارے گاؤں پر ویرانی چھا جاتی۔ سبودھ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ بچپن ہی سے تجسس اور کھوج کا عادی تھا۔ وہ بھوتوں کے مسکن کا حال معلوم کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس رات سبودھ نے کھیتوں میں جانے کی ٹھانی ویران گاؤں کے بے رونق راستوں سے گزرتا ہوا جہاں ہر دروازہ سرِ شام ہی بند ہو گیا تھا وہ پرانے چاول کے کھیت کی طرف ہو لیا۔ جیسا جیسا وہ قریب ہوتا گیا کھیت میں کوئی بڑا سا ہیولا نظر آتا گیا...... بہت ہی بڑا جیسے کوئی چھوٹی سی پہاڑی ہو۔ لیکن ڈر سبودھ کی فطرت سے دور تھا۔ وہ بے خطر بڑھتا چلا گیا.... ارے... ارے یہ تو بڑ کا درخت ہے میں تو بھول ہی گیا" سبودھ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا وہ اپنے وہم پر خود ہی نادم ہونے لگا۔ پرانے چاول کے کھیت میں ایک بڑا سا بڑ کا درخت تھا۔ وہ اس درخت کو غور سے دیکھنے لگا.... "لیکن یہ کیا" سبودھ نے تعجب سے دیکھا بڑ کے درخت کی شاخوں سے سفید دھواں اٹھ رہا ہے جیسا جیسا وہ آگے بڑھتا گیا چیخ و پکار شور و غل سنائی دینے لگا۔ "یہ آوازیں.... یہ تو انسانوں کی نہیں ہو سکتیں" پھر سبودھ واپس لوٹ گیا... گھر واپس ہوتے ہوتے وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے آج کیا دیکھا ہے.... اور یہ آوازیں کیسی خوفناک تھیں اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ ان بھوتوں کا سراغ لگا کر ہی دم لے گا۔

دوسرے دن گاؤں والوں سے سبودھ نے کہا کہ وہ ایک قریبی گاؤں کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہے... گاؤں والوں نے لاکھ منت سماجت کی رات کے وقت سفر خطرے سے خالی نہیں ــ لیکن سبودھ کہاں سننے والا تھا۔ رات کی تاریکی میں سبودھ روانہ ہو گیا۔ جب گاؤں اس کی آنکھوں سے دور ہوتا گیا تو اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا۔ وہ اب کھیتوں کی طرف چل رہا تھا... ہو سکتا ہے یہی درخت ان کا مسکن ہو...." اس نے بڑ کے درخت کے پاس پہنچ کر دم لیا۔ سبودھ نے چاروں طرف دیکھا کہ بے شمار قدموں کے نشان اور جا بجا راکھ کے ڈھیر تھے۔ یہ جگہ بھوتوں سے ملاقات کے لیے بالکل موزوں نہیں اس نے سوچا اور درخت پر چڑھ گیا.... ایک آرام دہ شاخ کو اس نے منتخب کیا اور ایسا چھپ گیا کہ کسی کو نظر نہ آئے۔

سچ ہے انتظار قتل سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا.... دو گھنٹے.... بھوتوں کا کہیں پتہ نہ تھا سبودھ نیند سے جنگ میں مصروف رہا۔ وہ کسی قیمت پر آج بھوتوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا.... پھر اچانک کانا پھوسی کی آوازیں شروع ہو گئیں ــ بے شمار آوازیں.... وہ مدھم سی روشنی میں بھوتوں کی شکلیں بھی دیکھ سکتا تھا بھوتوں کی شکلوں کو دیکھ کر سبودھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے

ان میں سے ایک بھوت آگے بڑھا اس نے ایک لانبے بانس پر سفید کپڑا باندھ دیا... پھر وہ بانس فضا میں بلند ہوتا گیا... سبودھ کی یہ حالت کاٹو تو لہو نہیں بدن میں اس نے سمجھ لیا کہ بھوتوں نے مجھے دیکھ لیا اور اس بانس سے اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نہیں.... سبودھ کا خیال غلط نکلا... وہ بھوت بانس کو ہوا میں لہرا کر ناچنے لگا.... ادھر سے دہ

اور تمام بھوت آوازیں.... عجیب عجیب... ڈراونی مکردہ آوازیں... چیخ و پکار.... کرنے لگے... یہ چیخیں اتنی وحشت ناک تھیں کہ کوئی مردہ بھی ہوتا تو بھاگ کھڑا ہوتا.... آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن ان کی چیخیں کم نہ ہوئیں۔ سبودھ حیران تھا کہ کیا کرے... اچانک سب آوازیں رُک گئیں۔ سب بھوت پیڑ کے قریب جمع ہوگئے... ایک بھوت آگے بڑھ آیا۔ اور اُس نے کیا کھڑ بھڑ کی کہ اچانک... ڈھکن نکل آیا۔ بڑا سا.... سب نے مل کر اُس کو ہٹایا... اندر کا منظر دیکھ کر سبودھ کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ ایک بہت بڑا گڑھا تھا جس کے اندر بھوتوں نے تھیلیاں، تھیلے، دیگیں وغیرہ چھپا رکھی تھیں... بھوت تھوڑی دیر وہاں کچھ کھٹا پٹ کرتے رہے۔ پھر تھوڑی سی کانا پھوسی کے بعد اندھیرے میں غائب ہوگئے —

"اچھا"۔ سبودھ نے ایک لمبی سانس لی۔ جب اُس کو پورا یقین ہوگیا کہ سارے بھوت چلے گئے ہیں وہ درخت سے نیچے اتر آیا.... اور اپنے گاؤں روانہ ہوگیا... وہ آج بے حد خوش تھا۔ اُس نے اپنے گاؤں والوں کا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

دوسرے روز جب گاؤں والوں نے سبودھ کے گاؤں ہی میں پایا تو حیران ہوگئے...؟ "ہم نے سوچا تھا تم اپنے کاروبار پر چلے گئے ہو" ایک نے کہا "ہاں میرا کاروبار صرف اتنا تھا کہ میں کھیتوں میں رات کا زیادہ سے زیادہ عرصہ گزارنا چاہتا تھا تاکہ تمہارے "بھوتوں" سے مل سکوں"۔ سبودھ نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن کیا تم نے بھوتوں کو دیکھا —؟ ہر کوئی اس سے یہی سوال کر رہا تھا۔

"ہاں میں نے بھوتوں کو دیکھ لیا" سبودھ نے کہا "اور اب میں تم لوگوں کو بھی وہاں لے چلوں گا۔ جہاں وہ رہتے ہیں"۔ پہلے تو گاؤں والے تیار ہی نہ ہوئے.... پھر تھوڑی سی آنا کانی کے بعد ہر کوئی ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہو کر سبودھ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

"یہی ہے وہ جگہ — جہاں آپ کے بھوت رہا کرتے ہیں" سبودھ نے کہا۔ سب لوگ اُس کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔

"یہاں دیکھ رہے ہیں آپ لوگ" سبودھ نے بلند آواز میں کہا "بھوتوں کے قدموں کے نشان پایا.... اب آپ میں سے کوئی طاقتور شخص آگے بڑھے اور یہ بولٹ... گھمائے.... گھمائے"

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد بولٹ کھل گیا... اور جوں ہی ڈھکن ہٹایا گیا.... گاؤں والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں — تھیلیوں میں بے شمار سونے چاندی ہیرے جواہرات کے زیورات رکھے تھے اس کے علاوہ اور بہت سی قیمتی چیزیں تھیں۔

اب آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں یہ سبودھ نے کہا "آپ کے بھوت... کوئی بھوت پریت نہیں ڈاکوؤں کی ایک ٹولی ہے جنھوں نے چالبازی سے آپ لوگوں کو خوفزدہ کر کے کھیتوں سے بھگا دیا اس طرح ان کو چوری کا مال چھپانے کے لیے ایک محفوظ جگہ ہاتھ آگئی — بھوتوں کے ڈر سے کوئی ادھر

(باقی ص ۳ پر)

وک حمزہ پوری



سیب کی واپسی

گرمی کا زمانہ تھا۔ بچّوں کے اسکول بند تھے۔ پڑھائی لکھائی سے چھٹی۔ اُچھل کود، دھما چوکڑی اور قصّہ کہانی سُننے سنانے کا بازار گرم تھا۔ نانی امّاں کی جان پر آ بنی تھی۔ روزرات کو بچّے انھیں گھیر لیتے اور اُن سے کوئی کہانی سُنے بغیر نہ رہتے۔

گرم سورج نے منھ چھپایا تو اُفق پر گول چاند نرم روپہلی چاندنی بکھیرے نکل آیا۔ نانی امّاں آنگن میں چارپائی نکال کر ابھی لیٹی ہی تھیں کہ بچّوں کا ایک غول آ پہنچا۔ اشرف نے ہانک لگائی "نانی اماں . . . "۔ سارے بچّوں نے "زندہ باد" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نانی اماں سمجھ گئیں۔ ہنسنے لگیں، "آج تو جان چھوڑو بچّو! کہاں تک روز بروز چھوٹی موٹی جن پریوں کی کہانی سناتی رہوں"۔ افشاں نے لقمہ دیا "تو آج کوئی "سچّی" کہانی ہی کہہ سنا دیجیے"۔ "جی ہاں! جی ہاں!!" سارے بچّوں نے تائید کی۔ نانی امّاں چپ ہو گئیں جیسے کچھ سوچنے لگیں، پھر بولیں "دیکھو بچّو! آج میں ایک سچّی داستان سناؤں گی لیکن ایک شرط ہے"۔ بچّے خوشی سے کھِل اٹھے "ہم لوگ ہر شرط منظور کرتے ہیں"۔ گڈّو نے پوچھا "وہ شرط کیا ہے؟" نانی امّاں بولیں "یہ کہ تم لوگ خاموش رہ کر دھیان سے سنو گے۔ اور ہاں متّا برابر بیچ بیچ میں ٹوکتا رہتا ہے اس سے مجھے کوفت ہوتی ہے"۔

سب بچّے ایک آواز میں ہو کر بولے "ہم غور سے سنیں گے بیچ میں کوئی نہ بولے گا"۔ نانی نے کہانی شروع کی۔

"ہندوستان کے پچھم میں ایک ملک ہے . . . . ."

"پاکستان" گڈّو میاں بول پڑے۔ نانی بی خفا ہو گئیں "بس اسی سے کہانی کا سلسلہ ٹوٹتا ہے"۔

متّا۔ "اب کے میں کچھ نہیں بولا ہوں"۔

نانی۔ "تو تم بھی بول ہی پڑے"

سب بچّے ہنسنے لگے۔ گڈّو اور متّا نے کان پکڑا "اب کچھ نہ بولیں گے۔ قسم لے لیجیے"۔

نانی۔ "ٹھیک ہے میاں! ابھی پاکستان کو بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ بھی ہندوستان کا ہی ایک حصّہ تھا۔ میں تو افغانستان کا ذکر کر رہی تھی۔ ہاں۔ تو افغانستان کا ایک شہر ہے بُست۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ بست کا ایک بادشاہ تھا۔ نام تھا اس کا "شاد روان"۔ بادشاہ بہت نیک دل اور انصاف پسند تھا۔ اپنی پرجا کو اولاد کی طرح مانتا تھا۔ رعایا بھی اس کا باپ کی طرح احترام کرتی تھی۔ ہر طرف خوشی اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔

ایک کہاوت ہے "جیسا راجا ویسی پرجا"۔ بادشاہ کی طرح اس کا وزیر بھی بڑا نیک مزاج تھا اور خدا ترس تھا۔

خدا کی شان، بادشاہ اور وزیر دونوں اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ بادشاہ کی نیکی اور رعایا پروری کی وجہ سے اِس بات کا بادشاہ سے بھی زیادہ غم پرجا کو تھا لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح حکومت کا ایک وارث پیدا ہو جاتا۔ بزرگوں کے مزار پر منتیں مانی گئیں۔ مسجدوں میں دعائیں کی گئیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہر طرف مایوسی چھا گئی۔

ایک دن جنگل کی طرف سے گدڑی پہنے ایک درویش شاہی محل کی طرف آنکلا۔ فقیر نے اپنی لاٹھی سے محل کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ نوکرانیوں نے دوڑ کر پوچھا "آپ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟؟"

فقیر نے درویشانہ لہجے میں کہا "میں نے سُنا ہے یہاں کا بادشاہ بہت انصاف پرور ہے لیکن اس کے دل میں ایک غم ہے جس سے وہ ہر دم ملول رہتا ہے خبر کر دو کہ میں آگیا ہوں۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے مانگ لے۔"

کنیزوں نے ساری بات جاکر ملکہ سے بیان کی ملکہ بہت خوش ہوئی اور درویش سے اپنی دلی تمنّا بیان کی۔ شاہی باغیچے میں سیب کا ایک درخت تھا — درویش نے اُس پر اپنی لاٹھی ماری۔ درخت سے دو سُرخ سیب گرے۔ درویش نے ایک سیب ملکہ کو دے دیا دوسرا وزیر کی بیوی کے پاس بھجوا دیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے درویش اچانک غائب ہو گیا۔

خدا خدا کر کے آخر وہ مبارک دن بھی آ پہنچا جب بادشاہ کے یہاں ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا اور وزیر کے گھر ایک حسین لڑکی۔ وزیر نے اپنی بیٹی کا نام "زابیا" رکھا۔ شاہزادے کا نام "بیتی" رکھا گیا۔ دونوں بچے بچپن سے ہی ساتھ ساتھ رہنے سہنے اور کھیلنے کودنے لگے، وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ دونوں بچے دیکھتے دیکھتے جوان ہو گئے۔ بچپن کی محبت نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو دونوں ایک دوسرے کی چاہت میں گرفتار ہو گئے۔

بچے زیادہ لاڈ پیار سے بھی بگڑ جاتے ہیں۔ بادشاہ کے ایک ہی تو لڑکا تھا اس لیے اس کی ناز برداری کا کیا پوچھنا! نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھمنڈی اور ظالم ہو گیا لڑکپن میں جو لوگ اس کی ناز برداری کرتے تھے وہی اب اس کے ظلم کا شکار ہونے لگے۔ نہ بزرگوں کی عزّت نہ چھوٹوں پر شفقت باہر نکلتا تو لوگ خوف کے مارے گھروں میں چُھپ جاتے۔ آوارہ نوجوانوں کا ایک گروہ اُس کے گرد جمع ہو گیا۔

شاہزادے کے ہاتھوں ستایا ہوا ایک مظلوم ایک دن ایک بوڑھی عورت سے کہنے لگا۔ "اِس نیک دل بادشاہ کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ بیٹے کو ظلم سے باز نہیں رکھتا"

عورت نے کہا "میرے بال اِسی بادشاہ کی حکومت میں سفید ہوئے ہیں میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وہ ہرگز شاہزادے کے ظلم وستم سے واقف نہیں!"

"واقف کیوں نہیں ہے" مظلوم بپھر کر بولا "ابھی شاہزادہ بچّہ ہی تھا کہ ایک بار اُس نے پنگھٹ پر پانی بھرتی ہوئی چند عورتوں کے گھڑے توڑ ڈالے — ! بادشاہ کو خبر ہوئی تو اُس نے عورتوں کو چاندی کے گھڑے دے دیئے لیکن بیٹے کو بادشاہ نے سزا نہ دی ڈانٹا تک نہیں۔"

بحث ہوئی۔ کرم" اور "پُردل" کا خیال تھا کہ راجہ انہیں ڈرا کے ان کی بہادری کا اندازہ لگانا چاہتا ہے لیکن پتی کا کہنا تھا کہ راجہ کے خط سے اس کی بہادری اور شرافت ظاہر ہوتی ہے۔ آخر پتی کی بات مان کر سب لوگ چین سے زندگی بسر کرنے لگے۔

بہت دنوں کے بعد ایک دن شاہزادہ اور پُردل شکار کو گئے ہوئے تھے۔ کرم نے قلعہ کے نزدیک سے اونٹوں کا ایک قافلہ گزرتے ہوئے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اونٹوں پر راجہ کا خزانہ لدا ہوا ہے۔ کرم نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قافلہ کو لوٹ لیا۔ راجہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے لڑائی کا اعلان کر دیا پتی جب شکار سے لوٹا تو یہ بات سن کر بڑا غمگین ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا "جب ہم لوگ مرنے مارنے پر تیار ہیں تو پھر غم کی کیا بات ہے؟"

شاہزادے نے جواب دیا "تمہارے نزدیک صرف لڑائی کے میدان ہی میں آنے والی موت، موت ہے لیکن میرے نزدیک قول سے پھر جانا بھی موت ہی ہے اور اس طرح ایک بار تو ہم سب لوگ مر چکے ہیں۔"

دوسرے دن صبح سے لڑائی شروع ہو گئی چالیس دن تک لڑائی چلتی رہی۔ پتی کے ۳۹ ساتھی مارے گئے۔ راجہ کے ۳۰۰ آدمی کام آئے اکتالیسویں دن بست کا شاہزادہ پتی خود لڑائی کے میدان میں گیا، اور ایک مہینے تک اکیلا لڑتا رہا۔ بے شمار پہلوانوں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔

اگلے دن جب وہ لڑائی کے میدان میں جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا نوزابیا نے اُس سے کہا۔

"آج مت جاؤ!"

"کیوں؟"

"میں نے ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے۔"

"وہ کیا ——؟"

"کوئی نورانی شکل کا بزرگ ہے اُس نے مجھ سے کہا کہ میرے سیب واپس کر دو۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔"

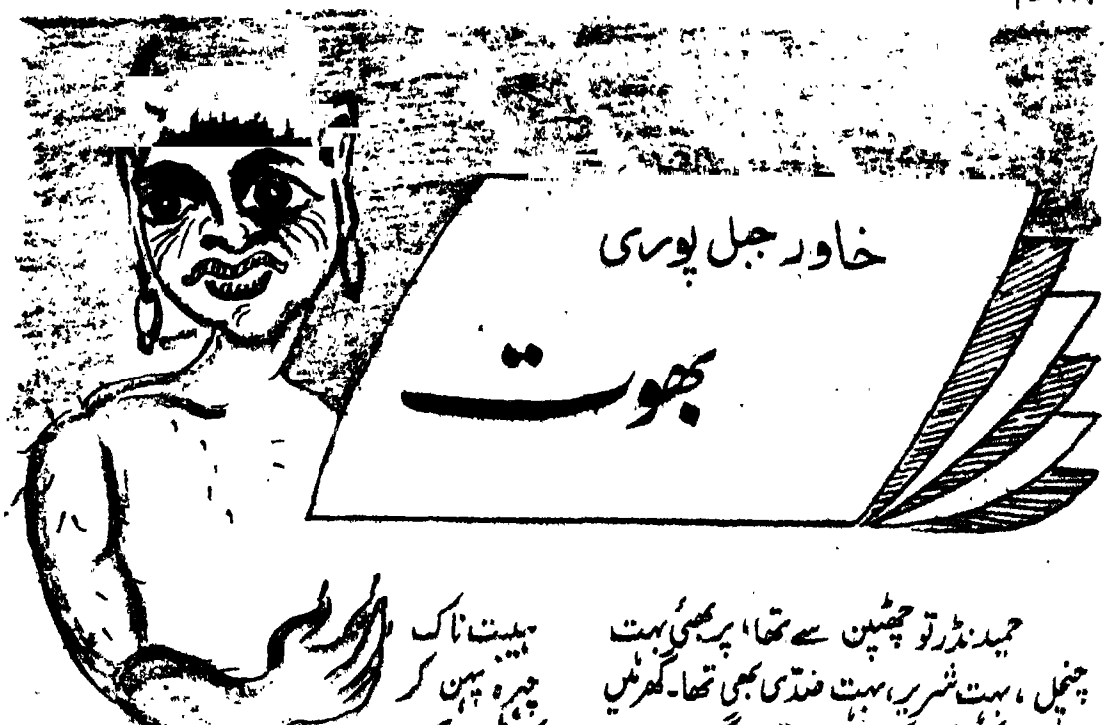
اور پتی لڑائی کے لیے روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پتی اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا قلعہ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ نزابیا نے سمجھا کہ وہ ڈر کر لڑائی کے میدان سے بھاگا آ رہا ہے۔ سہیلیوں نے دروازہ کھولنا چاہا نوزابیا نے منع کر دیا "میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگنے والے کے لیے دروازہ کھولنا مناسب نہیں ہے" لیکن دروازہ تک آتے آتے پتی گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑا زابیا نے دروازہ کھول کر دیکھا پتی کا سینہ دشمنوں کے تیروں نے چھلنی کر دیا تھا۔ بست کا شاہزادہ مر کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ درویش نے اپنا سیب واپس لے لیا۔

نانی بی نے کہانی ختم کر کے پوچھا "کہانی کیسی لگی بچو؟"

اشرف چہک کر بولے "بہت اچھی نانی اماں!"

بے بی اور منی کہانی سنتے سنتے سو گئے۔ گڈو، ناہج افشاں، کہکشاں حسنین اور عقیل یوں اداس تھے جیسے کسی نے سیب انھی کے ہاتھوں سے جھپٹ کر چھین لیا ہو۔


میری بولی
سمجھ میں نہیں آتی تو
تو خود
ہی پڑھ لو
اندر آنا منع ہے



بھوت

خاور جل پوری

حمید نڈر تو بچپن سے تھا، پر بھی بہت چنچل، بہت شریر، بہت ضدی بھی تھا۔ گھر میں بہن بھائیوں کا ناک میں دم تھا۔ گھر سے باہر اپنے ہم عمر ساتھیوں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ اس بُری عادت نے محلے کے بچوں کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ لیکن وہ بے چارے نہ تو اس کی شکایت کر سکتے تھے نہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکتے تھے۔ وہ تو وہ ان کے ماں باپ بھی زبان ہلاتے ڈرتے تھے۔ کیوں؟ اس کے باپ پولس افسر جو تھے۔

پر ایک وقت آیا کہ خود اس کے گھر والے اس کی شرارتوں سے تنگ آ گئے انھوں نے کپڑے کا ایک ڈراونا چہرہ بنوایا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ٹیڑھی ناک، چوڑے چوڑے کان، بڑے بڑے دانت، لمبی سی باہر نکلی ہوئی زبان دیکھ کر خاصے بڑے بچے بھی ڈر جاتے۔

ایک دن حمید کسی بات پر ضد کر رہا تھا۔ منائے نہیں منتا تھا اس کی بڑی بہن نے کیا کیا کہ یہ ہیبت ناک چہرہ پہن کر کوٹھری کے دروازے میں سے جھانکا اور "خوخو" کی آواز نکالی۔

ماں بولیں: "وہ دیکھو حمید، آخر تمھیں پکڑنے آگیا نا 'ہوّا'، بڑی شرارت اور ضد کرتے تھے۔ اب کان پکڑو کہ کبھی شرارت اور ضد نہ کروگے"

حمید نے اس ہوّے کی طرف دیکھا پر وہ نہ ڈرا، نہ سہما، نہ گھبرایا اور دل مضبوط کر کے بولا: "ڈرا لانا تو اپنے بڑے بھائی کی ہاکی، میں ابھی مار کر بھگائے دیتا ہوں اس جنگلی جانور کو"

مزے کی بات یہ کہ حمید کی عمر کے چچیرے بھائی کو پہلے سے یہ چہرہ دکھا کر سمجھا دیا گیا تھا کہ کہیں تم مت ڈر جانا۔ پر جب اس نے اس بہروپ کو دیکھا تو چیخ کر ماں کی گود میں چھپ گیا اور بھئی حمید صاحب پر جنھیں ڈرانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا، شمّہ برابر اثر نہ ہوا۔

حمید نے زرا اور ہوش سنبھالا تو جن، پری، بھوت پریت کی جھوٹی کہانیاں سُنتے سُنتے، اس کے کان پک گئے۔ یہ کہانیاں نمک مرچ لگا کر ایسی چٹخارے دار بنا دی جاتی تھیں اور اس دل نشیں انداز سے کہی جاتی تھیں کہ بچّے تو بچّے خاصے بڑوں کو بھی اُن کی سچّائی پر یقین آجاتا تھا۔ کہانی کہنے والے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ واقعات انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اندازِ بیان ایسا دل فریب کہ اُن کی جادوبیانی پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ پھر کہانی کہنے والی ہستیاں اتنی بزرگ ہوتی تھیں کہ ان کے بارے میں جھوٹ بولنے کا وہم وگمان کبھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جوں جوں حمید بڑا ہورہا تھا ذہن اور عقل بھی ترقی کررہے تھے۔ مگر کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا۔ کیا عجب جو بھوتوں سے انسان کو نقصان پہنچ سکتا ہو مگر جلد ہی عقل غالب آجاتی: "یہ سب من گھڑت، سُنی سُنائی بے سر پیر کی باتیں ہیں۔ دیو، پری، بھوت پریت وغیرہ محض دماغوں کی اپج ہے۔"

حمید اب ہائر سیکنڈری اسکول پاس کرکے شہر کے کالج میں داخل ہوگیا تھا کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اس کا کمرہ ہوسٹل کی تیسری منزل پر تھا۔ ایک دن رات کے کوئی دس بجے کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حمید تیسری منزل کی چھت پر کتاب پڑھ رہا تھا۔ آواز نہ سُن سکا۔ ایک لڑکے نے نیچے سے آکر اُس سے کہا:۔

"کیا سورہے ہو حمید میاں"

حمید چونک کر بولا۔ "نہیں تو"

"تمھیں کوئی بلا رہا ہے۔ بہت دیر سے دستک دے رہا ہے"

"کون صاحب ہیں وہ" حمید کتاب پر نظر جمائے ہوئے بولا

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" لڑکا بولا

حمید کتاب بند کرکے جھنجھلاتا ہوا نیچے گیا۔

ابھی وہ زینے کی آخری سیڑھی پر تھا کہ بیچ والے کمرے کے سامنے دالان میں، میز کے پاس کی والی کُرسی پر ایک موٹا تازہ، بھدّے جسم اور ہیبت ناک شکل وصورت کا لمبا تڑنگا آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ کمرے کی اور دالان کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

پر حمید نہ جھجکا نہ ٹھٹکا اور قریب جاکر ایک لات جو ماری تو یہ دیو صاحب کرسی سمیت نیچے آرہے۔ اور جناب چاروں طرف سے قہقہوں کی آواز گونج اٹھی۔

حمید نے ان سب دوستوں کو ڈانٹا پھٹکارا اور چھت پر آکر کتاب پڑھنے لگا۔ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جس چیز سے ڈر لگے اسے قریب سے جاکر دیکھنا چاہیے۔ یہ بات اس نے گرہ میں باندھ لی تھی۔ کئی بار ساتھیوں نے طرح طرح سے اُسے ڈرانے کی کوشش کی مگر وہ ہمیشہ حقیقت معلوم کرنے کے بعد ہنستا اور لاحول پڑھ کر کہتا کہ یہ ڈر ور تو بس اپنے ہی دماغ کی پیداوار ہے۔ اور بھئی سچ ہی کہتا تھا حمید۔ کیوں ہے نا یہی بات!

ایک رات حمید گھُپ اندھیری رات میں کہیں سے لوٹ رہا تھا۔ جب وہ پُل پر سے گزرنے لگا تو اُسے کچھ فاصلے پر بھینس جیسی ایک شکل نظر آئی۔ اُس کی

آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس پُل کے بارے میں لوگوں نے عجیب بات مشہور کر رکھی تھی۔ رات گئے بھینسا سوُر نامی ایک بھوت یہاں چکر لگاتا ہے۔ مسافروں کو ڈراتا ہے دھمکاتا ہے۔ طرح طرح سے ستاتا ہے۔ کبھی کبھی ٹکریں مار مار کر ہلاک بھی کر دیتا ہے۔

لیکن حمید میاں ذرا بھی نہ ڈرے نہ اُن پر دہشت سوار ہوئی۔ پُل پار کر کے سیدھے بڑھے چلے گئے اور جلد ہی انھیں بھینسا سور صاحب کی حقیقت معلوم ہو گئی۔

ایک اونچے چبوترے پر کسی نے کوڑا کرکٹ اکٹھا کر کے اس میں آگ لگا دی تھی۔ اس کی چنگاریوں نے یہ ڈراونا روپ دھارن کر لیا تھا۔

یہ بات تو اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی کہ حمید کے نڈر پن، بے خوفی اور بہادری کی بدولت بہت سے لوگوں کے دلوں سے یہ بات نکل گئی تھی کہ بھوت پریت بھی کوئی چیز ہے۔ پر حمید میاں اب کچھ بہکنے لگے تھے۔ اپنی بہادری کی ڈینگیں مارنے کا۔ دوستوں کے آگے شیخی بگھارنے کا خبط سا ہو گیا تھا۔

اُس کے دوست اس کی باتوں سے اُکتا گئے تھے اور ڈرانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتے تھے پر حمید، اکثر اپنی بے خوفی اور دلیری سے انھیں حیرت میں ڈال دیتا تھا۔

ایک دن آدھی رات کو اندھیرے میں ایک لڑکے نے کالا لباس پہنا۔ بدن کے کھلے حصّوں پر تارکول لگایا اپنے سر پر جلتی ہوئی آگ کا کونڈا رکھ کر حمید کو سوتے سے جگایا۔ پر وہ نہ گھبرایا نہ ڈرا۔ لیک کر آگ سے دہکتا ہوا کونڈا ڈرانے والے کے سر پر اوندھانے کی کوشش کرنے لگا اور بھئی جب بلا کے اوپر بلا نازل ہوئی تو اس لڑکے نے گڑگڑا معافی مانگی اور حمید کے پنجے سے چھٹکارا پانے کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا گیا۔

ایک دن حمید نے اپنے بے تکلف دوستوں سے کہا: ”تم لوگ آخر کب تک میرا امتحان لوگے۔“

جواب ملا: ”جب تک تم شیخی بگھارنے سے باز نہ آؤ گے۔“

حمید نے جواب دیا: ”ہار تو میں آخر دم تک نہ مانوں گا۔“

”تو پھر ہمارے پروگرام کا انتظار کرو۔“ دوستوں اور ساتھیوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا، اور وہ پھر کوئی تازہ منصوبہ سوچنے لگے۔

کئی دن بعد یہ شرط بدی گئی کہ حمید اگر آدھی رات کو مرگھٹ میں اکیلا جا کر، وہاں رکھی ہوئی نشانی لے آئے تو سارے دوست باری باری اُسے پیٹ بھر کے مٹھائی کھلائیں گے، اور اگر وہ ڈر گیا یا ڈر کے مارے وہاں نہ پہنچا تو ہر ایک دوست کو پیٹ بھر کر مٹھائی کھلانا پڑے گی۔

لیجیے دن تاریخ مقرر ہو گئی اور حمید میاں بالکل ٹھیک وقت پر اِتراتے ہوئے مقام پر جا پہنچے۔

وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سی اَدھ ننگی عورتیں، پاؤں میں گھنگرو باندھے ڈھولک اور مجیروں کے ساتھ ناچ رہی ہیں۔

یہ دیکھتے ہی حمید میاں کے ہوش اڑ گئے وہ تو ڈر سے چیخنے اور سر پر پیر رکھ کر بھاگنے والے تھے کہ

قدرت نے ان کا ساتھ دیا۔ ان میں سے ایک لڑکے کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ حمید نے آواز پہچان لی۔ پھر کیا تھا گئے حواس لوٹ آئے اور حمید میاں نے یہ کڑی شرط جیت لی۔ دوست اور بھی جز بز ہوئے۔

حمید کو رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی عموماً جنگل کی طرف نکل جاتا ایک بار ٹہل کر واپس آرہا تھا رات زیادہ ہوگئی تھی۔ اچانک خوفناک آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔ یہ آوازیں پیپل کے ایک بڑے سے پیڑ کے پاس سے آرہی تھیں۔

اس نے درخت کی طرف غور سے دیکھا تو اس کی چوٹی پر سے چنگاریاں جھڑتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اور قریب پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالا بھوت زمین سے اُٹھتا ہوا اتنا لمبا ہوگیا کہ اس کا سر پیپل کی چوٹی تک جا پہنچا۔

یہ بھیانک منظر دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی، چیخ مار کر بے تحاشا بھاگا بدحواسی کے عالم میں گھر کا راستہ چھوڑ، دوسری سڑکوں کے چکر کاٹتا، ہانپتا کانپتا مشکل سے گھر پہنچ پایا۔ کمرے میں پہنچتے ہی چارپائی پر گر گیا۔ اور اتنی شدت کا بخار چڑھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

دوسرے دن اس کے دوستوں نے قسمیں کھا کر سارا قصہ بتایا حمید کو یقین نہ آیا تو انھوں نے سب ساز و سامان لاکر اُسے بتایا کہ کس طرح اسے ڈرایا گیا تھا۔ تب کہیں حمید کی تسلی ہوئی اور آہستہ آہستہ بخار سے نجات ملی۔

اس جان لیوا واقعے کے بعد اس کے دوستوں نے قسم کھائی کہ آیندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔

اِدھر میاں حمید نے بھی دل سے توبہ کی کہ آیندہ کسی کے سامنے شیخی نہ بگھاریں گے اور جب سے آج کا دن ہے کیا مجال جو حمید نے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکالی ہو۔ ہاں کبھی پچھلے قصے چھڑ جاتے ہیں تو خوب دل چسپی رہتی ہے۔ قہقہوں سے کمرہ گونج اُٹھتا ہے۔

بقیہ بھوتوں کا مسکن صفحہ ۲۷ سے آگے

کا رخ بھی نہ کرتا۔ اب ہم جائیں گے اور پولیس کو اطلاع کردیں گے ——

پھر سبودھ اور گاؤں کے چند بڑے لوگوں نے پولیس میں اس کی اطلاع کردی —— اور تری بھوتوں کی کہانی کہہ سنائی —— تھوڑی ہی دیر میں پولیس سے بھری ہوئی لاریاں کھیتوں کی طرف دوڑ رہی تھیں اب تو یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ راتیں جونہی ڈاکو اپنے "مسکن" میں داخل ہوئے پولیس والوں نے اُن کی کس طرح تواضع کی اور کس طرح آن واحد میں جیل بھر گیا ——

گاؤں والوں سے سرکار بڑی خوش ہوئی خاص طور پر سبودھ کو بہت بڑا انعام ملا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے ہر شخص کو سونا، چاندی، اور کپڑے انعام کے طور پر دیئے گئے کیونکہ ان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی —— اس طرح رنگاپور کی خوشحالی پھر لوٹ آئی۔ آج گاؤں بڑا خوشحال ہے لیکن آج بھی شمال کی جانب کے کھیت "بھوتوں کا مسکن" ہی کہلاتے ہیں۔

آدھی ملاقات

کہانی نمبر مجھ کو بہت پسند آیا سب سے چھوٹے بچّے عفان نے جس کی عمر چھ سال ہے کہانی نمبر دیکھ کر فرمائش کی ہے کہ میں آپ کو اس کی طرف سے لکھ دوں کہ "غ سے عفان ہوتا ہے"! آپ پیام تعلیم میرے نام بھیجنے کے بجائے اسی کے نام بھیجیں۔

کہانی نمبر کے بعد والا شمارہ ان لوگوں کو کم پسند آیا اس میں کہانیاں کم تھیں اور ان کے کام کی بس ایک نظم تھی۔

حُمید عثمانی الٰہ آباد

"پیام تعلیم" کا معیاری اور بھاری بھرکم "کہانی نمبر" پا کر جی خوش ہو گیا۔ دوسری زبان کی کہانیوں کو اس سلیقے سے پیش کر کے آپ نے بچّوں کے اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے، ایک نئی راہ کی بنا ڈالی ہے۔ اس کامیاب پیش کش پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

سناظر عاشق

میں اُس وقت کتنا شرمندہ ہوا ہوں جب آپ مجھ سے ملنے کی خاطر جامعہ سے نیّر صاحب کے دولت کدہ تک تشریف لائے ں تو آپ کو لکھ ہی چکا تھا، خود حاضر ہوتا۔ مگر اس سے ایک بات نردر ہوئی۔ مجھے آپ کی شفقت اور محبت کا پتا چلا۔ آپ سے یک قلمی تعلق تو تھا ہی۔ ملاقات ہوئی ہے تو ایک خاص قسم کا قلبی تعلق بھی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ بچّوں کا بھلا چاہنے، ان کے لیے ادب تخلیق کرنے اور دوسروں کو لکھنے لکھانے پر مجبور کرنے والوں کے لیے آپ کا دم غنیمت ہے۔ خدا پ کو سلامت رکھے۔

کہئیے میرا کتابوں والا تبصرہ پڑھا؟ کیسا لگا؟ آپ سے جو تعلق ہے، اس کا بھی اظہار ہے اور آپ کے ادب سے جو دلچسپی ہے اس کا بھی اعتراف! جامعہ کی ملاقات یاد رہے گی۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

پروفیسر آفاق احمد

پیام تعلیم پابندی سے موصول ہو رہا ہے، کرم فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ رشید حسن خاں صاحب کا سلسلۂ مضامین بہت دلچسپ اور کارآمد ہے۔ طالب علموں اور بچّوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی، اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض غلطیاں اور خامیاں۔ ایسے استادوں کے یہاں بھی ہیں، جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھا رہے ہیں مثلاً وجہ کے بجائے وجوہات، لفظوں یا الفاظ کے بجائے الفاظوں وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض الفاظ کا املا اتنا غلط رائج ہو گیا ہے کہ صحیح لکھ دیجیے تو پڑھے لکھے لوگ بھی مذاق اڑائیں گے مثلاً طوطا (جب کہ صحیح املا توتا ہے)

آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ رشید حسن خاں صاحب ایسے معروف اور واقعی پڑھے لکھے ادیب سے "پیام تعلیم" کے لیے لکھوا لیتے ہیں۔ یہ وہ کارِ خیر ہے، جس کا اجر آپ کو ہمیشہ ملتا رہے گا۔

امید ہے مزاج اقدس بخیر ہو گا۔

سعادت صدیقی سنبھل

اِدھر اُدھر سے

" یے تی "

اِس عجیب و غریب انسان نما جانور یا جانور نما انسان کا ذکر پہلے بھی انھی صفحوں میں آچکا ہے۔ یہ مخلوق، کہتے ہیں پہاڑوں میں رہتی ہے اور کسی خوش قسمت آدمی کو کبھی کبھار دکھائی دے جاتی ہے۔ سائنس داں، کوہ پیما (پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین) اور دوسرے لوگ اس کی تلاش میں برابر پہاڑوں پر گھومتے بلکہ یوں کہیے کہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ابھی تک اس کی زیارت سے محروم ہیں۔

نیپال کے ایک عالم فاضل اور تاریخ کے ماہر نرہری ناتھ آج کل پہاڑوں میں عبادت اور ریاضت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ماہوار رسالہ " یے تی " میں اس عجیب غریب مخلوق (یے تی) پر ایک مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے یتی کو دیکھا ہے۔ اور اس کا فوٹو بھی لیا ہے۔ باقی باتیں خود ان کی زبانی سُنیے:۔

اس پہاڑی مخلوق کے دُم نہیں ہوتی۔ نہ وہ انسان سے ڈرتا ہے۔ اب سے ساڑھے چار برس پہلے جولائی کی ایک صبح کو میں نے اس عجیب و غریب مخلوق کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں کیلاش کی طرف جا رہا تھا۔

یہ بڑا روشن، بہت شاندار دن تھا۔ برف کے گالے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ فضا میں خاموشی اور سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک سیدھی طرف ایک شکل نظر آئی یہ پہاڑیوں پر سے دھیرے دھیرے نیچے آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لنگڑا لنگڑا کر چل رہی ہے۔ جونہی ذہن میں یہ بات آئی کہ ہو نہ ہو یہ " یے تی " ہے۔ میں نے اپنا کیمرہ سنبھالا۔ پھر بھی وہ تو نہ جانے کیوں فوراً پیچھے مڑ گیا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اس سے میں مُنھ پیچھے کی طرف کی تصویر لے سکا۔ اور یہ شکل دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس شکل نے میری طرف دیکھا بھی اور سر بھی ہلایا۔

اس کے قدموں کے نشان جو دیکھے تو ان کی لمبائی دو ہاتھ تھی چوڑائی دو مٹھی خود یے تی، لگ بھگ ساتھ ہاتھ لمبا تھا بہت ہی توانا اور تن درست، لمبے لمبے مضبوط ہاتھ۔ ہتھیلیاں چپٹی اور سپاٹ کوتہ (چھوٹی) گردن، چہرے پر چپٹا اور باقی بدن پر کوئی دس انچ لمبے بال۔ رنگ ہلکا بھورا۔ ناک چھوٹی اور چپٹی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، اندر کو دھنسی ہوئیں۔ سینہ کوئی دو ہاتھ چوڑا۔

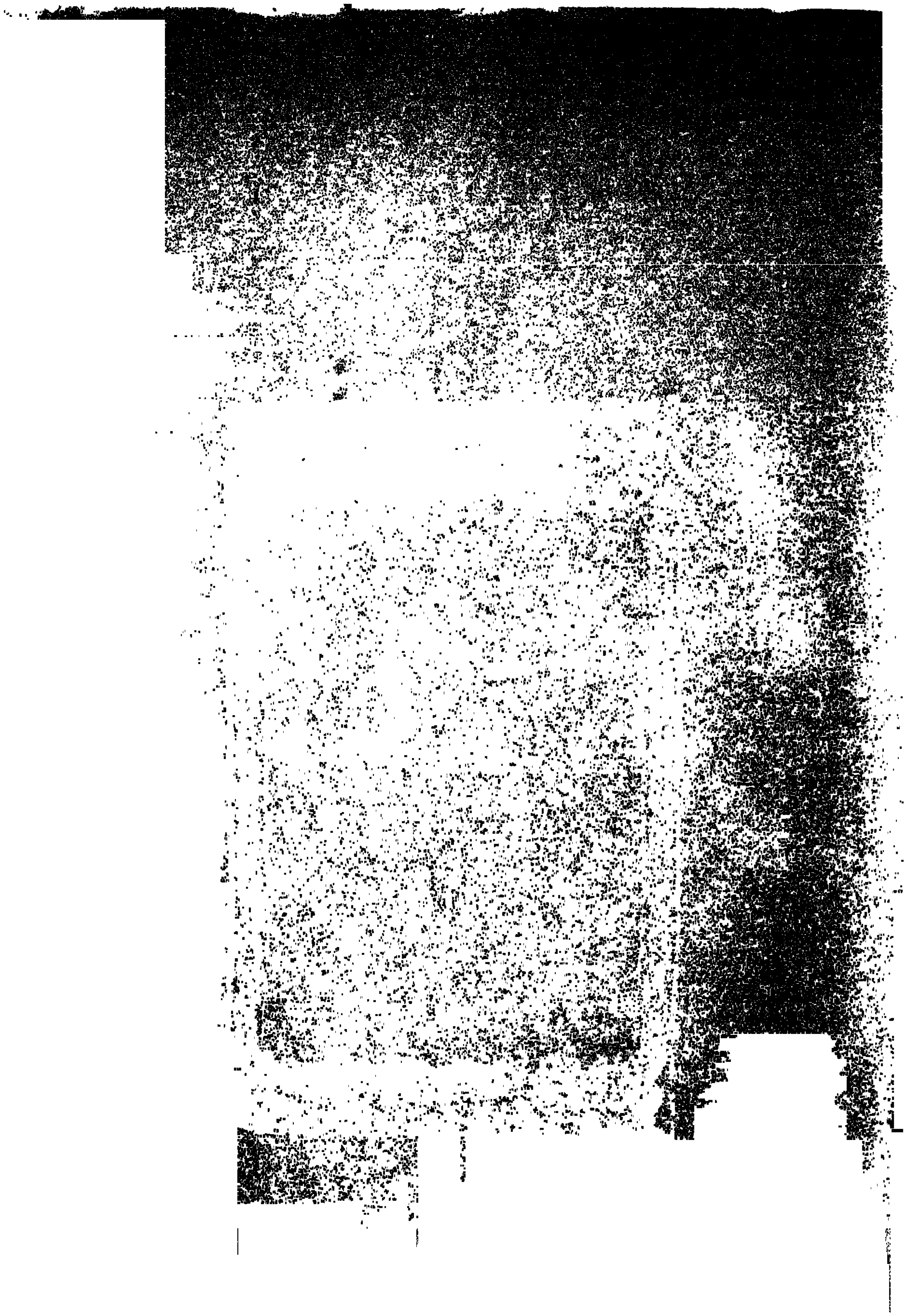
غرض " یے تی " کی شکل انسان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ شرپا لوگ، اور پہاڑی قبیلوں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ " یے تی " کی ان سے مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ " یے تی " پھل یا پتیوں والی سبزیاں کھاتا ہے۔ وہ جب اکیلا ہوتا ہے تو بچوں کی سی آواز نکالتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو اپنے بارے میں بتا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمس ۲۷ جولائی ۷۲ء)

بقیہ ہمت اور مستقل مزاجی کی جیت صفہ 19 سے

ہال سے باہر نکلی تو اپنے والدین کو دیکھ کر چیخ اٹھی میں نے بازی مارلی" اس کی ماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں: کون کہہ سکتا تھا ہم یہاں تک پہنچ سکیں گے" یہ کہہ کر اس نے اپنی بچی کو لپٹا لیا۔

بعد میں ویری نے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا ۱۹۶۷ء میں وہ نیولنڈن گریجویٹ اسکول آف بزنس میں لائبریرین ہوگئی۔





AYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-25.


پیام تعلیم
10 (3)

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

جلد ۱۰ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۷۴ء

قیمت

۶۰ پیسے

سالانہ چندہ

چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین



پیاموں سے باتیں

پچھلے (فروری کے) پیام تعلیم میں کہانیاں ہی کہانیاں تھیں۔ ہمارے ننھے پیامیوں کو خاص طور سے یہ بات بہت اچھی لگی۔ ساری کہانیاں انھوں نے بہت مزے لے لے کر پڑھیں۔ ان میں سے کچھ کہانیاں۔ "مونگے کا جزیرہ" "بھوتوں کا مسکن" تو بہت ہی اچھی لگیں۔ اور ہاں ہمت اور مستقل مزاجی کی جیت بھی۔

اس پرچے میں بھی کہانیوں کا پلّہ بھاری ہے مضمون کم ہیں۔ کہانی نمبر کی بچی ہوئی کہانیاں اب بھی باقی ہیں۔ یہ سب وہ کہانیاں ہیں جو کاتبوں یا خوش نویسوں سے لکھوائی گئی ہیں۔ انھیں چھپوانے میں دیر کی جائے تو ان کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

پیام تعلیم نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ رسالے میں ایک ہی مضمون لکھنے والے کی دو چیزیں شائع نہ ہوں۔ لیکن کبھی کبھی مجبوری کی وجہ سے یہ اصول توڑنا پڑتا ہے کہانی نمبر میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اس پرچے میں بھی خلیق انجم صاحب کی کئی کہانیاں شائع کی جا رہی ہیں۔ اسی مجبوری کی وجہ سے شائع کی جا رہی ہیں۔ یہ سب کہانی نمبر والی کہانیاں ہیں۔

شاید آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر بشیر الحق ندوی نے چند مضمون کتّوں کے رہن سہن کے بارے میں لکھے تھے۔ یہ مضمون آپ نے بہت پسند بھی کیے تھے بشیر صاحب اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ اس مرتبہ ہماری مسلسل درخواست پر آپ نے دو مضمون مرحمت فرمائے ہیں۔

ان میں سے ایک مضمون 'امتحان' پر ہے یہ مضمون ہم اسی پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔ مارچ سے آپ کے امتحانوں کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اس لیے یہ وقت کے مناسب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے ضرور پڑھیں گے، اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں آپ کے ساتھی امتحان کے وقت کتنی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور کبھی ہمارے دیش میں؟

اسی کے ساتھ ایک اور مضمون ہے "ہم پچوں سے کیا کیا سیکھ سکتے ہیں" کتنا پیارا مضمون ہے۔ کتنے اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے آپ اسی کو پڑھیں۔ ہم نے بھی پرچے میں سب سے پہلے اسی کو جگہ دی ہے۔ یہ مضمون ہمارے محترم بزرگ جناب غلام [illegible] نے لکھا ہے دلّی کے رہنے والے ہیں نہ جانے کب سے حیدرآباد میں قیام ہے مگر زبان دِلّی کی ہے۔ نکھری ستھری صاف اور سادہ۔ اور دلچسپ

تیسرا مضمون محترم راج نرائن راز کا ہے "سچا سپنا" معلوماتی مضمون ہے۔ مگر کہانی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ آپ پڑھنا شروع کریں گے تو بس پڑھتے ہی چلے جائیں گے، ذرا بھی دماغ پر بوجھ محسوس نہ کریں گے۔ امید ہے کہ محترم راز صاحب کی سرپرستی کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

محترم مولانا مقبول احمد سیوہاروی کو آپ بھولے نہ ہوں گے۔ ابن بطوطہ کا سفرنامہ کئی برس پیام تعلیم میں چھپتا رہا ہے۔ اصل سفرنامہ عربی میں ہے۔ مولانا نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اصل کتاب تو بہت بڑی بہت ضخیم ہے مولانا نے اس بڑی کتاب میں سے بس وہی باتیں لی ہیں جو بچوں کے لیے دلچسپ ہیں۔ مولانا آج کل بہت بیمار ہو گئے ہیں۔ خدا ان کو جلد صحت دے آپ بھی دعا کیجیے۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں میں مولانا کی حیثیت بہت اہم ہے۔

بچوں کے لیے بمبئی سے ایک بہت ہی اچھا رسالہ چلڈرنس ڈائجسٹ بہت دنوں سے نکل رہا ہے۔ رسالے میں بہت ہی آسان زبان میں چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضمون شائع ہوتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر کی یہ بات جی کو لگی "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کل کیا بچے اور بڑے لڑکے معلوماتی مضمونوں کے مقابلے میں کہانیاں اور کامک زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمارے رہن سہن کے مہذب اور شائستہ طور طریقوں میں جو گراوٹ آ رہی ہے اور ہمارا تعلیمی معیار جو روز بروز گر رہا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔"

"چلڈرنس ڈائجسٹ" کے خیال سے ہم کو پورا اتفاق ہے۔

پیام تعلیم نے اسی لیے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اچھی اچھی کہانیوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ معلوماتی مضمون ضرور ہوں۔ اور ہم اپنے بس بھر اس کوشش میں برابر لگے رہتے ہیں۔

فارم ۱۷ حسب قاعدہ ۸

بابت "پیام تعلیم" نئی دہلی

(۱) مقام اشاعت:- جامعہ نگر نئی دہلی

(۲) وقفہ اشاعت:- ماہنامہ

(۳) پرنٹر کا نام: سید احمد ولی، قومیت۔ ہندوستانی
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۴) پبلشر کا نام: سید احمد ولی، قومیت:- ہندوستانی،
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۵) اڈیٹر کا نام: محمد حسین حسان۔ قومیت۔ ہندوستانی،
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۶) مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی
چیرمین:- پروفیسر محمد مجیب، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
ڈائرکٹرز:- سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۲) ڈاکٹر عبدالعلیم، ۳ یونیورسٹی روڈ۔ علی گڑھ
(۳) ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کولابہ، بمبئی ۵
(۴) کرنل بشیر حسین زیدی، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
(۵) ضیاء الحسن فاروقی، پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۶) مالک رام بی ۲۹۶۔ ڈفنس کالونی نئی دہلی ۳

(۷) کمپنی کے سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
اسلامی تعمیر خانہ، کنسٹرکشن ہاؤس، بمبئی ۱

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط: احمد ولی (پبلشر)

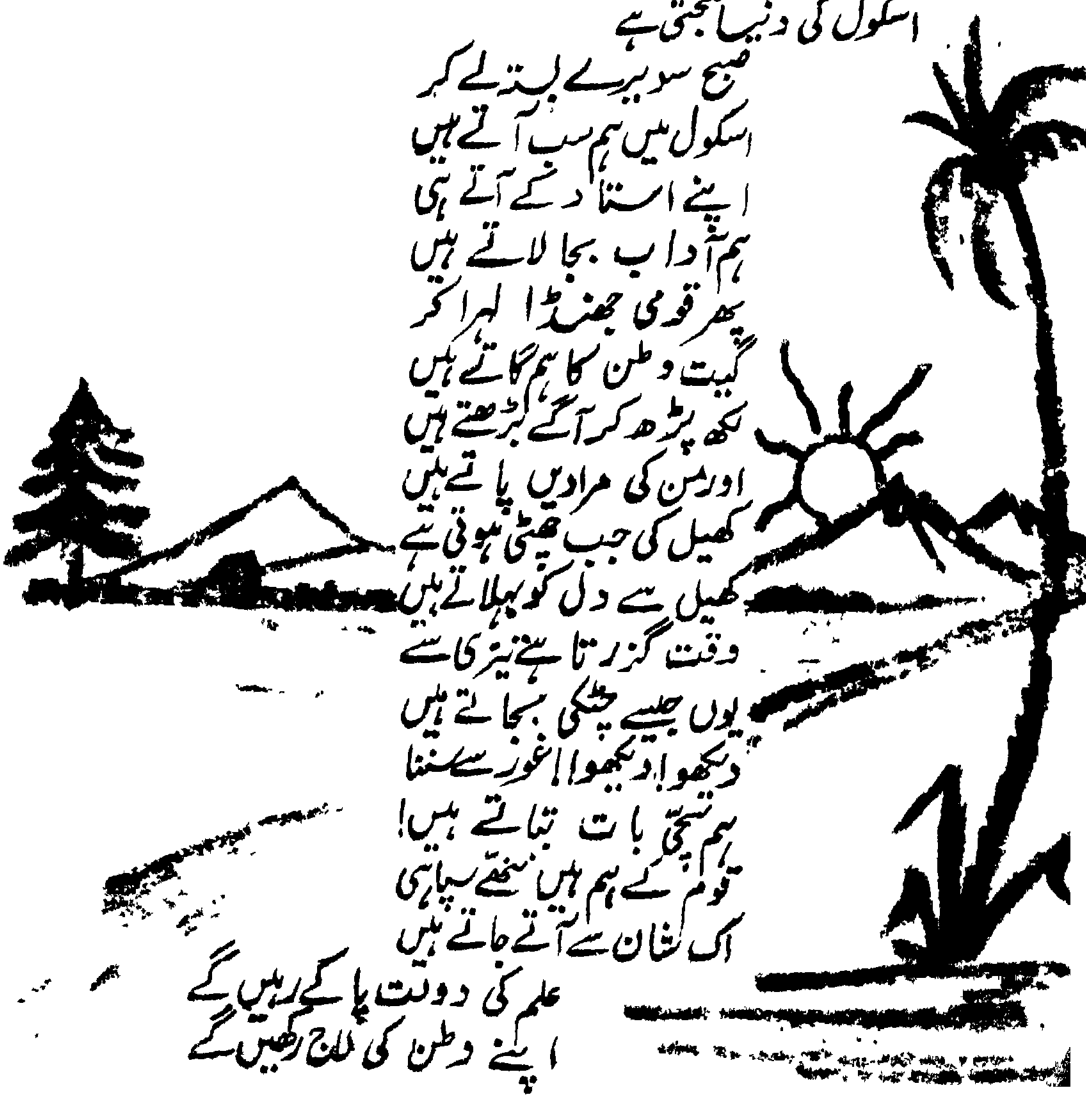
۲۸۔ فروری ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر امانت، ایم اے، پی ایچ ڈی

بھاؤ گیت

بھاؤ گیت بچوں کے لیے بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ اس کے ہر شعر میں کہی گئی بات بچے ACTION (اداکاری) کے ذریعے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس کا دہرا فائدہ ہے: ایک تو یہ کہ بچے اسے آسانی سے حفظ کر لیتے ہیں، دوسرے پورے گیت کا مفہوم بخوبی ان کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

ٹن ٹن گھنٹی بجتی ہے
اسکول کی دنیا سجتی ہے



صبح سویرے بستہ لے کر
اسکول میں ہم سب آتے ہیں
اپنے استاد کے آتے ہی
ہم آداب بجا لاتے ہیں
پھر قومی جھنڈا لہرا کر
گیت وطن کا ہم گاتے ہیں
لکھ پڑھ کر آگے بڑھتے ہیں
اور من کی مرادیں پاتے ہیں
کھیل کی جب چھٹی ہوتی ہے
کھیل سے دل کو بہلاتے ہیں
وقت گزرتا ہے تیزی سے
یوں جیسے چٹکی بجاتے ہیں
دیکھو! دیکھو! غور سے سننا
ہم سچی بات بتاتے ہیں!
قوم کے ہم ہیں ننھے سپاہی
اک شان سے آتے جاتے ہیں

علم کی دولت پا کے رہیں گے
اپنے وطن کی لاج رکھیں گے

جناب غلام ربّانی

ہم بچوں سے کیا کیا سیکھ سکتے ہیں



یہ بات سب جانتے ہیں کہ بچے بڑوں سے سیکھتے ہیں مگر یہ بات سب نہیں جانتے کہ بڑے بھی بچوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بچوں میں سیکھنے اور معلوم کرنے کا جو شوق ہوتا ہے وہ بڑوں میں کم ہوتا ہے۔ بعض لوگ معمولی سی بات کو دوسروں سے پوچھنے میں شرماتے [illegible]

ہیں بہت بے باک ہوتے ہیں جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی بے دھڑک پوچھ لیتے ہیں۔

ایک دن ہم اپنے ایک دوست کے مکان پر ان سے ملنے گئے، ہماری چھ سال کی بچی سحر ہمارے ساتھ تھی۔ ہم اپنے دوست سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کا پالتو کتا کمرے میں آ گیا، سحر اسے دیکھ کر گھبرانے لگی۔ ہمارے دوست نے کہا گیٹ آؤٹ (باہر جاؤ) [illegible] کتا اسی وقت باہر چلا گیا، سحر نے ہم سے پوچھا،

دادا جان، یہ کتا انگریزی جانتا ہے؟"
ہم نے کہا: ہاں یہ انگریزی جانتا ہے۔
بچوں کی کتاب میں شاید یا غالباً کا لفظ نہیں ہے؛ وہ اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتے کہ ان کے سوال کو ٹال دیا جائے۔ ان کو صاف جواب ملنا چاہیئے۔

بچے بڑے مزے کے سوال کیا کرتے ہیں۔ اور بعض تو ایسے مشکل ہوتے ہیں کہ ان کے جواب کتابوں میں بھی نہیں مل سکتے، جیسے یہ سوال کہ

جب ہوا چلتی نہیں ہے تو اُس وقت
وہ کیا کرتی ہے؟

بچوں کے پاس لفظ کم ہوتے ہیں مگر وہ بڑی سمجھ سے کام لیتے ہیں اور کم سے کم لفظوں میں اپنا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ کم لفظوں میں مطلب بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ گُر بچوں سے سیکھا جا سکتا ہے۔

ایچ پیچ کی بات بچوں کو پسند نہیں، ان کے سامنے بات چیت میں محاورہ کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

آپ کا آدمی سودا لینے بازار گیا ہے وہ ذرا دیر سے لوٹا، آپ ڈانٹ کر اس سے کہتے ہیں اتنی دیر ہوگئی کہاں مر گئے تھے۔ آپ کا بچہ اسی وقت کہہ دے گا، ابا جان یہ تو زندہ ہیں مرے نہیں۔

بچوں کی کوئی چیز کھو جائے تو وہ اس کا زیادہ رنج نہیں کرتے، وہ ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتے جن سے ان کو رنج ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اگر ان کو اپنے کام میں مشکل پیش آئے تو ہمت نہیں ہارتے اور جب تک وہ کام نہیں ہو جاتا چیونٹیوں کی طرح اس میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا بار بار کوشش کرنا بڑوں کے لیے ایک سبق ہے۔

بچوں کو کسی بات کا کھٹکا نہیں ہوتا، کاروباری شہروں کے بازاروں میں کتنی ہی بھیڑ بھاڑ، موٹروں اور بسوں کی ریل پیل ہو وہ سڑک پار کرنے میں نہیں ہچکچاتے۔ وہ بھوتوں سے نہیں ڈرتے۔ ان کو بڑھاپے کا اندیشہ نہیں ہوتا، وہ سمجھتے ہیں کہ کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔

وہ آس پاس کی چیزوں میں ایسی دلچسپی لیتے ہیں کہ بڑے نہیں لیتے، پھول، پتے، بھونرے، چمکدار پر، سیپیاں، املی اور شریفے کے بیج، رنگ برنگ کے پتھر، کوڑیاں ان کی ذاتی چیزیں ہیں، کسی بچی یا بچے کی جیب یا ڈبا دیکھیے۔ تو اس میں بہت سی ایسی چیزیں ملیں گی جن کو اس نے بڑے شوق سے جمع کیا ہے۔ گلاب کی شاخ تراشنے کو وہ پسند نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ اس سے گلاب کو تکلیف ہوتی ہے۔

بچوں میں ہمدردی بہت ہوتی ہے۔ کوئی پھٹے حال آدمی بھیک مانگ رہا ہو یا کوئی بڑھیا ان کے دروازہ پر روٹی کا ٹکڑا مانگ رہی ہو تو اُس پر ان کو ترس آ جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو مجبور کرتے ہیں کہ اس کو کچھ دیں۔ بعض وقت وہ خود روٹی کا ٹکڑا لے جا کر اسے دے دیتے ہیں۔

بہت سی اچھی عادتیں بچوں سے سیکھی جا سکتی ہیں۔

وہ بہت جلد دوست بن جاتے ہیں۔ کسی سے کپٹ نہیں رکھتے۔ مل جل کر پیار سے کھیلتے ہیں۔ کھیل میں کبھی آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھول جاتے ہیں اور پھر دوست بن جاتے ہیں۔ دل میں میل یا کھوٹ نہیں رکھتے۔ بُری باتوں کو بھلانا مشکل کام ہے۔ جو لوگ گذری ہوئی بُری باتوں کو یاد رکھتے ہیں۔ وہ پریشان اور دُکھی رہتے ہیں۔ گذری ہوئی باتوں کو بھلانا بچوں سے سیکھا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ دل میں دشمنی ہوتی ہے اور دوستی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی چیز ہے "بچے" اس سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کا ظاہر باطن آئینہ کی طرح صاف ہوتا ہے۔ ان کو کوئی بچہ پسند نہیں ہوتا تو صاف کہہ دیتے ہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں کھیلتے۔ وہ بے ایمانی کو پسند نہیں کرتے ایکھل میں کوئی "بچہ" دھاندلی کرے تو اس کو نکال دیتے ہیں۔

قدرت کی بہت سی چیزوں کا لطف جو بچے اٹھاتے ہیں وہ بزرگوں اور اولیاء اللہ ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ بادلوں کی طرح طرح کی شکلیں، چاند کا بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلنا، گھونگوں اور سنکھوں کی عجیب آوازیں، پیپل یا نیم کی نئی نئی سُرخ کونپلیں بچوں کے دیکھنے کی خاص چیزیں ہیں۔ ہم کو خوب یاد ہے۔ ایک دن رات کے وقت ہم فتح میدان کے پاس سے گذرے اس وقت چودھویں کا چاند نوبت پہاڑ کے اس قدر قریب تھا کہ اس پر لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا ہماری بچی ہمارے ساتھ تھی کہنے لگی۔

میں چاند کو پکڑوں گی اور ہاتھ لگا کر دیکھوں گی، یہ کیسا ہے؟

ہم بہت خوش ہوئے، اور اس سے کہہ دیا بھئی اس وقت ہم دوسرے کام پر جا رہے ہیں پھر کسی دن چلیں گے۔

بچوں کی برادری تعریف کے قابل ہے۔ ان میں امیر، غریب، چھوٹا بڑا۔ گورا کالا سب برابر ہیں، وہ مکر اور فریب نہیں جانتے۔ وہ سچ بولتے ہیں اور اگر کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو بھولپن کی وجہ سے ان کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے۔

بچے کوئی بُرا کام نہیں کرتے، وُہ گُناہ سے پاک ہوتے ہیں، یہ فرشتے ہوتے ہیں، اسی لیے فرشتوں کی تصویریں بچوں کی بنائی جاتی ہیں۔

ماں کا خط

از۔ نوق فاروقی

میرے منّے میرے نین تارے
تجھکو لاکھوں دُعائیں دُلارے

لکھ رہی ہوں تجھے اس لیے خط　　تیرے کام آئیں گے یہ مرے خط
اس لیے دور دل سے کیا ہے　　سیکھ لے علم، یہ مُدّعا ہے
تو پڑھائی میں دل کو لگانا!　　کھیل میں دن نہ اپنے گنوانا
تو جو پڑھ لکھ کے قابل بنے گا　　سر ہمارا بھی اُونچا اُٹھے گا
سب سے مل جل کے رہنا وہاں پہ　　مان لینا کہیں جو بھی ٹیچر
اچھی ہوتی نہیں ہے لڑائی　　ہے محبت میں سب کی بھلائی
عادتیں نیک ہوتی ہیں پیاری　　نیکیوں سے ہے خوش ذاتِ باری
لاڈلے خوب محنت سے پڑھنا　　تجھ کو جیون میں ہے جو سنورنا
تجھ کو دے گا خدا کامیابی　　شان تیری بھی ہو گی نوابی

چھٹیوں میں بلاؤں گی تجھ کو
منّے حلوہ کھلاؤں گی تجھ کو

آٹھویں قسط

ار۔ ایم۔ بیلن ٹائن

تلخیص و ترجمہ:- خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ



سورج نے مشکل سے اپنی پہلی کرن بحرالکاہل کے چوڑے چکلے سینے پر ڈالی ہوگی کہ جیک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیٹرکن کے کان میں چیخ کر اسے جگا دیا اور خود ساحل پر دوڑتا ہوا روز کی طرح نہانے چلا گیا۔ ہم دونوں البتہ حسب معمول اپنے آبی باغ میں نہانے نہیں گئے بلکہ جلدی کے مارے گھر کے سامنے والے لیگون ہی میں نہا لیے۔ جلدی جلدی الٹا سیدھا ناشتہ کیا اور ایک گھنٹہ سے بھی کم میں سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔

اپنے روز مرّہ کے لباس کے علاوہ جیک نے ناریل کے کپڑے سے بنی ہوئی ایک پیٹی بھی اپنے کمرے کے گرد باندھی اور اسی میں کلہاڑی اڑس لی۔ میں نے بھی ویسی ہی پیٹی باندھ کر اس میں ایک مضبوط ڈنڈا اڑس لیا۔ ظاہر تھا کہ کسی جنگلی جانور سے دوبدو مقابلے میں غلیل کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ رہا پیٹرکن تو حالانکہ وہ اپنے کندھے پر اتنا لمبا اور بھیانک سا بھالا رکھے ہوئے تھا پھر بھی اس نے اپنی لاٹھی بھی رکھ لی اور ہمارے سمجھانے پر بھی اسے چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔

"کیونکہ" اس نے وضاحت کی "اگر دشمن قریب آ جائے تو بھالے کی اہمیت تنکے سے زیادہ نہیں اور میرا خیال تھا کہ ایسی حالت میں اس کی لاٹھی بھی اس کے الفاظ

مدھن سے زیادہ مفید ثابت ہوتی کیونکہ اس کا سرا بڑا بھدّا اور کھردرا تھا۔ یہ لاٹھی تو کچھ اس قسم کی تھی جیسی میں نے "جیک دی جائنٹ کلر"[۱] کی تصویری کہانی میں دیکھی تھی۔ ساتھ ہی یہ لاٹھی اتنی بھاری تھی کہ پیٹرکن کو اسے چلانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے سنبھالنا پڑتا تھا۔ بہر حال اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور اسے بھی ساتھ لے لیا اور اس طرح ہم اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔

ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی ہمیں معلوم تھا کہ جزیرے پر ہم جدھر بھی جائیں گے راستہ میں ہمیں ناریل کے درخت ضرور ملیں گے اور بقول پیٹرکن ناریل کے درختوں کی موجودگی میں ہمیں کھانے، پانی اور اور کپڑے، ان تینوں چیزوں کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں نے احتیاطاً خوردبین کا شیشہ اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ جانے کہاں ہمیں آگ کی ضرورت پڑ جائے۔

آدھ میل چلنے کے بعد ایک ایسا موڑ آیا کہ ہمارا گھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر تک بالکل خاموش چلتے ہی رہے ہماری زبانیں تو خاموش تھیں لیکن نظریں جنگل، ساحل یا سمندر کی ہر دلچسپ چیز پر پڑتی رہیں۔ اس پہاڑ سے گزرنے کے بعد جو ہماری وادی یعنی وادیٔ جہاز کی ایک سمت بناتا تھا، ہماری نظر ایک دوسری چھوٹی سی وادی پر پڑی۔ بڑی حسین تھی یہ وادی۔ سرسبز و شاداب اور رنگ برنگے درختوں اور جھاڑیوں سے بھرپور۔ ہم نے اس وادی کو پہلے بھی پہاڑ کی چوٹی پر سے دیکھا تھا لیکن اس وقت ہمیں خیال بھی نہ تھا کہ

قریب سے دیکھنے پر یہ وادی اتنی حسین، اتنی پیاری معلوم ہوگی۔ ہم اس کا معائنہ کرنے کے لیے اس وادی میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ پیٹرکن نے ہمیں روک دیا اور ہماری توجہ ساحل پر ہونے والے ایک عجیب سے نظارے کی طرف دلائی۔

"وہ کیا ہے؟ کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟" اس نے یہ کہتے کہتے بھالے کو اس طرح تھام لیا گویا وہ چیز کوئی دم میں حملہ کرنے والی ہو حالانکہ وہ کچھ بھی تھی ہم سے آدھ میل دور تو ہوگی ہی۔

اس کے بولتے ہی بولتے چٹانوں پر ایک سفید بادل سا نظر آیا۔ یہ بادل بھاپ کا لگتا تھا۔ چند منٹ اونچا اٹھ کر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ اگر یہ بادل سمندر کے قریب اٹھ رہا ہوتا تو ہم بالکل حیران نہ ہوتے کیونکہ اس صورت میں ہم اسے کوئی بڑی موج سمجھ لیتے۔ لیکن یہ سفید بادل تو سمندر سے پچاس فٹ دوری پر بن رہا تھا۔ اس جگہ چٹانیں کھردری تھیں اور ریتیلے ساحل سے سمندر کے اندر تک چلی گئیں تھیں۔ ہم نے مشکل سے تعجب ظاہر کرنا بند کیا ہوگا کہ اچانک پہلے ہی جیسا ایک اور بادل ظاہر ہوا اور پہلے ہی کی طرح چند سیکنڈ میں غائب ہو گیا۔ یہ بادل بھی اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا جہاں پہلا نظر آیا تھا اور اس طرح یہ عجیب نظارہ جاری رہا۔

اب ہمیں یہ تو یقین آ چلا تھا کہ یہ بادل پانی سے ہی بن رہے ہیں لیکن بن کس طرح رہے ہیں اس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکے اس لیے ہم نے سوچا کہ اسے وہیں چل کر دیکھنا چاہیے۔ چند ہی منٹ میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ یہ مقام بڑا خراب سا اور پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ ہمیں وہاں سے سوکھے پیر گزرنے کی کوشش میں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ زمین

---

۱ انگریزی کی ایک مشہور اور دلچسپ کہانی

ہیں جگہ جگہ سوراخ بھی تھے۔

ہم کھڑے بے چینی سے ان عجیب بادلوں کے ظاہر ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ہمیں اپنے قریب ہی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحہ پانی کا ایک گول بادل چٹانوں میں بنے ایک سوراخ سے نکل کر ہوا میں بلند ہو گیا۔ یہ ہمارے اتنے قریب سے گزرا تھا کہ اس نے ہمیں قریب قریب چھو ہی لیا تھا۔ اس سے پہلے ہم اچھل کر ایک طرف ہوتے اس کے پانی نے واپس آکر ہمیں شرابور کر دیا۔ پیٹرکن جو ذرا دور کھڑا تھا اور جس پر بس چند ہی چھینٹیں پڑ سکیں، ہماری یہ حالت دیکھ کر مارے ہنسی کے بے قابو ہو گیا۔

"ذرا بچنا" وہ ہنستے ہنستے اچانک چیخا "یہ چلا دوسرا" اور اس سے پہلے کہ ہم چونک کر اس کے الفاظ پر عمل کرتے دوسرا بادل ایک اور سوراخ سے نکلا اور پہلے ہی کی طرح اس نے ہمیں ایک بار اور بھگو دیا۔ پیٹرکن مارے خوشی کے چلانے لگا لیکن اسے جلد ہی چپ ہو جانا پڑا کیونکہ اس کے قریب بھی ویسی ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"پتہ نہیں اب یہ کم بخت کدھر سے نکلے گا" وہ کچھ پریشان سا ہو کر بولا اور بھاگنے کو تیار ہو گیا۔

اچانک ایک زوردار آواز آئی، پانی کا ایک بہت بڑا بادل پیٹرکن کی ٹانگوں کے درمیان پھٹا، اس کے زور نے پیٹرکن کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ ہوا میں تھوڑا بلند ہوا اور پھر دھڑام سے زمین پر گرا۔ اتنی زور سے گرا تھا کہ ہمیں خوف ہوا کہ کہیں اس کی ایک آدھ ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ بے چین ہو کر اس کی طرف دوڑے لیکن خوش قسمتی سے وہ ایک جھاڑی میں گرا تھا اور اب اس میں لمبا لمبا لیٹا تھا۔

اب ہنسنے کی ہماری باری تھی لیکن ہمیں ابھی تک یہ یقین نہ تھا کہ وہ اس "حادثہ" میں زخمی نہیں ہوا ہے۔ ادھر ہمیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ اگلا بادل کب اور کہاں سے نکلے گا اس لیے ہم نے پیٹرکن کو سہارا دے کر جلدی سے اٹھایا اور گرتے پڑتے وہاں سے دور بھاگے۔

"اب کیا کیا جائے؟" پیٹرکن نے منہ بنا کر بڑی سنجیدہ آواز میں پوچھا۔

"بس آگ جلا کر اپنے کپڑے سکھائے جائیں ننھے میاں" جیک نے بڑے پیارے جواب دیا۔

"اور یہ رہا آگ جلانے کا سامان" میں نے چلتے چلتے ایک درخت کے نیچے پڑی ایک خشک شاخ اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس کے ایک گھنٹہ بعد ہمارے کپڑے سوکھ چکے تھے۔ ابھی وہ آگ کے سامنے لٹکے ہی ہوئے تھے کہ ہم دوبارہ ساحل کی طرف چل دیے۔

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بادل کسی بڑی موج کے گرنے کے فوراً بعد ہی بنتے تھے اس سے پہلے نہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ بادل اسی وقت بنتے تھے جب موج بہت بڑی ہو۔

اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان چٹانوں میں اندر ہی اندر کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں یہ بڑی بڑی موجیں اپنے زور میں پانی دھکیل دیتی ہوں گی اور یہ پانی نکاسی کا کوئی اور راستہ نہ پا کر ان سوراخوں کے ذریعہ زور لگا کر بادل کی شکل میں باہر نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان عجیب بادلوں کے اس طرح نکلنے کی کوئی اور وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ سامنے کی اور سیدھی سادی وجہ وہی ہو سکتی تھی جو ہم نے سوچی تھی۔

"رالف۔ ذرا دیکھنا تو۔ یہ پانی میں کیا چیز ہے؟ شارک تو نہیں؟" ہم وہاں سے چلنے ہی والے تھے کہ اچانک

جیک نے مجھ سے کہا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا سمندر پر جھکی اس چٹان پر پہنچا جہاں سے جیک جھک کر سمندر میں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی جھک گیا۔ ایک سبزی مائل زرد سی چیز نظر آئی جو ہلکے ہلکے حرکت کر رہی تھی۔

"یہ تو کسی قسم کی مچھلی لگتی ہے،" میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ارے پیٹرکن!" جیک چلایا "ذرا بھالا تو لانا یہاں اس کا کام ہے۔"

لیکن جب ہم نے بھالے سے اس عجیب شے تک پہنچنا چاہا تو بھالا اس کام کے لیے بہت چھوٹا ثابت ہوا۔

"دیکھا!" پیٹرکن بولا "تم دونوں تو مجھ سے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ یہ بھالا ضرورت سے زیادہ لمبا ہے۔"

جیک نے زور لگا کر بھالے کو اس عجیب چیز کی طرف پھینکا۔ حالانکہ نشانہ صحیح لگا تھا۔ مگر پھر بھی چوک گیا۔ کیونکہ جب بھالے کا دستہ دوبارہ ابھرا تو ہم نے دیکھا کہ وہ سبزی مائل زرد شے ٹھیک اسی جگہ موجود تھی۔ اور ہلکے ہلکے اپنی دم ہلا رہی تھی۔

"بڑی عجیب بات ہے!" جیک سر ہلا کر بولا۔

اور بات واقعی بڑی عجیب تھی کیوں کہ ہم تینوں نے باری باری سے بھالا لے کر اس عجیب چیز کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن نشانہ بنانا تو درکنار ہم اسے جگہ سے ہٹا تک نہ سکے۔ مجبوراً ہمیں ہار کر یہ معلوم کیے بغیر کہ یہ عجیب چیز کیا ہے، اپنے سفر پھر روانہ ہونا پڑا۔ لیکن وہ "عجوبہ" میرے ذہن پر اس بری طرح سوار ہو گیا تھا کہ میں لبقیہ سفر میں مستقل اسی کے بارے میں سوچتا رہا کہ آخر وہ چیز تھی کیا۔ آخر میں مجھے اپنے ذہن کو یہ تسلی دے کر مطمئن کرنا پڑا کہ میں کسی وقت پھر وہاں پہنچ کر اسے دیکھوں گا۔

(باقی آئندہ)

جناب فرحت قمر

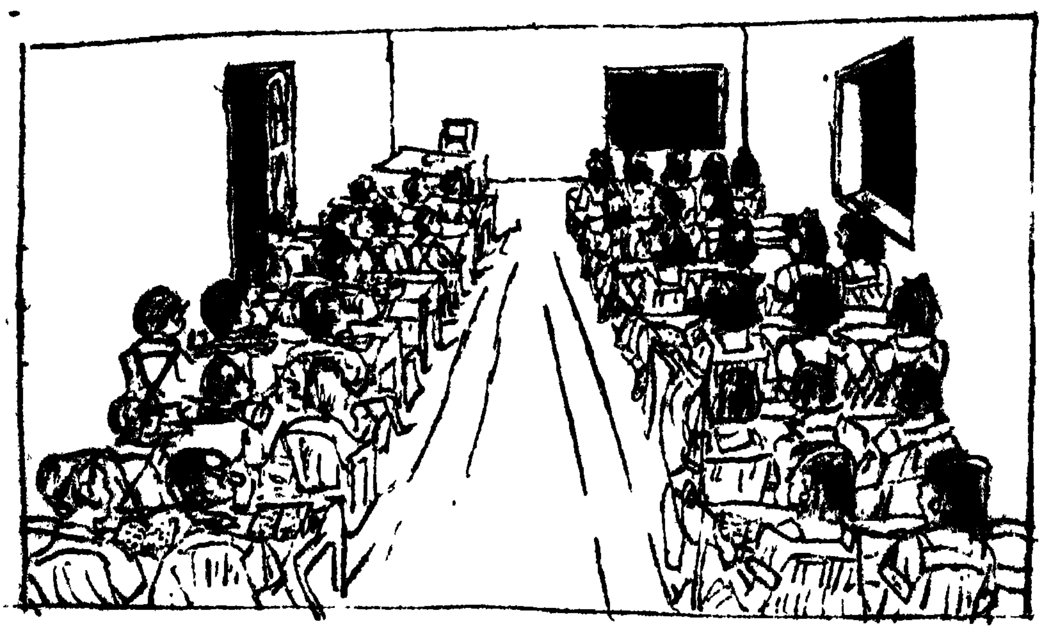
چندا ماما سے سوال

چندا ماما چندا ماما! تو ہے ہم سے دُور
پھر بھی ہم پر برساتا ہے اپنا اُجلا نور
دھول، دھواں، ہنگامہ، شورش جنگوں کے طوفان
تلواریں، بارود، دھماکے، موت کے یہ سامان
بیماری، بیکاری، غربت، زخمِ دل کے چاک
تیری دھرتی ان ساری باتوں سے بالکل پاک
لیکن جب انسان زمیں کا تیرے گھر آئے گا
کیا تو بھی اپنی دُنیا میں اس جیسا بن جائے گا؟

مانٹریال کی بھولی بسری یادیں

امتحان

ڈاکٹر مشیرالحق



اپنے ملک میں اسکولوں اور کالجوں میں سالانہ امتحان ایک مجوبہ ہو گئے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب خبریں نہ آتی ہوں کہ لڑکوں نے ہال کی نگرانی کرنے والے استادوں پر حملہ کیا یا کالج کے پرنسپل کا گھراؤ کیا، یا استاد خود اپنی حفاظت کی خاطر پستول اور بندوق کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔

اخباروں میں جب اس قسم کی خبریں نظر سے گذرتی ہیں تو میکگل یونیورسٹی، مانٹریال (کناڈا) میں گذارے اپنے طالب علمی کے دن یاد آنے لگتے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں جب میں میکگل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تو میں امتحان کے صرف اس ایک طریقے سے واقف تھا جس سے اپنے ملک میں بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ وہی طریقہ یہاں آج تک رائج ہے گو امتحان کے کمرے کی فضا اب پہلی سی نہیں رہ گئی ہے۔ بہرحال میں انسٹی ٹیوٹ میں امتحان کی بات کر رہا تھا۔

امتحان کے دن کلاس کے تمام لڑکے ایک ہی کمرے میں ایک بڑی سی میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ ہم سب

ایک دوسرے کے اتنے قریب بیٹھے تھے کہ بلا اختیار نظر اٹھ جانے پر دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ساتھیوں کی کاپیوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں اس انتظار میں خاموش بیٹھا تھا کہ اب پروفیسر صاحب آکر ہم لوگوں کو الگ الگ بٹھا دیں گے۔ لیکن ان کا دور نزدیک کہیں پتہ نہ تھا۔

امتحان شروع ہونے کا وقت آیا تو انسٹی ٹیوٹ کی لڑکی (جسے وہاں کی اصطلاح میں آفس سکریٹری کہا جاتا ہے) امتحان کے پرچے بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ خاموشی سے ہر ایک کے سامنے ایک ایک پرچہ رکھ کر بولی: "اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں کوئی ضرورت ہو تو بلا تکلف بلا لیجیے گا۔ ویسے میں ½ گھنٹہ بعد آپ لوگوں کے لیے کافی لے کر آؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی، اور ساتھیوں نے جواب لکھنے شروع کیے اور بغیر بتائے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا کہ ہم لوگوں کی نشست میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے والی ہے۔ چند منٹ تک تو میں یہ سمجھتا رہا کہ اب خوب دھڑلے سے نقل بازی ہوگی لیکن کمرے میں ایسی خاموشی طاری تھی گویا سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ایک دوسرے سے پوچھنا تو درکنار، نظریں بھی دائیں بائیں نہیں گھوم رہی تھیں۔ میرے لیے تو حیرت کی بات تھی کہ کسی نگراں کے بغیر امتحان ہو رہا ہے۔

لڑکوں کی نشست کچھ اس طرح تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی نقل کرنے کا امکان تھا پھر بھی کمرے کی فضا کچھ ایسی تھی کہ شاید ہم میں سے ہر شخص اپنے کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

دوسرا اچنبھا اس وقت ہوا جب میں نے امتحان کے پرچے کو بغور پڑھا۔ اوپر دائیں کونے پر واضح الفاظ میں ممتحن اور نائب ممتحن کا نام چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی میرے لیے عجوبہ تھا۔ اب تک کا تجربہ تو یہ تھا کہ طالب علم سینکڑوں جتن کر کے امتحان لینے والوں کے نام معلوم کرتے تھے پھر ان کے پاس سفارشیں پہنچواتے تھے، اور یہاں خود انسٹی ٹیوٹ نے امتحان لینے والوں کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت تو میں یہ سمجھا کہ اب امتحان ختم ہونے کے بعد ان کے گھروں پر لڑکوں کی دوڑ دھوپ شروع ہو جائے گی۔ لیکن تجربے سے معلوم ہو گیا کہ اس معاملے میں ممتحن حضرات ایسا پتھر تھے جس میں جونک نہیں لگتی۔

ہر پرچے کے دو ممتحن ہوتے تھے ایک تو وہ استاد جو اس مضمون کو پڑھاتا تھا اور ایک انسٹی ٹیوٹ ہی کا کوئی دوسرا استاد۔ دونوں کے دونوں الگ الگ کاپیوں کی جانچ کرتے تھے۔ اور پھر ان دونوں کے دیے ہوئے نمبروں کو ملا کر اوسط نکال لیا جاتا تھا۔

ایک پرچے کو عموماً ڈھائی یا تین گھنٹے میں مکمل کرنا ہوتا تھا لیکن اس معاملے میں انسٹی ٹیوٹ کبھی بھی سختی نہیں کرتا تھا۔ وقت کے ختم ہو جانے پر آفس سکریٹری کاپیوں کو جمع کرنے کے لیے کمرے میں آتی تھی۔ جو لوگ جوابات مکمل کر چکے ہوتے ان کی کاپیاں تو وہ لے لیتی۔ لیکن جو لوگ لکھنے میں مشغول ہوتے تھے ان سے کبھی کاپیاں چھینتی نہیں تھی صرف یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی کہ آدھے یا پون گھنٹہ بعد وہ دفتر بند کر کے جانے والی ہے اس لیے براہ کرم اس کے جانے سے پہلے پہلے کاپیاں اس کے حوالے کر دیں۔

ایک امتحان میں تو مجھے یاد ہے کہ ایک فلسطینی لڑکا اپنے جواب دفتر بند ہونے کے وقت بھی مکمل نہ کر سکا تو سکریٹری یہ کہہ کر اپنے گھر چلی گئی کہ جب جواب مکمل ہو جائیں تو دروازے کے دفتر میں کاپیاں ڈال دینا۔

اس معاملے میں کوئی تخصیص نہ تھی بلکہ ہر لڑکے

کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوتا تھا۔ اس لیے کبھی کسی کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ کچھ لوگوں کو زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے استادوں کا خیال تھا کہ ایک گھنٹہ زیادہ لگا دینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ عین ممکن ہے کہ کسی طالب علم کو سب کچھ معلوم ہو لیکن اس کے سوچنے کی رفتار سست ہو۔ اس لیے اس سلسلے میں کوئی قانون نہ بنایا جائے بلکہ اسے انفرادی طور سے لڑکوں ہی پر چھوڑ دیا جائے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ لڑکے خود ہی کوشش کرتے تھے کہ تین گھنٹے کے اندر ہی اندر کاپیاں جمع کر کے گھر چلے جائیں۔

لڑکوں کی ذہانت اور دیانت پر بے پناہ بھروسا رکھنے کے سلسلے میں ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔

ابوزید عبدالرحمٰن سوڈان کا رہنے والا، بے تحاشا سونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ جس دن صبح ۹ بجے سے تاریخ کا امتحان تھا۔ اس دن وہ ہانپتا کانپتا ۱۱ بجے انسٹی ٹیوٹ پہنچا تقریباً سب ہی لڑکے امتحان کی کاپیاں دفتر میں جمع کر کے گھر جا چکے تھے شاید ایک یا دو لڑکے آخری سوال کا جواب لکھ رہے تھے۔ اس نے جب سکریٹری سے جا کر آنکھ نہ کھلنے کا عذر پیش کیا تو وہ بڑے زوروں سے ہنسی اور امتحان کا پرچہ دے کر بولی: "چلیے کوئی بات نہیں آپ صرف ڈھائی گھنٹہ تاخیر سے آئے ہیں۔ اگر کہیں ڈھائی دن کی تاخیر ہو جاتی تب کیا ہوتا! یہ لیجیے پرچہ اور اب میرے کمرے میں بیٹھ کر جواب لکھنے شروع کر دیجیے تاکہ مجھے بار بار اٹھ کر آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے دوسرے کمرے میں نہ جانا پڑے"

آفس سکریٹری کے منہ سے ڈھائی گھنٹے اور ڈھائی دن کی بات نہ جانے کس گھڑی سے نکلی تھی کہ اگلے امتحان میں ایک طالب علم سچ مچ ڈھائی دن کی تاخیر سے پہنچا۔ اور عذر صرف یہ کہ اسے یہی تاریخ یاد تھی۔ یہ طالب علم خود بھی ایک عجوبہ تھا۔ جنوبی امریکہ کی ریاست کیلفورنیا سے آیا تھا، ہربیرو ویسوتو نام تھا اور اپنے ملک کی وزارتِ قانون میں کسی اچھے عہدہ پر فائز تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے خاص طور سے قانونِ اسلام کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بے چارہ ہر سال کسی نہ کسی مضمون میں فیل ہو جاتا تھا۔ انفرادی طور سے کوئی بھی مضمون ایسا نہ تھا جس میں وہ پاس نہ ہوا ہو لیکن ۵، ۶ سال کے دوران قیام میں بھی وہ تمام مضامین میں بیک وقت پاس نہ ہو سکا۔ معاملہ بہرحال گمبھیر تھا۔ ساتھیوں کی کونسل بیٹھی اور یہ طے ہوا کہ سکریٹری سے بات کی جائے دیکھیں وہ کیا ترکیب بتاتی ہے۔ سکریٹری سے گفتگو کی گئی تو اس نے کہا کہ پروفیسر کے پاس سب کاپیاں جا چکی ہیں اس لیے اب ان کے علم میں لائے بغیر وہ کچھ کرنے سے معذور رہے۔ پروفیسر صاحب گھر جا چکے تھے اس نے فون پر رابطہ قائم کر کے صورتِ حال سے انھیں مطلع کیا ہربیرو ویسوتو کا نام سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور سکریٹری سے کہا کہ ہربیر کو پرچہ دے دیا جائے اگر وہ ایک سال میں تیار نہ ہو سکے ہوں گے تو پرچہ دیکھ لینے کے بعد بھی ڈھائی دن میں تیاری نہیں کر سکتے۔ ان کی پیشین گوئی صحیح نکلی، ویسوتو اس پرچے میں پاس نہ ہو سکے۔

دن اسی طرح گذرتے رہے۔ چند ہی برسوں میں امتحان کا ہوّا دل سے نکل گیا۔ کہ اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ اور انسٹی ٹیوٹ کے امتحان ہال میں بھی ایک نگراں کی ڈیوٹی لگنے لگی۔ یہ اپنے ہاتھ میں گھڑی لے کر بیٹھنے لگا اور وقت ختم ہو جانے کے بعد ہاتھوں سے کاپیاں چھیننے لگا۔ یہ تبدیلی ایک ہندوستانی طالب علم کی وجہ سے آئی تھی۔

انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ امتحان ہال میں کوئی نگراں نہیں ہوتا تو انھوں نے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ساتھیوں کی کاپیوں میں تانک جھانک شروع کی۔

ان کی اس حرکت سے پریشان ہو کر لڑکے ان سے دور بیٹھنے لگے اور اڑتے اڑتے خبر ڈائرکٹر تک پہنچ گئی۔ ڈائرکٹر نے ان کو بلا کر فہمائش کی اور ان سے وعدہ لیا کہ اب وہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا اور اپنے وعدے کی لاج تو ضرور رکھی کہ پھر کسی ساتھی کی کاپی سے نقل کرنے کی حرکت نہیں کی لیکن اپنے ساتھ کتابیں لے کر جانے لگے اور ان سے نقل کرنے لگے۔ چونکہ امتحان ہال میں تقریباً سب ہی لڑکے اپنی اپنی کتابیں لے کر آتے تھے اور انھیں ایک طرف رکھ دیا کرتے تھے اس لیے ان حضرت کا کتابیں لانا کسی کو بھی عجیب نہ معلوم ہوا۔ چوری تو اس وقت کھلی جب عربی کے استاد کو یہ اندازہ ہوا کہ ان کے تمام جوابات کتاب سے لفظ بلفظ مل رہے ہیں۔ اس وقت اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس لیے پہلے تو انہیں خاموشی سے اپنے کمرے میں بلایا اور ان سے یہ کہا کہ انھوں نے چونکہ سب جوابات نقل کیے ہیں، اس لیے وہ ان کی کاپی کو نہیں جانچیں گے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھ کر دوسرا پرچہ حل کریں۔ پہلے تو انھوں نے کچھ حیل حجت کی لیکن پھر راضی ہو گئے کہ اس امتحان پرچے کو استاد کے سامنے بیٹھ کر وہ حل کر دیں گے لیکن استاد کا اصرار یہ تھا کہ وہ دوسرا پرچہ بنائے گا اور انھیں نیا پرچہ حل کرنا پڑے گا۔ اس بات پر وہ کبھی بھی راضی نہ ہو سکتے تھے۔ انھیں اپنے علم کا اندازہ تھا۔

آخرکار وہ استاد پر یہ الزام لگا کر اس کے کمرہ سے باہر آ گئے کہ وہ ان کے ساتھ تعصب برت رہا ہے۔ استاد نے پورا معاملہ ڈائرکٹر کے سامنے رکھ دیا۔ ڈائرکٹر نے ان کے جوابات کو کتاب سے ملا کر دیکھا تو دونوں میں بال برابر فرق نہ تھا۔ انھیں یقین تو ہو گیا کہ طالب علم نے نقل کی ہے۔ لیکن نقل کرنے والے صاحب کا اصرار تھا کہ انھوں نے نقل نہیں کی۔ کتاب سے لفظ بلفظ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ یہی تو نصاب کی کتاب تھی جسے انھوں نے زبانی پورا کا پورا رٹ ڈالا تھا۔ نیا امتحان دینے پر وہ اس لیے راضی نہیں تھے کہ اسے وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کو چاہیے تھا کہ صحیح جواب دینے پر ان کی ہمت افزائی کرتا نہ کہ ان پر چوری کا الزام لگایا جائے۔ معاملہ کچھ اتنا پیچیدہ ہو گیا تھا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے کہ جلد ہی ان کی دوسری چوری نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔

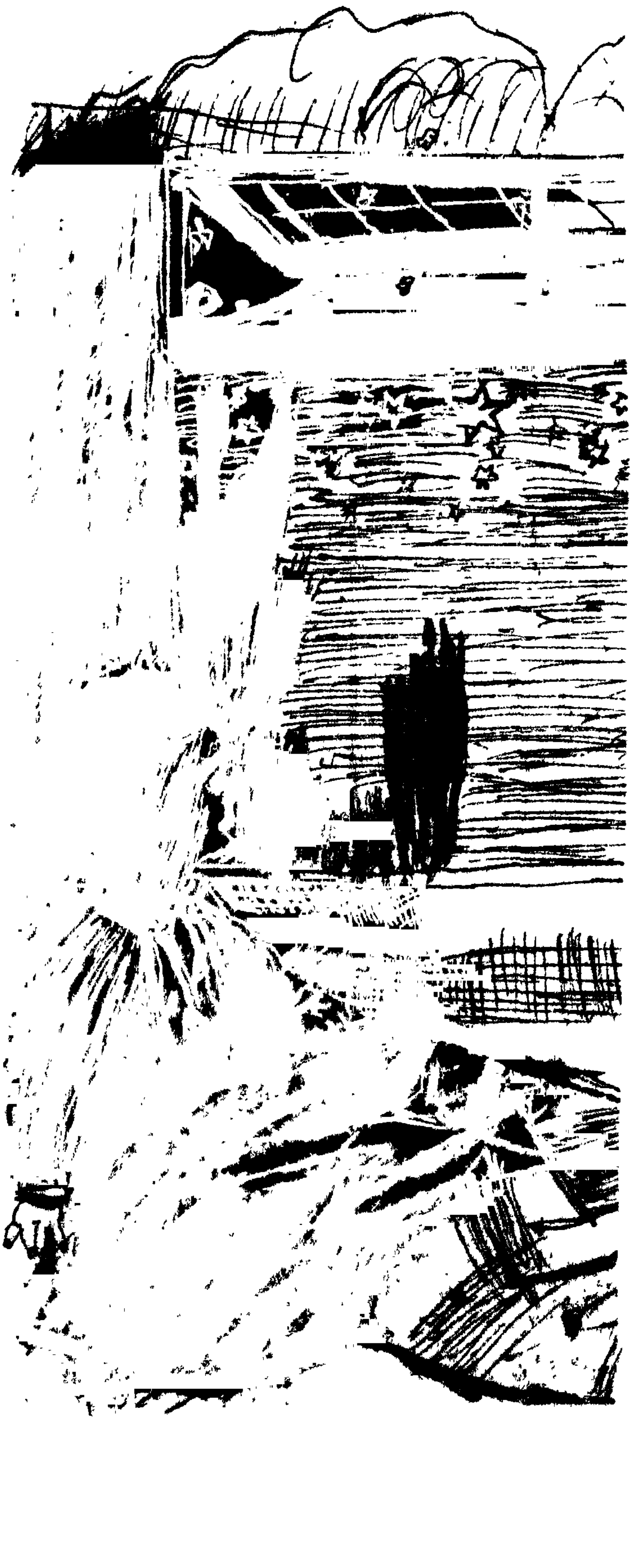
دوسرا پرچہ خود ڈائرکٹر کا تھا اس میں ان حضرت نے انسائی کلوپیڈیا آف اسلام سے تقریباً ½ صفحہ لفظ بلفظ نقل کر کے رکھ دیا تھا۔ عربی کے پرچے کا جھگڑا چل رہا تھا کہ ڈائرکٹر نے اپنے پرچے کو جانچنا شروع کیا۔ جب اس نے ان کی کاپی دیکھی تو اب اسے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے انھیں اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ وہ انسائی کلوپیڈیا کا وہ نصف صفحہ جو انھوں نے اپنے پرچہ میں نقل کیا ہے اسے زبانی سنائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ شروع میں تو انھوں نے بہت غرفش کیا کہ ڈاکٹر صاحب عربی کے استاد کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن دو دو واقعات کے بعد انسٹی ٹیوٹ میں کوئی استاد یا طالب علم ایسا باقی نہیں رہ گیا تھا جو ان کی باتوں پر کان دھرتا۔

بہرحال اس پورے جھنجھٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈائرکٹر نے اسی وقت ان کا نام انسٹی ٹیوٹ سے کاٹ دیا۔ بہت رونے دھونے اور سفارشیں پہنچانے کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ ڈائرکٹر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ انھیں ایک ایسا سارٹیفکٹ دے دیں گے جس میں یہ لکھا ہوگا کہ انھوں نے ایک سال تک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ امتحان کا کوئی تذکرہ نہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈائرکٹر نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ اگر کسی درسگاہ نے انسٹی ٹیوٹ سے پوچھا

باقی صـ۳۳ پر

راج نرائن راز

سچا سپنا



صبح سویرے جب امی جی بابر کو جگانے آئیں تو وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا:

"وہ چھوٹے گیند جیسا کُرہ اور وہ ـــــ وہ پیلا سا تارا۔"

امی جی بولیں: "میاں اٹھو بھی۔ یہ کس پیلے تارے کی باتیں کر رہے ہو؟"

بابر نے آنکھیں کھول دیں ـــ لیکن وہ حیران اور کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔

ابا جی نے پوچھا: "میاں، کیسا پیلا تارا دیکھا ہے تم نے؟"

بابر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔" اوہو! یہ بات ہے! میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ نیلو، میں اور آفاق خلا میں اونچے بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔ وہاں

بہت سارے تارے ہیں۔ ہم نے دیکھا۔ چھوٹے گیند جیسا ایک کُرہ ہے۔ ایک پیلا سا تارا ہے۔ وہ گیند جیسا کُرہ ایک دائرے میں اُس کے گرد گھوم رہا ہے۔ اور بھی بے شمار ننھے منھے تارے ہیں۔"

ابا جی بولے: "اچھا اچھا! تو بابر میاں خواب میں خلا کی سیر کر رہے تھے۔ خوب۔ لیکن میاں پتہ ہے، وہ چھوٹے گیند جیسا کُرہ ہے کیا؟ وہ ہماری زمین ہے۔ اور وہ پیلا سا تارا سورج ہے۔ اور یہ کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن بات بس یہیں تو ختم نہیں ہوتی۔ خیر۔ تم اٹھو۔ نہا دھو لو۔ پھر میں تمھیں تاروں اور سیاروں کے بارے میں کچھ باتیں اور بتاؤں گا۔"

بابر جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ لپک کر ضروریات سے فارغ ہوا۔ دانت صاف کیے۔ پھر نہایا۔ اور کپڑے بدل کر فوراً ناشتے کی میز پر آ بیٹھا۔ ناشتہ کر چکا تو ابّا کے اردگرد گھومنے لگا۔ وہ تاروں اور سیّاروں کے بارے میں باتیں جاننے کے لیے بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ اُسے ابا جی کے آگے پیچھے ہوتے دیکھ کر نیلو نے بھی اسکول کا کام چھوڑ دیا۔ ننھا آفاق بھی اُچھلتا کودتا اُن کے ساتھ آ ملا۔ وہ دونوں جان گئے تھے: ابا جی کوئی خاص بات بتانے والے ہیں۔

بچّوں کو اس طرح آس پاس دیکھ کر وہ ان کی بے چینی کا سبب بھانپ گئے۔ بولے: "آؤ بچّو، آؤ! مجھے یاد ہے: میں نے تمھیں زمین سورج وغیرہ کے بارے میں بعض باتیں بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ لو سنو!"

"بابر تم نے خواب میں خلا کی سیر کرتے ہوئے چھوٹے گیند جیسا جو کُرہ دیکھا، وہ ہماری زمین ہے۔ اور جیسا کہ میں نے تمھیں صبح بتایا تھا: وہ چھوٹا سا پیلا تارا سورج ہے۔ وہ خلا میں اونچائی سے گیند جتنا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہ ہے بہت بڑا۔ سوچو تو ہماری زمین کتنی بڑی ہے۔ کتنا بڑا اس کا قطر ہے۔ لیکن شاید تمھیں یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ سورج کا قطر ہماری زمین کے قطر سے ۹۰ گنا زیادہ ہے۔ یہ آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار چھ سو میل ہے۔ ہماری زمین ایک سیّارہ ہے۔"

بابر نے سوال کیا: "ابا جی سیّارہ کیا ہوتا ہے؟"

ابّا جی نے جواب دیا: "سورج کے گرد گھومنے والے بڑے جرم فلکی کو سیّارہ کہتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی سیّارہ سورج سے بڑا نہیں۔ زمین کی طرح دوسرے سارے سیّارے بھی سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔"

نیلو کسی سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک بول اُٹھی۔ "دوسرے اور کتنے سیّارے ہیں۔؟"

ابا جی بولے: "زمین کے علاوہ آٹھ اور بڑے سیّارے ہیں۔"

ایکا ایکی آفاق اپنی توتلی زبان میں بول اٹھا: "ابا جی، ان کے نام بتلائیے۔"

ابا جی نے جواب دیا: "یہ عُطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زُحل، یورے نس، نپ چُون اور پلوٹو ہیں۔ یہ سیارے سورج سے مختلف دوریوں پر واقع ہیں۔ سورج کے سب سے قریب واقع سیارہ عطارد ہے اور سب سے دور پلوٹو ہے۔"

ابا جی کو خاموش پاکر بابر نے پوچھا: "ابا جی کیا ایسے سیارے بھی ہیں جو ان بڑے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں؟"

ابا جی نے جواب دیا: "ہاں۔ ایسے سیارے بھی ہیں۔ اِن سیاروں کو سٹیلائٹس یعنی ثانوی سیارے کہتے ہیں۔ زمین سے زیادہ بڑے جتنے سیارے ہیں، ان کے آگے ثانوی سیّارے ہیں۔ زیادہ تر ثانوی سیارے اسی سمت میں اپنے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں، جس سمت ان کے سیارے

سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ لیکن مشتری اور زحل کے بعض ثانوی سیاروں کی بات کچھ انوکھی ہے۔ وہ الٹی گردش کرتے ہیں۔ سیاروں میں مشتری سب سے بڑا ہے۔ سب سے زیادہ ثانوی سیارے مشتری کے ہیں۔ ان کی تعداد بارہ ہے۔ زحل کے کل نو ثانوی سیارے ہیں۔ اسی طرح یورے نس کے پانچ، نپ چون کے دو، ارض یعنی زمین کا ایک اور مریخ کے دو ثانوی سیارے ہیں۔ عطارد، زہرہ اور پلوٹو ایسے سیارے ہیں جن کا کوئی ثانوی سیارہ نہیں۔ گویا اب تک کل ۳۱ ثانوی سیارے دریافت ہوئے ہیں۔ یہ پچھلے لاکھوں برسوں سے اپنے اپنے بڑے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ انہیں چاند بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ سورج کی روشنی نیچے کی طرف پھینکتے ہیں۔ سب سے چھوٹے چاند یعنی ثانوی سیارے مریخ کے ہیں۔

اس کے ثانوی سیارے فوبیس کا قطر دس میل سے کم ہے۔ مریخ جتنی رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد گھومتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ یہ مریخ کے گرد گھوم جاتا ہے۔ یہ اپنی ایک گردش ۷ گھنٹے اور ۳۹ منٹ میں پوری کر لیتا ہے۔

پتہ ہے! اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

تینوں بچے بے اختیار بول اٹھے: "کیا؟"

اباجی بولے: مریخ کا یہ ثانوی سیارہ ہمارے شمسی نظام کا ایک اکیلا چاند ہے جو مغرب میں نکلتا اور مشرق میں ڈوبتا ہے۔

ایک لمحہ چپ رہ کر اباجی بولے: "کیا تمھیں معلوم ہے، خلا میں مصنوعی یعنی انسان کے بنائے ہوئے سیارے بھی گردش کر رہے ہیں؟"

"مصنوعی، یعنی انسان کے بنائے ہوئے ثانوی سیارے؟"

تینوں بچے پلکیں جھپکاتے ہوئے ایک زبان ہو کر بول اٹھے۔

"ہاں" ۔ اباجی نے بتایا۔ "روسی سائنسدانوں نے ایسا پہلا مصنوعی سیارہ ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو خلا میں چھوڑا تھا۔ یہ زمین کے گرد گھومنے والا مصنوعی سیارہ ہے۔ روسی سائنسدانوں نے ایسا دوسرا مصنوعی سیارہ اسی برس تین نومبر کو چھوڑا۔ ان مصنوعی سیاروں کا نام اسپوتنک ہے۔ امریکی سائنسدانوں نے پہلا مصنوعی سیارہ فروری ۱۹۵۸ء میں خلا میں چھوڑا تھا۔"

یا برسے نہ رہا گیا۔ بولا: "مصنوعی سیارے کیوں چھوڑے جاتے ہیں؟"

"یہ بات ہوئی نا۔" اباجی بولے۔ پھر کہنے لگے سائنسی تحقیق کے کام میں مصنوعی سیاروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔

ان مصنوعی سیاروں سے زمین کی شکل، بہت اونچائی پر فضا کا درجۂ حرارت، سورج سے حاصل ہونے والی روشنی کی مقدار، بیرونی خلا سے آنے والی کائناتی شعاعوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہر مصنوعی سیارے میں چھوٹے چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگے ہوتے ہیں۔ مصنوعی سیاروں میں لگے آلے جو معلومات فراہم کرتے ہیں، وہ [illegible] ریڈیو ٹرانسمیٹروں کے ذریعے نیچے زمین پر موصول ہوتی ہیں۔ امریکہ نے بعض ایسے مصنوعی سیارے چھوڑے ہیں۔ جو اوپر سے بادلوں کی تصویریں لیتے اور زمین کو بھیجتے ہیں۔ یہ سیارے موسم کی پیش گوئی کے سلسلے میں بڑے مفید ثابت ہوئے ہیں۔"

تینوں بچوں کو حیران اور دم بخود دیکھ کر اباجی بولے

سائنسی تحقیق میں یہ مصنوعی ثانوی سیارے بڑے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی بدولت سب سے بڑا انقلاب رسل و رسائل اور پیغام رسانی میں آیا ہے۔ یہ مصنوعی ثانوی سیارے پیغام کو آگے پہنچانے والے میناروں کا کام دیتے ہیں۔ ایسے سیارے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پیغام یعنی سگنل کو، اس کی قوت میں اضافہ کیے بغیر آگے پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو سگنل کی قوت میں اضافہ کرکے اور پھر آگے پہنچاتے ہیں۔ ایسے مصنوعی ثانوی سیارے ٹیلی ویژن پروگراموں کو ریلے کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوئے ہیں۔

"وہ کیسے؟" تیلو نے پوچھا۔

اباجی بولے:- مثلاً ایک ایسا مصنوعی ثانوی سیارہ (TELSTAR) ہے۔

یہ امریکہ کے بیل ٹیلی فون سسٹم نے تیار کیا اور خلا میں چھوڑا تھا۔ اس کے خلا میں چھوڑے جانے کے بعد پندرہ گھنٹوں کے اندر اندر شمالی امریکہ میں پیش کیا جانے والا ٹیلی ویژن پروگرام یورپ کے ملکوں میں ٹیلی ویژن سیٹوں پر دیکھا جانے لگا تھا۔ یہ مصنوعی ثانوی سیارے قدرتی ثانوی سیاروں کے مقابلے میں چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹیل اسٹار ہی کو لو اس کا وزن کل ۱۷۰ پونڈ ہے۔ اس کا قطر ۳۴½ انچ ہے۔ ایسے دوسرے مصنوعی سیارے ریلے اوّل۔ سن کوم اور ارلی برڈ وغیرہ ہیں۔ سن کوم سوم کی بدولت ۱۹۶۴ء میں جاپان میں ہونے والے اولمپک کھیل امریکہ میں ٹیلی ویژن سیٹوں پر دیکھے گئے تھے۔ اسی طرح ارلی برڈ نے پہلی بار ۱۹۶۵ء امریکہ، یورپ اور ایشیا کے درمیان ٹیلی ویژن پروگرام ریلے کیے۔ اور ہاں، اگر ٹیل اسٹار اوّل یا ریلے اول جیسے پچاس مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑ دیے جائیں تو کسی بھی ملک میں ہونے والے ٹیلی ویژن پروگرام دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک دیکھے جا سکیں گے۔

اباجی نے انھیں بتایا کہ بھارت نے بھی ایک مصنوعی سیارہ تھمبا کے قریب آروی کے مقام سے چھوڑا تھا، یہ بحر ہند کے اوپر ۳۶۰۰۰ میل کی اونچائی پر ہے۔ چونکہ یہ مصنوعی سیارہ زمین کی رفتار سے گھومتا ہے، اس لیے ہمیشہ ایک ہی مقام پر دکھائی دیتا ہے۔

اباجی نے بتایا کہ ہماری سرکار رسل و رسائل کی ترقی کے لیے ایک زمینی اسٹیشن دہرہ دون کے قریب بنا رہی ہے۔ یہ اسٹیشن اگلے سال اپنا کام شروع کر دے گا۔ اس مرکز کی مدد سے پانچ ہزار دیہات میں ٹیلی ویژن کے پروگرام براہ راست دکھلانے کا تجربہ عمل میں لایا جائے گا۔

اباجی نے دیکھا: تینوں بچوں کی آنکھیں خلا میں کسی چیز کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ کسی سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ شاید سوچ رہے ہیں۔ کاش ایسے بہت سے مصنوعی سیارے خلا میں ہوتے۔ اور وہ میونخ اولمپک کے سارے کھیل اپنے گھر بیٹھے ہی دیکھ لیتے۔

بابر کی آنکھیں اب بھی خلا پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے سپنا ابھی ٹوٹا نہ ہو۔ جیسے خواب کی تعبیر دیکھنا ابھی باقی ہو۔

نیا سویرا

جناب محمد شفیع کلکتہ

نیا سویرا آیا بچو لے کر یہ پیغام!
دنیا والو! نفرت سے اب نہیں چلے گا کام

نفرت پیدا کرنے والی باتوں کو تم چھوڑو
کیا ہندو کیا مسلم سب سے پیار کا رشتہ جوڑو

رہو ہمیشہ سب سے مل کے سب کو کرو سلام
نیا سویرا آیا بچو لے کر یہ پیغام

کبھی نہ ادنیٰ کسی کو سمجھو اور نہ کسی کو اعلیٰ
سب سے پیار بڑھاؤ تم وہ گورا ہو یا کالا

سبھی تو رب کے بندے ہیں کیا آقا اور غلام
نیا سویرا آیا بچو لے کر یہ پیغام

کر دے گا برباد کسی دن اونچ نیچ کا یہ چکر
کبھی ترقی کر نہ سکو گے بھید بھاؤ میں پھنس کر

اچھا ہے جو دو سب کو الفت کا چھلکتا جام
نیا سویرا آیا بچو لے کر یہ پیغام

کہانی ایک ماڈرن دیو کی

فرحت قمر

پرانے زمانے کے دیوؤں کے خاندان کا ایک بچا کھچا دیو ایک گھنے جنگل میں رہتا تھا۔ وہ جنگل کے کٹنے سے پریشان ہونے لگا۔ جانتا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ملے گی اور نئے زمانے کا انسان اسے دیکھ پائے گا تو زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس جنگل کو چھوڑ کر بھی وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے اِس آبائی وطن سے بہت محبت تھی۔

وہ زمانہ تو ہزاروں سال پرانا ہو چکا جب آدمی دیوؤں سے ڈرتا تھا اور پریاں ان دیوؤں کی خدمت کرتی تھیں۔ دیو اگرچہ جنگل میں رہتا تھا پر اس نے بدلتے زمانے کو بہت دیکھا تھا۔ سمجھا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ بھی اپنے کو نئے زمانے کے نئے سانچوں میں ڈھالے۔

اس سلسلے میں اسے ایک آدمی کی مدد کی ضرورت تھی اور آدمی ایک دن اس کو مل گیا۔ یوں تو جنگل میں جو آدمی اس سے پہلے اس دیو کے ہاتھ لگا تھا اس نے اسے ہڑپ کر لیا تھا۔

لیکن یہ آدمی کھائے جانے کے لیے نہیں تھا دیو اس کو اپنا استاد بنانا چاہتا تھا پر اس بے چارے آدمی کو کیا پتہ تھا! وہ تو دیو کے غار میں دیو کے سامنے بیٹھا سر سے پیر تک کانپ رہا تھا اور پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے دیو کے سوالوں کا جواب دیا۔

دیو کو جب پتہ لگا کہ وہ بھی دنیا میں اکیلا ہے اور نوکری کی تلاش میں ہے تو بہت خوش ہوا کیونکہ آدمی پڑھا لکھا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔

"بھئی تم اپنے ہم جنس آدمیوں سے گھبرا کر وطن چھوڑ کر نکلے ہو۔ اگر میں تم کو اپنے یہاں ملازمت دے دوں تو..؟" دیو نے کہا۔

وہ آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ بھلا دیو کا وہ کیا کام کر پائے گا۔ وہ حیران ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انکار کر کے ملے گا بھی کیا۔ دیو کو غصہ آ گیا تو وہ مجھے باہر جانے ہی کب دے گا۔ دیو نے اس کو خاموش دیکھ کر پھر کہنا شروع کیا۔

"تم حیران ہو رہے ہو نا! دیکھو اس کونے میں پرانے زمانے کے سونے چاندی کے سکوں کا ڈھیر! اگر تم مجھے تھوڑا پڑھنا سکھاؤ تو پھر اسی دولت سے ہم دونوں کام شروع

کردیں گے۔

آدمی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دولت کے انبار ڈھیر کو دیکھا اور پھر دیو کو۔ اس نے سوچا دیو بھی کوئی برا نہیں اور سودا بھی ٹھیک ہے، تو بس اس نے ہاں کر دی۔

دیو کو چونکہ پڑھنے کی خواہش تھی اس لیے وہ بہت جلد لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔ اسے دنیا اور دنیا والوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں پر اس کا قد ۲۵ فٹ تھا وہ انسانوں کی دنیا میں آزادی کے ساتھ گھوم پھر تو نہیں سکتا تھا اس لیے اس آدمی کو بنایا اپنا حصہ دار اور سارا کام اس کو سونپ دیا۔ آدمی نے جنگل کے کنارے والی کالونی میں فیکٹری کی جگہ حاصل کی اور مشینوں، مزدوروں کے انتظام اور کچے مال کی فراہمی میں لگ گیا۔

فیکٹری بننا شروع ہوگئی اور اس کے احاطے میں ایک بنگلہ بھی۔ بنگلے کا صدر دروازہ عام بنگلوں کی طرح تھا لیکن درختوں کے جھرمٹ میں گھرا پچھلا دروازہ تھا ۱۹ فٹ اونچا۔ باہر سے ایسا لگتا تھا جیسے بنگلہ تین منزلہ ہے لیکن صدر دروازے کے پاس کے دو کمروں کو چھوڑ کر باقی بنگلے کی صرف ایک ہی چھت تھی — تیس فیٹ اونچی چھت آدمیوں کی سی رہائش گاہ رکھنے والا بنگلہ دراصل دیو کی رہائشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تھا۔

وہ آدمی یوں تو فیکٹری کا آدھا مالک تھا لیکن مزدوروں سے لے کر منیجر تک یہی جانتے تھے کہ وہی اکیلا مالک ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ وہی اکیلا اس بنگلے میں رہتا ہے۔ یوں اس آدمی نے اس دیو کا ایک نام رکھ دیا اور کمپنی ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس کے دستخط بھی کاروبار میں استعمال ہوتے تھے مگر نہ کوئی اس کو جانتا تھا نہ اس سے مل سکتا تھا۔

دیو اس نئی زندگی سے مطمئن تھا۔ اب اس کو انسان سے بچ کر اسے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں تھی۔ رہی گھومنے پھرنے کی بات تو وہ رات کی خاموشی اور تاریکی میں ہو جاتی تھی۔

جب سب چلے جاتے تو دیو پچھلے دروازے سے نکل کر دور دور تک گھومتا۔ چاندنی راتوں میں وہ اپنی فیکٹری کے احاطے کے اندر اندر ہی گھومتا آدمی کے ساتھ رہ کر اس نے آدمیوں کا سا کھانا کھانا سیکھ لیا تھا اور اس آدمی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈھیر سے کھانے کے ساتھ ساتھ ٹرک میں روز دو بکرے بھی آتے ہیں اور بنگلہ کے اندر غائب ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی فیکٹری کا کوئی مزدور یا جنگل میں گھومتا پھرتا کوئی آدمی بھی غائب ہو جاتا لیکن یہ بات دیو نے اپنے ساتھی سے بھی راز میں رکھی تھی کہ کبھی کبھی اسے آدمی کو کھانے کی پرانی عادت سے مجبور ہونا پڑتا ہے۔

موقع ملنے پر کسی آدمی کو پکڑ کر لانے کا کام پچھلے دروازے سے ہوتا تھا اور دیو چپ چاپ ہڈیوں کو فیکٹری کے چمنی میں ڈال دیتا تھا۔ دیو رات کو جاگتا تھا اور اس کا ساتھی آدمی

دن میں، اس لیے دیو کی اس حرکت کا پتہ اس کو نہیں لگ سکا تھا۔

بہت سے آدمیوں کے غائب ہو جانے کے سبب پولیس کو بھی پریشانی ہوئی اور سی آئی ڈی کو بھی! ادھر دیو کے ساتھی آدمی کو بھی شک ہوا کیونکہ زیادہ تر وہی آدمی غائب ہوتے تھے جو نیکر ی میں ہوں یا آس پاس اس نے دو راتیں جاگ کر دیو کے اس راز کا پتہ لگا لیا اور چپ چاپ یہ بات سی آئی ڈی افسر کو صفائی سے بتا دی حالانکہ وہ آدمی دیو کا وفادار ساتھی اور اچھا دوست تھا لیکن اپنے ہم جنسوں کے کھائے جانے کی بات سے اسے دیو سے ایک دم نفرت ہو گئی تھی۔

سی آئی ڈی کی رپورٹ ایس۔ پی صاحب کے سامنے تھی اور اس کے دو ساتھی اس سے گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ ان دونوں کا خیال تھا پولیس فورس سے اچانک حملہ کر کے دیو کو مشین گنوں سے بھون دیا جائے لیکن ایس۔ پی صاحب کے دماغ پر ایک اور ہی خیال ابھر رہا تھا انھوں نے کہا۔

"پولیس فورس تو دیو کو آناً فاناً میں ختم کر سکتی ہے لیکن بھئی دیو کو تو پرانے طریقے سے ہی مارنا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟" ان کے ایک ساتھی نے پوچھا

"یہی کہ کوئی ایک آدمی دیو کو مارے اور انعام حاصل کرے۔" ایس۔ پی صاحب بولے

"مشکل ہے آج کے آدمی اتنے بہادر کہاں" ایک پولیس افسر بولا "بیکار کئی لوگ مفت میں جان گنوائیں گے۔"

"دیو کو ایک دو گولیوں سے بھی مار کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ زخمی ہو کر وہ بپھر جائے گا اور پھر رائفل چلانے والے کا زندہ رہنا مشکل ہے" دوسرے نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ذرا تفریح ہی سہی" ایس پی صاحب نے کہا اور اخبار والوں کو بلا کر ساری بات بتا دی، اخبار والوں کو تو یہ شوشہ چاہیے تھا ہر ایک نے ایک عجیب و غریب کہانی شائع کی اور کسی ایک نے تو دیو کے فرضی فوٹو شائع کر کے اس کی پرائیویٹ زندگی کا حال بھی خود ہی لکھ دیا۔ بہرحال سب اخباروں میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ دیو کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے کو ایک ہزار روپیے نقد انعام اور پولیس کا ایک اونچا عہدہ سرکار کی طرف سے ملے گا۔

مگر کون مائی کا لال دیو کو مارتا؟

کئی لوگوں نے خفیہ طریقے سے کوشش کی مگر وہ دیو کے بنگلے کی سرحد تک ہی جا کر رہ گئے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ سوتے میں دیو پر حملہ کرے یا جاگتے میں! خود ایس پی صاحب بھی کئی طرح کی تیاری کر کے ایک رات گئے تھے مگر دیو کو مارنے کا کوئی محفوظ راستہ نہ دیکھ کر چپ چاپ واپس آ گئے تھے۔

اور ــــ ایک ہفتہ کے بعد ایس پی کے دفتر میں اعلانیہ طریقے سے ایک بہادر آیا۔ جانتا کون؟ ایک پندرہ سال لڑکا!

"تم — تم دیو کو، مارو گے؟" ایس۔ پی نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

"جی" لڑکے کا جواب مختصر تھا مگر اٹل ارادے کا مظہر! ایس پی صاحب نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی اور ہر پہلو بتانے کی بھی، مگر لڑکے نے "یہ سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑیے" کہہ کر بات ختم کر دی۔ لڑکے کے باپ کو پتہ تھا کہ اس کا بیٹا بہادر بھی ہے اور ہوشیار بھی۔ گو لڑکے نے اپنے منصوبے کے بارے میں ایس۔ پی کو بھی نہ بتایا تھا مگر اس کے باپ کو منصوبے کا پتہ تھا۔ وہ خود بھی بہادر باپ تھا اور اپنے بچے کے منصوبے سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے بہادر بیٹے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہی تھی اس لیے اس نے ایس۔ پی صاحب کو وہ لکھ کر دے دیا جو انہوں نے لکھایا۔

آخر وقت آ گیا۔ پولیس کو فیکٹری کے چاروں طرف سخت گھیرا ڈالنے کی تاکید تھی اور بنگلے کے سو گز دوری پر بھی — سو گز کے اندر نہ کسی پولیس والے کو جانا تھا نہ پبلک کے کسی آدمی کو۔

دیو کو پتہ تھا کہ وہ اب بچ نہیں سکتا نہ کہیں بھاگ سکتا ہے وہ مرنے کو تیار تھا، ہاں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ زندگی کی آخری صبح کا ناشتہ ضرور شاندار ہوگا۔ وہ کھانے کی میز پر اسی لیے بیٹھا تھا کہ وہ ملائم گوشت والا نوجوان اس کے بنگلے میں آئے وہ اتنا مطمئن تھا کہ اس نے کوئی احتیاطی تدبیر بھی نہیں کی تھی۔

لڑکا ایک ترکش اور ایک کمان لیے پولیس کے دائرے سے نکلتا ہوا بنگلے کے لان میں پہنچ چکا تھا اس کے ترکش میں آٹھ دس تیر تھے لیکن دو تیروں پر لوہے کی نوک کی بجائے کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیوں، صرف حیران ہونے کے علاوہ کوئی یہ بھی ابھی تک نہیں سوچ سکا تھا کہ آخر وہ لڑکا دیو کو مارے گا کیسے؟

لڑکے نے دیو کو باہر نہیں پایا تو وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ بنگلے کے اندر جانا تو خطرناک ہوگا اس نے سوچا اور پھر ترکش سے ایک تیر نکال کر اس نے بنگلہ کی کھڑکی کا ایک بڑا سا شیشہ چھناک سے توڑ دیا۔ وہ ایک اچھا نشانے باز تھا۔

دیو کا موڈ تو نہیں تھا کہ وہ باہر نکلے لیکن اب اسے تھوڑا سا غصہ آ گیا اور یہ سوچ کر باہر نکلا کہ لڑکے کو خود ہی مرنے کی کچھ جلدی ہے۔ دیو پچھلے دروازے سے آ کر کھڑا ہو گیا اور ادھر سے ادھر دیکھنے لگا۔ پچاس گز کے فاصلے پر لڑکا کھڑا تھا۔

"ہونہہ — کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ" دیو نے دل میں کہا اور آگے بڑھا — مگر ایک جلتا ہوا تیر دیو کے بڑے بڑے بالوں میں آگ لگا گیا اور پٹرول میں بھیگے دوسرے تیر سے اس کی ٹیری لین کی قمیص جل اٹھی۔ دیو سب کچھ سو چکا تھا۔

آگ بجھانے کے لیے اس کے ہاتھ پیر تیزی مصروف تھے اور وہ کتھاکلی سے لے کر بھارت ناٹیم اور راک اینڈ رول سے لے کر بنگو تو سد تک کے ڈانس کر رہا تھا۔ وہ بہادر لڑکا اپنی ہنسی دبائے تیر پہ تیر چلا رہا تھا۔ پبلک کی حیرا مسرت میں بدل چکی تھی۔ ہر تیر کے ساتھ پبلک

باقی صفحہ ۴۸ پر

گڈو

جناب محمد ارمغان ساحل سہسرامی

ننھا منا کتنا پیارا
گڈو میرا بھولا بھالا

باتیں اس کی پیاری پیاری
خوش ہے اس سے دنیا ساری
پیاری پیاری آنکھیں اس کی
ہیں شربت کے پیالوں جیسی
صبح سویرے وہ اٹھتا ہے
اور اٹھ کر لکھتا پڑھتا ہے
پھر وہ مکتب کو جاتا ہے
پڑھے سبق کو دہراتا ہے

ساحل کا یہ کہنا ہے
"گڈو" اچھا لڑکا ہے

کالا سانپ

سلمیٰ جاوید

واجد اشرف صاحب ابھی تھوڑے دن ہوئے جرمنی سے ڈاکٹریٹ کرکے اپنے قصبے میں لوٹے تھے وہ بہت پچھنے سے اپنے قصبے سے باہر رہے تھے۔ دبلا قد، سرخ و سفید جلد، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سر پہ لہراتے ہوئے بال سیر و شکار کے بے حد رسیا۔ جب سے گھر آئے تھے ایک چہل پہل سی رہتی تھی رات دن حویلی میں۔ دور اور نزدیک کے رشتہ دار اور پرانے بچھڑے ہوئے دوستوں کا خاصا سیلاب آگیا تھا اشرف منزل میں۔

اشرف منزل کے پچھم کی طرف انھی کے خاندان کے لوگوں کی ایک عظیم الشان حویلی تھی۔ یہ برسوں سے ویران پڑی تھی۔ اور اب جا بجا اس کے کھنڈر باقی رہ گئے تھے جس سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی تھی لیکن اس کھنڈر کا ایک حصہ تو سب سے زیادہ توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کے سب سے اونچے برج کے گرے ہوئے ایک حصے پر روزمرہ بڑی پابندی سے ایک کالا سانپ دیکھا جاتا تھا۔

گری ہوئی برجی پر لمبی سوکھی گھاس لرزتی رہتی اور اس کے درمیان کالا ناگ اپنا سر اٹھائے ہوئے سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے ہمیشہ دیکھتا رہتا۔ لوگ دیکھتے اور آپس میں ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کرتے۔

بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ ہم نے اس سانپ کو اپنے بچپن سے اس شکستہ برجی پر دیکھا ہے۔ روزانہ سورج نکلنے کے بعد یہ برجی پر آجاتا ہے اور جیسے جیسے سورج بلند اور پست ہوتا ہے اسی طرح سے یہ اس کی طرف نگاہ جمائے دیکھا کرتا ہے۔ البتہ بارش کے دنوں میں جب سورج بادلوں کی اوٹ میں آجاتا ہے، یہ سانپ بھی برجی پر نہیں دکھائی دیتا۔ محض کائی لگی ہوئی سیاہ اور بدرنگ سی برجی اور اس پر نکلنے والی گھاس کی کونپلیں آنکھ بند کیے پڑی رہتی ہیں۔

اور جیسے ہی بادل چھٹ جاتے ہیں، سورج کی کرن سیاہ بادل کے ٹکڑوں سے باہر نکلتی ہے کہ یہ سانپ بھی برجی پر دکھائی دینے لگتا ہے۔ بہت سی بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا کہ سانپ کے بھیس میں کوئی جنات ہے جس نے کھنڈر میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔

سب سے بڑی تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اس سانپ سے آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ گری ہوئی حویلی کے بہت بڑے قطعے میں خودرو درخت اور گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس حویلی سے ملا ہوا چھوٹا سا ایک جنگل کا سلسلہ چلا گیا تھا جس میں بڑے چھوٹے

قسم کے کانٹے والے اور بے کانٹے والے سیکڑوں درخت تھے۔ مگر کسی نے بھی اس قطعہ میں کوئی زہریلا جاندار نہیں دیکھا قصبے کی اتنی بڑی آبادی میں کوئی سانپ یا بچھو نہیں دیکھا گیا۔

واجد میاں اور ان کے کچھ ساتھی ہر صبح اور شام بڑی پابندی سے پچھم کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے جنگل کی طرف آتے اور اس سے آگے نکل کر اپنے فارم پر چلے جاتے۔ راستے میں بندوق سے کبھی کبھی کسی چڑیا کا شکار بھی کرتے۔

"دوستو! کسی دن یہ کالا سانپ بھی میری بندوق کی زد میں آجائے گا مجھے اس سے سخت خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ دیکھتے نہیں کس طرح آسمان کی طرف منہ اٹھائے سورج سے آنکھ لڑا رہا ہے۔ کتنا خطرناک نظر آرہا ہے۔ کیوں بھئی جمیل تمھارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟"

"واجد بھائی! ویسے میرا تو یہ کبھی اعتقاد نہیں رہا کہ یہ سانپ جن یا کوئی بھوت پریت ہے۔ مگر یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ آج تک اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے میں یہیں پل کر بڑھا ہوں یہیں جوان ہوا ہوں۔ ابھی کھنڈروں میں آنکھ مچولی بھی کھیلی ہے اور اس کے پاس والے میدان میں فٹ بال اور والی بال بھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی کو بھی اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے۔ جب اس سے آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تو کیا ضرورت ہے کہ ہم اس کو کوئی نقصان پہنچائیں؟"

"یہ بات کہ اس نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہمیشہ کے لیے کوئی ضمانت تو نہیں ہے کہ کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ تو سانپ ہے سانپ جب کبھی اس کو موقع مل جائے گا ڈسے بغیر نہیں رہے گا۔ اس کی فطرت ہی ہے انسان کو نقصان پہنچانے کی۔ کہیں فطرت بھی بدلی ہے کسی چیز کی؟" واجد اشرف صاحب دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

"ہاں آج تو میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس کالے سانپ کا اپنی اس سیاہ بندوق سے صفایا کر ہی دوں۔"

"بیٹے تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم ابھی بچے ہو۔ ابھی تم نے یہاں کے حالات کو اچھی طرح سے سمجھا کہاں ہے میں پندرہ برس کی عمر سے بیاہ کر اس کوٹھی میں آئی تھی آج میرا بچا سواں سال ہے میں نے آج تک اس سانپ سے کسی شخص کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھا۔ اور میری ساس جن کا سو سال کی عمر میں پچھلے سال انتقال ہوا ہے انھوں نے بھی کبھی اس سے کسی کو نقصان اٹھاتے نہیں دیکھا اللہ تم اپنی جوانی اور ہمارے بڑھاپے پر رحم کھاؤ اور اس سانپ کے بارے میں جو غلط فہمی تمھیں ہے اسے اپنے ذہن سے نکال دو۔ یہ اصول ہوا کہتا ہے کہ تم کو جس چیز سے کوئی نقصان نہ پہونچے تم بھی اسے نقصان نہ پہنچاؤ۔ میرے اچھے بیٹے! تم اس سانپ کو بالکل نہ چھیڑو۔"

واجد میاں کو سانپ کی حمایت کرنے والوں کی سبھی باتیں بوڑھوں کی بڑ اور دقیانوسی معلوم ہوئیں۔ یہ بات عقلمندی کے بالکل خلاف ہے کہ دشمن کو یوں چھوڑ دیا جائے کہ وہ بے خطر ہو کر جب چاہے نقصان پہنچاسکے ہیں نہیں میں آج ہی اس کا خاتمہ کردوں گا۔

واجد میاں اپنی بھری ہوئی رائفل لیے ہوئے شام کو جب آفتاب کی کرنیں مغرب کی طرف آسمان پر پھیلی ہوئی تھیں۔ غروب میں تھوڑا سا وقت باقی تھا ننھو گزکا ذنا...

باقی ص۳۸ پر

مصنف : ایم فرینک
مترجم : خلیق انجم اشرفی

جرمن کہانی

بھلکڑ بڑھیا

ایک قصبے کے ایک چھوٹے سے مکان میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ یوں تو وہ ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی لیکن اپنی چیزیں رکھ کر بھول جاتی تھی۔ انھیں ڈھونڈنے میں اُسے بہت اُلجھن اور پریشانی ہوتی۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اسے بھلکڑ بڑھیا کہتے تھے۔

کبھی وہ اپنی عینک چائے دانی میں رکھ دیتی اور پھر بھول جاتی کہ کہاں رکھی ہے۔ بھلکڑ جو ٹھہری۔ اب عینک کی ضرورت پڑتی تو سارا گھر کھنگالے دے رہی ہے اور عینک ہے کہ مل کر نہیں دیتی لیکن بڑھیا بھی دھن کی پکی تھی جب تک عینک ڈھونڈ نہ نکالتی چین سے نہ بیٹھتی اور یہ کوئی ایک روز کی بات نہ تھی۔ روز کا قصہ تھا۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کھو جاتا اور بھلکڑ بڑھیا سارا گھر تلپٹ کرتی پھرتی۔

ایک دن بھلکڑ بڑھیا نے بازار جانے کی سوچی عمدہ سا جوڑا نکال کر پہنا اور دروازے میں تالا لگا کر باہر نکلی۔ "اب چابی کہاں رکھ جاؤں؟" وہ سوچنے لگی۔

بے چاری کبھی ادھر رکھتی کبھی اُدھر۔ لیکن فیصلہ نہ کر پاتی کہ آخر اسے رکھے کہاں۔

"ٹھیک ہے" سوچتے سوچتے وہ خوش ہو کر بولی "میں اسے گملے میں رکھے جاتی ہوں"۔

یہ سوچ کر وہ اپنی کھٹارا موٹر گاڑی میں جا بیٹھی لیکن ایک دم خیال آیا۔ "لیکن مجھے یہ کیسے یاد رہے گا کہ میں نے کون سے گملے میں چابی رکھی ہے؟" یہ واقعی الجھن کی بات تھی۔ وہ بہت سوچ میں پڑ گئی۔

"میں گملا کسی دوسری جگہ رکھ دوں گی"۔ بہت سوچ بچار کے بعد بڑھیا نے گملا برآمدے میں پڑے لکڑی کے بکس میں رکھ دیا۔

"شاید میں بھول جاؤں کہ میں نے کون سے بکس میں گملا رکھا ہے"۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں رکھوں۔" بکس بہت بھاری تھا۔ لیکن جیسے تیسے کھینچ کر بھلکڑ بڑھیا اسے احاطے تک لے آئی

اصطبل کے دروازے کے پاس رکھ دیا۔ لیکن وہاں تو پہلے ہی کئی بکس رکھے تھے۔

"میں تو بالکل پہچان نہ پاؤں گی کہ ان میں کون سے بکسے میں چابی والا گملا ہے۔ کوئی دوسری جگہ دیکھتی ہوں" وہ بولی۔

اس نے بھاری بکس اٹھایا اور اصطبل میں کھڑی گھوڑا گاڑی کے پیچھے رکھ دیا۔ "میں پھر بھول جاؤں گی" وہ یہ سوچتی ہوئی موٹر کی طرف چل دی۔ "مجھے یہ کیسے یاد رہے گا کہ میں نے بکسا گھوڑا گاڑی کے پیچھے ہی رکھا تھا..... اوہ ٹھیک ہے۔ سب سے اچھا یہی رہے گا کہ میں گھوڑا گاڑی اپنے ساتھ ہی لے چلوں" یہ سوچ کر وہ دوڑی دوڑی اندر گئی اور لاکر گھوڑا گاڑی موٹر کے پیچھے باندھ دی۔ موٹر بہت پرانی اور چھوٹی تھی۔ وہ گھوڑا گاڑی کو نہ کھینچ سکی۔

"تب تو مجھے گھوڑا گاڑی ہی میں بازار جانا پڑے گا" یہ سوچ کر وہ موٹر گاڑی سے اتر آئی۔ لیکن اب دوسری الجھن نے آگھیرا۔

"گھوڑا گاڑی کے لیے گھوڑا چاہیے۔ اب گھوڑا کہاں سے لایا جائے؟"

وہ سوچنے لگی آخر اسے یاد آیا کہ پڑوسن کا گھوڑا شاید خالی ہو۔ وہ پڑوس میں گئی اور ان کا گھوڑا لاکر اپنی گھوڑا گاڑی کے آگے جوت دیا۔ لیکن گھوڑا بڑا اڑیل تھا اس نے ہنہنانا اور دانت نکوسنا شروع کر دیا۔ خیر کسی نہ کسی طرح بڑھیا نے اسے قابو میں کیا اور بازار کی طرف روانہ ہوئی۔

بازار کا راستہ خاصا لمبا تھا۔ جب وہ بازار کے نزدیک پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ڈھیروں لوگ سجے بنے بازار کی طرف جوق در جوق چلے جا رہے ہیں۔ بازار میں سجی دکانیں اور طرح طرح کے پنڈال لگے تھے اور وہ گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

"اب گھوڑے کو کہاں باندھوں؟" کھلکڑ بڑھیا سوچ میں پڑ گئی "مجھے یہ کیسے یاد رہے گا کہ میں اسے کہاں باندھ گئی تھی۔ یہاں تو بڑی بھیڑ ہے۔ کتنا شور ہے۔ اچھا یہی ہوگا کہ میں اسے گھر باندھ آؤں" کھلکڑ بڑھیا نے اپنی گھوڑا گاڑی گھر کی طرف موڑ لی۔

"میں اپنے جھمیلے سے گھر کی طرف لوٹ رہی ہوں" یہ سوچ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ بولی "باورچی خانہ کی کھڑکی سے باغیچے میں کھلے پھولوں کا نظارہ کرتے ہوئے گرم گرم کافی پینے میں کیسا مزا آئے گا!"

گھر پہنچ کر بڑھیا جلدی جلدی اصطبل میں گئی گھوڑے کو گائے کے نزدیک ہی باندھ کر اس کے آگے چارہ ڈالا، اصطبل کا دروازہ بند کیا اور گھر کی طرف چل پڑی۔

"میری چابی" بند تالا دیکھ کر کھلکڑ بڑھیا چلائی "میں چابی کہاں رکھ گئی تھی" اس نے ادھر ادھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ جب وہ تھک گئی تو اسے ایک دم یاد آیا کہ چابی تو وہ گملے میں رکھ گئی تھی۔

"گملا!" بڑھیا بولی "ہاں اب مجھے یاد آیا "مگر گملا میں نے کہاں رکھا ہے؟" پھر اسے یاد آیا کہ گملا اس نے لکڑی کے بکس میں رکھا تھا بکس بھی تو برآمدے میں نہیں تھا۔ پھر دماغ پر زور دینے پر اسے یاد آیا کہ بکس تو گھوڑا گاڑی میں رکھ کر لے گئی تھی۔

باقی ص ۳۸ پر

قالو بلا

ابو فکیہہ فکاہی

ایک دن پوچھا فکاہی سے کسی نے اے میاں　　جانتے ہو آج کل ہے کون سی چالو بلا
ہنس کے بولے ایک دو ہوں تو کہوں ہیں سیکڑوں　　گھر میں یوں بیوی بلا ہے جنگل میں جوں بھالو بلا
شہر میں لیڈر بلا تو مسجدوں میں شیخ جی　　جیسے کتا یار کی گلیوں میں ہے پالو بلا
چل رہے ہوں دونوں نافے مسلسل ان دنوں　　بن بلائے دھم سے آجائیں اگر خالو بلا
جیب خالی ہو تو پھر بیوی کی فرمائش عذاب　　جیسے راہی کے لیے صحرا میں ہے بالو بلا
ایک ہی لولو بلا تھا جب تھے ہم بیٹے، مگر　　اب ہوئے ہم باپ تو ہیں سیکڑوں لالو بلا
ہے غنیمت مفلسی میں پیٹ بھرنے کے لیے　　ورنہ دسترخوان پر ہے روز کا آلو بلا

سب سہی لیکن فکاہی یہ بلائیں کچھ نہیں
سچ اگر پوچھو تو ہے بس ایک ہی "قالو بلا"


भारत छोड़ो
QUIT INDIA
भारत छोड़ो

پنجابی کہانی

مصنفہ :- دلیپ کور ٹوانا

مترجم :- خلیق انجم اشرفی

گیندا

پرانے زمانے کی بات ہے ایک پنڈت جی تھے بڑے عالم فاضل۔ دور دور تک ان کے علم کی شہرت تھی اور لوگ وید شاستروں کا مطلب سمجھنے ان کے پاس آتے تھے۔ ایک بار ایک چھوٹے سے گاؤں کی پاٹھ شالا کے بچوں نے سوچا کہ کیوں نہ پنڈت جی کو پاٹھ شالا کے جنم دن کے موقع پر بلایا جائے۔

پاٹھ شالا کے جنم دن سے کچھ دن پہلے انھوں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے پاٹھ شالا کے کچّے فرش کی لپائی پتائی کی۔ پھولوں کی کیاریوں کی گڑائی کی پاٹھ شالا کے دروازے پر سواگتم (خوش آمدید) لکھ کر لٹکایا۔ چھوٹے چھوٹے بچّے پھولوں کے ہار اور گلدستے لیے پنڈت جی کی راہ تکنے لگے۔

پاٹھ شالا کے گرو نے جا کر پنڈت جی سے درخواست کی "آج ہماری پاٹھ شالا کا جنم دن ہے۔ آپ نے وہاں تشریف لانے کا وعدہ کیا تھا چلیے۔" پنڈت جی نے سوچا، میں اتنا بڑا پنڈت میرے پاس دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ میں بڑی بڑی محفلوں میں جاتا ہوں اور یہ معمولی سا استاد کہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔"

پھر کچھ سوچ کر گرو جی سے سوال کیا۔" آپ میرے لیے کیا سواری لائے ہیں؟"

گرو جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا " جی۔ پاٹھ شالا صرف کوس بھر ہے یہاں سے۔۔۔۔"

" میں پیدل نہیں جا سکتا" پنڈت جی نے بڑے رعب سے کہا۔

" جی۔ میں کسی کی بیل گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

گرو جی نے پھر بڑی عاجزی سے کہا۔

" کب آپ جائیں گے اور کب آپ آئیں گے۔ میں بیکار تو نہیں۔ مجھے اور بھی کام ہیں کہ سارا دن آپ کا انتظار کرتا رہوں۔ آج ہی چلنے سے راج پنڈت مجھ سے ملاقات کرنے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد کہیں اور بھی جانا ہے مجھے۔"

" گرو جی سر جھکا کر واپس چل دیے اور پاٹھ شالا پہنچ کر ننھے منے شاگردوں کو پنڈت جی کے نہ آنے کی اطلاع دی۔ بچّے یہ سن کر پہلے تو بڑے اداس ہوئے پھر انھوں نے سارے ہار گرو جی کے گلے میں ڈال دیے اور ان کی صدارت میں جنم دن کا جشن منایا گیا۔

گرو جی کہنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن دل ہی دل میں بے اختیار کہہ اُٹھے " پنڈت تو نے یہاں آنے

سے انکار کر دیا ہے۔ کل یگ میں تو ٹھوکر ٹھوکر مارا مارا پھرے گا۔ تجھے کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔"

ایک سچے گرو کی بد دعا بیکار کیسے جا سکتی تھی۔ بھگوان نے جب پنڈت جی کو دوسرا جنم دیا تو ان کے وید شاستروں کے علم کے باعث کسی نچلی ذات میں تو نہیں بھیجا ہاں پھول بنا دیا لیکن پھول بنایا گیندے کا۔ جس میں نہ رنگ نہ خوشبو۔ اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ گرو جی کی بد دعا پوری ہوئی وہ پنڈت جسے اپنے علم پر ناز تھا۔ آج گیندا بن در در رلتا پھرتا ہے۔

●●

بقیہ بُھلکڑ بڑھیا صت ۳۳ سے

"میں بھی کتنی احمق ہوں" وہ اصطبل کی طرف دوڑی۔ وہاں کھڑی تھی گھوڑا گاڑی۔ اس پر رکھا تھا بکس اور بکس کے اندر تھا گملا اور گملے میں تھے بہت سارے ننھے ننھے سرخ پھول۔ ڈھیر ساری مٹی اور مونڈی۔ بس چابی وہاں نہیں تھی۔ اچانک بھلکڑ بڑھیا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اوہو!" یہ تو میری جیب ہی میں رکھی ہے جب میں سوچ رہی تھی کہ چابی کہاں رکھوں تو جلدی میں شاید میں نے اسے جیب میں رکھ لیا تھا" بھلکڑ بڑھیا خوش ہو کر بولی۔

●●

خط و کتابت کے وقت
پیام تعلیم کا
خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے

افضل امام کلکتہ

آزادی کا دن

کیا بات آج کی ہے
ہر سمت دلکشی ہے
ہر موڑ ہر گلی میں
اک دھوم سی مچی ہے
ہر شخص مطمئن ہے
کیا خوش نصیب دن ہے
راحت ہے سرخوشی ہے
نغمہ ہے روشنی ہے
اس دور میں جو سوچو
کس چیز کی کمی ہے
ہر فرد شادماں ہے
آزاد ہر جواں ہے

بقیہ امتحان صفحہ ۱۸ سے

یہ معلوم کرنا چاہا کہ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کیوں چھوڑا ہے تو پھر ڈائرکٹر اس معاملہ میں کوئی ذرہ رعایت نہ کریں گے اور صاف بتادیں گے کہ امتحان میں نقل کرنے کی وجہ سے ان کا نام کاٹ دیا گیا تھا۔ اس وعدے وعید کے بعد وہ حضرت تو امریکہ کی ایک دوسری یونیورسٹی میں چلے گئے۔ لیکن اس پورے واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسٹی ٹیوٹ والوں کا بھروسا ہندوستانی طالب علموں پر سے اٹھ گیا اور امتحان میں باقاعدہ ایک استاد کی ڈیوٹی لگنے لگی۔ سنتے آئے تھے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ عملاً یہ بات انسٹی ٹیوٹ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اب معلوم نہیں وہاں کے امتحان کا کیا طریقہ ہے۔ لیکن جس وقت میں وہاں سے چلا تھا اس وقت تک فضا وہی تھی جو اپنے ملک کی درسگاہوں میں ہوتی ہے۔ سنتا ہوں کہ انسٹی ٹیوٹ میں ہندوستانی طالب علم اب برائے نام ہی رہ گئے ہیں ہو سکتا ہے وہی پچھلے دن پھر لوٹ آئے ہوں۔

بقیہ کہانی دیو کی صفحہ ۳۸ سے

کا ایک نعرہ بھی بلند ہو رہا تھا۔

پانچ منٹ میں ہی دیو زمین پر تڑپ رہا تھا اس کی ایک آنکھ بھی پھوٹ چکی تھی۔ پولس کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور پبلک بے قابو ہوا ٹھی تھی۔ ایک عجیب سا ہنگامہ تھا اور ایک بے ہنگم سا شور۔ مگر برٹا کا اس سب سے بے نیاز تیر کے بعد تیر چلا کر دیو کے جسم کے اہم حصوں کو بیکار کر رہا تھا۔ آخر اس کے ترکش کے سب تیر ختم ہو گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دیو بھی۔

بقیہ سانپ صفحہ ۳۱ سے

لیٹے ہوئے سانپ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ سانپ حسب معمول آفتاب کی جاتی ہوئی کرنوں کو الوداعی سلام کرتا ہوا پچھم کی جانب اپنا منھ کیے ہوئے تھا۔ واجد میاں کی انگلیاں لبلبی پر جانا ہی چاہتی تھیں کہ اچانک سانپ کا رخ واجد میاں کی طرف پھر گیا اور اس کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں ایکبارگی واجد میاں کے چہرے اور بدن پر پڑیں اور اچانک ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ بے خیالی میں لبلبی کے دبنے میں ایک دھماکہ خیز فائر ہوا۔ واجد میاں تیزی سے اپنی کوٹھی کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اور آگ کی لپٹیں ان کے بدن کو پورے طور سے اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ فائر کی آواز کر تمام نوکر چاکر اور گھر کے لوگ دوڑ پڑے واجد میاں کو کسی طرح سے زمین پر لٹا کر لوگوں نے مٹھیوں میں بھر کر ان کے بدن پر مٹی ڈال کر آگ کے شعلوں کو بجھا تین مہینے اسپتال میں رہ کر وہ ٹھیک تو ضرور ہو گئے ان کی آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔

اس کے بعد سے آج تک برجی کا کالا سانپ دکھا نہیں دیا۔ البتہ بستی میں اور گھروں میں مختلف قسم سانپ نظر آنے لگے۔

آدھی ملاقات

نیا سال مبارک

جنوری کا پیام تعلیم ملا۔ سبھی نظمیں اور مضامین پسند آئے۔ خصوصاً نئے سال والی نظمیں تو بہت ہی دلچسپ ہیں۔ نیّر صاحب کی نظم اپنی نظیر آپ ہے۔ دعا ہے کہ "پیام تعلیم" آپ کی سرپرستی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جائے۔

حافظ عبدالرزاق، حافظ باقوی میل وشارم

"حرفوں کا جادو" دلچسپ مضمون ہے۔ دو لفظ پڑھنے اور لکھنے میں بری طرح کھٹکے ہیں۔ جیسے "لُہار" اسے تو ہم لوگ "لوہار" ہی لکھتے ہیں۔ دوسرے مضامین "انڈولا سے نئی دہلی" "کمپیوٹر" اور "لنکا کے گاندھی" پسند آئیں۔ نظمیں بھی اچھی ہیں۔ خاص کر "بالو کا پیغام" اور "مبارک یوم آزادی" آپ کا مضمون "تم کہاں ہو؟" گھر میں سبھی بھائی بہنوں کو پسند آیا۔ مبارک باد قبول ہو۔

افضل امام کلکتہ

"پیام تعلیم" کہانی نمبر ملا میں نے اس نمبر کا خاص طور پر تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ بہت پسند آیا اس دور میں اردو کا پرچہ نکالنا اور وہ بھی بچوں کے ادب سے متعلق واقعی بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی دشوار امر کسی خاص نمبر کے لیے ملک کے بڑے بڑے فنکاروں کی تخلیقات کو اکٹھا کرنا ہے۔ اس مرحلے پر "پیام تعلیم" واقعی قابلِ ستائش ہے کہ ملک کے چوٹی کے فنکاروں کی دلچسپ کہانیاں اس خاص نمبر میں شامل [illegible] سے زیادہ متاثر کرنے والی کہانی "تحفہ" رہی۔ جناب سلام بن رزاق نے مراٹھی کی ایک اچھی کہانی کا ترجمہ کیا ہے۔ "بہنی کہانی" "سب نے اچھے کام کئے" "پپو اور سونالی" (بنگلہ کہانی) بھی متاثر کن ہیں۔ جناب خلیق انجم نے بہترین کہانیوں کو اردو قالب عطا کیا ہے۔ اس نمبر میں جہاں اچھی اچھی کہانیاں چھپی ہیں وہیں "چوہے کا کرتا" جیسی بے کار کہانی کو شامل کرکے آپ نے ذوق مطالعہ کو مجروح کیا ہے۔ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر، غلام ربانی، شاہد عظیم، سہیل عظیم آبادی فرحت قمر اور خواجہ معین الدین بھی متاثر کرتے ہیں۔ "مرغی رانی" اور "دوست ہو تو" اچھی نظمیں ہیں۔ فن کہانی سے متعلق دونوں مضامین اچھے ہیں۔ اس نمبر کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ولی تنویر حیدرآباد

"پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آدھی ملاقات کے کالم میں جناب خلیق انجم اشرفی صاحب کا خط پڑھنے کو ملا۔ رسالہ "کھلونا" میں چھپنے والی کسی کہانی سے میں واقف نہیں ہوں جس کا مرکزی خیال میری کہانی سے مماثلت رکھتا ہو۔ اگر واقعی ایسی کوئی کہانی موجود ہے اسے محض اتفاق سمجھئے "ہم نے چور پکڑا" کا مرکزی خیال کوئی اس قدر اچھوتا یا نایاب نہیں تھا کہ اس مماثلت کو شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔ خیالات کا ٹکراؤ عین ممکن ہے۔ اگر اس قسم کی حرکتیں دانستگی میں سرزد ہوتی ہیں تو واقعی قابلِ مذمت ہے۔ اور جناب خلیق انجم اشرفی نے جس جذبہ کے تحت اس سلسلے میں اظہار خیال فرمایا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں۔

براہ کرم اس خط کو آدھی ملاقات میں جگہ دیجیے۔

سعید انور درمنگل



…YAM-E-TALEEM

NEW DELHI-25

پیام تعلیم


10(4)

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

جلد ۱۰ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۷۳ء

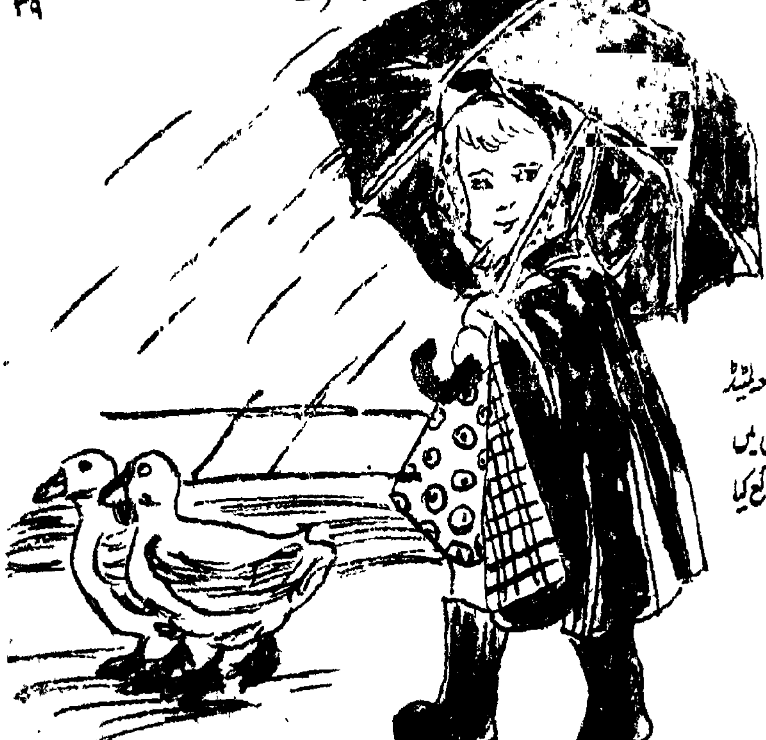
فہرست مضامین

قیمت

۶۰ پیسے

سالانہ چندہ

چھ روپے



پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

بچوں سے باتیں

پیام تعلیم کی ترتیب سے فارغ ہوکر آپ سے باتیں کرنے کو قلم اٹھایا تھا کہ برادرم اسرار ندوی صاحب کا خط ملا لکھا تھا..... " مارچ کا پرچہ اچانک ملا سرورق دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی بے ساختہ زبان سے نکلا حسین صاحب زندہ باد مکتبہ پائندہ باد! ورق الٹے تو تصویریں ملیں، ڈیزائن بھی بہت خوب بہت خوب۔ اچھی چیز اچھے لباس ہی میں دل آویز ہوتی ہے۔"

اور پھر لکھتے ہیں: "میں جس علاقے میں رہتا ہوں یہاں افلاطون زیادہ رہتے ہیں۔ اردو کے لیے جان دینے والوں کی یہاں کمی نہیں لیکن زر (پیسے) دینے والے ڈھونڈے نہیں ملتے ہیں۔ تاہم خریدار نذرانے میں لایا ہوں"۔ اسرار صاحب ہمارے پرانے ساتھی ہیں۔ مکتبے میں کام کر چکے ہیں اور اس سے پہلے پیام تعلیم کے کئی خریدار دے چکے ہیں۔

اور ہاں ایک اور خط بھی اسی دن آیا۔ یہ پیام تعلیم کے محبوب شاعر محبوب راہی صاحب کا خط ہے لکھن واڑا بلڈانہ سے آیا ہے لکھتے ہیں:..... ویسے میں اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہتا ہوں اور اپنے حلقۂ تعلقات میں پیام تعلیم کے خریدار بننے کے لیے لکھتا رہتا ہوں۔ لیکن یہ ہماری بدبختی نہیں تو کیا ہے کہ ہم ہزاروں روپے تفریحات وغیرہ پر بے دریغ خرچ کر ڈالتے ہیں۔ لیکن علم وادب کے لیے ہماری جیب سے چند ٹکے بھی نہیں نکل سکتے"

پھر فرماتے ہیں: "پیام تعلیم اپنے اغراض ومقاصد پورا کرنے میں پورے طور سے کامیاب ہے۔ ہندوستان سے اردو زبان میں بچوں کے لیے کئی رسائل نکل رہے ہیں، لیکن پیام تعلیم اپنے معیار اور مزاج کے اعتبار سے سب میں منفرد ہے جس میں دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں سلیس اور رواں دواں نو بہ نو عنوانات پر دل کش نظمیں سائنسی اور تعلیمی مضامین اور وہ بھی آسان اور عام فہم زبان میں جنھیں پرائمری (ابتدائی) درجوں میں پڑھنے والے بچے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میرا لڑکا جو درجۂ چہارم میں زیر تعلیم ہے، ہر ماہ بڑی بے چینی سے پیام تعلیم کا انتظار کرتا ہے۔ اور پرچہ میرے ہاتھوں میں دیکھتے ہی جھپٹ لیتا ہے کیونکہ میں بھی اس سے کم دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس لیے پورا پرچہ ایک نظر دیکھ لینے تک میں اسے چھپائے رکھتا ہوں"

"اب اسی مارچ کے شمارے کو لیجیے۔ میرے پڑھ لینے کے بعد کل ہی یہ پرچہ میرے لڑکے کے ہاتھ لگا ہے اور کل سے آج تک وہ 'ماں کا خط'، 'چندا ماما سے سوال'، اور 'نیا سویرا'، تینوں نظمیں ازبر کر چکا ہے۔ یہ نظمیں مجھے بھی اچھی لگیں"

"بالخصوص فرحت قمر صاحب کی نظم نے بے حد متاثر کیا ویسے گڈو اور قالو بلا بھی اچھی نظم ہے۔

"غلام ربانی صاحب کا مضمون" ہم بچوں سے کیا کیا سیکھتے ہیں۔ نفسیات کے موضوع پر بہترین مضمون ہے۔ ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کا مضمون "امتحان" پڑھنے کے بعد کناڈا کے امتحانات سے جب ہم اپنے ملک میں ہونے والے امتحانوں کے ماحول اور واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو گردن خود بخود شرم سے جھک جاتی ہے۔ راج نرائن رازؔ، فرحت قمرؔ، اور سلمیٰ جاوید کی کہانیاں بھی بے حد پسند آئیں۔ ان کہانیوں میں تحیّر، تجسس، روانی اور دلچسپ واقعات غرض وہ سب کچھ ہے جو ایک اچھی کہانی کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے"

مارچ کے پیام تعلیم کے بارے میں اس طرح کے کئی خط اور بھی آئے ہیں۔ ان میں مضامین اور کہانیوں کے علاوہ ٹائیٹل اور اندر کی تصویروں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ یہ ٹائیٹل اور لیتھو کی تصویریں سب بیگم شاہد علی خاں (جنرل منیجر) کی نوازشوں کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر مشیر الحق کے مضمون کی سبھی نے تعریف کی ہے۔

اس پرچے میں ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کا ایک اور مضمون شائع ہو رہا ہے "خرید و فروخت"، یہ مضمون بھی آپ کو عجیب سا لگے گا۔ خصوصاً آج کل کے زمانے میں کہ ہمارے دکانداروں کی ہوس انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ ہمارے بہت سے بزرگ یورپ اور امریکہ کی بے حیائی اور ہر طرح کی اخلاقی برائیوں کی برائی کرتے نہیں تھکتے۔ مگر یہ تصویر کا صرف ایک ہی پہلو ہے۔ وہاں کی تجارت اور سوداگری کے جو آداب ہیں اپنے ہاں کی تجارت سے مقابلہ کرتے سچ مچ شرم آتی ہے۔

اس پرچے میں آپ م۔ ندیم صاحب کا ڈراما پڑھیں گے۔ احمد جمال صاحب کی دلچسپ کہانی پڑھیں گے۔ یہ دونوں کا نی دنوں کے بعد پیام تعلیم کی بزم میں شامل ہوئے ہیں۔

جگہ کی کمی کی وجہ سے اب کے بھی بہت سے اچھے اچھے مضمون شامل نہ ہو سکے۔ محترم رشید حسن خاں صاحب کا مضمون اور محترم شفیع الدین صاحب اور برکت علی صاحب فراقؔ کے مضمون اور کئی اچھی اچھی دلچسپ کہانیاں بھی یہ سب اگلے پرچے میں چھپیں گی۔

اور ہاں۔ مونگے والی کہانی کے علاوہ خلیق انجم صاحب کی دو اور کہانیاں اس پرچے میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ بھی کہانی نمبر کی کہانیاں ہیں۔ ان کی کتابت ہو چکی تھی۔ نہ چھاپتے تو کاپیاں خراب ہو جاتیں کہانی نمبر کی یہ آخری کہانیاں تھیں۔ کہانی نمبر کی کوئی کہانی اب باقی نہیں ہے۔

شائل ادیب، ایم۔ اے

منظوم کہانی

خموشی ہے سونا

گدا اک یہ کہتا ہوا جا رہا تھا — "خموشی ہے سونا، خموشی ہے سونا"
یہ کہتا ہوا جب وہ گزرا محل سے — لگا سوچنے شاہزادہ یہ سُن کے
مگر کچھ بھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا — گدا کا یہ کہنا اُسے کچھ نہ بھایا
اُسے جھوٹ سے تھی نہایت ہی نفرت — صداقت سے تھی اُس کو بے حد محبت
وُہ چلّا اٹھا، جھوٹ ہے یہ سراسر — "خموشی ہے سونا" یہ سچ ہے تو کیوں کر
بُلا کر دیا حکم خادم کو اپنے — کہ لائے گدا کو وہ فوراً پکڑ کے
ہوا جب گدا پیش، خدمت میں اُس کی — کہا "زندگی میں تو بولا ہے سچ بھی؟"
"خموشی ہے سونا" یہ کیا بک رہا ہے — بتا پاس تیرے ثبوت اس کا کیا ہے
گدا ہنس پڑا پہلے یہ بات سُن کے — کہا پھر "نہ بیکار یوں غصہ کیجے"

سمجھ بوجھ جب آپ میں ہوگی پیدا　　　　یہ سمجھو گے خود ہی "خموشی ہے سونا"
بھڑک اٹھا شہزادہ شعلے کے جیسا　　　　کہا چپ ہو، ورنہ زباں کھینچ لوں گا"
دیا حکم ہے جاؤ اس کو یہاں سے
کرو جیل میں بند، مرنے دو گھٹ کے

مگر یوں ہوا: ایک دن، شاہزادہ　　　　ہوا میں کھلی، سیر کرنے کو نکلا
ندی کے کنارے جو پہنچا تو دیکھا　　　　ہرن ایک کچھ دور پر جا رہا تھا
وہ چونکا، سنبھالی کماں اس نے اپنی　　　　بہت زور مارا مگر کھائی منہ کی
بہر کیف ہلکان، حیران ہو کر　　　　کیا قصر کا رخ، پریشاں ہو کر
وہ جا ہی رہا تھا کہ اڑتی چکوری　　　　صدا کرتی "چک چک" کی نظروں سے گذری
وہ چونکا، کماں ٹھیک کی، تیر کھینچا　　　　نشانہ تھا سچا، لگا سینے میں جا
گری بے تحاشہ، زمیں پر چکوری　　　　اسی دم مثل یاد آئی ..... گدا کی
وہ بولا "چکوری اگر "چک" نہ کرتی　　　　نہ چلتا مرا تیر، اور نہ وہ مرتی
"خموشی ہے سونا" یہ بالکل بجا ہے　　　　وہ بے چارہ بے کس گدا بے سزا ہے
وہاں سے وہ فوراً محل لوٹ آیا　　　　گدا کو رہا کر کے انعام بخشا
کہا ہوں میں نادم، خطا میری بخشو　　　　نہیں ہو گنہگار، تم بے خطا ہو
یہ بالکل بجا ہے "خموشی ہے سونا"
ہوئی ہے سمجھ بوجھ اب مجھ میں اب پیدا"

ط محل

اپریل ۱۹۷۳ء

مانٹریال کی بھولی بسری یادیں

(ڈاکٹر شبیر الحق صاحب

خرید و فروخت



تجارت کو خدمت خلق کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ تقریباً
ہب کی اخلاقی تعلیمات میں زور دیا گیا ہے کہ اچھا تاجر
ہے جو منافع خوری کے بجائے خدمتِ خلق کو اپنا نصب العین
ے لیکن اگر ہم اپنے ارد گرد پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں
ں ہوگا کہ عام طور سے اس قسم کی تعلیمات پر عمل کرنا ضرور
مجھا جاتا۔ مسلمانوں کے بارے میں تو خاص طور سے
مشہور ہے کہ وہ بہت ہی برے دکان دار ہوتے ہیں۔

خود مجھے اپنی زندگی میں دکانداروں کے ہاتھوں
جو تلخ تجربے ہو چکے ہیں ان کی بنا پر مانٹریال جانے سے پہلے
یں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ دکانداروں کی برادری
میں اکا دکا کوئی بھلا مانس ہو تو ہو ورنہ بحیثیت مجموعی یہ پوری
برادری ایک پیسے کے زائد نفع کے لیے اپنا دین وایمان
بیچ سکتی ہے اور گلے لگائے گاہکوں کو ہمیشہ کے لیے
کھو سکتی ہے۔ لیکن مانٹریال پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہاں کے

کے لوگ تجارت کو سچ مچ خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

جو لوگ ہندوستان کے شہروں میں رہتے ہیں، انھیں "سیل" کے تماشے کا ضرور تجربہ ہوگا۔ اہم تیوہاروں خاص خاص موقعوں پر بڑے بڑے دکان دار قیمتوں میں کچھ کمی کر دیتے ہیں، اور اس کمی کا زور و شور سے اعلان کرتے ہیں۔

فرض کیجیے آج آپ کوئی چیز خریدیں اور دوسرے دن "سیل" میں اس چیز کی قیمت کم ہو جائے تو آپ کو کتنا دکھ ہوگا۔ کیونکہ اگر آپ ایک دن اور رک جاتے تو پھر وہی چیز رعایتی قیمت پر آپ کو مل سکتی تھی۔ لیکن وہی مثل ہے

اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

دکان دار میں اتنی ایمان داری کہاں جو وہ آپ کو بتادے کہ ایک دن کے بعد اس چیز کی قیمت کم ہونے والی ہے اور آپ علمِ غیب کے مالک نہیں اس لیے اب قسمت کو روئیے۔

اس کے برخلاف مانٹریال میں بارہا اس بات کا تجربہ ہوا کہ دکان دار نے خود ہی یہ بتا دیا کہ اگر میں دو ایک دن رک جاؤں تو مطلوبہ چیز رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتا ہوں۔

میرے ایک دوست کے ساتھ تو یہ بھی ہوا کہ وہ ایک سوٹ خرید کر لائے۔ چند روز کے بعد اتفاق سے وہ اسی اسٹور کے سامنے سے گزرے تو دروازے پر سیل کا اشتہار دکھائی دیا۔ چیزوں پر ایک نظر ڈالنے کے لیے وہ دکان کے اندر چلے گئے گھومتے پھرتے سلے سلائے کپڑوں کے حصے میں بھی گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ جس سوٹ کو وہ چند روز پہلے خرید کر لے گئے تھے اس کی قیمت میں ۱۰ ڈالر (تقریباً ۷۵ روپے) کمی ہو گئی ہے۔

طرفہ تماشہ یہ کہ اس وقت وہ حضرت وہی س[illegible] پہنے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہیں بہت تاؤ آیا ا[illegible] جھنجھلائے ہوئے سیدھے منیجر کے کمرے میں گھس گ[illegible] اس سے شکایت کی کہ جب سوٹوں کی قیمت میں کمی [illegible] والی تھی تو پھر انھیں خریدتے وقت اس کی اط[illegible] کیوں نہیں دی گئی وہ ۱۰ ڈالر بچانے کے لیے انتظار کر سکتے تھے۔

منیجر نے ٹھنڈے دل سے ا[illegible] شکایت کو سنا اور [illegible] لہجہ میں بولا: "اسے اپنے [illegible] اس حرکت پر بہت شرمندگی [illegible] ہے۔ اس کا فرض تھا کہ وہ [illegible] بیچتے وقت انھیں اس با[illegible] آگاہ کر دیتا کہ سوٹوں کی قیمت [illegible] میں کمی ہونے والی [illegible] وہ اب بھی اپنے ملازم کی

کی اصلاح کرنے کو تیار ہے۔ اگر میرے دوست کیش میمو پیش کر دیں تو وہ زائد قیمت واپس کر دے گا۔"

"اس وقت ان کی جیب میں کیش میمو موجو[د] تھا منیجر نے انھیں اطمینان دلایا کہ جب تک سی[ل] رہی ہے وہ کسی دن بھی کیش میمو لے کر آئیں زائد قیمت واپس لے جائیں۔"

یہ میرے لیے بھی اور ان کے لیے بھی ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ دوسرے دن وہ رسید لے کر اسٹور گئے اور زائد قیمت واپس لے آئے۔ اس وقت ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید ہمیں غیر ملکی طالب علم سمجھ کر مینیجر نے اتنا اخلاق برتا ہے لیکن جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کچھ ہم لوگوں کے ساتھ خاص رعایت نہ تھی بلکہ وہاں کی تجارت کا یہ بنیادی اصول ہے کہ لین دین میں تاجر کو غلطی ہمیشہ اپنے اوپر اوڑھ لینی چاہیے۔

مینیجر کے اس اخلاق کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم لوگوں کو جب کوئی چیز خریدنی ہوتی تھی تو سب سے پہلے اسی دکان پر جاتے تھے۔

اس کے بالکل برعکس ابھی شملے میں ایک تجربہ ہوا۔ اسی اکتوبر ۷۲ء کی بات ہے: میرے ایک دوست گاندھی بھنڈار سے ایک گرم صدری خرید کر لائے۔۔۔ صدری اچھی تھی قیمت بھی مناسب تھی اس لیے انھوں سوچا کہ اپنے عزیزوں کے لیے دو ایک صدریاں اور خرید لیں اسی خیال سے دوسرے دن ہم لوگ پھر اسی دکان پر گئے تو دیکھا کہ گاندھی بھنڈار میں سیل ہو رہا ہے۔ اور کل والی صدریاں آج کم قیمت پر مل رہی ہیں۔

ہم لوگوں نے جب اس بات کی شکایت کی کہ جب صرف ایک رات کا معاملہ تھا تو اخلاق کا تقاضا تھا کہ صدریاں دکھاتے وقت ہمیں بتا دیا جاتا کہ دوسرے دن قیمت کم ہو جائے گی۔ یہ بات گاندھی بھنڈار کے منتظمین کو عجوبہ معلوم ہوئی۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے پوری دکان ہی ٹھپ ہو جاتی۔ کیونکہ ہر گاہک سیل کے انتظار میں اپنی خریداری ملتوی کر دیتا۔ ظاہر ہے جن دکانداروں کی یہ ذہنیت ہو وہاں زائد قیمت کو لوٹانے کا کیا سوال!

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں یہ بات ایک طرح سے طے کر لی گئی ہے۔ کہ خریدار چیزوں کو خریدنے پر مجبور ہے۔ اس کے برخلاف یورپ اور امریکہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ خریدار اپنی خریداری سے دکان دار پر احسان کر رہا ہے۔ لین دین کے معاملے میں سوچنے کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے "مانٹریال" میں مجھے نت نئے تجربے ہوتے رہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ خریدی ہوئی چیزوں کو آپ ہفتے عشرے کے اندر اندر جب بھی چاہیں بلا کسی عذر کے واپس کر دیں بڑے بڑے اسٹوروں میں ایک کاونٹر صرف اس لیے ہوتا ہے جہاں خریدی ہوئی چیزیں واپس کی جاتی ہیں۔ کاونٹر کے پیچھے تین چار ملازم کھڑے ہوتے ہیں۔ واپس کرنے والے کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں سامان کا بنڈل کاونٹر پر رکھ کر رسید آگے بڑھا دیجئے ملازم پیکٹ کھول کر سامان پر ایک گہری نظر ڈالے گا اگر چیز میں کوئی خرابی نہیں آئی ہے تو وہ رسید پر واپسی کی مہر لگا کر دوسرے ملازم کی طرف بڑھا دے گا وہ رسید اپنے پاس رکھ کر کھڑے کھڑے رقم واپس کر دے گا اسٹور کھلتے ہی کاونٹر پر لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں اور دکان بند ہونے کے وقت تک چیزوں کے واپس کرنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔

واپس کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خریداری کرتے وقت ہی دل میں طے کر لیتے ہیں کہ دو ایک دن میں واپس کر دیں گے۔ ایسے لوگ

کم ہوتے ہیں ان میں اکثریت عورتوں کی ہوتی ہے اور خریدی ہوئی چیز عموماً لباس یا مصنوعی نگینوں کے زیورات ہوتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو وجہ بھی سن لیجیے۔

امریکہ اور کناڈا میں کام کاجی ہفتہ، جمعرات سے لے کر جمعے تک صرف پانچ دنوں کا ہوتا ہے، سنیچر اور اتوار چھٹی کے دن ہوتے ہیں۔ انھی دونوں میں لوگ عام طور سے دعوت اور پارٹیاں کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر عورت کی طرح وہاں کی عورتوں میں بھی ہر دعوت کے موقع پر نئے نئے لباس اور نئے نئے زیور پہننے کا شوق ہے۔

اب ہر عورت کے بس کی بات تو ہے نہیں کہ اتنے کپڑے اور زیور اسٹاک میں رکھے کہ ہر موقع پر نیا جوڑا بدل سکے اس لیے کچھ عورتوں نے یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ جس ہفتے انھیں کسی خاص دعوت میں جانا ہوتا ہے اس جمعے کی شام کو وہ کسی اسٹور سے نیا جوڑا خرید لاتی ہیں دعوت میں اسے احتیاط سے پہنتی ہیں اور دوشنبہ کی صبح کو یہ کہہ کر واپس کر دیتی ہیں کہ انھوں نے اسے پہن کر دیکھ لیا۔ لیکن اس لباس میں وہ کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں، یا ان کے شوہر کو یہ لباس پسند نہیں آیا۔

دکان دار سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ چال چلی جا رہی ہے لیکن وہ تالاب کی ایک گندی مچھلی کو ایک ہی مچھلی سمجھتا ہے پورے تالاب کو گندا نہیں سمجھتا اس لیے مسکراتے ہوئے سامان واپس لے لیتا ہے۔ اس قسم کی حرکت کرنے والے لوگ ایک دکان سے سامان نہیں خریدتے، بلکہ میدان بدلتے رہتے ہیں۔

اس طرح جو واپس کیا ہوا سامان جمع ہو جاتا ہے اسے دکان کے اس حصے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں چیزیں اپنی اصل قیمت سے آدھی چوتھائی قیمت پر بکتی ہیں۔ اس حصے کی خریدی ہوئی چیزیں دوبارہ واپس نہیں کی جاتیں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکان داروں کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہوگا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ وہاں کے ماہرین تجارت نے لین دین کے ایک ایک پہلو پر تحقیق کی ہے۔ انھوں نے اس بات کے اعداد و شمار نکالے ہیں کہ کتنا سامان دکان سے ضائع ہوگا، کتنا سامان لوگ واپس کریں گے، اس قسم کے اعداد و شمار کی روشنی میں قیمتوں کو طے کیا جاتا ہے۔ اور خریداری کے بعد واپسی کی وجہ سے دوکاندار کو جو نقصان ہونے والا ہوتا ہے اس رقم کو پہلے ہی سے پورے سامان پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہر خریدار تھوڑا تھوڑا کرکے دکان دار کے نقصان کو پورا کرتا رہتا ہے۔

خریدی ہوئی چیزوں کو واپس کرنے کے سلسلے میں ایک واقعہ میرے ساتھ ایسا پیش آیا جسے میں تمام زندگی نہ بھول سکوں گا۔ مانٹریال کے ایک بڑے اسٹور میں جوتوں کی سیل لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک جوڑا جوتا اپنے لیے خریدا دکان پر اسے پہن کر دیکھا تو وہ ٹھیک معلوم ہوا۔ لیکن جب اسے مسلسل چند گھنٹوں تک پہن کر چلنا پڑا تو اندازہ ہوا کہ جوتا اچھا خاصا تنگ تھا اور پیروں کی انگلیاں بری طرح دب رہی تھیں۔

میں یہ سوچ کر اسے جبراً پہنتا رہا کہ شاید دو ایک دن میں پیر کی انگلیاں جوتے میں اپنی جگہ بنا لیں گی لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ بہر حال ہلکی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ میں اسے اپنے پیروں میں گھسیٹتا رہا۔ دباؤ دے کر چلنے کی وجہ سے تلے کا اگلا حصہ معمول سے کچھ

پہلے ہی گھس بھی گیا۔ اس طرح کوئی ایک ہفتہ کی مدّت گذر گئی۔

ایک دن یونیورسٹی میں میرے ایک ساتھی نے مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھا تو وجہ پوچھی۔ میری پوری کہانی سن کر وہ بولا " تم جوتے کو واپس کیوں نہیں کر دیتے، میں اس کی بات کو سن کر ہنس پڑا۔ اور بولا" میاں اسے خریدے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا ہے، میری بد احتیاطی کی وجہ سے تلے کا اگلا حصّہ بھی گھس گیا ہے۔ اور تم اسے واپس کرنے کی رائے دے رہے ہو، آخر کس منہ سے دکان پر جاؤں!

" منہ ؛ پیر تو میں جانتا نہیں،، میرے دوست نے مجھ سے کہا۔" میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تمھارے پیر کے ناپ سے جوتا ایک نمبر کم ہے، اس لیے تمھارے واسطے یہ جوتا بالکل بے کار ہے۔ دکان دار کو پیر کا سائز دیکھنا چاہیے تھا"

میں نے اسے جواب دیا" دکان دار کی اس میں غلطی نہیں ہے۔ مجھے خود اپنے پیر کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا میں نے اسے پہننے کے بعد دوکاندار سے کہہ دیا کہ یہ میرے پیروں میں ٹھیک ہے، تو اب اس کی کیا غلطی ہے؟"

لیکن میرا دوست اس بحث سے مطمئن نہیں ہوا، اس نے کہا" اگر تم اسے واپس نہیں کرنا چاہتے ہو تو بات دوسری ہے ورنہ سیدھے دکان پر جاؤ، غلطی دکان دار کی ہے کہ اس نے تمھارے پیر کے سائز کو غور سے نہیں دیکھا۔ چونکہ اس کی غلطی ہے اس لیے تمھیں پورا حق ہے کہ تم اپنی پوری قیمت واپس لے لو"

" قیمت! ارے بھئی تم قیمت کی بات کرتے ہو میں تو یہی بہت سمجھوں گا کہ وہ اس کے بدلے میں دوسرا جوڑا دے دے "

قصّہ مختصر دوکان پر گیا۔ میں نے گھسا ہوا جوتا اسے دکھایا اور بہت ہی مسکین لہجے میں صورت حال سے مطلع کیا کہ جوتا ایک نمبر چھوٹا ہے اس کی وجہ سے اس کا جوتا اور میرے پیر دونوں کچھ خراب سے ہو گئے ہیں۔

اس نے جوتے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا بلکہ میرے پیروں کی تکلیف پر معذرت کی۔ اس کے بعد بولا "اگرچہ آپ نے یہ جوتا پہن لیا ہے اور جوتے کی قیمت کچھ کم نہیں ہے لیکن میں نے اسے بیچنے کے دوران غلطی کی اس لیے اگر آپ اس کے بدلے دوسرا لینا چاہیں تو مزید قیمت دینے کی ضرورت نہیں ایک نیا جوڑا لے لیں یا اگر چاہیں تو ادا کی ہوئی قیمت واپس لے لیں" میں نے قیمت کے بجائے جوتوں کو بدل کر ایک دوسرا جوڑا لے لیا اور دکان دار کا شکریہ ادا کرکے خوشی خوشی واپس آ گیا۔

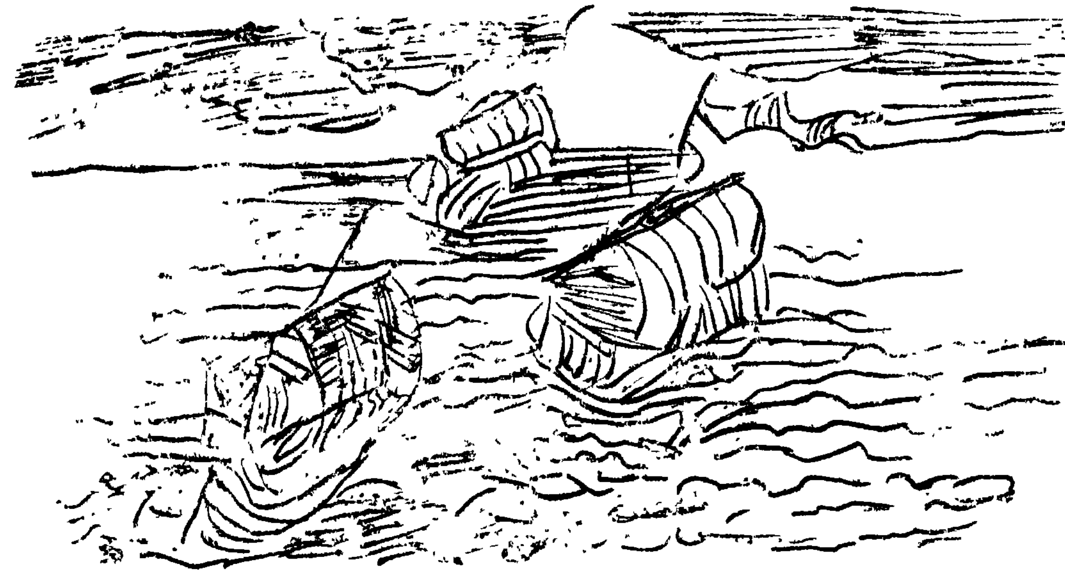
اس وقت تو یہ واقعہ میرے لیے حیرت میں ڈال دینے والا تھا لیکن جلد ہی میں اسے بھول بھال گیا کیوں کہ وہاں کی زندگی میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر جب مانٹریال سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا بھولی بسری باتوں کو یاد کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل ہی کا واقعہ

نویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ

سفر کا دوسرا دن



اس چھوٹی وادی کا معائنہ کافی مفید رہا۔ وہاں وہ تمام درخت موجود تھے جو ہم اس سے پہلے اپنی وادی میں دیکھ چکے تھے بلکہ ایک دو نئے درخت بھی نظر آئے۔

یہاں ہم نے ایک عجیب سی سبزی بھی دریافت کی جیک کا کہنا تھا کہ یہ ٹارو[1] نام کی وہی سبزی ہے جس کے بارے میں وہ پڑھ چکا ہے کہ اس طرف کے جزیروں میں عام پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں یام[2] بھی کثرت سے اُگی ہوئی تھی اور ایک دوسری جڑ بھی جو شکل و صورت میں آلو[3] سے ملتی جلتی تھی۔

یہ سب کی سب ہمارے لیے بالکل نئی چیزیں تھیں۔ ہم نے ایک ایک جڑ توڑ کر اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لی تاکہ اُسے رات کے کھانے میں استعمال کر سکیں۔ ان نئے درختوں

---

[1] گرم علاقوں میں پایا جانے والا ایک پودا جس کی جڑ کھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے خصوصاً بحرالکاہل کے جزیروں میں یہ نام بھی وہاں کی علاقائی زبان کا لفظ ہے۔ [2] ایک دوسرا پودا۔ اس کی جڑ بھی کھانے کے کام آتی ہے [3] آلو بھی اسی طرح پیڑ کی جڑ ہے۔ جو ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی دونوں سبزیاں بھی اسی طرح کی ہیں۔ (مترجم)

اور جڑوں کے علاوہ ہمیں اس وادی میں بہت سی خوب صورت، رنگ برنگی چڑیاں بھی نظر آئیں اور کسی چوپائے کے قدموں کے نشان بھی ۔

اسی دوران میں سورج کے سرخ گولے نے اپنا آدھا سفر ختم کرلیا تھا اور اب وہ تیزی سے پچھم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہم ساحل کی طرف لوٹے اور بادل پیدا کرنے والی چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے دوسری وادی میں گھس گئے۔ یہ وہی وادی تھی جس کے بارے میں میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ جزیرے کے درمیان سے گزرتی تھی۔ یہ وادی ہماری اب تک دیکھی ہوئی وادیوں میں سب سے بڑی، سب سے زیادہ خوب صورت وادی تھی۔ جتنی قسموں، رنگوں اور جسامت کے درخت اور پودے تصوّر میں لائے جا سکتے ہیں، وہ سب یہاں موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے درخت ہم نے اس سے پہلے والی وادیوں میں نہیں دیکھے تھے۔

اس وادی میں بہنے والا چشمہ بہت بڑا اور یہاں کی زمین 'وادی جہاز' کی زمین سے زیادہ زرخیز معلوم ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وادی کی زمین طرح طرح کے درختوں اور پودوں سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں سے کچھ درخت چمکدار ہرے رنگ کے، کچھ گہرے مٹ میلے اور کچھ عام پائے جانے والے زردی مائل ہرے رنگ کے تھے۔

ان درختوں کے درمیان ہمیں 'روٹی والے درخت' کے چوڑے پتّے اور ان میں لگے ہوئے سنہرے پھل بھی نظر آئے اور اُس درخت کی چمک دار سفید پتیاں بھی جس کے پھل سے ہم نے چراغ کا کام لیا تھا۔ اس کے علاوہ پائن سے مشابہ ایک اور درخت بھی جو دوسرے درختوں سے اونچا نکل گیا تھا اور جس کی شاندار پتیاں اور درختوں کے اوپر سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

ہم خاموش کھڑے تعریفی نظروں سے ادھر اد
رہے تھے کہ اچانک جیک نے ایک حیرت بھری چیخ
ہماری ایک جانب کھڑے ایک درخت کی طرف اشہ
ہوئے بولا۔ "یہ برگد کا پیڑ ہے۔"

"اور یہ برگد کا پیڑ کیا ہوتا ہے؟ پیٹرکن نے سو
"بہت عجیب چیز جیسا کہ تم ابھی دیکھو گے" جہ
جواب دیا۔

ایک حیرت انگیز درخت ہے۔ دیکھو یہ کتنا
ہے نا؟"

"یہ!" پیٹرکن نے چونک کر دہرایا "کیوں! یہ
برگد کے درجنوں پیڑ ہیں! تمھاری قواعد اتنی غلط کہ
ہوگئی جیک؟ یا اب تمہاری عقل رفتہ رفتہ تمھارا
جارہی ہے؟"

"یہاں برگد کا صرف ایک پیڑ ہے" جیک ایک
پر زور دیتا ہوا بولا "یقین نہیں آتا تو خود غور سے د
اور واقعی جسے ہم نے برگد کے پیڑوں کا جنگل سمج
ایک ہی پیڑ تھا۔ اس کا تنا ہلکے چمک دار رنگ کا تھا،
پتیاں چھوٹی چھوٹی، بھالے کے پھل جیسی اور گہرے
صورت ہرے رنگ کی تھیں۔

ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی شاخو
(جو اس کے تنے سے کسی صلیب کے بازوؤں کی طرح
تھیں) لمبی لمبی جٹائیں جھول رہی تھیں اور ان جٹ
نے زمین میں جڑ پکڑ کر درختوں کی شکل اختیار کرلی
اور یہی نہیں ان کے تنے بھی دوسرے پیڑوں کے
طرح چھال سے ڈھکے تھے۔

ان جٹاؤں میں جو شاخوں کے مختلف حصّوا
پھوٹ پھوٹ کر زمین پر اتر آئی تھیں۔ کچھ تو

ور بوٹی تھیں کہ ان میں اور خاص درخت میں فرق کرنا مشکل تھا۔ ن جٹاؤں میں کچھ شاخ سے ابھی پھوٹی ہی تھیں اور رسّی کے جھولے چھوٹے ٹکڑوں کی طرح تھیں، کچھ زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ لیکن ابھی بڑ نہیں پکڑ سکی تھیں اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ لہرا رہی تھیں۔ کچھ جڑ پکڑ کر مضبوط اور تناور درخت بن چکی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ اگر اس درخت کو پھولنے پھلنے کے لیے بگہ مل جاتی تو شاید یہ اکیلا درخت اس پورے جزیرے کو گھیر لیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے ایک اور عجیب و غریب درخت دیکھا۔ یہ درخت بھی بڑا حیرت انگیز تھا اور بعد میں ہمارے لیے کافی مفید ثابت ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کا صحیح نام تو جیک کو معلوم نہیں تھا لیکن اس کے اوپر بہت عمدہ قسم کے پھلوں کے گچھے لگے تھے ہم نے ان میں سے بہت سے توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لیے۔

اس درخت کا تنا ہی اس کا سب سے حیرت انگیز حصّہ تھا۔ زمین سے بارہ فٹ کی بلندی تک اس میں کوئی شاخ نہیں پھوٹی تھی اور وہ کوئی خاص موٹا بھی نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اس درخت کی لمبائی کے مقابلے میں تنے کی موٹائی بہت کم تھی لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس میں چار پانچ حیرت انگیز تختے لگے تھے۔

ان کا تذکرہ کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں اپنے پڑھنے والوں سے یہ درخواست کروں کہ وہ تصوّر میں پانچ، پانچ انچ موٹے اور پانچ فٹ چوڑے تختے لائیں جو اس تنے سے اس طرح لگے تھے جیسے الگ سے لا کر اس میں چپکا دیے ہوں۔ ان تختوں پر چھال بھی تھی اور اس طرح وہ تنے سے مل مشابہ ہو گئے تھے۔ اگر یہ تختے نہ ہوتے تو شاید یہ ک سا تنا اپنا پتّوں اور پھلوں سے لدا اوپری حصّہ نہ سہار پاتا۔ بعد میں ہم نے اس قسم کے بہت سے چھوٹے چھوٹے درخت چشمے کے کنارے اُگے دیکھے۔ جب ہم ان میں ایک چھوٹے درخت کا معائنہ کر رہے تھے تو جیک نے اس کے ایک تختے کا ٹکڑا کلہاڑی سے کاٹ لیا اور دیکھا تو معلوم ہوا کہ لکڑی کافی مضبوط اور آسانی سے کٹنے والی تھی۔

اب جیک نے زور سے اپنی کلہاڑی تنے پر ماری اور اس پورے تختے کو کاٹ کر درخت سے الگ کر لیا۔ اس طرح ہمیں یہ اطمینان ہو گیا کہ وقت ضرورت ہم اس درخت سے عمدہ قسم کے بنے بنائے تختے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بہت اہم دریافت تھی۔ شاید اب تک کی تمام دریافتوں سے زیادہ اہم۔

اب ہم نے ساحل کی طرف چلنا شروع کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ وہیں کہیں اپنا کیمپ لگائیں گے کیوں کہ جنگل میں تو مچھروں کی کثرت سے ٹھہرنا محال تھا۔

واپسی میں ہم ان رنگ برنگی حسین چڑیوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے جو ہمارے چاروں طرف ادھر سے ادھر اڑتی اور چہچہاتی پھر رہی تھیں۔ ان میں چند تو بہت ہی خوب صورت رنگوں کی تھیں۔ چمکدار ہری، نیلی اور سرخ رنگوں والی چڑیاں تو عام تھیں۔ ہم نے سارے دن کوشش کی تھی کہ تیر کمان یا غلیل سے ان میں سے کچھ کو مار گرائیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ ایک دو بار تو ہم نے انھیں تقریباً مار لیا تھا۔ اس نشانہ بازی کا مقصد محض تفریح یا کھیل نہیں تھا۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ چڑیاں کھانے میں کیسی ہیں۔

شام کا وقت قریب آ رہا تھا۔ دور افق میں سیاہی کے لہریے اور شفق کی سرخی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پرندوں کے پرے کے پرے چہچہاتے، شور مچاتے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ عجیب دل کش منظر تھا۔ ہم اس منظر کے حسن میں کھو سے گئے تھے کہ اچانک

ایک کافی بڑا جھنڈ شور مچاتا ہمارے سروں پر سے گذرا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے ایک پتھر سے ان کے بیچ میں نشانہ لگایا اور خوش قسمتی سے ایک پرندے کو مار گرانے میں کامیاب ہو گیا۔

چند ہی منٹ بعد ہم اپنے سروں پر تیز سیٹی سے مشابہ ایک آواز سن کر حیران رہ گئے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو جنگلی بطوں کا ایک جھنڈ اڑتا نظر آیا اس کا رخ ساحل کی طرف تھا ہم ان کا پیچھا کرنے لگے اور آخر میں انتہائی خوب صورت نیلی جھیل کے کنارے پہنچ گئے

یہ جھیل دو سو گز سے زیادہ لمبی نہ ہوگی۔ اس کے چاروں طرف ہرے بھرے پودے اور درخت کھڑے تھے اس کی سطح کیسی شفاف تھی ہم اس کے کنارے کھڑے ہوئے پودوں کی ایک ایک شاخ اور پتّی کا عکس دیکھ سکتے تھے۔ اس وقت مختلف قسم کی بطوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

یہ بطیں اس پر تیرتے ہوئے چوڑے پتوں والے مختلف قسم کے آبی پودوں سے کچھ جھجک رہی تھیں۔ بہت سے دوسرے آبی پرندے اس کے کنارے موجود تھے اور بڑی آزادی اور بے فکری سے اڑ کر ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ جیسے ہی ہم لوگ قریب پہنچے، آہٹ پا کر یہ سب کے سب بڑی تیزی سے اڑ گئے۔ جھیل کے کنارے چلتے ہوئے ہم نے اس میں مچھلیاں بھی دیکھیں لیکن ان کی قسموں کے بارے میں ہم کوئی اندازہ نہیں لگا سکے۔

ساحل کے نزدیک پہنچنے لگے تو جیک نے کہا کہ ہمیں اپنے راستے سے ذرا ہٹ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ایک آدھ بط ہاتھ لگ سکتی ہے یا نہیں۔ یہ طے کر کے ہم نے پیٹرکن کو ہدایت کی کہ وہ سیدھا ساحل پر جا کر آگ جلائے، ہم جلدی ہی اس سے آملیں گے ہم نے اب بطخوں کی تلاش شروع کی لیکن باوجود کوشش کے وہ کہیں نظر نہ آئیں۔

مایوس ہو کر ہم واپسی کے لیے مڑے ہی تھے کہ ایک حیرت انگیز نظارے نے ہمارے قدم روک لیے۔ ہمارے بالکل سامنے، بس کوئی دس گز کے فاصلے پر ایک بہت ہی شاندار درخت تھا، اس جزیرہ پر اب تک دیکھے ہوئے درختوں میں سب سے بڑا۔ اس کے تنے کا قطر کوئی پانچ فیٹ ہوگا اور وہ بہت چکنی بھورے رنگ کی چھال سے ڈھکا تھا۔ اس کی شاخیں ہلکے رنگ کی پتیوں سے لدی تھیں جن میں سے گہرے رنگ کے پیلے کے پھلوں کے بے شمار گچھے جھانک رہے تھے یہ گچھے اتنے زیادہ تھے کہ اس درخت کی مضبوط شاخیں بھی ان کے وزن سے جھک گئی تھیں۔ یہ پھل سنترے کی برابر ہوگا۔

درخت کے نیچے کی زمین گرے ہوئے پھلوں سے پٹی پڑی تھی اور اس زمین کے بیچ میں کوئی بیس چھوٹے بڑے سُوّر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے پھولے ہوئے پیٹوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے ان پھل سے پیٹ خوب بھر لیے ہیں۔

ان موٹے بھدے جانوروں کو اس مضحکہ خیز انداز میں سوتے اور سانس لیتے دیکھ کر میں اور جیک ہمیشہ اپنی ہنسی روک سکے۔

"اچھا رالف" جیک نے سرگوشی کے انداز میں "تم اپنی غلیل میں ایک پتھر رکھو۔ ذرا بڑا سا اور موٹے والے سُوّر پر، ہاں ہاں وہی جس کی پشت تمہاری طرف ہے۔ نشانہ تو لگاؤ۔ میں اس چھوٹے والے کے جسم میں ایک تیر فٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں!

"بھئی انھیں پہلے جگا کیوں، نہ دیا جائے؟" میں نے
ہلکی آواز میں احتجاج کیا۔

"سوتے ہوئے کو مارنا تو بڑا ظلم ہے۔"

"رالف۔ اگر میرا مقصد محض تفریح ہوتی تو میں انھیں ضرور جگاتا لیکن اس وقت تو ہمیں ان کے گوشت کی ضرورت ہے اس لیے انھیں اسی طرح پڑا رہنے دو۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ یقین بھی تو نہیں کہ ہم انھیں مار ہی لیں گے۔ اچھا اب لگاؤ نشانہ۔"

جیک کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے غلیل کھینچی اور اس خوبی سے اس کے مقرر کردہ سور پر نشانہ لگایا کہ میرے پتھر نے اس کے ڈھول جیسے پیٹ سے ٹکرا کر ایسی ہی آواز پیدا کی جیسی کسی ڈھول کو بجانے سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اثر اس کے علاوہ کچھ نہ ہوا کہ میرے شکار نے چیخ مار کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے جیک نے بھی اپنی کمان کھینچی اور اس کا تیر اس ننھے سؤر کے کان میں سے گزرتا ہوا زمین میں دھنس گیا اور اس طرح اسے زمین سے یوں نتھی کر دیا جیسے پن سے کاغذ۔

"اوہ! نشانہ چوک گیا آخر! جیک اپنی کلہاڑی اٹھا کر دوڑتے ہوئے چیخا۔ اس ننھے سؤر نے یہ دیکھ کر ایک چیخ ماری، زور لگا کر اپنا کان آزاد کرایا اور تیر سمیت اپنے پورے گلے کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جھاڑیوں میں گھس کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہاں ان کی خوفزدہ آوازیں ضرور دیر تک ہمیں سنائی دیتی رہیں

"یہ صورت حال واقعی قابلِ رحم ہے" جیک نے اپنی ناک کی نوک سہلاتے ہوئے کہا۔

"بہت!" میں نے بھی اپنی ناک ملتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا۔ اب ہمیں جلدی سے پیٹرکن کے پاس پہنچنا چاہیے" جیک بولا "کافی دیر ہو چکی ہے اور وہ پریشان ہو گا۔" اور پھر مزید کچھ کہے بغیر ہم تیزی سے جھاڑیوں میں راستے بناتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لکڑی کے تختے ایک طرف لگا دیے گئے تھے۔ آگ جل رہی تھی، کیمپ کی دوسری تیاریاں بھی تھیں۔ لیکن پیٹرکن کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہم پہلے تو بہت حیران ہوئے لیکن پھر جیک نے کہا کہ شاید وہ پانی لینے گیا ہو اور یہ بتانے کے لیے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ اس نے ایک زور کی آواز لگائی اور ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا کوٹ ایک طرف پھینکا اور کلہاڑی اٹھائی تاکہ لکڑی کے ایک دو ٹکڑے کاٹ لوں لیکن میں اپنی جگہ سے بمشکل ہلا ہی ہوں گا کہ اچانک دور سے ایک خوفزدہ کر دینے والی چنگھاڑ سنائی دی اور اور اس کے فوراً بعد ہی سؤروں کی تیز چیخوں کی آواز اور ایک تیز ہرّا۔

"مجھے یقین ہے کہ پیٹرکن کی ملاقات سؤروں سے ہو گئی ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"ہرّا!" فاصلے سے پیٹرکن کی چیخ پھر سنائی دی۔

ہم تیزی سے اس سمت مڑے جدھر سے آواز آئی تھی۔ جلد ہی پیٹرکن اس طرح آتا نظر آیا کہ اس نے اپنا بھالا فاتحانہ انداز میں اٹھا رکھا تھا اور اس کی نوک پر سؤر کا ایک چھوٹا سا بچہ ٹنگا تھا۔

"شاباش!" وہ قریب آیا تو جیک نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے زور سے کہا۔

"تم ہم تینوں میں بہترین نشانہ باز ہو۔"

"ذرا ادھر دیکھو جیک" پیٹرکن نے شکار کو

بھالے کی نوک سے اتارتے ہوئے کہا۔ "یہ سوراخ کبھی دیکھا تم نے!" اور یہ کہہ کر اس نے سؤر کے کان کی طرف اشارہ کیا۔ "اور کیا تم اس تیر کو بھی پہچانتے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے پہچان لیا" جیک بولا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہی تھا کہ تم پہچان لوگے" پیٹرکن بولا۔ "لیکن خدا کے لیے اب مزید کچھ نہ کہنا کیونکہ مجھے سخت بھوک لگی ہے اور تمھیں معلوم ہی ہے کہ سؤروں کے پورے گلّے پر جس میں ان کی موٹی امّاں بھی موجود ہو، حملہ کرنا کتنا خطرناک کام ہے۔"

ہم نے اب رات کے کھانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور جب اس دن کی کل کمائی ۔ ایک بیٹی چٹائی پر سجائی گئی تو اس کا نظارہ ہی ہمارا خون بڑھانے کو کافی تھا۔ سب سے پہلے چھوٹا سؤر تھا پھر ٹارو کی جڑ۔ پھر یام اور آلو اور آخر میں وہ چڑیا۔

سؤر بنانا اور پکانا خاصا مشکل کام تھا ہمارے لیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس سے پہلے کسی سؤر کو کاٹنے اور بنانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور اس لیے ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ شروعات کس طرح کی جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اس کام کے لیے اس کلہاڑی کے علاوہ کوئی دوسرا اوزار بھی نہ تھا۔ چاقو ہم گھر ہی پر بھول آئے تھے۔ آخر جیک اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا "بھئی اب ہمیں باتوں میں زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ ذرا پیٹرکن تم اسے پکڑنا۔ اس کی پچھلی ٹانگیں اس لکڑی کے ٹکڑے پر رکھ دو۔ بس اسی طرح۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے کلہاڑی کی ایک ہی ضرب میں اس کے جسم کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹ لیا۔

"اور اب دوسرا! یہ رہا!" اور اس طرح اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں کاٹ کر اس نے ان میں کئی چھوٹے چھوٹے سوراخ کیے اور ہر سوراخ میں لکڑی کا ایک نوک دار ٹکڑا گھسیڑ دیا اور پھر انھیں آگ کے سامنے بھننے کے لیے ڈال دیا۔ اس کے بعد اس چڑیا کا پیٹ کھولا گیا اسے نمکین پانی میں دھو کر اس سے بھی یہی سلوک کیا گیا۔ یہ دونوں چیزیں اس طرح پکنے لگیں تو ہم نے آگ کے نزدیک ہی ریت میں سوراخ کر کے اس میں اپنی سبزیاں دبا دیں اور پھر سوراخ کا منہ ڈھک دیا۔

ٹارو کی جڑ انڈے جیسی شکل کی، کوئی دس انچ لمبی اور چار پانچ انچ، موٹی ہو گی۔ اس کا رنگ بھورا تھا اور اوپری چھلکا کافی موٹا تھا۔ اس کا ذائقہ ائرلینڈ کے آلو سے ملتا جلتا اور مزے دار تھا۔ یام گول گول اور اس کا چھلکا بھورا مگر کھردرا تھا۔ یہ بہت میٹھا اور مزے کا تھا اور سؤر اور چڑیا کے ذائقہ کا تو پوچھنا ہی کیا۔ بس مزا آ گیا۔ یہ کہنا ہی پڑے گا کہ اس جزیرے پر کھائے گئے۔ اب تک کے تمام کھانوں میں یہ بہترین تھا بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ ایسا مزے دار کھانا ہمیں اپنے جہاز پر بھی کبھی نہیں ملا تھا۔ پیٹرکن نے حسب عادت یہ تبصرہ کیا کہ اگر ہم زیادہ دن اس جزیرے پر رہ گئے تو رات دن کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچیں گے۔ اس پر جیک نے کہا کہ اسے اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تو وہ پہلے ہی سے کر رہا ہے۔ اور اس طرح گپیں ہانکتے ہوئے ہم نے اپنا کھانا ختم کیا اور پھر ایک مونگے کی چٹان کے سائے میں نرم نرم شاخوں کے بستر پر سونے لیٹ گئے۔

باقی آئندہ

حافظ باقوی

بچھڑا

وہ دیکھو اک ننّھا بچھڑا ننّھا بچھڑا مُنّا بچھڑا
بھُولا بھالا پیارا بچھڑا گائے کی آنکھ کا تارا بچھڑا
اک کھونٹے سے بندھا کھڑا ہے دیکھنے میں معصُوم بڑا ہے
کھول کے دیکھو چھوڑ کے دیکھو خوب کُلانچیں مارے بچھڑا تو
خوب یہ ناچے خوب یہ اچھلے خوب یہ کھیلے خوب یہ کودے
اے لو اُس کی امّی آئی اس کے مُکھ پر شوبھا چھائی
دُودھ گوالا آکر دوہے پھر بچھڑے کو کھول کے چھوڑے
پہلے گائے اُسے چومے گی بچھڑے سے پھر یوں وہ کہے گی
"بچےّ مانیں بڑوں کا کہنا بیٹا ہر دم سُتھرے رہنا
دیکھو کتنے گندے ہو تُم میلے اور کچیلے ہو تم

پی لو دودھ دیئے دیتی ہوں
چاٹ کے صاف کیے دیتی ہوں"

ندیم علیگ

دُور کا دوست



کام کرنے والے

خالد:- سیر و سفر کا شوقین نوجوان۔
اعظم میاں:- خالد کا اسکول فیلو (اسکول کا ساتھی) اور مالدار تاجر۔
زلفی میاں:- ایک غریب مزدور
، زلفی کے دو بچے، پپّو اور ڈبّو اور نوکر وغیرہ

پہلا منظر

(رات کا وقت ہے۔ خالد ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک بوڑھا نوکر دروازہ کھولتا ہے۔)

نوکر: (سخت لہجے میں) کون ہو جی! کہاں سے آئے ہو؟ کیا نام ہے؟"

خالد: "میرا نام خالد ہے۔ اعظم میاں کا بچپن کا دوست ہوں۔ باہر سے آیا ہوں۔ میرے آنے کی اطلاع اعظم میاں کو کر دو۔"

(نوکر دروازہ بند کرکے اندر جاتا ہے۔ ذرا دیر بعد پھر آتا ہے۔)

نوکر: "اعظم میاں کی طبیعت ناساز ہے۔ آپ سے وہ صبح ملاقات کر سکیں گے۔ اندر آجائیے۔"

خالد: (اندر جاتا ہے) کتّا اُسے دیکھ کر غرّاتا ہے۔ نوکر کتّے کو پکڑ لیتا ہے)

نوکر: "میاں یہ کتّا ہر اجنبی کو دیکھ کر غرّاتا ہے، بھونکتا ہے یہ اس کی عادت ہے۔ ویسے یہ کاٹتا کبھی نہیں۔ آپ ڈریے نہیں۔"

خالد:- "نہیں بھئی میں کتّے کے کاٹنے سے تو نہیں ڈرتا،
لیکن اس کے کاٹنے کے بعد جو علاج ہوتا ہے وہ بہت
تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بس مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"
نوکر: "ہمارے آقا کو کتّے پالنے کا بہت شوق ہے۔ ایک
سے ایک عمدہ نسل کا کتّا پال رکھا ہے، خرگوش
اور لومڑی کے شکار میں بڑا مزہ آتا ہے .... اچھا
حضرت آیئے، آپ کو کمرہ دکھلا دوں۔ اب رات
بہت ہوگئی ہے آرام کیجئے۔ صبح ملاقات ہوگی۔"
خالد: "میاں، ایک گلاس پانی ....."
نوکر: "میاں رات کو پانی پینے سے زکام ہو جاتا ہے۔
اور پھر جاڑے کی رات، ٹھنڈا پانی، آپ کی آواز
بھی مجھے بھاری لگ رہی ہے، نہیں جناب آپ کو
اگر کچھ ہوگیا تو اعظم میاں میری جان ہی لے ڈالیں
گے۔ صبح کو آپ گرم گرم چائے پیجئے گا۔ آرام کیجیے۔
اچھا خدا حافظ" (چلا جاتا ہے)
خالد: (اپنے آپ سے) سبحان اللہ.... کھانا تو در کنار
پانی بھی میسر نہیں۔ بن بلائے مہمان کے ساتھ شاید
ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ خیر رات گزر ہی جائے گی۔
مگر بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

دوسرا منظر

صبح کا وقت۔ خالد کے سامنے چائے کے خالی
برتن رکھے ہیں۔ وہ ناشتہ کر چکا ہے.... اعظم میاں
کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ لمبا قد، گورا رنگ،
ہاتھ میں نفیس سی چھڑی ہے؛
اعظم میاں: ہلو، خالد صاحب۔ السلام علیکم، صبح بخیر۔"
خالد: (کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے ہاتھ ملاتا ہے) -
وعلیکم السلام۔ اعظم میاں۔
اعظم میاں: "بھئی معاف کرنا۔ میری طبیعت کچھ دنوں سے
خراب چل رہی ہے اس لیے رات کو تم سے ملاقات کے
لیے نہیں آسکا۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔!"
خالد: "نہیں .... بہت آرام ملا۔ لیکن سب سے پہلے مجھے
خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ ورنہ
مجھے ڈر تھا کہ ہم دونوں اتنے بدل گئے ہیں کہ شاید
پہچاننے میں مشکل ہوگی۔"
اعظم میاں: (کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے) "ہاں یہ تو بتاؤ
یہ بے سر و سامانی کی حالت میں، بغیر کسی اطلاع کے تم
کیسے آنکلے... کیا گھر سے ناراض ہوکر آئے ہو؟"
خالد: "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تم جانتے ہی ہو،
مجھے سیر و سیاحت کا شوق ہے۔ سمندری جہاز کے
ذریعے اپنے ملک کی سیر کے ارادے سے نکلا تھا...
تمھارے اس شہر کی بندرگاہ پہ جہاز آن کر رک گیا
اور کچھ خراب ہوگیا۔ جہاز کے کپتان نے بتایا کہ
جہاز کی مرمت میں ایک ہفتہ لگ جائے گا.... میں
ساحلی علاقے کی سیر کو نکل گیا۔ بدقسمتی سے جہاز تیسرے
دن ہی ٹھیک ہوکر روانہ ہوگیا، اور میری کرائے کی
رقم، سامانِ سفر سب چلا گیا۔ اب میرے پاس پھوٹی
کوڑی بھی نہیں ہے، اور اس اجنبی شہر میں بے سر و
سامان ہوں۔ اچانک خیال آیا کہ میرا اسکول کا ساتھی،
جس نے مجھے کئی بار اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی اسی
شہر میں رہتا ہے۔ پتہ پوچھتا پوچھتا تم تک آن پہنچا۔
یہ ہے میری مختصر سی داستان۔"
اعظم میاں:- افسوس.... یہ تو واقعی بہت برا ہوا.... مگر اس میں
تمھاری غلطی زیادہ ہے تم کو جہاز چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔"

خالد:- "ہاں اعظم میاں ... میری غلطی تھی ۔ اس کی سزا مجھے مل گئی، نقصان ہوا سو الگ اور پریشانی بھی اٹھانی پڑ رہی ہے - لیکن ہر مصیبت ایک تجربہ ہے"

اعظم میاں:- "مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے"

خالد: مصیبت پڑنے پر دوست ہی کام آتا ہے تم مجھے اتنی رقم ادھار دے دو کہ میں جہاز کا کرایہ ادا کر سکوں اور واپس گھر پہنچ سکوں ۔ گھر پہنچتے ہی رقم واپس بھیجنے کا انتظام کردوں گا"

اعظم میاں: (کھڑا ہو جاتا ہے) ...... ہوں .... بھئی خالد میاں ... تم نے وہ مثل ضرور سنی ہوگی کہ قرض محبت کی قینچی ہے ۔ میرے ابا جان مرحوم نے مرتے وقت مجھے وصیت کی تھی کہ دوستوں کو قرض مت دینا ۔ میں اس اصول پر زندگی بھر قائم رہوں گا ۔ ورنہ میرے ابا جان کی روح کو صدمہ پہنچے گا ۔ میں مجبور ہوں"

خالد: "اچھا ... تو اپنے اصطبل سے ایک گھوڑا ہی دے دو ... میں خشکی کے راستے سفر کر لوں گا .... گو اس میں مجھے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور وقت بھی بہت لگے گا"

اعظم میاں: مگر ذرا سوچو تو تمھارے پاس اپنے کھانے کو کچھ نہیں ہے ۔ تم گھوڑے کو کہاں سے کھلاؤ گے ۔ میرے ذہن میں ایک عمدہ ترکیب آئی ہے ...... یعنی ہر لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے ۔ اس ترکیب سے تم ایک کوڑی خرچ کئے بنا ساری دنیا کا سفر کر سکتے ہو .... (کونے میں رکھا ہوا ایک ڈنڈا اٹھاتا ہے) یہ ڈنڈا بہت مضبوط ہے ۔ اس سے تم گھوڑے کا کام بھی لے سکتے ہو ۔ یہ تمھاری حفاظت بھی کر سکتا ہے ۔ اور چوروں، بدمعاشوں سے بھی تم اس کی مدد سے نمٹ سکتے ہو ۔ اور یہ تم سے کھانے پینے کو بھی نہیں مانگے گا .....

(ڈنڈا خالد کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے) ہاں جب تم گھر پہنچ جاؤ تو خیریت کا خط ضرور لکھنا ۔ مجھے ایک ضروری کام ہے ۔ میں چلوں گا ۔ (چلا جاتا ہے)

خالد: (ڈنڈا ہاتھ میں لے کر) ایسے نامعقول دوست کے سر پہ یہ ڈنڈا مارنے کو دل چاہتا ہے ۔ کتوں کے ساتھ رہتے رہتے جانور بن گیا ہے ..... نامعقول ...."

تیسرا منظر

سڑک کا منظر ۔ لوگ ادھر ادھر آ جا رہے ہیں ... خالد ایک اجنبی سے مخاطب ہو کر

خالد: "میاں ذرا سننا ... یہاں کہیں قریب میں کوئی سرائے بھی ہوگی .... ؟"

اجنبی: "جناب میرا نام زلفی ہے ۔ آپ کس سرائے کا پتہ پوچھ رہے ہیں - یہ دنیا تو خود ایک بہت بڑی سرائے ہے - آپ پردیسی معلوم ہوتے ہیں ..."

خالد: "ہاں بھئی زلفی میاں - میں پردیسی ہوں - آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں"

زلفی میاں: "آپ پریشان نظر آتے ہیں - میں غریب آدمی ہوں - لیکن آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی"

خالد: آپ کا خیال درست ہے ۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں - اور ایک مصیبت کا مارا ہوا، ایک دوست کے پاس گیا تھا لیکن اب معلوم ہوا ۔ ہر دوست، دوست نہیں ہوتا - وہ اعظم میاں، جن کا اونچا مکان اس سڑک کی دوسری جانب ہے......

زُلفی میاں: بس بس ..... رہنے دیجیے .... ان کا
نام ہی کافی ہے۔ وہ اپنی کنجوسی کے لیے سارے
شہر میں مشہور ہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے غریب خانے
پر چلیے، وہیں باتیں ہوں گی۔

خالد: "ضرور چلوں گا..... آپ تو میرے لیے فرشتہ رحمت
بن کر آئے ہیں، کسی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

زلفی میاں: "خوب، خوب، غریب آدمی ہوں۔ میری
مہمان نوازی کیا۔ جو دال دلیا ہوگا۔ حاضر کروں گا۔
اچھا تو چلئے۔"

(دونوں چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر

(زلفی کا مکان۔ ایک کمرے میں ایک طرف چارپائی
بچھی ہوئی ہے۔ قریب ہی بوریے پر بیٹھے دو بچے
پڑھ رہے ہیں۔ خالد اور زلفی چارپائی پر بیٹھے ہیں۔)

خالد: "بھئی زلفی میاں، مجھے اب آرام کرتے کرتے ایک
ہفتے سے زائد ہو گیا۔ میری ماں نے میرے لیے سفر
خرچ بھی بھیج دیا ہے اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔"

زُلفی میاں: "خالد صاحب۔ طبیعت تو نہیں چاہتی کہ
آپ اتنی جلد چلے جائیں۔ بچے بھی "آپ سے
مانوس ہو گئے ہیں۔"

خالد: آپ سب کی محبت کی بدولت آپ کا گھر اپنے گھر جیسا
لگا۔ لیکن اب مجھے جانا ہی چاہیئے میری بوڑھی ماں
پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

پپو میاں: "چاچا خالد تو کیا آپ سچ مچ چلے جائیں گے۔؟"

ڈبو میاں: چاچا پھر ہمیں سمندر کی پریوں کی کہانیاں
کون سنائے گا؟"

خالد: "پپو میاں اور ڈبو میاں کے لیے میں گھر جا کر ڈھیر
ساری کتابیں کہانیوں کی بھیجوں گا۔"
(بچے خوشی سے تالی بجاتے ہیں) "واہ، واہ،
یہ تو اچھی بات ہے۔")

خالد: "ہاں دل لگا کر پڑھنا۔ اور کلاس میں سب سے
زیادہ نمبر لانے کی کوشش کرنا.....
(اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

پیارے بچو تم نے میری اُداسی کے دنوں
میں میرا دل بہلایا، تمہارا یہ احسان میں
کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں اپنا سفر نامہ
لکھوں گا۔ اس میں جہاں ایک طرف اپنے
بے وفا اور خود غرض دوست کا ذکر ہوگا
وہاں تم دونوں کا ذکر شاندار الفاظ میں ہوگا۔"

زُلفی: "خالد میاں..... ہم غریب آدمی ہیں۔ آپ کی
خاطر تواضع میں جو کمی رہ گئی ہو معاف کیجیے گا۔"

خالد: "ارے زلفی میاں۔ یہ تم کیا کہہ رہے
ہو۔ تمہارا دل تو سخی ہے۔ تم امیروں سے لاکھ درجے بہتر ہو جن
کے پاس بے شمار دولت ہے۔ لیکن
دل کے کنجوس ہیں۔ تم نے ایک اجنبی مسافر
کی جو مدد کی ہے جو احسان کیا ہے اس کا بدل
زندگی بھر نہیں ہو سکتا۔"

(چلا جاتا ہے) (پردہ گرتا ہے) ••

نغمۂ عزیز

عزیز مراد آبادی (ایم - اے - بی - ایڈ)

بات میری سنو! تم خدا سے ڈرو
شمعِ ایمان کو خوب روشن رکھو
علمِ دُنیا و دیں خوب حاصل کرو
فکرِ دُنیا عبث[۱] آخرت ٹھیک ہو
تلخ کامی نہیں مُسکراؤ، ہنسو
عزم و ہمّت کے تم زندہ پیکر بنو
ریگزاروں[۲] میں تم ابر[۳] بن کے چلو
فکرِ ماضی عبث وقت کا ساتھ دو
تم عزیزِ وطن
نُور بن کے چلو

۱ بے کار - ۲ ریگستان ریت کا میدان ۳ بادل

چچا غالبؔ کی رُوح سے معذرت کے ساتھ

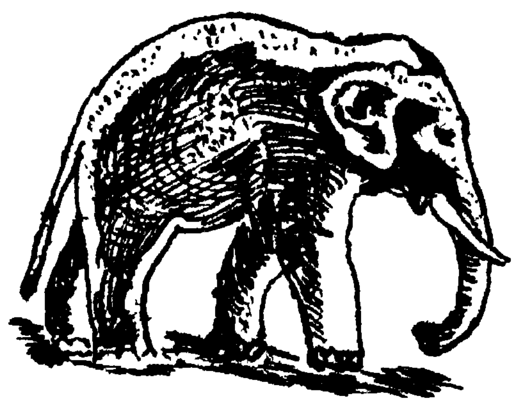
"کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی چھٹی نظر نہیں آتی
حلوہ ملتا ہے، پر نہیں ملتا چائے آتی ہے پر نہیں آتی
جو پڑوسی کے گھر میں آئی ہے وہ مٹھائی ادھر نہیں آتی
دودھ اور گھی "نظر نہیں آتا تُو بھی اس کی مگر نہیں آتی
امتحان کیا قریب ہے یارو "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟؟"
بس ریاضی کو دیکھ کر چپ ہوں "ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
سارے ٹیچر ہوں خوش سدا ہم سے اُس کی صورت نظر نہیں آتی
خوب سوتے مزے سے ہم لیکن
کوئی شب[۱] بے سحر[۲] نہیں آتی

۱ رات ۲ صبح

بنگلادیش کی لوک کہانی

ہاتھی کے پیٹ میں لومڑی

جناب احمد جمال پاشا



کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ جو اپنے ایک ہاتھی کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔ اور خاص موقعوں پر اس پر سوار ہوکر نکلتا۔ ایک دفعہ ہاتھی بیمار پڑگیا۔ بادشاہ نے بہتیرا علاج کیا مگر وہ مرگیا۔ بادشاہ کا دل ٹوٹ گیا۔ درباریوں کو بھی بہت افسوس ہوا۔

اُس زمانے میں مردہ ہاتھی کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً بادشاہ نے ہاتھی کی لاش ایک بڑے چشمے میں بہادینے کا حکم دیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لیے بہت مضبوط رسوں اور پانچ تنشو طاقتور آدمیوں کی ضرورت تھی۔ جو ہاتھی کی لاش شاہی فیل خانے سے کھینچ کر بہت دور بڑے چشمے تک لے جاتے۔

اس شاہی اصطبل کے نزدیک ایک لومڑی رہتی تھی۔ اسے کئی دن سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا تھا۔ بے چاری بہت بھوکی تھی۔ ایک برساتی سے ڈھکی ہوئی ہاتھی کی لاش دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ پیچھے سے برساتی کے نیچے گھس گئی اور اسے کھانا شروع کردیا۔ کھاتے کھاتے ہاتھی کے پیٹ کے اندر پہنچ گئی۔ اور اُسکی آنتیں تک چٹ کرگئی۔ یہ خیال تک نہ آیا کہ پورے دو دن سے ہاتھی کے پیٹ میں ہے۔ کھا رہی ہے اور آرام کررہی ہے۔

یہاں تک کہ وہ ہاتھی کا سارا گوشت کھاگئی۔ اب اسے اپنے گھر واپس جانے کی سوجھی۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کر بہت پریشانی ہوئی کہ جدھر سے وہ پیٹ پھاڑ کر کھاتی ہوئی ہاتھی کے جسم کے اندر گھسی تھی۔ وہ راستہ سوکھ کر سکڑ گیا ہے۔ اتنا سکڑ گیا ہے۔ کہ اب وہ ہاتھی کے پیٹ میں پھنس گئی ہے۔ باہر نہیں نکل سکتی ہے۔

پر چالاک لومڑی تھک کر نہیں بیٹھی۔ باہر نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ یہاں تک کہ اُس نے لوگوں کے قدموں کی چاپ سُنی اور ان کی باتیں سُنیں۔ اُس کے بعد وہ فوراً اندر سے چلائی۔

"میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ جا کر بادشاہ سے کہو کہ اس کا پیارا ہاتھی۔ جس کو وہ سمجھتا ہے کہ مر چکا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اگر بڑی مقدار میں گھی ہاتھی کے پیٹ پر ملا جائے تو وہ پھر زندہ ہو جائے گا۔"

جن لوگوں نے یہ بات سُنی وہ بھاگتے ہوئے بادشاہ کے پاس ہاتھی کی بات بتانے پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ پچاس من گھی مردہ ہاتھی کے پیٹ پر ملا جائے۔

سات دن تک سیکڑوں آدمی ہاتھی کے پیٹ پر گھی ملتے رہے اور جیسے ہی کھال دوبارہ ملائم ہو گئی تو لومڑی نے سوچا کہ اب وہ ہاتھی کے پیٹ سے نکل سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اُسے ان سب آدمیوں کو پہلے ہٹا دینا ہوگا۔ ورنہ جونہی اسے ہاتھی کے پیٹ سے نکلتے دیکھیں گے تو مار ہی ڈالیں گے۔ اس لیے وہ ہاتھی کے پیٹ میں سے پھر چلائی۔

"دوستو! میں اب کھڑا ہونے والا ہوں۔ لیکن میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ مجھ سے بہت دور فاصلے پر چلے جاؤ۔ اگر کھڑے ہونے میں مجھے چکر آ جائے اور میں گر پڑوں تو تم میں سے بہت سے میرے بوجھ سے کچل کر کہیں مر نہ جائیں۔"

جیسے ہی لوگوں نے یہ سُنا فوراً بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی بھی ہاتھی کے نیچے کچل کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اتنے تیز دوڑے جتنا دوڑ سکتے تھے۔

لومڑی نے موقع غنیمت جانا۔ جلدی سے ہاتھی کے پیٹ سے نکل جنگل میں بھاگ گئی۔ اس افراتفری میں کسی نے اسے بھاگتے بھی نہ دیکھا۔

اگر مکھیاں زندہ رہیں

امریکی سائنسدانوں کے ایک گروپ نے جو مکھیوں پر تحقیقات کر رہے ہیں بتایا کہ مادہ مکھی سے خارج ہونے والے مادے کو لیبارٹری میں دوسری کیمکل کے ساتھ ملا کر مکھیوں کو مارنے اور بانجھ بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نے کہا کہ اگر ساری مکھیاں زندہ رہیں تو پوری زمین ۴۷ فٹ دبیز چادر سے ڈھک جائے گی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسے کیڑے بھی ہیں جو ان کی نسل کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

بقیہ بھلا بُرا صد ۲۹ سے

خاطر میرا جسم بھرشٹ کرا دیا جو ڈوم گر ذات کے لڑکے سے میرا بیاہ کر دیا۔"

راجہ ذات پات کا قائل ہی نہ تھا۔ وہ انسان کی ذاتی شرافت اور خوبیوں کو مانتا تھا۔ بھلا خوبیوں سے بھرا تھا۔ راجہ نے اسے ڈانٹ دیا اور بھلا کی اور عزت افزائی کی۔ اور اس طرح بُرا یہاں بھی ذلیل ہوا اور اس کی ترکیب چوٹ پڑ گئی۔

مالوہ (مدھیہ پردیش) کی لوک کہانی

مصنف : پ۔ چ۔ جوشی
ترجمہ : خلیق انجم اشرفی

بھلا بُرا

ایک ٹھاکر تھے۔ اچھے۔ مالدار آدمی تھے لیکن خیر خیرات کرنا انھوں نے نہیں سیکھا تھا۔ ان کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام رکھا 'بھلا'، اور چھوٹے کا 'برا'۔ ٹھاکر ٹھکرائن تو مر گئے اور جائیداد خاندان والوں نے بیچ کھائی۔ لڑکے سمجھدار ہوئے تو غریبی میں گھرے تھے بھلا جنگل سے لکڑیوں کی مولی[1] لاتا اور اسے بیچ کر دونوں بھائی پیٹ پالتے۔

بھلا گاؤں والوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ سبھی اس سے محبت کرتے۔ لیکن برا کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا وہ تھا بھی تو جھگڑالو۔ دن رات لوگوں سے جھگڑتا پھرتا۔ تنگ آکر ایک دن گاؤں والوں نے بھلا سے کہا "برا کو بھی اپنے ساتھ جنگل لے جایا کرو۔ وہ بیکار پڑا پڑا سارے گاؤں والوں سے لڑتا رہتا ہے"

برا، بھلا کے ساتھ جنگل جانے لگا۔ ایک دن جنگل میں برا نے بھلا کے لیے بڑی مولی باندھی اور اپنے لیے چھوٹی اور پھر اس سے جھگڑنے لگا۔ بولا "تو تو رات رات بھر چبوترے پر بیٹھا رہتا ہے۔ تیرے دیر سے گھر آنے کی وجہ سے مجھے اُٹھ کر کواڑ کھولنے پڑتے ہیں

میں دن بھر کام کرتا ہوں اور رات کو بھی میری نیند خراب ہوتی ہے"۔ بھلا نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ خاموشی سے اپنا بستر اُٹھا کر چبوترے پر لے گیا اور اس دن سے وہیں سونے لگا۔

بھلا کی مولی پہلے بک جاتی لیکن برا کی مولی کوئی نہ لیتا وہ سارا سارا دن مولی کا بوجھ اٹھائے پھرتا تب کہیں جاکر آٹھ آنے کی ہوتی تو چار آنے کی بکتی۔ یہ دیکھ کر برا جل گیا اور ایک دن پھر بڑے بھائی سے لڑ پڑا کہ تو مولی مت لایا کر۔ بھلا نے مولی لانا بند کر دیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ برا کو وہی آدھے دام ملتے۔ ایک دن برا پھر بھلا سے لڑنے لگا کہ تو دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے۔ کام نہیں کرے گا تو اَن کہاں سے آئے گا؟"

بھلا بولا "بھائی۔ تمھارے ہی کہنے سے بیٹھا تھا۔ اب تم مولی لانے کو کہتے ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں"

دونوں چل پڑے۔ پانی کا کاچبا (چمڑے کی تھیلی) پانی سے بھر کر کندھے پر ٹانگ لیا۔ جیٹھ بیساکھ کے دن تھے۔ تیز لو چل رہی تھی۔ برا ڈونگر (پہاڑی) پر جاکر بھلا سے پھر جھگڑنے لگا "اتنے دنوں تک تو مزے سے بیٹھا آرام کرتا رہا۔ اب دونوں کے

---

[1] گٹھا یا ڈھیر

شان بھارتی

انسانیت کا دیوتا

انسانیت کا دیوتا نہرو کا وہ چہیتا
مانند برقِ سوزاں دشمن پہ چھا گیا تھا

کشمیر کی ادا پر تن من لٹا دیا تھا
تیروں کی بارشوں میں چلنا سکھا دیا تھا

ہر سخت مرحلے کو طے کر کے چل دیا تھا
"دشمن کو پیار کرنا!" یہ کہہ کے چل دیا ہے

آؤ کہ آج مل کر عہدِ وفا نبھائیں
جو کہہ گئے بہادر[1] وہ کر کے ہم دکھائیں

---

[1] لال بہادر شاستری

سیف سہسرامی

ببلو

پیارا ببلو چاند کا ٹکڑا
کالی آنکھیں گورا مکھڑا

عمر ابھی ہے ایک برس کی
لیکن اس کی عقل ہے اچھی
رکھتا ہے پہچان سبھی کی
کہتا ہے یہ ابّی، امّی

چمکارو تو مسکاتا ہے
ٹھمک کے گود میں آجاتا ہے
پیار سے کب یہ گھبراتا ہے
کب یہ کسی سے شرماتا ہے

ابّی کی آنکھوں کا تارا
امّی کے بھی دل کا سہارا
بھائی بہنوں کا ہے پیارا
گھر بھر کا ہے راج دلارا

بھولی بھالی صورت اچھی
صورت اچھی سیرت اچھی
عادت اچھی فطرت اچھی
اس کی نیک طبیعت اچھی

سیفؔ جوان ہو بچپن اس کا
پھولے پھلے یہ گلشن اس کا



....اور غنچے کھِل اُٹھے

خلیق انجم اشرفی

یہ ابھرتے سورج کے دیس جاپان کی ایک لوک کہانی ہے اس زمانے میں جاپان پر بادشاہ ٹسے موالس کی حکومت تھی۔ جاپان کی راجدھانی ٹوکیو کے ایک خوبصورت ہرے بھرے دیہات میں لکڑی کے ایک چھوٹے سے بھورے رنگ کے مکان میں ایک بڑے میاں اور ان کی بڑی بی رہتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا پالتو کتا تھا ننّا پیارا سا انیکو بھی رہتا تھا لمبے بالوں والا بھورے رنگ کا یہ کتا دونوں میاں بیوی کی آنکھ کا تارا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اس کتّے ہی کو اپنی اولاد سمجھتے اور اس سے بہت پیار کرتے۔ ہر طرح سے اس کے آرام کا خیال رکھتے کھانا کھاتے بیٹھتے تو انیکو کا ریشمی گدا دسترخوان کے قریب بچھایا جاتا۔ وہ اس پر مزے سے بیٹھ جاتا اور پھر وہ اسے مچھلی کے ٹکڑے نکال کر دیتے جاتے اور وہ مزے لے کر کھاتا رہتا۔ بڑی بی بازار جاتیں تو انیکو کے گلے میں چاندی کے بٹن لگا سرخ ریشم کا پٹّا باندھ دیتیں اور بڑے پیار سے اپنے ساتھ لے جاتیں۔

بڑے میاں کسان تھے مرغ کی اذان سن کر اپنے دھان کے کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔ اور جب سورج کا سرخ گولا جھیل کے نیلے نیلے پانی میں ڈوبتا ہوتا تو گھر لوٹتے۔

انیکو روز ان کے ساتھ جاتا اور کھیت کے آس پاس پھرتا رہتا۔

بڑے میاں کی سفید مرغی بھی کیڑے چننے میں مصروف رہتی لیکن انیکو اس سے کبھی کچھ نہ کہتا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ بڑے میاں ہل چلا رہے تھے کہ انیکو دوڑتا ہوا بڑے میاں کے پاس آیا اور اپنے پنجوں سے ان کا پاجامہ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ پہلے تو بڑے میاں نے یہ سوچ کر کہ روز کی طرح انیکو کھیل رہا ہے، کچھ دھیان نہ دیا۔ لیکن جب وہ بار بار دانتوں اور پنجوں سے انھیں ایک طرف چلنے کا اشارہ کرتا رہا تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

چند ہی گز چلنے کے بعد انیکو ایک جگہ رک گیا۔ اور اچھل اچھل کر اپنے پنجوں سے مٹی ہٹانی شروع کر دی

بڑے میاں سمجھ گئے ہو نہ ہو یہاں کوئی ہڈی یا خشک مچھلی کا ٹکڑا دبا ہوا ہے اور انیکو اسے نکلوانا چاہتا ہے۔

اپنے پیارے کتّے کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے پھاوڑے سے زمین پر ایک ضرب لگائی۔ کھن کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے ان کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر موجود تھا۔ انھوں نے حیرت سے اپنی آنکھیں ملیں یہ خواب نہ تھا۔ سچ مچ سونے کے سکّے۔ ڈھیروں سکّے سورج کی روشنی میں جگمگاتے ان کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ انھوں نے سونے کے

سے بیٹے اور گھر کی طرف چل دیئے۔

اتنی ساری اشرفیاں دیکھ کر بڑی بی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لیکن اس دولت نے انھیں مغرور نہیں بنایا انھوں نے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا دوستوں اور عزیزوں کی شاندار دعوت کی اور غریب پڑوسیوں کو بھی اس دولت کا حصہ دار بنایا اور اب اینکو کا تو پوچھنا ہی کیا تھا اس کی تو اتنی خاطر کی گئی کہ وہ گھبرا سا گیا۔

اسی گاؤں میں ایک بدمزاج بوڑھا اور اس کی بڑھیا بیوی بھی رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کتوں کو مارا اور دھتکارا ہی تھا اپنے پڑوسی کی خوش قسمتی کی داستان سن کر انھوں نے بھی مالدار ہونے کی ٹھانی۔ ایک دن ان لوگوں نے چپکے سے اینکو کو پکڑ لیا اور اس کے آگے خوب مچھلیاں ڈال دیں تاکہ وہ خوش ہو کر ان کے لئے بھی کوئی خزانہ ڈھونڈے لیکن اینکو جسے ان ظالم میاں بیوی نے ہمیشہ مارا اور دھتکارا تھا کاہے کو مچھلیوں کو منہ لگاتا۔ غصے میں آکر بوڑھے نے اینکو کے گلے میں رسی باندھی اور اسے گھسیٹتا ہوا کھیتوں میں لے گیا۔ پھاوڑا بھی اس کے ساتھ تھا۔ پیچھے پیچھے بڑھیا بھی تھی۔ جیسے ہی وہ ایک کانٹے دار جھاڑی کے پاس پہنچے اینکو نے زمین میں اس طرح پنجے مارنا شروع کئے گویا وہاں کوئی بڑا خزانہ دفن ہو۔

جلدی کرو۔" لالچی بوڑھے نے خوشی سے ناچتے ہوئے چیخ کر اپنی بیوی سے کہا "پھاوڑا مجھے دو" پھاوڑا لے کر بوڑھے نے زمین کھودنی شروع کی کھودتا رہا لیکن کچھ نہ ملا۔ سوائے اس کے کہ گڑھا گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر غم و غصے کے مارے بوڑھے کی بری حالت ہوگئی۔ اور اس نے اینکو کو اتنا پیٹا کہ وہ مر گیا۔ اور وہ اسے وہیں دفن کر کے ناکام و نامراد گھر لوٹ آیا۔

اسی رات کو بڑے میاں نے جو اپنے چہیتے کتے کی گمشدگی سے بے حد پریشان تھے۔ اسے خواب میں دیکھا۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا۔ فلاں کھیت میں جو کانٹے دار پیڑ ہے اسے کاٹ کر اس کی لکڑی سے دال دلنے کی چکی بنائیے۔ بڑے میاں نے دوسری صبح اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ اور پھر انھوں نے چکی میں ڈھیر ساری دال ڈال کر اسے چلانا شروع کیا۔ اور اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ چکی سے دال کی بجائے چمکدار سونے کے مہین مہین ٹکڑے گر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں چکی کے نیچے رکھا برتن سونے کے چمکدار ٹکڑوں سے بھر گیا۔

بڑے میاں کا ظالم پڑوسی اپنی کھڑکی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

وہ فوراً آیا اور بڑے میاں سے ایک دن کے لئے جادو کی چکی لے لی۔ بڑے میاں بہت شریف اور بامروت آدمی تھے ہی انھوں نے کچھ پوچھے بغیر چکی دے دی۔

ظالم بڑھا خوشی خوشی گھر آیا اور بڑھیا سے دال لانے کو کہا۔ جلدی جلدی چکی میں دال ڈال کر بوڑھے نے اسے گھمانا شروع کیا۔ لیکن یہ کیا! چکی سے سونے کے ذرے تو نکلے نہیں ان کی جگہ مٹی نکل رہی تھی بوڑھا اور بڑھیا کو سخت تاؤ آیا۔ اور مارے غصے کے انھوں نے چکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں چولھے میں ڈال دیا۔

اس کے کچھ دن بعد بڑے میاں نے پھر خواب میں اینکو کو دیکھا۔ اس نے بڑے میاں کو بتایا کہ کیسے اس ظالم بوڑھے اور بڑھیا نے اس چکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے جلا دیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ چکی کی راکھ لے کر خزاں کے مارے درختوں پر چھڑک دیجئے۔ اس میں پھر سے پھول کھل اٹھیں گے۔

بڑے میاں صبح اٹھ کر اپنے بدمعاش پڑوسی کے گھر گئے اور بڑی عاجزی سے چٹکی کی راکھ مانگی ۔ ظالم بوڑھے اور بڑھیا نے شرمندہ ہونے کی بجائے الٹے ناک بھوں چڑھائی اور انھیں برا بھلا کہا۔ لیکن چٹکی کی راکھ لے جانے پر اعتراض نہ کیا اور بڑے میاں ٹوکری بھر کر راکھ لے آئے ۔

گھر آکر بڑے میاں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے چھوٹے سے باغ میں گئے ۔ خزاں کا موسم تھا اور تمام درخت ننگے کھڑے تھے ۔ ان کا محبوب چیری کا خوبصورت پیڑ بھی غنچوں سے محروم تھا۔ بڑے میاں نے راکھ کی ایک چٹکی اس پر چھڑک دی ۔ اور بس ۔ ایک لمحہ میں چیری کا درخت گلابی گلابی شگوفوں سے بھر گیا۔ اور ہوا میں ان کی مست کر دینے والی خوشبو مہکنے لگی ۔

اسی دن بڑے میاں کو خبر ملی کہ ان کا محبوب بادشاہ ڈیمیو ان کے گاؤں کے قریب سے گزرنے والا ہے ۔ وہ فوراً اپنے بادشاہ کے دیدار کیلئے چل پڑے اور اپنی راکھ کی ٹوکری بھی ساتھ لے لی ۔ جیسے ہی بادشاہ کی چمکدار گاڑی جسے چمکدار وردیوں والے آٹھ مزدور کھینچ رہے تھے ۔ قریب آئی ۔ بڑے میاں جھٹ چیری کے ایک ٹنڈ منڈ درخت پر چڑھ گئے ۔ یہ درخت سڑک کے کنارے کھڑا تھا ۔

بادشاہ ڈیمو کے زمانے میں جاپان میں یہ رواج تھا کہ جہاں سے بادشاہ کی سواری گزرتی لوگ اپنے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکیاں بند کر لیتے ۔ بلکہ کاغذ لگا کر ان کے سوراخ تک بند کر دیتے تاکہ کوئی بے ادب اوپر سے بادشاہ کو دیکھنے کی گستاخی نہ کرے ۔ لوگ سڑک کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑے ہو جاتے اور بادشاہ کی سواری نزدیک آتے ہی ادب سے گھٹنوں پر جھک جاتے ۔ اس رواج کے ہوتے ہوئے بڑے میاں کا درخت پر چڑھ کر بادشاہ کے سر کے اوپر ہو جانا بڑی ہی گستاخانہ حرکت تھی ۔

جلوس نزدیک آتا گیا ۔ ہوا میں رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے ۔ سپاہیوں کے خود، تلواریں اور نیزے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے ۔ قدم سے قدم ملائے سپاہی بڑی شان سے مارچ کر رہے تھے ۔ جلوس میں سب سے آگے ایک نقیب پکارتا چل رہا تھا " باادب باملاحظہ ہوشیار ۔ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے ادب سے جھک جاؤ ادب سے جھک جاؤ ۔ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے ۔"

اچانک نقیب کی نظر بڑے میاں پر پڑی پہلے تو اس نے غصے میں آکر پکارنا چاہا ۔ لیکن پھر ان کی ضعیفی پر ترس کھا کر یہ ارادہ ترک کر دیا ۔ اور اسی طرح پکارتا چلا گیا ۔

جیسے ہی بادشاہ سلامت کی سواری اس چیری کے درخت کے نیچے پہنچی بڑے میاں نے ایک چٹکی راکھ درخت پر چھڑک دی ۔ اور دوسرے ہی لمحے پوری فضا چیری کے گلابی گلابی شگوفوں کی خوشبو سے مہک اٹھی ۔ بادشاہ نے چونک کر نظر اٹھائی تو بڑے میاں نے ایک شاخ پکڑ کر ہلا دی ۔ اور بادشاہ پر پھولوں کی بارش ہو گئی ۔ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں بادشاہ نے جلوس کو رکنے کا حکم دیا ۔ اور بڑے میاں کو نیچے آنے کا اشارہ کیا ۔ بڑے میاں نیچے آکر بادشاہ کے سامنے گھٹنوں پر جھک گئے ۔ بادشاہ نے انھیں اٹھنے کا حکم دیا اور فرمایا ۔ مابدولت آپ سے بہت خوش ہیں ۔ جیسا حیرت انگیز استقبال آپ نے مابدولت کا کیا ہے ۔ ویسا آج تک رعایا کے کسی فرد نے کسی ملک کے بادشاہ کا نہ کیا ہوگا ۔

اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے انھیں زرکار خلعت اور ڈھیروں اشرفیاں انعام میں دی گئیں اور سب سے

بڑی خوشی کی بات تو یہ تھی کہ بادشاہ نے انھیں اپنے محل آنے
کی دعوت بھی دی۔ بڑے میاں خوشی اور فخر کے جذبات میں
ڈوبے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ اپنی عزیز بیوی کو بھی
اس خوشی میں شریک کریں۔

ادھر لالچی اور بدنیت بڈھے نے یہ دیکھا تو بھاگا بھاگا
لپٹ گھر گیا اور چکی کی پی ہوئی راکھ ایک ٹوکری میں بھر لیا۔
اور بڑے میاں کی طرح چیری کے ایک ٹنڈ منڈ درخت
پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی بادشاہ کی سواری وہاں پہنچی
بوڑھے نے مٹھی بھر راکھ درخت پر پھینکی لیکن یہ کیا۔ وہاں
پھول تو پھول پتی تک نہ نکلی۔ درخت ویسا کا ویسا
کھڑا رہا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ راکھ کے ذرات بادشاہ سلامت
اور ان کے حواریوں کی ناک اور آنکھوں میں گھس گئے۔ کھانستے
کھانستے اور چھینکتے چھینکتے ان کا برا حال ہو گیا۔

سپاہیوں نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھیں کس بے
ہودہ اور بدتمیز نے بادشاہ سلامت کی شان میں یہ
گستاخی کی ہے۔ بوڑھے کے ہاتھ میں راکھ بھری ٹوکری
دیکھ کر وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گئے۔ اسے کھینچ کر درخت
سے اتارا اور گھسیٹتے ہوئے بادشاہ سلامت کے حضور
میں پیش کر دیا

"عالی جاہ۔ یہی ہے وہ گستاخ اور بدتمیز بڈھا
جو ادھر درخت پر چڑھ کر عالم پناہ کے فرق مبارک پر راکھ
پھینک رہا تھا۔ حکم ہو تو ابھی گردن اڑا دی جائے۔"

بادشاہ نے غصہ بھری نظریں اس پر ڈالیں اور
گرج کر کہا "تیرے بڑھاپے پر ترس آتا ہے ورنہ گستاخی
تو وہ (قصور) ایسی تھی کہ تیرا سر قلم کر دیا جاتا۔ جا ما بدولت
نے تیری جان بخشی کی لیکن کل صبح کا سورج طلوع ہونے
سے پہلے پہلے تو ذلت سمیت ہمارا ملک چھوڑ دے۔"

اس طرح ظالم بڈھے بڑھیا کو جلا وطنی نصیب ہوئی اور
نیک دل بڑے میاں اور ان کی مہربان بیوی مزے
سے عیش کی زندگی بسر کرنے لگے ::

آدھی ملاقات

مارچ کا پیام تعلیم مل گیا ہے۔ ٹائٹل پسند آیا مگر ہر بار ایک ہی رنگ نہ دیجیے۔ رنگ بھی بدل بدل کر دیا کیجیے۔ میری کہانی کی اشاعت پر دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ ابھی تو تین چار کہانیاں باقی ہیں۔ ایک ایک کرکے وہ بھی شایع کردیجیے تو پھر نئی نئی دوسری زبانوں اور ملکوں کی دلچسپ کہانیاں آپ کو روانہ کروں۔

مواد کے لحاظ سے اس بار کا پیام تعلیم خوب ہے۔ تصویریں گو بہت عمدہ نہیں پھر بھی ان کی موجودگی سے بڑی مسرت ہوئی۔ یہ بھی میرے خیال میں بیگم شاہد صاحب کا کارنامہ ہے انھیں میرا شکریہ اور مبارک باد پہنچادیجیے۔ امید ہے کہ وہ اسی طرح کرم فرمائی کرتی رہیں گی۔ محترم مشیر الحق صاحب کا مضمون "امتحان" مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ یہ مضمون بڑا عبرت انگیز ہے اور ساتھ ہی ساتھ سبق آموز بھی۔ ہندوستانیوں کی بے ایمان فطرت غیر ممالک میں بھی ہمیں شرمندہ اور بدنام کراتی ہے۔ غلام ربانی صاحب کا مضمون بھی بہت خوب ہے۔ ان سے اور چیزیں بھی لکھوائیے۔ اس میں ایک دو کتابت کی بے ڈھب غلطیاں صفحہ پر نیچے سے دوسری سطر (پہلا کالم) میں "لفظ "لکھا" کی جگہ "لٹکا" ہونا چاہیے۔ اسی صفحہ پر دوسرے کالم میں اوپر سے دسویں سطر میں "جھٹ" کی جگہ "جھوٹ جھٹ" ہونا چاہیے۔

اس بار نہ صرف مضمون اور کہانیاں اور نظمیں خوب ہیں بلکہ نام بھی بڑے بڑے ہیں۔ خدا کرے پیام تعلیم اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

انجم اشرفی

آپ کی عنایت سے پیام تعلیم مسلسل مل رہا ہے۔ اس بار رشید حسن خاں صاحب کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکی ہے۔ وہ بچوں کے وسیلے سے ہمیں بھی لکھنا پڑھنا سکھا رہے ہیں۔ میں نے بھی اک مضمون اپنے کالج کے لڑکوں کے لیے لکھا تھا یہاں فاعل "نے" کا قطعاً استعمال نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے لڑکوں کی اُردو تحریر غلط اور تکلیف دہ ہوتی ہے اور تو اور اکثر لڑکے "کر" اور "کے" کے فرق سے بھی نا آشنا ہیں۔ اپنے مضمون میں، میں نے اسی طرف توجہ دلائی تھی۔ لڑکے تو لڑکے اساتذہ تک ایسی غلطیاں کرتے ہیں (اُردو کا خدا حافظ) رشید حسن خاں صاحب کے مضامین ایسے لوگوں کے لیے تو بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر خدا انھیں پڑھنے کی توفیق دے۔

رؤف خیر حیدر آباد

بھئی "کہانی نمبر" ملا تھا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ خود کو مستثنیٰ قرار دے کر میں یہ کہوں گا کہ اس نمبر میں لکھنے والوں نے بچوں کے ادب کے لیے ایک اچھا سرمایہ مہیا فرمایا ہے۔ اس کامیابی پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں مختلف زبانوں سے سرمایہ فراہم کرنے میں جناب خلیق انجم خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنی محنت سے نہ صرف یہ کہ اس نمبر کو کامیاب بنایا ہے بلکہ اُردو کو ایک قیمتی سرمایہ بخشا ہے۔ مگر غرض ہے کہ میں کس کس کا نام لوں، ایک مجھے چھوڑ کر ہر ایک کامیاب ہے یوں کہیے کہ "ایک ایک کا جواب ہے سب ہی ہیں لاجواب"

ناظم میواتی

جناب قیصر سرمست

بیربل نے تان سین کی تان توڑی



بیربل۔ اکبر اعظم کا جتنا مُنہ چڑھا تھا اتنا ہی دوسرے درباری اس سے حسد کرتے تھے ہمیشہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بیربل بھی ایک ہی کائیاں تھا کبھی ان کی زد میں نہ آتا۔ صاف بچ کر نکل جاتا۔ اور یہ لوگ غصّہ میں اپنا ہی منہ نوچ کر رہ جاتے۔ پھر سب سر جوڑ کر بیربل کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کی تدبیروں میں لگ جاتے۔

ایک مرتبہ تقریباً سب درباریوں نے مل کر بادشاہ سے شکایتاً کہا " خداوند، بیربل میں ایسی کیا خوبی ہے جو حضورِ والا کی اس پر اتنی نظرِ کرم ہے۔ تان سین کو ظلِ الٰہی بھی پسند فرماتے ہیں اور یقیناً تان سین کسی ہیرے سے کم نہیں۔ کیوں نہ بیربل کی جگہ تان سین کو دی جائے "۔

اس طرح کی باتیں تقریباً روزانہ اکبر کے کانوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اکبر ان باتوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس

دن درباریوں کے اصرار پر اکبر اعظم کی تیوری پر بل پڑ گئے، مزاج ایک دم بگڑ گیا۔ بولا ”تم لوگ ہمیشہ بیربل کو ہماری نظروں سے گرانے کی کوشش کرتے رہتے ہو، ہم تمھیں قائل کرنے کے لیے بیربل اور تان سین کا امتحان لیتے ہیں۔“

یہ کہہ کر قلم دان منگوایا۔ برما کے بادشاہ کے نام دو خط لکھے۔ ایک بیربل کو دیا، دوسرا تان سین کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”یہ خط برما کے بادشاہ تک پہنچا دیں۔ اور سخت تاکید کر دی کہ راستے میں اس خط کو کھولنے والے کی سزا موت ہے۔“

اب تمام درباری پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بیربل اور تان سین سفر کی تکالیف اٹھاتے، گرتے پڑتے بہ ہزار دقت منزل مقصود (برما) پہنچے۔ برما کے بادشاہ نے اکبر اعظم کے درباری ہوتے کے ناطے ان لوگوں کی خوب خاطر مدارات کی۔ ہندوستان کے حالات دریافت کیے۔ بیربل اور تان سین نے اپنے اپنے خط نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔

برما کے بادشاہ نے جو یہ خط پڑھے تو سناٹے میں آ گیا۔ ان دونوں کو تو ادھر سفر کی تکان دور کرنے کا حکم دے کر رخصت کر دیا۔ ادھر ان کے دربار سے ہٹتے ہی اپنے وزیروں اور درباریوں سے مشورہ کرنے لگا کہ ان خط لانے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ بے چارے درباری کیا مشورہ دیتے؟ سب ہی تو پریشان تھے۔ کیوں کہ ان خطوں میں لکھا تھا۔ کہ ”خط لانے والے کو قتل کروا دیجیے۔“ یہ اپنی نوعیت کی انوکھی اور عجیب بات تھی۔ دربار میں فیصلہ ہوا کہ خط لانے والوں سے پہلے پوچھ لیا جائے کہ انھوں نے کیا جرم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی مناسب قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن دونوں کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے انھیں مخاطب کرکے کہا ”تمھارے بادشاہ نے ان خطوں میں لکھا ہے کہ خط لانے والوں کا سر قلم کر دو اب تم ہی بتاؤ کہ تمھارا جرم کیا ہے؟“

بیچارے بیربل اور تان سین کے فرشتوں کو خود خبر نہیں تھی تو کیا بتاتے؟ خط کا مضمون سن کر بیربل تو سوچ میں پڑ گیا کہ اصل بات کیا ہو سکتی ہے لیکن میاں تان سین کے تو حواس گم ہو گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ خوف کے مارے سارے بدن کا جیسے خون خشک ہو گیا۔

ان دونوں کو ایک ہفتہ سوچ کر جواب دینے کے لیے جیل میں رکھا گیا۔

تان سین جیل خانے میں لگا بیربل کی خوشامد کرنے کہ کسی طرح کوئی تدبیر لڑا کر اس وقت جان بچا لو میں زندگی بھر تمھارا احسان [illegible]

بیربل نے کہا بھائی تان سین ایک [illegible] کے بعد جب یہ لوگ ہمیں قتل کرنے چلیں تو تم خاموشی سے ان کے ساتھ [illegible] اگر تمھیں قتل کریں تو میں کہوں گا پہلے [illegible] اور مجھے قتل کرنے لگیں تو تم کہنا پہلے مجھے قتل کرو۔ تمھارا کام بس اتنا ہی ہوگا باقی میں دیکھ لوں گا۔“

مہلت کا ایک ہفتہ ختم ہو گیا اور ان دونوں کو قتل گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ اتفاقاً تان سین کی باری پہلے آئی۔ بیربل نے چلا کر جلاد سے کہا۔ ٹھہرو! ان سے پہلے مجھے قتل کرو!!“

جلاّد نے تان سین کو ہٹایا، بیربل کو قتل کرنا چاہا تو تان سین نے تان ماری "نہیں پہلے مجھے قتل کرو!" اسی طرح کئی بار ہوا تو جلاّد جھلا گیا اور ان دونوں کو دوبارہ بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا اور سارا قصّہ سنایا۔ بادشاہ اب تو پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا کہ مرنے سے یہ لوگ گھبرانے کی بجائے خود کو پہلے پیش کر رہے ہیں۔

بادشاہ نے غصّے میں آکر کہا تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ نہ تو اپنا جرم بتاتے ہو۔ نہ اپنے جرم کی سزا میں خاموشی سے سزا پانے کو تیار ہوتے ہو۔

بیربل نے کہا "اے بادشاہ۔ آپ جرم کی نوعیت جانے بغیر ہمیں قتل کروا دیجئے۔ رہا پہلے قتل ہونے کی خواہش! تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی اگر اپنے بادشاہ کے حکم پر پہلے سر کٹوا دیں۔"

برما کے بادشاہ نے جب بہت زیادہ اصرار سے پوچھا تو بیربل نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہمارے شہنشاہ آپ کے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ پسند نہیں کہ ناحق بیگناہوں کا خون بہائیں یا جنگ کرکے ملک پر قبضہ کریں۔ اس لیے نجومیوں کے بتائے ہوئے طریقے پر آپ کا ملک حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

برما کے بادشاہ نے اپنے ملک کی ہاتھ سے نکل جانے کی بات سنی تو سناٹے میں آگیا۔ سنبھل کر پوچھنے لگا کہ وہ کیا طریقہ ہے ہمیں بھی بتاؤ؟"

بیربل بولا "ہمارے نجومیوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ہم دونوں میں سے جو بھی پہلے آپ کے حکم سے قتل ہوگا وہ قتل کے بعد بہت جلد دوبارہ اسی ملک میں پیدا ہوگا اور آپ کے تخت اور تاج پر قبضہ کرلے گا۔ اس کے بعد اس ملک کو اپنے بادشاہ کے حوالے کر دے گا یہی وجہ ہے کہ قتل گاہ میں ہم ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہ رہے تھے۔"

بادشاہ نے یہ سارا ماجرا سن کر کہا "میں تم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کراؤں گا۔ میں تمھارے بادشاہ کا باج گزار نہیں ہوں جو اس کا حکم مانوں گا۔ تم لوگ آزاد ہو جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

بیربل نے کہا میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ہم ایک خاص مقصد کے لیے آئے ہیں۔ اگر آپ قتل کروانا نہیں چاہتے تو ہمارا یہاں ٹھہرنا ہی بیکار ہے۔ ہمارا لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔

برما کے بادشاہ نے انھیں عزت و احترام سے اپنے ملک کی سرحد تک پہنچانے کا انتظام کردیا... دہلی پہنچنے پر میاں تان سین منہ چھپا کر سیدھے اپنے گھر پہنچے اور بیربل سینہ تانے دربار پہنچا۔ دربار لگا ہوا تھا۔ بیربل کو دیکھتے ہی سارے درباریوں کے چہرے فق ہوگئے۔ اکبر نے کہا "بیربل تم کب آئے، زندہ کیسے بچے اور تان سین کہاں ہے؟"

بیربل نے تمام قصہ سنایا۔ تان سین کی تان [illegible] تان سن کر اکبر بہت دیر تک ہنستا رہا [illegible] اور سارے درباری سوچ رہے تھے کہ [illegible] ورنہ ہم اس میں مارے جائیں۔ اکبر نے بیربل کو انعام [illegible] [illegible] دیا اور برما کے راجہ کے نام [illegible] خط لکھا [illegible] بیربل اور تان سین [illegible] [illegible] تھی [illegible] بادشاہ غلط فہمی میں [illegible] [illegible] ہوئے۔

••

ادھر اُدھر سے

بغیر پٹرول کے چلنے والی موٹر

پُونا۔ جنوری ۲۸

اب تک تو آپ کی موٹریں۔ پٹرول سے چلتی تھیں۔ وہ دن دور نہیں کہ اب یہ بجلی کی بیٹری سے چلا کریں گی۔ اس طرح کی ایک گاڑی پونا میں تیار ہو چکی ہے۔ یہ پونا کے ملٹری کالج کے انجنیروں کا کارنامہ ہے۔ لیفٹننٹ جنرل سرتاج سنگھ نے اس موٹر پر سواری بھی کی۔ یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو پٹرول اور ڈیزل آئل سے نجات مل جائے گی۔ ان دونوں کا دھواں تندرستی کے لیے بہت مضر ہے

(ہندوستان ٹائمس)

مصر کا ۱۵۰ سال بوڑھا انسان

قاہرہ ۲۹۔ جنوری

مصر کا سب سے بوڑھا انسان حسن جلّاد چل بسا اس نے ڈیڑھ سو سال کی عمر پائی۔ مشہور نہر سوئز کی کھدائی میں وہ بھی شریک تھا۔ حسن جلاد ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوا تھا اور مصر کے ایک گاؤں منزل میں پیدا ہوا تھا۔

ہندوستان ٹائمس

کشمیر کے ۳۵۰ سال پرانے پیڑ کا "انتقال"

نئی دہلی۔ ۲۱۔ دسمبر۔ کشمیر کا سب سے معمر پیڑ جو ۳۵۰ سال پرانا تھا، گر کر ختم ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس چنار کے پیڑ کے تنے کا گھیرا ۵۶ فٹ تھا اور اسے سترھویں صدی میں جب مغلوں کی حکومت تھی۔ مغل باغ کے قریب لگایا گیا تھا اور تب ہی سے یہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پچھلے مہینے وادیٔ کشمیر میں بے موسمی برف باری کے دوران یہ بوڑھا پیڑ اچانک زمین پر آ گیا۔ اس پیڑ کے ختم ہو جانے کے بعد اب کشمیر میں "ایلم" کے ایک پیڑ کو جس میں سے ایک خاص قسم کا گوند نکلتا ہو سب سے معمر سمجھا جانے لگا ہے یہ پیڑ وادی کے پلوما علاقے میں ہے اور اس کی عمر تقریباً ۳۲۵ سال ہے اس کے تنے کا گھیرا بھی ۵۶ فٹ ہے۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

لبنان میں تین ہزار برس پرانی چیزیں ملیں

نئی دلّی۔ ۸۔ دسمبر۔ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے طالب علموں کے ایک گروپ نے کھدائی کے دوران ایسی نادر چیزیں حاصل کی ہیں جو کم سے کم تین ہزار سال پرانی ہیں۔ ان چیزوں میں تانبے کا ایک بہت بڑا پیالہ بھی شامل ہے جس کے بارے میں تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وسط لبنان کی پہاڑی علاقوں میں آج سے تین ہزار برس پہلے اس طرح کے پیالے استعمال ہوتے تھے جس جگہ یہ پیالا ملا ہے وہاں کھدائی کا کام ۱۹۵۶ء میں شروع کیا گیا تھا۔ کھدائی کے دوران سب سے پہلے مٹی کے برتن۔ نقشین پیالے سوئیاں اور دھات کی سلائیں ملی تھیں۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

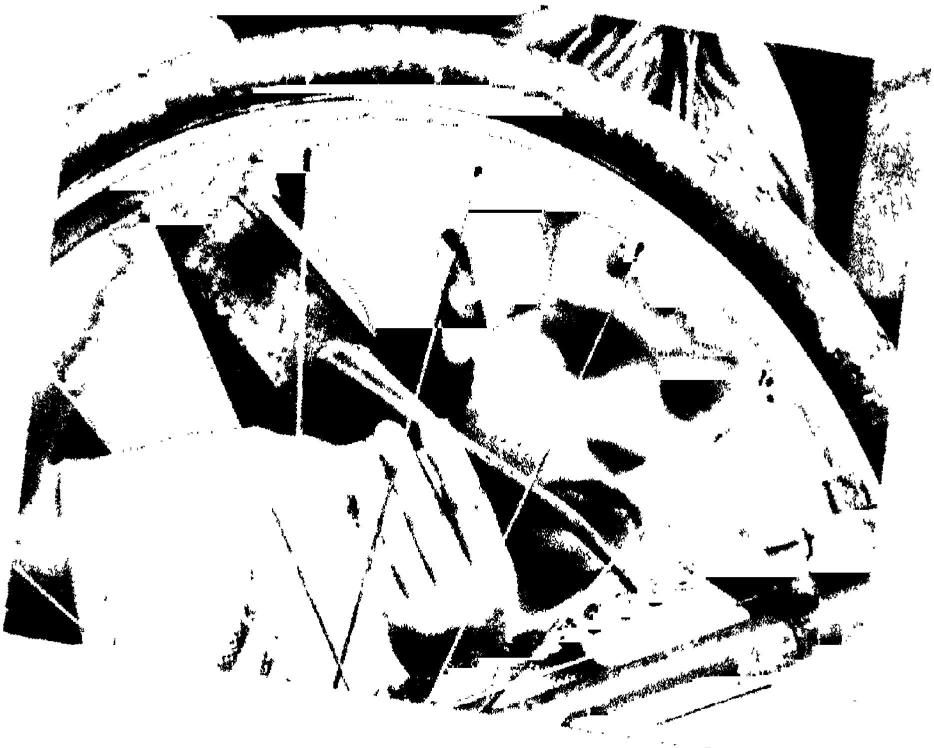
Regd. No. D. [illegible] APRIL [illegible]

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-25.

پیام تعلیم

10(5)



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

APRIL

ماہنامہ پیام تعلیم
نئی دہلی

فہرست مضامین

جلد ۱۰ شمارہ ۵

اڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

مئی ۱۹۷۳ء

قیمت : ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ : چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۱/۵۰
آں حضرت الیاس احمد مجیبی اردو ۶۵/-
پاک کہانیاں (دو حصوں میں) مقبول احمد سیوہاروی ۲/۲۵
چار یار الیاس احمد مجیبی ۱/۳۰
خلفائے اربعہؓ خواجہ عبدالحی فاروقی ۲/۲۵
رسول پاکؐ عبدالواحد سندھی ۱/۸۰
عقائد اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۵۰/-
مسلمان بیبیاں مولانا اعجاز الحق قدوسی ۷۵/-
نبیوں کے قصے خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۱/۲۵
ہمارے رسول " " " ۱/۶۵
ہمارے نبی سیّد نواب علی رضوی اردو ہندی ۱/۷۵ ۴۰/-

معلومات

آدمی کی کہانی مشتاق احمد ۱/۷۵
انوکھا عجائب خانہ محمد حسین حسان (چار حصے) ۱/۸۰
بجلی کی کہانی علی احمد خاں ۵۰/-
پڑدادا کی کہانی محمد عبدالغفور ۵۶/-
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل خجستہ سلطان ۸۰/-
" " " دوم ضیاء الرحمٰن ۱/۰
" " " سوم مشتاق احمد اعظمی ۱/۸۰
" " " چہارم " " ۹۵/-
پٹھانوں کی کہانی محمد امین ۱/۷۵
خبر رسانی کا طریقے رفیعہ منظور الامین ۸۵/-
دُنیا کے بچے محمد حسین حسان ۱/۰
دُنیا کے بسنے والے بشیر حسین زیدی ۷۵/-
دہلی ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور صفدر حسین ۱/۲۵
سماجی زندگی (اوّل) احمد شبیل و غلام ابرار ۵۶/-
" " (دوم) " " " ۸۱/-
" " (سوم) " " " ۸۱/-
سمندر کے کنارے سلطانہ آصف فیضی ۱/۳۰
سمندر کے نیچے " " " ۲/۰
قدرت کے کرشمے ادارہ ۶۲/-
میر انیس محمد حسین حسان ۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ کیلاش چندر ۱/۵۰

کہانیاں، ڈرامے، ناول

جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے ۴/۰
اس نے کیا کرنا چاہا (کہانیاں) آصفہ مجیب ۳۷/-
پریم کی جیت (ڈراما) اسداللہ کاظمی ۳۷/-
تا نبیل خاں (کہانی) محمد حسین حسان ۳۰/-
ترکوں کی کہانیاں " مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۵۵/-
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) م۔ ندیم ۱/۵۰
تین اناڑی (") عصمت چغتائی ۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی) برکت علی فراق ۴۰/-
چمپاوت کا آدم خور شیر (بیچی ") محمد معین ۳۵/-
چنبیلی محمد حسین حسان ۵۰/-
ستاروں کی سیر (ناول) کرشن چندر ۱/۷۵
کوے دادا (سیما ناول) مجیب احمد خاں ۱/۷۵
لال مرغی (کہانی) عبدالواحد سندھی ۵۰/-
مزہ چکھائیں گے " مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۳۵/-
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) محمود علی خاں ۶۵/-
ننھا نٹ کھٹ کہانی خورشید سلطانی ۳۰/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵

بچّوں سے باتیں

یہ آج سے تین برس پہلے کی بات ہے۔ جامعہ کے سب سے بڑے بزرگ سب سے بڑے سرپرست مخدوم و محترم ذاکر صاحب قبلہ مرحوم و مغفور ۳۔ مئی (۶۹) کو ہم سے اچانک جدا ہو گئے۔ اس سال یہ ان کی تیسری برسی ہے۔ ان کی یاد میں اس پرچے میں اُن پر دو مضمون اور چند رباعیاں شائع کر رہے ہیں۔

پہلا مضمون ہماری درخواست پر ان کی بیٹی صاحبزادی محترمہ سعیدہ خورشید عالم نے مرحمت فرمایا ہے۔ محترمہ ذاکر صاحب پر ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔ یہ مضمون اسی میں سے لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون رشید الوحیدی صاحب نے محترم پروفیسر مجیب صاحب کی انگریزی کتاب سے لیا ہے۔

ذاکر صاحب کے سچے عقیدت مند محب محترم شفیع الدین نیّر صاحب سے بھی ہم نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ آپ نے بھی چند رباعیاں مرحمت فرمائی ہیں۔ ہم ان تینوں کے احسان مند ہیں۔

اسی پرچے میں نیّر صاحب کی ایک اور نظم "چھٹی آئی" بہت بروقت ہے یقین ہے کہ آپ کو بہت پسند آئے گی۔

پچھلے پرچے کے سبھی مضمون پیام تعلیم پڑھنے والوں نے بہت پسند کیے۔ محبی ڈاکٹر بشیر الحق صاحب کا مضمون۔ "خرید و فروخت"، تو سبھی نے پسند کیا۔ بلکہ کچھ لوگوں نے تجویز کی ہے کہ اس طرح کے مضمون پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر تجارت پیشہ لوگوں میں مفت تقسیم کیے جائیں۔ اس سے آپ پسندیدگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ہماری درخواست پر اس طرح کے چند اور مضمون لکھ رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان دنوں غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے اپنا مضمون وقت پر نہ بھیج سکے۔ ان شاء اللہ اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔ یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو کتابی صورت میں چھپے گا۔ ڈاکٹر صاحب اس طرح کے کچھ مضمون پچھلے سالوں میں بھی لکھ چکے ہیں۔ اس سلسلے کے سب مضمون کتاب میں شامل ہوں گے۔

پیام تعلیم کے پرانے ہمدرد اور سرپرست محترم محمد اکرام صاحب ام۔ اس سی لکچرر ٹیچرس کالج جامعہ نے کوپرنکس پر ایک مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں "وگیان بھون" دہلی میں کوپرنکس کا ۵ سو واں جنم دن (۱۹- فروری ۱۹۷۳ء) منایا گیا تھا۔ محترم اکرام صاحب اسی تقریب میں یہ مضمون

خاص طور پر آپ کے لیے لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ کہ پچھلے پرچے میں اس کے لیے گنجایش نہ نکل سکی۔ یہ اس پرچے میں شایع کیا جا رہا ہے۔

محترم رشید حسن خاں کے مضمون کے لیے چاروں طرف سے تقاضا تھا۔ رشید حسن خاں صاحب عموماً مصروف رہتے ہیں ہماری درخواست پر انھوں نے دو قسطیں ایک ساتھ مرحمت فرما دیں۔ یہ بھی ہم پچھلے پرچے میں شایع نہ کر سکے تھے۔ پہلا مضمون اس پرچے میں شایع ہو رہا ہے — دوسرا اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔ یہ تمام مضمون بھی انشاء اللہ کتابی صورت میں چھپیں گے۔

ابھی ابھی ہمیں یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا کہ محترم رشید حسن خاں کی محترمہ بیگم صاحبہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ خاں صاحب کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ ہے۔ خدا انھیں اور دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ ادارہ پیامِ تعلیم اور مکتبہ جامعہ پوری طرح اس غم میں اُن کے شریک ہیں۔

اس پرچے میں چند اچھے اور دلچسپ مضمون بھی آپ کو پڑھنے کو ملیں گے۔ محترم حسیب شمائی صاحب کی سوچ تھوڑی سی ہے مگر بڑی مزے دار ہے۔

خواجہ معین الدین صاحب نے تو جیسے آپ بیتی لکھی ہے۔ ہمارے پرانے ساتھی برادرم برکت علی صاحب نے بالکل انوکھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ کو پسند آیا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی چلے گا۔

نظموں میں دو تو محترم نیّر صاحب کی ہیں۔ ان کے علاوہ محترم ناظم میواتی صاحب کی دعا پڑھیے۔ حافظ باقوی صاحب، رؤف خیر صاحب کی محمد ایوب واقف صاحب کی نظمیں پڑھیے ایک سے ایک اچھی ہے۔

اب کی بار آپ کو پیامِ تعلیم کے ٹائیٹل میں خاص بات نظر آئے گی۔ کتنا اچھا چھپا ہے۔ کاغذ کتنا اچھا ہے۔ اگلے ٹائیٹل بھی ایسے ہی شاندار ہوں گے۔ انشاء اللہ۔ اگلا ٹائٹل تو آپ دیکھتے ہی پھڑک اٹھیں گے۔ ڈیزائن بہت خوبصورت ہے۔ ہمارے عزیز دوست جناب قیصر سرمست، کا عطیہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ . . . . اس کی چھپائی بھی اتنی ہی شاندار ہوئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قیصر سرمست صاحب بھی بہت پسند فرمائیں گے۔

اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے ہمارے محترم جنرل منیجر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کی ذاتی دلچسپی، پیامِ تعلیم کی ظاہری خوشنمائی انھی دونوں کی نوازش کا نتیجہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ دلچسپی دن پر دن بڑھتی جا رہی ہے۔

ہر اسپیامی اس کے خریدار بڑھ جانے میں کتنی ر دکھائیں گے۔ یہ ان کے سوچنے اور کرنے کی بات ہے۔

ناظم سیوانی سہرامی

دعا

(ایک چھوٹے طالب علم کی)

میرے مولا! علم کی دے روشنی — میں بھی پھیلاؤں گا اپنی چاندنی
علم کا گر نور مجھ کو مل گیا — میں مٹا دوں گا اندھیرا جہل کا
علم کا دے شوق اے میرے خدا! — اور عمل کا حوصلہ بھی کر عطا
اچھے اچھے کام کی توفیق دے — اچھے اچھے کام مجھ سے روز لے
میرے مولا! ہر برائی سے بچا — راستہ بھی نیک لوگوں کا دکھا
اہلِ حق کی پیروی ہو میرا کام — حق پرستوں میں ہو اک میرا بھی نام
سب کی ہمدردی کا جذبہ کر عطا — ملک و ملت کا مجھے خادم بنا
بے بس و مجبور کی خدمت کروں — بے کس و مقہور کی خدمت کروں
مجھ سے لے وہ کام جس کو دیکھ کر — میرے ساتھی بھی ہوں میری راہ پر
امن کا پیغام میں دنیا کو دوں — امن کی خاطر جیوں جب تک جیوں

زندگی کا خار بھی ہو جائے پھول
یہ دعا ناظم کی ہو جائے قبول

جناب سعیدہ خورشید عالم

ذاکر صاحب اور بچے

محترمہ سعیدہ خانم (ذاکر صاحب کی بڑی صاحبزادی) آج کل مخدوم محترم قبلہ ذاکر صاحب مرحوم پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ ہماری درخواست پر محترمہ نے اسی کتاب کا ایک مختصر سا ٹکڑا پیام تعلیم میں شائع کرنے کے لیے مرحمت فرمایا ہے۔ ہم محترمہ کی اس نوازش کے ممنون ہیں۔ (ایڈیٹر)

میاں کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ بچے چاہے اپنے ہوں چاہے کسی اور کے۔ ان کی نظروں میں سب برابر تھے۔ جتنا اپنوں کا خیال کرتے اتنا ہی دوسرے بچوں کا رکھتے۔

بچوں کو صرف دل بہلانے کا کھلونا نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ وہ اکثر ہم سے کہتے۔

"بچوں کی عزت کیا کرو کون جانتا ہے ان میں سے کون کیا بنے گا۔ نہ جانے ان میں کتنے عالم، کتنے صوفی، کتنی بڑی ہستیاں چھپی ہوئی ہیں۔"

بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند کی مختلف چیزیں مثلاً پنسل، کاغذ، رنگین چاک، چاکلیٹ ٹافی وغیرہ موجود رکھتے اور جب بچے ان کے پاس آتے تو ان کو دیتے، صبح چہل قدمی کر کے لوٹتے تو بچوں کے پاس آتے کوئی بچہ سو رہا ہوتا کوئی اٹھ کر کھسیانا بیٹھا ہوتا۔ وہ بڑے پیار سے تھپکی دیتے، سر سہلاتے اور یہ شعر پڑھتے۔

اٹھا ہے کچی نیند سے کوئی خفا خفا

اور ساتھ ہی اپنی پر لطف باتوں سے بچوں کا موڈ ٹھیک کر دیتے، یہ مصرع میں نے خود اپنے بچپن میں اور اپنے بچوں کے لیے بار بار پڑھتے سنا تھا۔

بچوں کے سلسلے میں۔ آنحضرتؐ کی وہ حدیث

سناتے جس میں ایک شخص نے رسول اللہؐ کو بچوّں کو پیار کرتے دیکھا تو کہا۔

یارسول اللہؐ آپ رسولِ خدا ہو کر
"بچوّں کو (یعنی ایسی نا قابل
توجہ شے کو) پیار کرتے ہیں۔
مرے تو بہت سے بچےّ ہیں۔
لیکن میں نے تو آج تک کسی کو
پیار نہیں کیا۔ رسول اللہؐ نے
فرمایا کہ اگر خدا تمھارے دل سے
محبت چھین لے تو میں کیا کروں"

جب کبھی ہم بچوّں کو کسی بات پر جھڑکتے تو کہتے :-

"رسولِ خدا جب نماز پڑھتے تھے
تو اُن کے نواسے ان کی پیٹھ اور
کندھوں پر چڑھ جاتے تھے اور
تم لوگ دنیاوی کاموں میں بھی
بچوں کی مداخلت سے جھلّا اٹھتے ہو!"

مجھے وہ سماں نہیں بھولتا جب انھوں نے اپنے مالی کے لڑکے کے لیے جو پانچ چھ سال کا ہوگا گرم سوٹ سلوایا تھا اور اسے بلاکر بڑی شفقت سے خود پہنایا تھا تو اسے دیکھ دیکھ کر کیسے باغ باغ ہو گئے تھے۔ بچےّ بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔ میرے بچےّ تو سمجھتے تھے۔ انھیں کوئی بھی بڑی سے بڑی ضرورت ہو۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو۔ میاں اسے حل کر دیں گے۔ اور ضرورت پوری کر دیں گے۔ اس لیے سیدھے میاں کے پاس پہنچتے تھے۔ میری بڑی لڑکی خاص طور ان سے بہت مانوس تھی۔ جب وہ آٹھ نو سال کی تھی۔ ایک روز بڑے بھولے پن سے کہنے لگی۔

"امّی! جب میں یہ سوچتی ہوں کہ اللہ میاں کیسے ہوں گے تو مجھے ایسا لگتا ہے وہ بالکل میاں جیسے ہوں گے۔"

بچوّں سے یہ دلچسپی ان کی تعلیم و تربیت کا ولولہ ہی تھا جو جامعہ ملیہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بچوّں کے لیے۔ انھوں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں بچوں کی نفسیات ان کی دلچسپیوں اور ان کے سوچنے کے طریقے کو جس خوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ وہی شخص پیش کر سکتا تھا جس میں اس اس کام کی صلاحیت کے ساتھ لگن بھی ہو۔ اور بچوں کی زندگی میں سمو گیا ہو۔ ••

مُسکرائیے

ایک صاحب ریل کے ڈبےّ میں بیٹھے بار بار مُسکرا رہے تھے۔ آخر ایک شخص نے پوچھ ہی لیا "آپ بار بار کیوں مسکرا رہے ہیں؟"

"وہ بولے: "آج میں نے ریلوے والوں کو خوب بے وقوف بنایا۔ میں نے واپسی ٹکٹ لے تو لیا۔ لیکن واپس نہیں جاؤں گا"

★

یادِ ذاکر

جناب محمد شفیع الدین نیّر

محترم مولانا شفیع الدین نیّر نے ہماری درخواست پر قبلہ ذاکر صاحب (مرحوم) پر یہ رباعیات مرحمت فرمائی ہیں۔ دلی شکریے کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ (اڈیٹر)

ذاکر کو گئے ہو گئے اب سال کئی　　پر یاد ہے دل میں اُن کی ہر بار نئی
اک روحِ مبارک اس جہاں میں آئی　　وہ کھیلتی ہنستی سوئے فردوس گئی

کیا حال ہے دل کا کیا بتاؤں ہم دم　　دُنیا پہ نیا فلک نے ڈھایا یہ ستم
اِس واسطے ہے فرقتِ ذاکر کا الم　　عالم کی وفات ہے وفاتِ عالم

کیوں آہ کرے کس لیے فریاد کرے　　کیوں قلب کو اپنے کوئی ناشاد کرے
ہو شوق وطن کی ایسی خدمت کا ہمیں　　ذاکر صاحب کی بھی روح جس پہ صاد کرے

ہر قوم کے ساتھ کی بھلائی اُس نے　　خدمت کی نئی شان نبھائی اُس نے
"خدمت بڑی ہے یہ عظمت ہے" سبھی جانتے ہیں　　پر بات یہ سچ کر کے دکھائی اُس نے

قدرت کی انگوٹھی کا نگینہ ذاکر　　علم اور ہنر کا آبگینہ ذاکر
[illegible] بحر فنا میں غرقاب　　تھا ہند کی قوم کا سفینہ ذاکر

دسویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن

تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ

گھر کو واپسی



دوسری صبح سو کر اُٹھے تو دیکھا کہ سورج کافی بلند ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ اچھا کھانا مزا تو خوب دیتا ہے لیکن صبح جلدی اٹھنے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ بہرحال ہم خود کو کافی چاق چوبند محسوس کر رہے تھے اور ناشتہ کے لیے تیار تھے لیکن اس سے پہلے اپنے معمول کے مطابق صبح تیراکی اور صبح کا غسل نہیں بھولے۔

ہم ناشتے کے بعد اپنے سفر پر دوبارہ روانہ ہوئے۔

کوئی ایک میل چلے ہوں گے کہ اچانک ایک موڑ آ گیا۔ مڑتے ہی ہماری نظروں کے سامنے ننھے ننھے جزیروں کا ایک نیا جھنڈ، گیا۔ ہم ان جزیروں کے حسن و دل کشی میں کھو سے گیے۔ نہ جانے کتنی دیر کھوئے رہتے۔ اگر یکایک چیخ ہمیں چونکا نہ دیتی۔ یہ وہی جانی پہچانی اور عجیب چیخ تھی جس نے چند راتوں پہلے بھی ہمیں سہما دیا تھا۔ اس بار ہم اسے سن کر اتنے خوف زدہ تو نہیں ہوئے جتنے پہلے ہوئے

تھے اور اس کی وجہ بھی تھی۔ اُس بار رات تھی اور اس بار دن اور یہ میرا تجربہ ہے گو اس کی وجہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ دن میں وہ تمام ڈراؤنی چیزیں جو رات کے اندھیرے میں عجیب عجیب شکلوں میں آکر ڈراتے ہیں، دن کے اجالے میں ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

چیخ سنتے ہی۔ پیٹرکن نے اپنا بھالا تان لیا۔ "آخر یہ ہے کیا ؟" اس نے گردن موڑ کر جیک کو دیکھا۔ "میں کہے دیتا ہوں کہ اگر ہمیں اسی طرح خوفزدہ کرنے والی چیخوں اور حیرت زدہ کرنے والے واقعات کا مسلسل سامنا کرنا پڑا جیسا کہ پچھلے ایک ہفتہ سے ہو رہا ہے۔ تو ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ہم اس جزیرے کو جتنی جلد ممکن ہے چھوڑ دیں باوجود تمام نعمتوں : بام، ناریل اور سوروں اور آلو کے !"

پیٹرکن کی بات مشکل سے پوری ہوئی ہوگی کہ وہ چیخ پھر سنائی دی اور اس بار پہلے سے تیز۔

"یہ انھی جزیروں میں سے کسی ایک سے آتی ہے۔" جیک جزیروں کے اس جھنڈ کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"پھر تو یہ ضرور کوئی بھوت ہے" پیٹرکن بولا۔ "کیونکہ میں نے کسی اور جاندار کو تو ایسی بھیانک آواز نکالتے سنا نہیں۔"

ہم تینوں کی نظریں جزیروں کے اس جھنڈ پر جمی تھیں غور سے دیکھنے پر ان میں سب سے بڑے جزیرے پر ہمیں کچھ عجیب چیزیں حرکت کرتی نظر آئیں۔

"سپاہی ہیں یہ ! سچ کہتا ہوں !" پیٹرکن ان عجیب چیزوں کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہوا چلایا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ پیٹرکن کی بات مجھے سو فیصدی صحیح معلوم ہوئی۔ کیونکہ دور سے وہ چیزیں بالکل کسی فوج کی طرح نظر آرہی تھیں۔ باقاعدہ ٹکڑیوں اور قطاروں میں کھڑی ہوئیں۔ نیلے کوٹ اور سفید پتلونیں پہنے۔

ہم انھیں حیرت بھری نظروں سے تک ہی رہے تھے کہ اچانک وہی بھیانک آواز پھر آئی اور پیٹرکن نے چونک کر کہا کہ اس کے خیال میں یہ ضرور کوئی فوج ہے جو یہاں کے وحشی باشندوں کا صفایا کرنے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اس کی بات سن کر جیک ہنس پڑا اور بولا" واہ میاں پیٹرکن واہ۔ تمھارا بھی جواب نہیں۔ ارے بھئی یہ تو پنگوئن ہیں پنگوئن !"

" ہاں پنگوئن، پیٹرکن پنگوئن۔ وہی بڑی سمندری چڑیا جنھیں تم آنے والے چند دنوں میں قریب سے دیکھ سکو گے جب ہم انھیں دیکھنے اپنی کشتی میں چلیں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم کشتی گھر واپس پہنچتے ہی بنانا شروع کر دیں۔"

" اچھا ! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے وہ خوفناک چیختے بھوت اور خون کے پیاسے سپاہی پنگوئن میں بدل گئے" پیٹرکن نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

" بہت اچھے !۔ اب تو میں یہی کہوں گا کہ جتنی تیزی سے ممکن ہو سفر جاری رکھا جائے ورنہ اس سے پہلے کہ ہم اس کا ایک پورا چکر لگائیں۔ یہ جزیرہ ہمارے لیے ایک خواب بن جائے گا۔"

سفر پر چلتے وقت میں اس نئے انکشاف اور ان چڑیوں کی عجیب شکلوں کے بارے میں سوچتا رہا جن کے بارے میں جیک ہمیں بہت کم باتیں بتلا سکا تھا۔ میں نے سوچا کہ کس طرح جلد ہی ہماری کشتی مکمل ہو جائے اور ہم ان عجیب چڑیوں کو قریب سے دیکھ سکیں۔ کئی گھنٹے تک یہی خیالات میرے ذہن پر طاری رہے لیکن رفتہ رفتہ میں نے ان سے پیچھا چھڑا لیا اور اس علاقے کے ماحول میں دلچسپی لینی شروع کر دی جس سے ہم اس وقت گزر رہے تھے۔

دوسری رات ہم نے پہلی رات کی طرح گزاری۔ اس وقت تک ہم جزیرے کے چاروں طرف کا دو تہائی حصہ طے کر چکے تھے۔ اور ہمیں امید تھی کہ اگلی رات ہم اپنے گھر کی چھت تلے گزاریں گے۔ میں دوسرے دن دیکھی ہوئی چیزوں اور باتوں کا تذکرہ اتنی خصوصیت سے نہیں کروں گا جس طرح اب تک کرتا آیا ہوں۔ کیوں کہ ہم نے کوئی خاص دریافت بھی نہیں کی۔ ساحل کا وہ حصہ جس سے ہم گزر رہے تھے اور جنگل کے دوسرے حصے ویسے ہی تھے جیسے ہم اب تک دیکھتے آئے تھے۔ ہاں دو ایک خاص باتیں ہم نے ضرور دیکھیں جن کا تذکرہ میں کیے دیتا ہوں۔

ہم نے دیکھا کہ یوں تو زیادہ تر پھل دار درخت وادیوں میں اُگ رہے تھے اور کچھ تو محض چشموں اور جھیلوں ہی کے کنارے تھے جہاں کی مٹی عموماً زرخیز ہوتی ہے۔ لیکن ناریل کے پیڑ ہر جگہ اُگے ہوئے تھے۔ نہ صرف چٹانوں کے کنارے بلکہ ساحل پر بھی یہاں تک کہ خود مونگے کی چٹانوں پر بھی جہاں کی مٹی، اگر اسے مٹی کہنا مناسب ہو، ٹوٹے ہوئے گھونگھوں اور مردہ مونگے ملے ریت سے زیادہ نہ تھی۔ یہ مفید اور کارآمد درخت بعض بعض جگہ تو ساحل کے اتنے قریب اگا ہوا تھا کہ اس کی جڑیں موجوں کے پانی سے دھل رہی تھیں اور عجیب بات یہ تھی کہ ریت میں اُگے درخت اتنے ہی عمدہ اور ان کا پھل اتنا ہی مزے دار تھا جتنا وادیوں میں اُگے ہوئے درختوں کا۔

ہمیں جنگل میں سوروں کے کئی اور گلّے بھی ملے لیکن ہم نے ان کا شکار نہیں کیا کیونکہ ہمارے پاس موجودہ ضرورت بھر کھانے کا کافی سامان تھا۔ ہم نے اس تمام علاقے میں جگہ جگہ ان کے قدموں کے نشان دیکھے۔

دن کے باقی حصے میں ہم نے جو چیزیں اس وادی کے دوسرے سرے پر دیکھیں وہ پہلے دیکھی ہوئی چیزوں سے اتنی مشابہ تھیں کہ ان کا تذکرہ پہلے کہی ہوئی باتوں کا دہرانا ہوگا۔ اس لیے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ شام ہوتے ہوتے ہم گھر پہنچ گئے اور ہر چیز اسی حالت میں پائی جیسی ہم تین دن پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔

اس رات جب ہم اپنے مکان پر سوئے تو تھکن سے اتنے چور تھے کہ بستر پڑتے ہی ہماری آنکھ لگ گئی۔ میں نے یقین سے یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جیک نے تو بعد میں خود ہی اس کا اعتراف کر لیا تھا۔ رہا پیٹر کن تو حالاں کہ پوچھنے پر تو اس نے انکار ہی کیا لیکن اس کے بستر پر لیٹنے کے ایک دو منٹ بعد ہی میں نے اس کے خراٹے سنے تھے۔ ہم تمام رات اور دوسرے دن بھی کچھ اس طرح بے خبر پڑے سوتے رہے کہ کروٹ تک نہیں بدلی۔ جب ہماری آنکھ کھلی تو سورج ڈوب رہا تھا اور ہم نے محض اس لیے بستر چھوڑے کہ کچھ کھانا نگل لیں۔ بقول پیٹر کن کے ہم نے ناشتہ شام کی چائے کے وقت کیا۔ اس کے بعد ہم دوبارہ بستروں پر پڑ گئے اور پھر دوسری صبح کی خبر لی۔

دوسری بلکہ یوں کہیے کہ تیسری صبح جب ہم اٹھے تو خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ ہم نے ایک دن کی گنتی کھلادی لیکن آپس میں بحث کر کے آخر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم واقعی دو رات اور ایک پورا دن سوتے رہے اور یہ متفقہ فیصلہ کر کے ہی ہمارے بے چین ذہنوں کو سکون ملا۔

اس کے کئی دن بعد پیٹر کن اور جیک تو اس درخت کے قدرتی تحفوں کی مدد سے ایک ننھی سی کشتی بنانے میں لگے رہے اور میں اپنا وقت دوربین سے ان کیڑوں اور مچھلیوں

کی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں گزار تا رہا جو میں نے چٹانوں میں بنائے ہوئے سوراخ میں لاکر رکھی تھیں۔

یہاں میں نے لال۔ پیلے اور ہرے رنگ کے وہ عجیب سمندری جانور دیکھے جو چٹانوں سے چمٹے اپنے بہت سارے بازو پھیلائے پڑے رہتے تھے اور جہاں کوئی ننھی مچھلی یا دوسرے ننھے کیڑے انھیں چھوتے وہ فوراً انھیں پکڑ لیتے اور اپنے بہت سارے بازو ان کے گرد لپیٹ کر انھیں پیٹ میں پہنچا دیتے۔

یہیں میں نے ان ننھے مونگوں کی ان تھک محنت کا دلچسپ اور ہمت افزا نظارہ بھی دیکھا جن کی کوششوں سے بحرالکاہل کے یہ سینکڑوں جزیرے وجود میں آئے تھے۔ ان میں کچھ تو بہت ہی ننھے منے لیکن ساتھ ہی انتہائی خوب صورت تھے۔ جس وقت یہ اپنے بلوں سے قطار در قطار خوب صورت رنگین دھاگوں کی صورت میں باہر نکلتے تو وہ ایسا بھلا لگتا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

یہیں میں نے وہ عجیب گھونگا مچھلی بھی دیکھی جس کی پشت سے رہ رہ کر ایک پتلا پر جیسا ہاتھ نکل آتا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی ہاتھ کی مدد سے وہ اپنی غذا پیٹ میں لے جاتی ہوگی۔ یہاں میں نے وہ کیکڑے بھی دیکھے جن کے جسم کے صرف اوپری حصے پر سخت خول تھے۔ لیکن ان کی نازک دُموں پر اس طرح کا کوئی غلاف نہ تھا جو انھیں بچا سکتا۔ اپنی حفاظت کے لیے وہ اپنی دُمیں مستقل کسی گھونگھا مچھلی کے خالی پڑے خول میں چھپائے رکھتے اور جب ایک خول چھوٹا پڑ جاتا تو اس سے بڑے خول میں دم چھپا لیتے۔

یوں تو یہ سارے ہی نظارے بڑے ہی عجیب و غریب۔ حیرت انگیز اور دلچسپ تھے لیکن سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز ترین نظارہ جو میں نے دیکھا وہ اس سمندری جانور کا تھا جو بیماری کی حالت میں اپنے دانت اور اندر کے سارے اعضا نکال کر ڈھیر کر دیتا اور چند ہی مہینوں میں اس کے یہ تمام اعضا پھر سے پیدا ہو جاتے۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی دلچسپ باتیں میں نے دیکھیں لیکن اب میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں بتاؤں گا کیونکہ ابھی مجھے اس جزیرے پر پیش آنے والے بہت سے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات بیان کرنے ہیں۔

(پھر کیا ہوا؟ کیا جیک اور پیٹر کشتی بنانے میں کامیاب ہو گئے؟ کیا وہ پنگوئنوں والے جزیرے پر پہنچ پائے یہ اور اسی طرح کے دوسرے سوالوں کا جواب معلوم کرنے کے لیے جون کا پیامِ تعلیم پڑھیے۔)

لطیفے

اُستاد: (شاگرد سے) تاج محل کہاں ہے؟
شاگرد: یقین کیجیے صاحب میں نے نہیں دیکھا۔ ویسے آپ نے کہاں رکھا تھا۔ میں تلاش کر دیتا ہوں۔

(عبدالرحمٰن)

صادق: اس وقت دنیا میں کتنے بے وقوف ہوں گے
آصف: پتہ نہیں، لیکن کیا تم اکیلے گھبرا رہے ہو؟

(رحمان)

دیہاتی:۔ (گارڈ سے) یہ گاڑی اتنی دیر سے کیوں کھڑی ہوئی ہے؟
گارڈ: انجن میں کوئلہ ڈل رہا ہے۔
دیہاتی: اس میں گاڑی کو روکنے کی کیا بات تھی انجن کو روک دیتے

(انیسہ جہاں)

جناب حافظ [illegible]

پڑھ لکھ کر ہشیار بنوں گا
حکمت کا مینار بنوں گا
علم و ہنر کی دنیا کا میں
ہو کے جواں سردار بنوں گا
غم کے ماروں ، ناداروں کا
مونس اور غمخوار بنوں گا
دل سے چاہیں اپنے پرائے
ایسا خوش اطوار بنوں گا
پیار سے رہنا دنیا سیکھے
سب کے لیے خود پیار بنوں گا
دیس کے ہر دشمن کے گلے پر
بجلی کی تلوار بنوں گا
دیس پہ اپنی جان جو وارے
اس کے گلے کا ہار بنوں گا
جنت بن جائے یہ دنیا
اس کا میں معمار بنوں گا
حق کا بول ہو بالا حافظ
حق کا علم بردار بنوں گا

آؤ گھر میں بیٹھو ——— باہر دھوپ ہے
تھوڑی دیر تو سو لو ——— باہر دھوپ ہے
ایسی دھوپ کہ سر پر انڈا دے دے چیل
دانہ دھرتی پر گر کر بن جائے کھیل
لڑنے مرنے پر آ کسائے دھکم پیل
کچھ آرام اٹھا لو ——— باہر دھوپ ہے
آؤ گھر میں بیٹھو ——— باہر دھوپ ہے
کچھ سکول کا کام کرو کچھ سستا لو
تازہ "پرچہ" آیا ہوگا پڑھ ڈالو
شربت پی لو کچھ ٹھنڈی چیزیں کھا لو
آؤ اور نہا لو ——— باہر دھوپ ہے
آؤ گھر میں بیٹھو ——— باہر دھوپ ہے
ایسی دھوپ میں جو بھی باہر جائے گا
سر میں درد سا ہوگا چکر آئے گا
شام کو سب کھیلیں گے وہ سو جائے گا
بستر ہے سجھا دو ——— باہر دھوپ ہے
آؤ گھر میں بیٹھو ——— باہر دھوپ ہے

ا۔ ب۔ ارشاد

رشید حسن خاں صاحب

حرفوں کا جادو

پچھلی دفعہ آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ عام طور سے یؔ کے اوپر فالتو ہمزہ لکھ دیا جایا کرتا ہے۔ جیسے: لیے کو لئے لکھ دینا یا لہریے کو لہرئے لکھنا یا کیجیے کو کیجئے لکھنا۔

مگر ابھی یؔ اور ہمزہ کی یہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بوائی کے زمانے میں کسان مٹھیاں بھر بھر کے کھیت میں بیج چھڑکا کرتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگ جی بھر کے ہمزہ کو کاغذ پر بکھیرا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر اس کی کہانی بھی لمبی ہوگی۔ اِس کہانی کا کچھ حصہ آپ سُن چکے ہیں، اِس کی اُمید ہے کہ آپ نے جی لگا کے اس کو ذہن میں بٹھا لیا ہوگا اور اپنی تحریر میں آپ اُن کی پابندی نہیں کریں گے۔ نہیں تو آپ کا حال بھی اُن سیاست دانوں یا مولویوں جیسا ہوگا، جو دوسروں کو تو بہت کچھ بتاتے اور سُناتے ہیں، اور خود اُس پر عمل نہیں کرتے۔ آپ جیسے اچھے بچّوں سے اِس کی اُمّید تو نہیں کہ آپ ان بدنام لوگوں کی طرح بننا پسند کریں گے۔ اِس طرح کے لفظوں کے شیر اور عمل کے گیدڑ لوگوں کو شیطان کے حوالے کیجیے اور آپ آگے بڑھیے اور اِس داستان کا باقی حصہ سُنیے۔

---

(۱) دو لفظوں کو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ملانے کے کئی طریقے ہیں۔ ایسے ہی ایک طریقے کا نام "اضافت" ہے یہ طریقہ فارسی زبان سے اُردو میں آیا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے۔ درد اور ایک لفظ ہے دل۔ دونوں الگ الگ لفظ ہیں، اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں کو ایک مکمل ٹکڑا بنا دیں اور دل اور درد میں ایک طرح کا تعلق پیدا کر دیں، تو "دردِ دل" لکھیے۔ یعنی پہلے لفظ کے آخر میں جو بھی حرف ہو، اُس کے نیچے ایک زیر لگا دیجیے۔ اِسی کا نام "اضافت" ہے۔ جیسے: ذاتِ خدا، رسولِ خدا، مالِ دُنیا، قومِ یہود، ملکِ بنگال، سیرِ باغ، رنگِ سرخ، پرچمِ ہندوستان، گُلِ تازہ۔

تو اب یہ بات معلوم ہوئی کہ اضافت کے لیے پہلے لفظ کے آخری حرف کو زیر دینا ہوگا۔ اس میں کسی حرف کی قید نہیں، کوئی بھی حرف ہو، یہی ہوگا۔ عام طور سے اس میں کوئی غلطی بھی نہیں ہوتی۔ مگر جن لفظوں کے آخر میں یؔ ہوتی ہے، اُن پر اضافت کے لیے بعض لوگ خواہ مخواہ ایک ہمزہ بھی یؔ کے ساتھ

شامل کر دیا کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ سب کچھ بگڑ جاتا ہے جیسے اور حرفوں کے آخر میں اضافت کا زیر آتا ہے، اسی طرح یؔ کے آخر میں بھی زیر آ جائے گا۔ ہمزہ کا یہاں کیا کام۔ جیسے:

زندگیِ فانی، والیِ ملک، بندگیِ خدا، خرابیِ ملک، خوبیِ قسمت، معزولیِ ناز و ادا، نرمیِ گفتگو، گرمیِ خلوص، سردیِ کشمیر، جوانیِ بہار، کرسیِ صدارت، آزادیِ وطن، مرضیِ جناب، مرضیِ خدا، مزدوریِ عشرت، مخموریِ عیش، مجبوریِ افلاس، صراحیِ شراب، کمزوریِ سیاست، فدویِ خاص، کمیِ دولت، کج رویِ فلک، کج خرامیِ منافق، کم فرصتیِ دنیا، فارسیِ جدید، سواریِ ریل، تیاریِ امتحان، دل بستگیِ دنیا،

ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ جن لفظوں کے آخر میں یؔ ہو، اضافت کی صورت میں، عام قاعدے کے مطابق، اس یؔ کے نیچے زیر لگایا جائے گا، اس کے اوپر ہمزہ ہرگز ہرگز نہیں آئے گا۔ یعنی آپ اگر "مرضئ خدا" یا "خوبئ قسمت" لکھیں گے، تو یہ لکھاوٹ سو فی صدی غلط ہو گی، کیوں کہ یہ قاعدے کے خلاف ہے ——— "مرضیِ خدا" اور "خوبیِ قسمت" صحیح لکھاوٹ ہو گی۔

یہیں پر ایک چھوٹی سی بات اور سمجھ لیجیے، اس کا تعلق بھی اضافت ہی سے ہے۔

(۲) شاعری میں، شعر کے وزن کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی غرض سے، کبھی کبھی کچھ کھینچ کھانچ اور کتر بیونت بھی کر لی جاتی ہے۔ یہ مانا ہوا قاعدہ ہے کہ اگر کسی لفظ کے آخر میں یؔ ہو، اور وہ لفظ کسی مصرع میں بندھ جائے، اور اس مصرع کا وزن پورا نہ ہوتا ہو، تو وزن پورا کرنے کی خاطر اس یؔ پر ایک تشدید لگائی جا سکتی ہے۔ یعنی زندگی کو زندگیّ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ آزادی بس شاعری کے لیے ہے۔ اس یؔ کو "مشدّد" کہا جائے گا۔ لیکن اس سے اضافت کے اصلی قاعدے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس طرح اضافت کے لیے زندگی کی یؔ کے نیچے زیر آتا ہے [زندگیِ] اسی طرح اب زندگیّ کی یؔ کے نیچے زیر آ جائے گا [زندگیِّ]۔ مثلاً ان مصرعوں کو پڑھیے:

ع: دوستیِّ بے ریا دنیا میں اب ملتی نہیں
ع: زندگیِّ بے وفا! تجھ سے محبت کیا کریں
ع: سردیِّ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
ع: مرضیِّ خدا یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہ بولیں
ع: سرخیِّ رنگِ رخ سے چمک بڑھ گئی ہے اور
ع: بندگیِّ اہلِ دنیا سے بھلا ہوتا نہیں

کچھ لوگ ان جانے پن سے تشدید کی جگہ، ایک عدد ہمزہ اس یؔ کے اوپر ٹانک دیا کرتے ہیں۔ (جیسے زندگئ بے وفا) ہے نا ہنسی کی بات! لکھنا چاہیے تشدید، لکھ دیا ہمزہ۔

مان لیجیے کہ ایک صاحب نے اپنے بھولے پن سے پہلے والے مصرع کو یوں لکھا:

ع: دوستئ بے ریا دنیا میں اب ملتی نہیں

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمزہ کی آواز، لفظ دوستی کے آگے آئے گی۔ یعنی یوں پڑھنا پڑے گا۔

دوستی ءِ بے ریا دنیا میں اب ملتی نہیں

اب آپ انھی بھولے بھالے صاحب سے پوچھیے کہ جناب! یہ لفظ دوستی کے آگے ہمزہ کس قاعدے سے آئے گا؟

تو اب یہ قاعدہ ہاتھ آیا کہ جس لفظ کے آخیر میں

یَی ہو، وہ یَی مشدّد ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں اُس کے نیچے زیر آئے گا۔ اور اگر یَی مشدّد ہے تو زیر کے ساتھ ساتھ اُس پر تشدید بھی بنا دی جائے گی، جیسے اور حرفوں پر بنائی جاتی ہے۔ ؎۱

---

(۳) کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جن کے آخر میں یَی ہوتی ہے اور اُس یَی سے پہلے والا حرف، ہمزہ ہوتا ہے۔ جیسے: رعنائی، زیبائی، شناسائی، بے وفائی، گدائی، خدائی، جدائی، فدائی، پذیرائی، یکتائی وغیرہ: ایسے لفظوں میں بھی اضافت کی صورت میں یَی کے نیچے، قاعدے کے مطابق، زیر آئے گا۔ جیسے:

رعنائیِ خیال۔ زیبائیِ شامِ سحر۔ خدائیِ فرعون۔ یکتائیِ محبوب۔ جُدائیِ محبوب۔ گدائیِ شہرت۔ شناسائیِ اہلِ علم۔ کارفرمائیِ دولت۔ کج ادائیِ دوست۔ بے وفائیِ عزیزاں۔ بے نوائیِ اہلِ علم۔

آخر کی یَی سے پہلے ہمزہ ہو یا اور کوئی حرف، بات ایک ہی ہے۔ جیسے جوانیِ بہار، اُسی طرح رعنائیِ خیال۔ واضافت کے زیر کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ؎۲

(۴) جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے تو اضافت کی صورت میں ایسے لفظوں کے آگے یَے بڑھا دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آخر میں الف ہو تو اُس پر تو زیر نہیں آسکتا وہ تو ساکن ہوتا ہے۔ جیسے دنیا، پروا وغیرہ۔ ان کے آگے یَے بڑھا کر اضافت کو لایا جائے گا۔ جیسے:

پروائے دنیا۔ دُعائے خیر۔ انشائے اُردو۔ املاء کتاب۔ وفائے دوست۔ اغوائے بدکردار۔ تماشائے روزگار۔ استغنائے بے دین۔ اِخفائے راز۔ ابتدائے عشق۔ انتہائے شوق۔ اِجرائے کار۔ معمائے حیات بلوائے عام۔ حلوائے سوہن۔ دُنیائے رنگ و بو۔ تمنّائے رنگ و بو۔ علمائے دین۔ امرائے دولت وفائے غیر۔ صفائے رُخ۔ خطائے بزرگان۔ اقتضائے زمانہ۔ پردہ ہائے غفلت۔ اولیائے ہندوستان ادائے خاص۔ کربلائے مُعلّیٰ۔ جفائے دوست نشوونمائے باغ۔ تقاضائے وقت۔ جلوہ ہائے صورت شعرائے فارسی۔ ثنائے خدا۔ صدائے غیب۔ مینائے کدہ۔ بقائے نام۔ تمنائے رنگ و بو۔ اندیشہ ہائے دور و دراز۔ کے آگے "ان" یا "وں" بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً۔

رعنائیاں۔ رعنائیوں۔ زیبائیاں، زیبائیوں۔ پُروائیاں، پُروائیوں۔ یکتائیاں۔ یکتائیوں۔ شناسائیاں شناسائیوں۔ بے وفائیاں۔ بے وفائیوں۔ جدائیاں جُدائیوں۔ بُرائیاں۔ بُرائیوں۔ کمائیاں۔ کمائیوں ہوائیاں، ہوائیوں۔ کلائیاں، کلائیوں۔ بے نوائیاں۔ بے نوائیوں۔

؎۱ اِن لفظوں کی جمع کی مشق بھی کر لیجیے۔ جمع بنانے کے لیے۔ لفظ کے آگے "الف نون" یا "واؤ نون" کو بڑھا دیتے ہیں مثلاً

زندگیاں، زندگیوں، بندگیوں، خرابیاں، خرابیوں۔ تیّاریاں، تیّاریوں، نرمیاں، نرمیوں۔ گرمیاں، گرمیوں خوبیاں، خوبیوں۔ پیالیاں، پیالیوں۔ مجبوری، مجبوریاں گاریاں، گاریوں۔ جوانیاں، جوانیوں۔

؎۲ ان لفظوں کی جمع بھی اُسی طرح بنے گی، جس طرح اِن سے پہلے والے لفظوں کی جمع بنتی ہے۔ یعنی لفظ

پائے مجہول۔ بائے بسم اللہ۔ رائے قرشت۔ پائے جاناں۔ گدائے سے کدہ۔ ہمائے عزم۔ خدائے برتر۔ ہمائے تیز پرواز۔ شعلہ ہائے ہوس۔ ؎

(۵) اسی طرح جن لفظوں کے آخر میں واؤ ہوتا ہے، اور وہ کھینچ کر پڑھا جاتا ہے، تو اضافت کے لیے اُن کے آخر میں بھی "ے" بڑھا دی جاتی۔ جیسے بُو، گیسو، بازو، وغیرہ۔ جیسے:

بوئے گل۔ آرزوئے معلّیٰ۔ گیسوئے سیاہ۔ جستجوئے عیش۔ پہلوئے عزم۔ گفتگوئے دوستانہ۔ کوئے ملامت۔ سوئے قبلہ۔ بازوئے محنت۔ آبروئے علم۔ خوش خوئے وفا۔ جادوئے بنگال۔ جوئے کم آب۔ ہندوئے سرکش۔ ترازوئے انصاف۔

اوپر کی دونوں صورتوں میں "ے" پر ہمزہ ہرگز نہیں آئے گا۔ کچھ لوگ "صدائے غیب" یا "بوئے گل" بھی لکھ دیا کرتے ہیں:

؎ ایسے کچھ لفظوں کی جمع کی مشق بھی کر لیجیے، جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے، ایسے اکثر لفظوں کی جمع بنانے کے لیے "ئیں"، یا "ؤں" اُن کے آگے بڑھا دیتے ہیں، جیسے:

تمنّائیں۔ تمنّاؤں۔ دنیائیں۔ دُنیاؤں۔ ادائیں، اداؤں۔ دعائیں۔ دعاؤں۔

ایک ضروری بات یہاں یہاں ضرور سمجھ لیجیے کہ جو لفظ خود جمع ہوتے ہیں۔ اُن کی جمع نہیں بناتے۔ جیسے اعلاؔ خود جمع ہے، اس کو "اعلاؤں" نہیں بنایا جائے گا۔ اسی

قاعدے کے لحاظ سے یہ غلط ہے ان دونوں صورتوں میں ہمزہ کا کہیں گزر نہیں ہوگا۔ اس کو یوں بھی دیکھیے کہ الف یا واؤ کے بعد اضافت کے ایک حرف کی ہے، وہ ایک حرف "یے" ہے اب اگر اس پر ایک ہمزہ بھی لگا دیا تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ ایک حرف کی جگہ دو حرف لکھ دیے۔ اس کو کون غلط نہیں کہے گا۔ ؎

طرح الفاظوں، علماؤں، شعراؤں، اولیاؤں، اشقیاؤں، انبیاؤں وغیرہ لکھنا صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ الفاظ، لفظ کی جمع ہے۔ اعدا، عدو کی جمع ہے۔ علما، عالم کی جمع ہے۔ شعرا، شاعر کی جمع ہے۔ اولیا، ولی کی جمع ہے۔ انبیا، نبی کی جمع ہے اور اشقیا، شقی کی جمع ہے۔

؎ جن لفظوں کے آخر میں واؤ (معروف) ہوتا ہے، جمع بنانے کے لیے ایسے لفظوں کے آگے "ئیں" یا "ؤں" بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے:

خوشبو، خوشبوئیں، خوشبوؤں۔
آرزو، آرزوئیں، آرزوؤں۔
جستجو، جستجوئیں، جستجوؤں۔
گفتگو، گفتگوئیں، گفتگوؤں۔
بہو، بہوئیں، بہوؤں۔

اوپر جتنے لفظ آئے ہیں، یہ سب مونث ہیں۔ مذکر لفظوں کی جمع عام طور سے "ؤں" سے بنائی جاتی ہے، جیسے:

جادو جادوؤں
پہلو پہلوؤں

(۶) عربی کے کچھ لفظ اردو میں ایسے بھی رائج ہیں کہ عربی میں اُن کے آخر میں ایک ہمزہ ہے، مگر اب اردو میں یہ سب ہمزہ کے بغیر بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لفظ واحد ہیں اور کچھ جمع۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

وُزرا۔ علما، فقرا، صلحا، اُمرا، شُہدا، شُرفا، غُربا، ابتدا، انتہا، اِخفا، اِملا، انشا، اولیا، انبیا، اتقیا، وغیرہ۔

عربی میں علماء، اخفاء، انشاء، اولیاء، ابتداء وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ مگر اردو میں اب اس طرح کے لفظ ہمزہ کے بغیر لکھے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح ان کو لکھنا چاہیے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے

پلّو	پلّوؤں	بالو	بالوؤں
اُلّو	اُلّوؤں	ستّو	ستّوؤں
بچھّو	بچھّوؤں	آلو	آلوؤں
ہندو	ہندوؤں	خالو	خالوؤں
تالو	تالوؤں	سادھو	سادھوؤں
لٹّو	لٹّوؤں	بازو	بازوؤں

ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ کوئی بھی لفظ، جس کے آخر میں واوِ معروف ہو، اُس کے آگے "ؤں" بڑھائیں گے۔ گویا اِس صورت میں دو واؤ آئیں گے۔ پہلا واو اصل لفظ کا ہوگا اور دوسرے واؤ پر ہمزہ ہوگا۔ جو لوگ "ہندؤں" یا "بالؤں" یا "آرزؤں" یا "گیسؤں" لکھتے ہیں، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔

(۷) نیچے لکھے ہوئے لفظوں کے آخر میں "یے" ہے، اور یہ ساکن ہے:

مَے (شراب) نَے (بانسری) شَے (چیز) جَے۔ ہَے ہَے (کلمۂ افسوس)۔ وَے۔ پَے (پیچھے) طَے۔ رَے (ایک شہر کا نام)، قَے۔

یہ تو وہ لفظ تھے، جن کے پہلے حرف پر زبر ہے۔ اب اُن لفظوں کو دیکھیے جن میں "یے" سے پہلے الف ہے:

گائے۔ ہائے۔ رائے۔ چائے۔ سرائے۔ وائے۔ برائے۔ بجائے۔ سہائے۔ اُپائے۔

پہلا لفظ گائے ہے۔ اس میں تین حرف ہیں: گ۔ ا۔ ے۔ آخر کے دونوں حرف ساکن ہیں۔ اب اگر اس "یے" پر ایک ہمزہ لگا دیا جائے۔ جیسا کہ کچھ لوگ کیا کرتے ہیں، تو یہ تین حرفی لفظ، چار حرفی ہو جائے گا۔ غلط ہوا نا۔ غلط اور بالکل غلط۔ ان سب لفظوں کو ہمزہ کے بغیر اُسی طرح لکھا جائے گا۔ جس طرح یہ اوپر لکھے ہوئے ہیں۔ "جگدیش سہائے" اور "رائے بہادر" یا "برائے خدا" اور "موہن کی گائے"، لکھنا غلط ہوگا۔ جگدیش سہائے، رائے بہادر، برائے خدا، موہن کی گائے، صحیح ہوگا۔

اضافت کی صورت میں بھی ان پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ جیسے:

رائے عالی۔ مےِ کوثر۔ شےِ دیگر۔ شےِ لطیف۔ پےِ قافلہ۔ سرائے۔ روح اللّٰہ خاں۔ برائے خدا۔ بجائے غم۔

---

(۸) قواعد میں حاصل مصدر کا حال آپ نے ضرور پڑھا ہوگا۔ اردو، میں فارسی کے کچھ ایسے حاصل مصدر عام

عام طور سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کے آخر میں "ش" ہوتا ہے اور اس سے پہلے "یٔ" ہوتی ہے۔ اور اس پر زیر ہوتا ہے۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

آزمایش۔ آرایش۔ آسایش۔ افزایش۔ آلایش۔ ستایش۔ نمایش۔ کشایش۔ گنجایش۔ پیدایش۔ فرمایش۔

ان کو ہمیشہ "ی" سے لکھا جائے گا۔ ہمزہ ان پر کبھی نہیں آئے گا۔

ان کا قاعدہ بھی سمجھ لیجیے۔ جیسے فارسی کا مصدر ہے: آزمودن۔ اس کا امر ہے: آزما۔ امر کے آگے حاصل مصدر کا "ش" بڑھایا گیا تو آزمایش بن گیا۔ ہمزہ سے کوئی واسطہ ہی نہیں ـــ اردو کے لہجے میں بھی آدھی "ی" نکلتی ہے، ہمزہ کی آواز نہیں نکلتی۔ اب اگر کوئی صاحب "آزمائش" لکھیں تو سمجھ لیجیے۔ کہ انھوں نے غلطی کی آپ کیوں غلطی کے پھیر میں پڑیں [1]

نیچے لکھے ہوئے لفظ بھی ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے:

شایستہ۔ شاید۔ جاے داد۔ پاے دار۔ آیندہ۔ پایندہ۔ نمایندہ۔ پاے گاہ۔

(۱۰) اسم مصدر بنانے کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں "ہ" ہوتی ہے، ان کے آگے "گی" بڑھا دیتے ہیں اور "ہ" کو نکال دیتے ہیں۔ جیسے:

نغمہ سے نغمگی۔ شعلہ سے شعلگی۔ خواجہ سے خواجگی۔ بندہ سے بندگی۔ زندہ سے زندگی۔ بے پردہ سے بے پردگی۔

نیچے لکھے ہوئے لفظ بھی اسی قاعدے سے بنے ہیں:

ہمسایگی۔ بے مایگی۔ بلند پایگی۔ نمایندگی۔

یہ اصل میں تھے: ہمسایہ۔ بے مایہ۔ بلند پایہ۔ نمایندہ۔ "ہ" کو ہٹا دیا اور "گی" کو بڑھا دیا۔ ہمسایہ سے ہمسایگی بن گیا۔ ہمزہ کا یہاں بھی گزر نہیں ہوگا یعنی "بے مایگی" اور "ہمسایگی" صحیح۔

(۱۱) کچھ اور لفظ دیکھیے۔ ان سب میں بھی صرف "ی" ہے:

اڑیل۔ مریل۔ دڑھیل۔ سٹریل۔ ناریل۔ ہمایوں۔ بدایوں۔ کمایوں۔

(۱۲) اب ایسے لفظوں کو بھی سمجھ لیجیے جن میں ہمزہ آتا ہے اور آنا چاہیے۔

عربی کے کچھ لفظوں میں ہمزہ آتا ہے۔ یہ زیادہ تر اسم فاعل ہوتے ہیں یا جمع۔ مثلاً:

---

[1] جمع بنانے کے لیے "یں"، یا "وں" لفظ کے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے:

فرمایش	فرمایشیں	فرمایشوں
نمایش	نمایشیں	نمایشوں
آرایش	آرایشیں	آرایشوں
آسایش	آسایشیں	آسایشوں
گنجایش	گنجایشیں	گنجایشوں
آزمایش	آزمایشیں	آزمایشوں
ستایش	ستایشیں	ستایشوں

قائل، سائل، مسائل، فضائل، حمائل،
رسائل، وسائل، شمائل، دلائل،
قبائل۔

نائب، تائب، صائب، عجائب، غرائب
غائب۔

لائق، فائق، شائق، حقائق، شقائق۔
کوائف، طوائف، وظائف۔

دائر، زائر، سائر، نظائر، بصائر، جزائر،
طائر، دوائر۔

ذرائع، وقائع، صنائع، بدائع، ضائع۔
شرائط، نتائج، جائز، فائز، متشائم۔
جرائد، فوائد، عقائد، عمائد، عائد،
قصائد، زائد، شدائد۔
نفائس، نقائص، فرائض، خزائن، قبائح،
لوائح، قرائن، ملائک۔
عزائم، علائم، دائم، قائم، جرائم۔

کچھ اور لفظ۔ ان میں عربی، فارسی اور ہندی کے ملے جلے لفظ ہیں:

ذائقہ، طائفہ، دائرہ۔ زائچہ، کائنات، مطمئن،
آئندہ، آئینہ، آئین، تائید، تزئین، پائل،
گھائل، جائفل، پائنتی، کائیاں، بائیں،
دائیں، سائیں، بکائن، اجوائن، ادوائن، گسائیں۔

انگریزی لفظوں میں عام طور سے ہمزہ آتا ہے، جیسے:

سائکل، رائفل، فنائل، کرائم، رائل،
مائکل، مائنس، سائنس، نائٹروجن، نائلون،
مزائل، بائبل، سائز، بائکاٹ۔ سائڈ، ٹوئنٹی،
موبائل، وائن، ڈائنامیٹ، سائن بورڈ۔

آپ نے ایک بات ضرور محسوس کی ہوگی۔ کہ جہاں جہاں ہمزہ آیا ہے، وہاں وہاں اس پر زیر ہے۔ اسے بھی دھیان میں رکھیے گا۔

ہمزہ اور یَ میں جو گڑبڑ ہوتی ہے اور جس طرح ایک کی جگہ دوسرے کو رکھ دیتے ہیں، اس کا بیان اب ختم ہوا۔

ذرا اطمینان کا سانس لیجیے۔ لیکن بس، کچھ دیر کے لیے۔ ابھی واؤ اور ہمزہ کا جھگڑا باقی ہے۔ اُسے بھی تو نپٹانا ہے۔ اس کے بعد آپ ذرا دیر تک آرام کر سکتے ہیں۔

رام پور کے ایک مشہور شاعر تھے۔ شادؔ عارفی۔ ان کا یہ شعر مجھے اس موقع پر یاد آیا:

ستائے جو رہ رو، تو نہ دیجے اُسے طعنہ
یہ دیکھیے، ہمّت تو نہیں ہار رہا ہے

تو اسی طرح ستانے میں کوئی حرج نہیں، بس ہمت ہارنے کی نہیں ٹھہری ہے۔ نہ میں کاہلی کے پھیر میں آؤں اور نہ آپ گھبراہٹ کے چکر میں پڑیں۔

(باقی)

مولانا شفیع الدین نیّر

آہاہاہا، چھٹی آئی، چھٹی آئی، چھٹی

محترم نیّر صاحب کی یہ پیاری نظم یقین ہے کہ آپ خوب مزے لے کر پڑھیں گے۔ محترم نیّر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ آپ چھٹیوں میں خوب ترو تازہ اور اگلی پڑھائی کے لیے چاق چوبند ہو جائیں۔ (اڈیٹر)

آہاہاہا، چھٹی آئی، چھٹی آئی، چھٹی
اوہو ہوہو، ہم نے پائی ہم نے پائی چھٹی

چھٹی ہے بھئی چھٹی۔ آؤ لکھنا پڑھنا چھوڑیں
کھیلیں کودیں، موج اڑائیں، سارے بندھن توڑیں

کیسی اُردو، کیسی ہندی، کیسا علم ریاضی
کیسا حال اور کیسا مستقبل اور کیسی ماضی

سائنس اور ڈرائنگ سے بھی اب چھٹکارا پائیں
چھٹی ہے، بھئی چھٹی، آؤ دن بھر لطف اٹھائیں

آؤ سارے مضمونوں کی دُم میں نمدا باندھیں
سیر کریں باغوں کی جا کر ان میں کودیں پھاندیں

کھیلیں اب سب مل جل کر ہم بن کر بھائی بھائی
تاریخ اور جغرافیہ چھوڑیں کھائیں دودھ ملائی

دودھ ملائی سنتے ہی منہ میں پانی بھر آیا
چھٹی کے تو نام ہی نے ہم سب کا خون بڑھایا

اب روزانہ کھیلیں گے ہم کرکٹ اور فٹ بال
کھا پی کر کپّا کریں گے اپنے اپنے گال

گلّی ڈنڈا، گیند تڑی، کھیلیں گے کھیل کبڈی
کچھ پرواہ نہیں میری ہوں یا ہو جائیں کھڈی

سیر کریں گے آگرہ کی دیکھیں گے جا کر تاج
خوب مزے آئیں گے یارو ہوگا کام نہ کاج

کھیلنے اور کھانے ہی سے بس ہوگا ہم کو کام
کھیل کود میں ہو جائے گا روشن اپنا نام

ٹھیک کہا بدھو بھیّا نے "ہے تعلیم خراب
کھیلو کودو موج اڑاؤ، بن جاؤ نوّاب"

چھٹی میں پڑھنے کو کہے جو ہم سے اُس سے کٹّی

آہاہاہا، چھٹی آئی، چھٹی آئی، چھٹی

خواجہ محمد معین الدین ایم ، اے بی ایڈ



میں بہت ذہین لڑکا تھا

مجھے کہانیاں لکھنے کا بڑا شوق ہے ، میں نے کئی چھوٹی اور اچھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں ۔ ، یہ شوق مجھے میری نانی امّاں نے دلایا تھا ۔ وہ بڑی اچھی کہانیاں کہتی تھیں ۔ جب میں بچہ تھا ، کسی بات پر رات میں ضد کرکے سارا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا تو نانی اماں بڑھاپے کی کمزوری کے باوجود مجھے اپنی گود میں لے لیتیں اور گھر کے صحن میں ٹہلتی ہوئی مجھے کہانیاں سُنایا کرتیں ۔ کبھی چاند کی طرف اشارہ کرکے کہتیں کہ چاند میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے تو میں اپنی آنکھیں مل مل کر چاند کی طرف دیکھتا سچ مچ ایک بڑھیا جیسی شکل دکھائی دیتی ۔ اس کے سامنے چرخہ ، اس کے ہاتھ میں لمبا دھاگا ، دوسرے ہاتھ میں چرخے کا دستہ ، سامنے پونیوں کی ٹوکری اور کھنڈکیوں کا گچھا ۔ یہ سب دکھائی دیتے تھے کبھی وہ آسمان کی طرف اشارہ کرکے کہتیں ، "بادل کیا ہیں ، شکر کی پیٹریاں ہیں ، اللہ میاں انھیں ضدی بچوں کو نہیں دیتے ، ہنسنے بولنے والے بچوں کو دیتے ہیں ۔" کبھی فرمائیں " یہ جو تارے ہیں وہ آسمان کی آنکھیں ہیں ، وہ بے حساب ہیں ۔ آسمان جب ضدی بچوں پر بگڑتا ہے تو اُن آنکھوں سے انھیں گھور گھور کر دیکھتا ہے ۔ اس لیے تم آنکھیں بند کرکے میرے کندھے پر سر رکھو تو وہ تمھیں نہیں دیکھے گا ، " میں ان کی بات مان کر کندھے پر سر رکھ دیتا اور ایسے میں مجھے نیند آجاتی ۔

جب میں ذرا بڑا ہوا اور مدرسہ جانے لگا تو ایک رات نانی امّاں نے گھر کے تمام بچوں کو ایک جگہ جمع کرکے کہا ۔ ہم سب اپنے اپنے بستر پر بیٹھے نانی ماں کا انتظار

کرنے لگے ۔ وہ آئیں اور ہمارے بچوں بیچ بیٹھ گئیں۔ پوچھا "کیا چاہتے ہو؟"

ہم سب ایک زبان ہوکر بولے "کہانی!" تو انھوں نے کہانی شروع کر دی۔

"ہماری بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح آسمان پر بھی ایک مخلوق کے غول گھومتے پھرتے ہیں، انھیں ہم بادل کہتے ہیں۔ وہ تمام دن دانہ پانی کی تلاش میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھرتے ہیں۔ ان کا ایک رکھوالا ہوتا ہے۔ وہ انھیں ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں چند بوڑھیاں اپنے بال بچّوں کے لیے بڑے بڑے گھڑوں میں پانی بھر کر رکھتی ہیں۔ وہ بادل چھپتے چھپاتے وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ڈرتے ڈرتے اُن گھڑوں کے اندر گھس کر سارا پانی پی لیتے ہیں اور لوٹ کر آسمان میں پھر سے پھیل جاتے ہیں۔ اور وہی پانی جب اُگل دیتے ہیں تو زمین پر بارش ہوتی ہے۔ مگر بوڑھیاں بھی بڑی ہوشیار ہوتی ہیں۔ وہ بادلوں کی تاک میں وہیں کہیں دبکی پڑی رہتی ہیں جوں ہی بادل گھڑوں کے اندر پہنچ جاتے ہیں کو جھٹ سے اُن پر ڈھکن ڈھک دیتی ہیں، پھر گھڑوں کو آگ پر رکھ دیتی ہیں جب بادل خوب پک جاتے ہیں تو انھیں ٹھنڈا کر کے ایک ایک ٹکڑا اپنے پوتا پوتی۔ نانی۔ نواسی میں بانٹ دیتی ہیں۔ وہ سب مزے لے کر کھاتے ہیں کیوں کہ بادل کے ٹکڑے بڑے میٹھے اور مزے دار ہوتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں وہ اسی طرح اپنے بال بچّوں کا پیٹ بھرتی تھیں۔ ورنہ یہ باجرہ، جوار، یہ چاول گیہوں اس زمانے میں کہاں تھے؟"

اس کہانی کو سن کر دو چار دن گزرے تھے کہ ماسٹر صاحب نے جماعت میں ہمیں "بھاپ" پر ایک سبق پڑھایا۔ انھوں نے کیتلی میں پانی گرم کیا، جب پانی کھولنے لگا تو ٹونٹی سے بھاپ بھک بھک نکلنے لگی۔ تب ماسٹر صاحب نے کہا "تالابوں، جھیلوں اور سمندروں کا پانی سورج کی گرمی سے اسی طرح بھاپ میں تبدیل ہوکر اوپر اٹھتا ہے، بھاپ کو جب سرد خطے ملتے ہیں تو وہ بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بادل جب اور سرد ہو جاتے ہیں تو پانی بن جاتے ہیں۔ ہوا اُس پانی کو سنبھال نہیں سکتی تو وہ زمین پر گر جاتا ہے۔ اسی کو پانی کا برسنا یا بارش کا ہونا کہتے ہیں۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب نے نیا سبق شروع کرنے سے پہلے پچھلے سبق پر کچھ سوال پوچھے "بچو! بتاؤ بارش کس طرح ہوتی ہے؟" سب بچے چپ چاپ بیٹھے رہے، کسی نے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ میں آفت کا مارا مچل اُچھل کر اپنا ہاتھ پکار رہا تھا کیوں کہ میں ذہین مانا جاتا تھا۔ اس لیے ماسٹر صاحب کو یقین تھا کہ ان کی پڑھائی کی لاج اگر کوئی رکھ سکتا تھا تو وہ میں ہی اکیلا تھا۔ اس لیے سب سے آخر میں مجھ سے کہا۔ "بابا! تم بتاؤ!"

بابا اُٹھے، بھولے بھالے بنے، ادب سے سینے پر ہاتھ باندھے پورے یقین اور بھروسے کے ساتھ وہ ساری کہانی سُنادی جو نانی اماں نے کچھ دن پہلے کہی تھی۔ میں اِدھر خوش تھا کہ جماعت بھر میں اکیلا ہی اس قابل تھا اور اُدھر ماسٹر صاحب کے غصّے کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جماعت کے تمام بچّوں کو تو چھوڑ دیا اور مجھ غریب پر بارش کی طرح برس پڑے اتنے بید برسائے کہ سارے جسم پر نیل پڑ گئے۔ جب بید نے جواب دیا تو مُکّے اور گھونسے شروع کر دیے۔ صاحب کا سانس پھولنے لگا، مُنہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ساتھی کیا بیچ بچاؤ کرتے۔ وہ تو اپنی خیر منا رہے تھے کہ اُن کی بلا مجھ پر ٹلی، وہ سانس روک جماعت کے ایک کونے میں دبکے پڑے تھے۔

جب ماسٹر صاحب کا جی بھر گیا یا غصّہ اتر گیا یا یوں کہیے کہ خوب تھک گئے تو مجھ سے کہا۔ "بنچ پر کھڑے ہو جاؤ۔" مجھ سے اب کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ گر گر جا رہا تھا تو ساتھیوں کو حکم ہوا کہ "اسے بنچ پر کھڑا کر کے پکڑے رہو۔"

وہ دن اور چھپن برس کی یہ عمر، اس دن کا تیسری جماعت کا طالب علم اور آج کا ایک فوقانیہ مدرسے کا سائنس کا ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر۔

ہر سال بارش ہوتی ہے، چار مہینے بادل گرجتے ہیں اور ادھر میرے سینے پر چکّی چلتی ہے۔ یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جسم بید کی طرح کانپتا ہے۔ جیسے سخت جاڑا بخار چڑھ گیا ہے۔

ان چار مہینوں میں ایک نہ ایک دن صاحب خواب میں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ وہ دُنیا میں ہیں یا نہیں اس کا کوئی پتہ نہیں۔ میں انھیں سبق سناتا ہوں۔ پٹائی ہوتی ہے، میں "بارش بارش!!" کہہ کر جاگ اُٹھتا ہوں اور ہکّا بکّا بیٹھ جاتا ہوں۔

بیوی بچّے دوڑ کر آتے ہیں اور سبب پوچھتے ہیں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ انھیں کیا بتاؤں۔ ہنس کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ لیکن جسم میں کپکپی ضرور رہتی ہے۔

بَرف جنگلی مرغ (گراؤزر) کی پناہ گاہ ہے۔

مغربی ملکوں میں پائے جانے والا ایک قسم کا جنگلی مرغ گراؤزر سخت سردی میں تیز ہواؤں سے بچنے کے لیے خود کو برف میں چھپا لیتا ہے۔ وہ برف میں کئی کئی دن پڑا رہتا ہے۔ کیوں کہ جب باہر سرو بدن کو جما دینے والی ہوا میں چلتی ہیں تو اس کے مقابلہ میں برف کے تودے کے اندر خاصی گرمی ہوتی ہے

جناب اکرام احمد ۔ ایم ۔ ایس ۔ سی ۔ ایم ۔ ایڈ ۔ ایم ۔ اے لندن
سائنس لیکچرر ۔ ٹیچرس کالج
جامعہ ملیہ اسلامیہ

کوپرنکس

جدید علمِ فلکیات کا خالق

سچ بولنا کبھی کبھی بہت خطرناک ہوتا ہے ۔ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں نڈر اور بہادر پھر بھی سچ بولنے سے باز نہیں آتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ پولینڈ کے سائنسداں کوپرنکس کے ساتھ پیش آیا ۔ انھوں نے بتایا کہ سورج ساکن ہے زمین اور دوسرے سیارے اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

یہ بات ہمیں آج بہت معمولی لگتی ہے ۔ لیکن پانچ سو سال پہلے " اسی بات " کے کہنے پر لوگوں نے کوپرنکس کو خوب بُرا بھلا کہا ۔ پادریوں نے ان کو پاگل ، گمراہ اور جھوٹا کہا ۔ اُن کو ڈرایا دھمکایا گیا تاکہ کسی طرح وہ یہ کہہ دیں کہ مذہبی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہی صحیح ہے ۔ لیکن کوپرنکس سچائی سے نہ ہٹے ۔ آج ساری دُنیا اُن پر فخر کرتی ہے ، ان کی دریافت کی قدر کرتی ہے ۔ ۱۹ فروری ۱۹۷۳ء کو دہلی کے "وگیان بھون" میں کوپرنکس کا پانچ سواں جنم دن منانے کے لیے ساری دنیا کے سائنسداں جمع ہوئے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

پرانے زمانے میں چاند تاروں اور کائنات کے بارے میں لوگوں کے عجیب عجیب عقیدے تھے ۔ بابل والے سمجھتے تھے کہ اس کائنات کے خالق (پیدا کرنے والے) نے سب سے پہلے ہوا کے دیوتا اور اس کی بیوی کو پیدا کیا پھر اُن کی لڑکی میں پانی کی روح ڈالی ۔ بڑی ہو کر یہ لڑکی 'نٹ دیوی' کہلائی ۔

بابل والوں کا خیال تھا کہ یہی دیوی زمین ، سورج ، چاند ، تاروں اور کل کائنات کو اپنی گود میں لیے بیٹھی ہے اس قسم کے مذہبی قصے کہانیاں ہر ملک اور قوم میں مشہور ہیں ۔ ہمارے ملک میں بھی لوگ اسی طرح کے قصے کہانیوں میں یقین رکھتے ہیں ۔ ایسے ماحول میں یونانی فلسفیوں نے خاصا اچھا کام کیا ۔ انھوں نے ان قصے کہانیوں کو ختم کرنے کے لیے کائنات کے بارے میں ایک نئی قسم کا نظام پیش کیا ۔ دیوی دیوتاؤں کی جگہ تاروں اور سیاروں کا مقام دیا ۔ اِن فلسفیوں نے بتایا کہ آسمان گول ہے اور اُس کے مرکز پر زمین ہے چاند سورج ، سب ستارے اور آسمان زمین کے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں ۔

ان پرانے خیالوں کے مقابلے میں یہ نظریہ اتنا معقول معلوم ہوا کہ ہر فلاسفر نے اس کی تبلیغ کی ۔ یونان کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر ارسطو نے تو اس نظریے کو اس خوبی سے سمجھایا کہ شبہ کی گنجایش ہی نہ رہی ۔ ارسطو کے بعد ایک اور فلاسفر ٹولمی (PTOLEMY) نے زمین کو مستقل مرکزی حیثیت دے دی ۔ تقریباً

ہر مذہب نے اس بات کو جوں کا توں مان لیا۔ اور مذہبی کتابوں میں اسی نظریے کا ذکر ہونے لگا۔

ڈیڑھ ہزار سال تک دنیا کے عالم، فلسفی اور مذہبی رہنما لوگوں کو بتاتے رہے کہ زمین رُکی ہوئی ہے، وہ کائنات کے بیچوں بیچ ہے، سورج، تارے اور آسمان سب اُس کا طواف کرتے ہیں۔

اِن حالات اور عقائد کے درمیان کوپرنکس کا جنم ہوا۔ اُن کی پیدائش ۱۹۔ فروری ۱۴۷۳ء کو پولینڈ کے ٹورن شہر میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد تاجر تھے۔ کوپرنکس نے ابتدائی تعلیم ٹورن ہی میں پائی۔ پھر اٹلی کی یونی ورسٹیوں میں آرٹ، قانون اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۵۰۳ء میں انھوں نے قانون میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ کوپرنکس کے والدین کا انتقال اُن کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اُن کی پرورش اُن کے چچا نے کی تھی جو ایک پادری تھے۔ چچا کے انتقال کے بعد اُن کی جگہ کوپرنکس کو ملی اور وہ بھی پادری بن گیے۔

ستاروں کے علم سے اُن کو شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ اس علم پر انھوں نے اٹلی اور یونان کے بڑے بڑے عالموں کے کاموں کا مطالعہ کیا۔ ارسطو اور ٹولمی کے نظریات کو انھوں نے خاص طور پر پڑھا اور اِن نظریات کو صحیح سمجھ کر لوگوں کو پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ لیکن جب انھوں نے مشہور ریاضی داں فیثاغورث (YTHAGORUS) کا مطالعہ کیا تھا تو انھیں ارسطو اور ٹولمی کے زمین کی مرکزی حیثیت کے نظریہ پر شبہ ہونے لگا۔

ان کا مکان ایک پہاڑی پر تھا اور اس میں ایک مینار تھا۔ کوپرنکس روز رات کو اُس مینار پر جاکر بیٹھ جاتے۔ یہ مینار اُن کی تجربہ گاہ بھی تھا اور لائبریری بھی۔ وہ گھنٹوں وہاں علم فلکیات سے متعلق کتابیں پڑھتے رہتے اور ستاروں کا مشاہدہ بھی کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوربین کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو کوپرنکس کے سو سال بعد بنی۔ بغیر دوربین کے ستاروں کا مشاہدہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ان کی جگہ طے کرنا، ان کے راستے معلوم کرنا بہت ہی مشکل بات تھی، لیکن کوپرنکس کو تارے دیکھنے کی دُھن تھی۔

انھوں نے لکڑی کے عجیب عجیب شکلوں کے آلات بنائے اور اُن کے ذریعہ تاروں کا تیس سال تک مشاہدہ کیا۔ بینائی کمزور ہو گئی لیکن تارے دیکھنے کی عادت کم نہ ہوئی انھوں نے تاروں کی حرکت سے متعلق پیچیدہ فارمولے بنائے اور ان کی مدد سے مریخ، زحل، مشتری اور زہرہ سیّاروں کی صحیح جگہ دریافت کی۔ مسلسل مشاہدے کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں ہے اور یہ سیّارے اس کے گرد گردش نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اگر سورج کو مرکز تسلیم کیا جائے اور اُس کے گرد سیّاروں کو گردش میں مانا جائے تو علم فلکیات (ستاروں کا علم) آسان ہو جاتا ہے۔ اس نئے نظریے کے ذریعے انھوں نے تاروں اور سیّاروں کے بارے میں بہت سی باتوں کی آسانی سے وضاحت کی۔ دِن رات کا بننا انھوں نے اِس طرح سمجھایا کہ سورج رُکا ہوا ہے اور اُس کے سامنے زمین اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے میں ایک بار لٹو کی طرح گھوم جاتی ہے۔ پرانا عقیدہ یہ تھا کہ زمین ساکن یا رُکی ہوئی ہے اور ۲۴ گھنٹے میں سورج اور آسمان زمین کا ایک چکر مکمل کر لیتے ہیں۔ کوپرنکس نے حساب لگایا کہ سورج اور آسمان کے دوسرے تارے زمین سے بہت دور ہیں۔ اور اُن کے ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر پورا کرنے کے لیے بہت تیز رفتار سے گھومنا پڑے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آسمان اور

دور کے تارے ٹوٹ سکتے ہیں ۔

اس نئی تھیوری نے ایک انقلاب برپا کردیا۔ ہزاروں سال پرانے عقیدوں کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ پادریوں نے کوپرنکس کو باغی اور خبطی کہا۔ اس کو پاگل کہا گیا ۔ مذہبی کتابوں میں لکھی ہوئی بات کے خلاف کچھ بھی سننے کے لیے لوگ تیار نہ تھے ۔

کوپرنکس کو طرح طرح سے تنگ کیا گیا لیکن وہ اپنی بات سے نہ ہٹے انھوں نے اپنی معلومات کو ایک کتاب کی شکل میں لکھا لیکن اس کتاب کو چھاپنے کے لیے کوئی پریس تیار نہ ہوا ۔ پادریوں اور عوام کی مخالفت سے سب کو ڈر لگتا تھا ۔

کوپرنکس نے اپنے ایک دوست سے کتاب چھپوانے کے لیے اصرار کیا۔ دوست نے ایک چھاپے خانے والے کو مشکل سے تیار کیا لیکن اپنی جان بچانے کے لیے کتاب کے دیباچہ میں لکھ دیا کہ اس کتاب میں کوپرنکس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذاتی رائے ہے ورنہ حقیقت وہی ہے ۔ جو مذہبی کتابوں میں درج ہے ۔

۲۴ ۔ مئی ۱۵۴۳ء کو یہ کتاب چھپ کر کوپرنکس کے ہاتھ میں آئی ۔ دیباچہ پڑھا اور دم نکل گیا ۔

کوپرنکس کی تھیوری اگرچہ بالکل صحیح نہ تھی لیکن اُس نے پرانے عقائد کو ضرب پہنچائی اور لوگوں کو اور آگے سوچنے اور تجربے کرنے کی دعوت دی اسی لیے کوپرنکس کو جدید علم فلکیات کا بانی کہا جاتا ہے ۔ اُن کے دریافت کی بنیاد پر ہی ، کیپلر، گلی لیو اور نیوٹن نے کائنات کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کیں ۔

کوپرنکس کے بعد کائنات سے سائنسدانوں کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کو سمجھنے کے لیے آج نئے نئے ماڈل پیش کیے جا رہے ہیں ۔ موجودہ زمانے میں آئنسٹائن ، گیمو اور ہائل (۱۹۵۶) نامی سائنسدانوں کے نام قابل ذکر ہیں ۔ آخری تھیوری اور ماڈل کچھ بھی ہو۔ لیکن کوپرنکس کو بھلایا نہیں جا سکتا ۔

رُوس کے کتب خانے

رُوس میں تین لاکھ ساٹھ ہزار کتب خانے ہیں جن میں تین کروڑ بیس لاکھ کتابیں ہیں۔ جس میں سائنس ، ٹیکنالوجی ۔ سماجی علوم، تاریخ ۔ جغرافیہ اور ادبی کتب شامل ہیں ۔ اٹھارہ کروڑ افراد ان کتب خانوں سے استفادہ کرتے ہیں ۔ لینن کا کتب خانہ دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے ۔ جس میں دو کروڑ چھ لاکھ کتابیں ہیں ۔ دنیا بھر میں جتنی بھی اچھی کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں ۔ وہ سب اس کتب خانے میں آتے ہیں ۔ اس کتب خانہ کا انتظام اتنا اچھا ہے کہ ۱۵۶۳ء سے ۱۹۱۷ء تک کے درمیان شدہ ۵ لاکھ ۔ ۵ ہزار کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب طلب کرکے پڑھی جا سکتی ہے ۔ اس کتب خانہ میں ۸ ہزار اخبارات ۱۶ ہزار غیر ملکی رسالے ایک ہزار غیر ملکی اخبارات آتے ہیں ۔ روزانہ دس ہزار ماسکو کے شہری یہاں ہر روز آتے ہیں ۔ کتب خانہ کے دفتر کو ہر روز ایک لاکھ ۳۰ ہزار ٹیلیفون کال کتابوں کے بارے میں آتے ہیں ۔

محمد عبیداللہ شریف حیدرآبادی

جناب رشید الوحیدی ایم اے لکچرر جامعہ کالج

معصوم برائی

آپ نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہوگا اور انھیں اچھی طرح جان گئے ہوں گے، اُن کے دلچسپ اور پیارے حالات سُن کر جی چاہتا ہوگا کہ کاش وہ زندہ ہوتے اور ہم انھیں دیکھ سکتے۔

ابھی کچھ دن ہوئے ذاکر صاحب کے بہت قریبی دوست اور ساتھی محترم مجیب صاحب قبلہ نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب ذاکر صاحب کی زندگی کے حالات پر ہے۔ بہت دلچسپ، بہت پیاری کتاب ہے۔ اس میں ذاکر صاحب کی زندگی کے بہت صحیح حالات لکھے ہیں۔ کتاب تو آپ بڑے ہوکر پڑھیں گے۔

اس کتاب سے جستہ جستہ چند قصے آپ کو سنائیں، ان قصوں میں آپ کو مزہ آئے گا۔ غور کیجیے گا تو سبق بھی ملے گا آپ کو اندازہ ہوگا کہ ذاکر صاحب بچپن ہی سے بڑے آدمی تھے۔ پھر آپ میں سے جو بچہ اپنے اندر یہ باتیں پیدا کرے گا۔ کیا عجب ہے کہ آگے جاکر وہ ذاکر حسین بن کر چمکے۔ آپ کے ذہن میں ایک بات اور ابھرے گی اور شاید آپ کو اس خاص بات سے اتنا لطف آئے کہ آپ چپکے چپکے ہنسنے لگیں۔ اور بھئی وہ ہیں ذاکر صاحب کی معصومیت اور بھولی ادائیں اچھا تو سنیے!

ذاکر صاحب جب اٹاوہ سے اسکول کی تعلیم ختم کرکے آنے لگے تو اسکول کے بانی اور منیجر مولوی بشیر الدین نے ان کو کھانے کے لیے بلایا تاکہ اپنے چہیتے شاگرد کو محبت سے رخصت کریں، ذاکر صاحب گئے اور ان کے پاس ان کی چارپائی پر بیٹھ گئے جب کھانا آیا تو مولوی صاحب نے گوشت کی پلیٹ میں خوب ڈھیر سا پانی ملا دیا، ذاکر صاحب دیکھتے رہے اور ایسا ہو گئے جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ مولوی صاحب نے کھانا شروع کرنے کے لیے کہا، ذاکر صاحب نے کھانا کھایا اور یہ بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کھانا بدمزہ تھا یا اس میں پانی ملایا گیا تھا۔ بچو یہ چلتے چلاتے آخری امتحان تھا جو ذاکر صاحب کے استاد نے لیا تاکہ دیکھ سکیں کہ ان کا شاگرد کھانے پینے کے لیے جی رہا ہے یا بلند کام دُنیا میں کرے گا

ذاکر صاحب اٹاوہ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر اور اونچی پڑھائی کے لیے علی گڑھ پہنچے۔

وہاں کے حالات عجیب صاحب نے اپنی کتاب میں ذاکر صاحب کی زبانی سنائے ہیں۔ بہت دلچسپ ہیں آپ بھی سنیئے مزہ آئے گا۔

علی گڑھ پہونچنے پر میرے دو بھائیوں میں سے جو وہاں پہلے سے پڑھتے تھے ایک بھائی نے بازار سے میرے لیے ایک جوڑا جوتا، چند کتابیں اور ایک لالٹین خرید دی۔ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے ہم دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ بازار یونیورسٹی سے بہت دور تھا اور پھر وہاں سے یکّے پر واپس آئے، یکّہ اس لیے کرنا پڑا کہ علی گڑھ کے طالب علم ہاتھ میں سامان لے کر چلنے کو بُرا سمجھتے تھے۔

بازار سے واپس آکر میرے بھائی نے مجھے اپنے ہاسٹل میں چھوڑا اور خود کسی دوست سے ملنے چلے گئے اور چلتے ہوئے ہدایت دے گئے کہ مغرب کے وقت گھنٹی بجے تو ڈائننگ روم جاکر کھانا کھالینا اس دن اتفاق سے گھنٹی کچھ پہلے ہی بج گئی، اب تک میں کھانا کھانے کے لیے کسی خاص لباس اور خاص قسم کی ٹوپی وغیرہ کا عادی نہیں تھا۔ اور یہاں آکر دیکھا کہ ترکی ٹوپی کوٹ، بوٹ پہنے بغیر ڈائننگ روم تک جانا ہی گناہ ہے۔ اس تیاری میں مجھے کچھ دیر ہوگئی۔

میں اس قدر بدحواس ہوا کہ یہ بھی بھول گیا جوتے میں فیتہ کیسے ڈالا جاتا ہے۔ میں دو سوراخوں میں فیتہ ڈال کر کھینچتا تو وہ پورے کا پورا کھنچ کر میرے ہاتھ میں آجاتا غرض کچھ دیر کی پریشانی اور بدحواسی کے بعد الٹا سیدھا فیتہ جو پڑا تو اب اس میں گرہ لگانا بھول گیا، حالانکہ بھائی صاحب نے نئے جوتے میں فیتہ ڈالنے اور گرہ لگانے کی خوب مشق کرادی تھی۔ بڑی محنت کے بعد اچانک خود بخود گرہ لگ ہی گئی۔

اور اب جوں ہی سنور کر میں کمرے سے نکلا تو کافی دیر ہو گئی تھی سارے ساتھی ڈائننگ ہال جاچکے تھے۔ اب ایک اور مصیبت آئی میں نیا نیا آیا تھا ڈائننگ ہال کا راستہ ہی نہ جانتا تھا۔ ناچار کبھی اس کمرے کو کھٹ کھٹاتا، کبھی دوسرا دروازہ کھول کر دیکھتا اور کبھی ڈائننگ ہال کو تلاش کرتے کرتے، چکر لگاتے لگاتے کیا دیکھا کہ پھر اسی اپنے کمرے

کے سامنے کھڑا ہوں جہاں
سے مصیبتوں کے بعد بن سنور
کر نکلا تھا۔ گھڑی دیکھی (جو اسی
دن ان کے بھائی نے دی تھی ورنہ
آج تک گھڑی نہ تھی۔ سارا کام
یا سورج کے حساب سے ہوتا تھا
یا اسکول کے گھنٹے سے)"
تو گھڑی میں کھانے کے اصل وقت
سے صرف آٹھ منٹ لیٹ مگر اس آٹھ
منٹ میں کیسی کیسی مصیبت گذر گئی۔"
تو دیکھا اتنے بڑے انسان کا بچپن کتنا سادہ
اور بھولے پن سے گذرا ہے۔ اور سنیے۔

ایک بار شام کو دیر سے اپنے
کمرے میں آئے بھوک زوروں پر
تھی، ادھر ادھر دیکھا ایک ساتھی
کا بھرا ہوا خمیرے کا مرتبان
صاف کر گئے۔ انھیں اس کی پرواہ
نہ تھی کہ اتنا سارا خمیرہ کس قدر
نقصان کر سکتا ہے۔

آپا جان کا ذکر اور ان کا نام
ذاکر صاحب کے ساتھ اکثر آتا ہے
یہ نیک دل خاتون جرمنی سے ہندوستان
خدمت کا جذبہ لے کر آئی تھیں مقصد
جامعہ کی اور جامعہ کے بچوں کی خدمت کرنا تھا
ذاکر صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے
اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انھیں بھی
ذاکر صاحب سے بے پناہ عقیدت تھی، وہ
ذاکر صاحب کے ساتھ کام کر کے بہت خوش
ہوئی تھیں۔ ایک بار کیا ہوا۔

آپا جان نے ذاکر صاحب کی دعوت کی
خاص جرمنی کھانا پکایا جو ذاکر صاحب بہت پسند
تھا۔ اتفاق کی بات ذاکر صاحب وقت پر دعوت
میں نہ پہنچ سکے۔ دوسرے دن جب ذاکر صاحب
آپا جان کے پاس معافی مانگنے آئے تو آپا جان
نے کہا میں نے آپ کے لیے خاص جرمنی کھانا تیار
کیا تھا، تو لائیے ذاکر صاحب نے نہایت شوق
سے کہا۔ ذاکر صاحب کے ساتھ ان کے ایک ساتھی
حامد صاحب بھی تھے۔ دستر خوان پر آج بھی
اچھے اچھے کھانا لگے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب
بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ آپا جان نے وہ کھانا
حفاظت سے رکھ لیا تھا۔ فوراً ذاکر صاحب کے
سامنے رکھ دیا ذاکر صاحب نے ایک لقمہ لیا اور
بڑی تعریف کر کے کھانا شروع کر دیا۔ حامد
صاحب نے بھی کھانا چاہا تو انھیں منع کر دیا
کہ یہ خاص میرے لیے تیار کیا گیا ہے اور حامد
صاحب سے کہا۔ آپ دوسرے کھانے کھائیے۔
آہستہ آہستہ سب کھا لیا۔ اور برابر تعریف کرتے رہے۔

بچو ذاکر صاحب نے اس لیے حامد صاحب کو منع
کیا تھا۔ کہ وہ کھانا خراب ہو چکا تھا۔ اور ممکن ہے
حامد صاحب اس کا اظہار کر دیتے اور آپا جان کے دل
کو صدمہ ہوتا۔ ذاکر صاحب نے آپا جان کو خوش
رکھنا چاہا۔ اس لیے وہ خراب سڑا ہوا کھانا لیا۔

یہ تھے ہمارے ذاکر صاحب۔ خدا ان کی
روح کو خوش رکھے۔

●●

محمد ایوب واقف ایم۔ اے۔

قوم کے بچّوں کے نام

بڑے پیامیوں کے لیے

تمھاری فکر کے پر تو سے ہو عالم میں تابانی
تمھارے ذرّے ذرّے میں ہو سورج کی درخشانی
تمھاری گفتگو میں وہ تقدس ہو کہ دل چھومے
تمھاری زندگی کا بانکپن ہو خندہ پیشانی
یہ ہے انسانیت کا فرض کہ ہو باطل کی سرکوبی
تمھاری ذات سے پھیلے جہاں میں نورِ ایمانی
ہو شاہی اور فراوانی کی لذّت بھی تمھیں حاصل
متاعِ فقر اور استغنا کی بھی حاصل فراوانی
نئی شیرازہ بندی کا ہو تم میں ولولہ ہر دم
تمھاری داستاں ہو داستانِ سوزِ سلمانیؓ
ثنا خانوں کا جھرمٹ ہو تمھارے آگے اور پیچھے
طریقِ زندگانی ہو تمھارا ایسا لا ثانی
تمھیں ہو نازشِ ملّت زعیمِ ملک ہو تم ہی
تمھارا سینہ ہو گنجینۂ انوارِ ربّانی

فضائے زندگی پر ایک تاریکی مسلط ہے
جلا دو سینۂ انسان میں پھر شمعِ عرفانی

حمید عثمانی

چور اور سپاہی



ایک تھے موہن بابو۔ اُن کی کپڑوں کی بہت بڑی دکان تھی خدا کی مہربانی سے روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ مگر موہن بابو پیسے بڑی مشکل سے خرچ کرتے تھے۔ انھیں صرف پیسہ جمع کرنے کا شوق تھا۔ جو کچھ کماتے اسے جمع کرتے تھے۔ جیسے جیسے ان کے پاس روپیہ زیادہ ہوتا جاتا ویسے ویسے ان کا ڈر بھی بڑھتا جاتا تھا کہ کہیں رات کو چور آکر اتنی محنت سے جمع کی ہوئی کمائی چرا نہ لے جائے۔ بے چارے ڈر کے مارے ٹھیک سے سوتے بھی نہ تھے۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا اور وہ کھٹ سے اُٹھ بیٹھتے۔

موہن بابو کے سر پر ہمیشہ روپیہ جمع کرنے کی فکر سوار رہتی تھی۔ اسی فکر میں ان کی تندرستی ٹھیک نہیں رہتی تھی لیکن ان کی بیوی بہت موٹی سی تھی۔ ان کا نام تھا شانتی وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھیں۔ زیادہ کھانے سے ان کا وزن بہت بڑھ گیا تھا اور طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔

موہن بابو نے انھیں ڈاکٹر صاحب کو دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا حال سنا، اچھی طرح دیکھا بھالا اور کہنے لگے۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے ساری تکلیفیں ہیں۔ انھیں گھی کی چیزیں اور شکر بند کرنا پڑے گی۔ روزانہ تھوڑا پیدل چلنا پڑے گا — محنت کرکے یہ اپنا وزن کم کرلیں۔ ورنہ ابھی تو کچھ نہیں ہے۔

تمہارے دانتوں کو طرح طرح کی بیماریاں گھیر لیں گی۔ زیادہ مٹھائی شاید تمہیں بتا دیا۔

موہن بابو نے یہ سنا تو دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ چلو کسی طرح خرچ کم ہوگا۔ وہ خود بھی بیوی کو ٹوکتے رہتے تھے اور جب دکان جانے لگتے تو لڑکوں سے کہہ جاتے کہ اگر تمھاری ماں وہ چیزیں کھاتے جو ڈاکٹر نے منع کی ہیں تو ہمیں بتا دینا۔

موہن بابو کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام رتن تھا دوسرے کا کشور۔ رتن بڑا تھا، کشور چھوٹا۔ دونوں کو پڑھائی لکھائی کا شوق کم تھا۔ کورس کی کتابیں چھوڑ کر دونوں زیادہ تر جاسوسی رسالے پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز رات کے گیارہ بارہ بجے کے قریب جب سب سو رہے تھے۔ اکبارگی کھڑ کھڑ کی آواز ہونے لگی۔ موہن بابو جاگ اٹھے۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ کوئی بلی ہوگی اور بل بل کر کے اسے بھگانے لگے۔ کچھ دیر تک آواز نہیں آئی پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی چپکے چپکے دالان میں چل رہا ہو۔

موہن بابو نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ چور ہے۔ وہ فوراً چور چور چلاتے ہوئے اس طرف بڑھے جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ شور سن کر رتن کی آنکھ کھل گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے پلنگ کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چھوٹے سے بلب کی ہلکی روشنی میں پلنگ کے نیچے اُسے دو ٹانگیں نظر آئیں۔ رتن نے سوچا کہ یہ یقیناً چور ہے اور ہم لوگوں کے جاگ جانے کی وجہ سے پلنگ کے نیچے ڈر کے مارے چھپ گیا ہے۔ اگر وہ ہمت کر کے چور کو پکڑ لے تو اس کے بابو جی اُسے ضرور انعام دیں گے۔ رتن نے دل مضبوط کر کے پلنگ کے نیچے سے جھانکتی ہوئی ٹانگیں زور سے تھام لیں اور پوری قوت سے چور چور چلانے لگا۔

ادھر موہن بابو برآمدے میں پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بیوی شانتی منہ میں کچھ بھرے ہوئے کھڑی ہیں۔ چور کا نام سنتے ہی ان کا گلا جیسے سوکھ گیا تھا اور منہ کا لقمہ کسی صورت سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ موہن بابو نے یہ حال دیکھا تو سمجھ گئے کہ روپیہ پیسہ چرانے والا چور نہیں بلکہ پوریاں اور مٹھائی چرانے والا چور ہے۔

ٹھیک اسی وقت رتن کی آواز آنا شروع ہو گئی چور چور۔ اب موہن بابو چکرائے۔ سوچنے لگے۔ اے بھگوان یہ کیا مصیبت ہے۔ ابھی ابھی تو ایک چور پکڑا گیا یہ دوسرا کہاں سے آ پہنچا۔

اس نئی مصیبت سے ان کی بیوی ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگیں۔ بھاگنا کیسا جہاں کھڑی تھیں وہیں دھم سے گر پڑیں۔ موہن بابو تنہا کمرے کی طرف بڑھے اور یہ سوچ کر کہ کہیں چور ان پر حملہ نہ کر دے انھوں نے باہر کا دروازہ کھول دیا تاکہ پاس پڑوس کے لوگ بھی ان کی مدد کو آ جائیں۔ اور کچھ لوگ آ بھی گئے پھر تو موہن بابو شیر تھے سب کے ساتھ وہ موٹا سا ڈنڈا لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں پہنچ کر انھیں اور بھی اطمینان ہوا۔ رتن چور کی ٹانگیں پکڑے مدد کے لیے چلا رہا تھا۔

چور اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی جیسے اس کا کسی نے گلا دبا رکھا ہو۔

موہن بابو نے گرج کر کہا "اب بچ کر کہاں جاؤ گے بچہ آج ہی تو پھنسے ہو۔ میں چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ اور پھر پولیس والے تم کو جیل میں سڑا ڈالیں گے سمجھے۔"

اب بھلائی اسی میں ہے کہ خود کو چپ چاپ میرے حوالے کردو۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے تیز بلب جلا دیا۔

کمرے میں روشنی پھیلی تو انھوں نے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں چور نہیں کشور تھا۔ بے چارا اس قدر ڈر گیا تھا کہ سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا منہ سے عجیب گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں وہ غریب یہ سوچ رہا تھا کہ چور نے اس کی ٹانگیں پکڑ رکھی ہیں۔ وہ پوری طاقت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں چور اس کو گھسیٹ نہ لے جائے۔ ادھر رتن ہاتھ آئے ہوئے شکار کو کسی قیمت پر چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ دونوں ہی پسینے پسینے ہو رہے تھے۔

لوگوں نے یہ حال دیکھا تو سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ کسی نے پوچھا کہ "موہن بابو بچے تو یہ رہے آپ کی بیوی نظر نہیں آئیں۔"

موہن بابو نے کہا "وہ کھانا کھا رہی ہیں۔"

"اتنی رات گئے کھانا کھا رہی ہیں!"

"ہاں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم بہت دبلی پتلی ہو دن رات کھایا کرو۔ یہ ساری آفت اسی وجہ سے تو مچی ہوئی ہے۔"

اس پر سب اور بھی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

جناب برکت علی فراقؔ

لڈو کے نام خط

محترمی ایڈیٹر صاحب۔ پیام تعلیم

طلبا کے سامنے طبع زاد مضمون نگاری کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے بات کو ٹالنے کے لیے یہ بات کہی یا واقعی اپنی کم مائگی کا اظہار کرنے کی غرض سے کہنے لگے۔ " صاحب کوئی موضوع ہی نہیں سوجھتا!" ہم نے کہا اپنے ماحول کی چیزوں کے نام ایک ایک دو دو صفحے کے خط لکھا کیجیے۔ کی مشق مضمون نگاری کا بہترین ذریعہ ہے۔ مثلاً چوہے کے نام خط، بکری کے نام خط، دلّی کے نام وغیرہ طبع زاد مضمون نگاری کی مشق کا بہترین ذریعہ ہے۔ طالب علم نے فرمائش کی" صاحب اس طرح کے خط کا نمونہ عنایت کیجیے ممکن ہے اسی نمونے پر ہماری طبعتیں بھی موزوں ہو جائیں!" ہم نے کہا۔ " کہیے کس کے نام لکھوں خط؟" اس نے کہا۔" لڈو کے نام"

زیر نظر " خط " کی یہی شانِ نزول ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے موقر رسالے میں شایع کر دیجیے۔ اگر پیامیوں کو پسند آیا تو ان کی دلچسپی کے لیے انشاءاللہ ہر مہینے ایک خط حاضر کروں گا۔

برکت علی فراقؔ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

دسترخوانوں کی زینت، بچوں کے ہاتھ کے کھلونے،

میاں لڈو، اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔ کہو میاں، آج کل کہاں ہو؟ کسی کی منگنی میں گئے ہو، یا کسی کے بیٹے کی پیدایش کی خوش خبری سناتے پھر رہے ہو؟ میاں تم بہت خوش نصیب ہو۔ کسی کے ہاتھ میں گئے نہیں کہ خوشی سے چور چور ہو جاتے ہو۔ مگر میاں یہ کیا کہ جب دیکھو، اکیلے ہی نظر آتے ہو۔ جیسے تمھارے آگے پیچھے کوئی ہے ہی نہیں۔ کبھی شادیوں میں نظر آتے ہو، تو کبھی میلاد شریف کی مجلسوں میں اور کچھ نہیں تو نائیوں کا کام کرنے لگتے ہو، اور گھر گھر شادیوں، ولادتوں، ختنوں، امتحان کی کامیابیوں، دلہنوں کی رخصتیوں کی خوش خبریاں سناتے پھرتے ہو۔ اور ادھر تو کچھ زمانے سے چھیلا بھی بنے پھرتے ہو۔ اپنے گندمی رنگ سے جیسے اکتا گئے ہو۔ کبھی منہ پر سرخی پوت لیتے ہو۔ کبھی سرخی کے ساتھ ہرے ہرے بھورے بھورے تل بندھوا لیتے ہو۔ اچھے خاصے بہروپیے بن گیے ہو۔ مگر ذرا دامن بچا کر رہنا،

اسی بانکے پن کے شوق میں زہر کھانا پڑ جائے، تو دیکھ لو، کوئی ٹکے کو بھی تو نہ پوچھے گا۔

کل چاندنی چوک میں تمھارے بڑے بھائی مولانا قلاقند ملے تھے۔ ان کے ساتھ تمھاری بھاوج بی امرتی بیگم بھی تھیں۔ صاحب سلام ہوتے ہی دونوں بچھ گئے۔ میں نے انھیں گھر چلنے کی دعوت دی۔ بولے، آج نہیں، پھر کبھی: میں نے کہا "مولانا میرے بچے آپ سے اور امرتی بیگم سے ملنے کے لیے بہت دنوں سے بیتاب ہیں۔ بس چلے چلیے۔ وہ آپ کو سر آنکھوں پر ہی نہیں، زبانوں پر بھی بٹھائیں گے، اور امرتی بیگم کو تو ان کا پیار لیتے لیتے چاٹ جائیں گے۔

تمھارا ذکر چھڑا ہی تھا، کہ مولانا شکایتوں کی پوٹ بن گئے راستے بھر، ان کی زبان پر بس تمھارا ہی ذکر تھا۔ کہنے لگے، چھوٹا بھائی ہے، مگر ہمارے ساتھ کبھی رہتا ہی نہیں، اپنا مرتبہ اور وقار کھو دیا ہے ایک ہمارے پردادا گنٹو میاں ہیں، کیا مجال جو اپنی جگہ سے ہل جائیں، قطب ہیں قطب گردن کٹ جائے مگر اپنے مقام سے نہیں ہلتے۔ ہم خیر ان کے مرتبے کو تو نہیں پہنچ سکے۔ مگر ہم بھی کسی کے یہاں جاتے ہیں تو سو نخروں کے بعد، اور ایسے دلیسوں کے یہاں تو ہم جاتے بھی نہیں۔ مگر یہ مردود لڈو بہت چھچھورا ہو گیا ہے۔ نہ رنگ دیکھتا ہے، نہ نسل نہ مقام نہ مرتبہ۔ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں کھیلنے لگتا ہے۔ بہت سستا کر لیا ہے اپنے آپ کو۔ ہم کہتے ہیں، شادی کر لے بیوقوف، اور نہیں تو جیسی جان ہی سے سہی۔ کم سے کم دور رہو گے تو کچھ تو قیمت بڑھ جائے گی۔ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نہیں پڑو گے مگر وہ تو آوارگی میں پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ آزادی چھن جائے گی۔

اماں لڈو میاں!، تم تو اپنی بھاوج کی بہت برائی کرتے تھے: "ہر وقت اینٹھی رہتی ہیں صاحب، ایک دفعہ میں نے ان کے ساتھ چلنے کو کہا تو کہنے لگیں، "میرے ساتھ تم کو لے ہی کون جائے گا۔ میری بھی سُبکی کرانے کا ارادہ ہے کیا! اپنی عزت تو کھو ہی بیٹھے ہو" یہ لیجیے ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے"

مگر لڈو میاں، ہمارا تجربہ تو بی امرتی کے بارے میں تم سے مختلف ہے۔ وہ تو بیچاری بے حد میٹھی ہیں۔ تمھاری طرح ہر ایک کے ہاتھ پھدکتی نہیں پھرتی ہیں۔ شریف زادیوں کی طرح سمٹی سمٹائی پڑی رہتی ہیں۔ ذرا کبھی کھلیں نہیں کہ منہ سے شہد ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ تم کو اپنے ساتھ نہیں لے گئیں، ٹھیک ہی تو کیا۔ تم تو اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس پیسے میں بک جاتے ہو۔ وہ روپوں میں کھینے والی، تم ان کے ساتھ بھلا کیا بھلے لگتے۔

لیکن میاں، میرے اس خط کا بُرا نہ ماننا۔ تم پھر بھی بہت اچھے ہو۔ کم سے کم بچے تو تمھیں دیکھتے ہی تمھاری ہی طرح [illegible] ہیں۔

اب دیکھو نا، بابا یا خاندان کا کوئی بڑا کوئی سنجیدہ کام کر رہا ہوتا ہے اور کوئی بچہ اس کے کاغذ یا کتابیں جھانک کر دیکھنے یا کوئی برتن ٹٹولنے لگتا ہے۔ تو تو وہ اُسے جھڑک دیتا ہے۔ کہتا ہے۔ "اس میں کیا لڈو رکھے ہیں۔ کیا جھانک رہا ہے!"

اگر تمھارے اندر کوئی جوہر نہ ہوتا تو یہ ضرب المثل کیوں بنتی۔ کوئی یہ تو نہیں کہتا "کیا اس میں قلاقند رکھا ہے؟" تو تمھاری قیمت سے تو انکار نہیں۔ لکھنا تو لڈو میاں بہت تھا، مگر اب مولانا قلاقند میرا انتظار کر رہے ہیں اور میری بیوی امرتی بیگم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہیں، اس لیے باقی پھر کبھی۔

(تمھارا قدرشناس)

فراق

★★

آدھی مُلاقات

"پیام تعلیم" بچّوں کا بے حد پسندیدہ رسالہ ہے۔ جس طرح بچّے اپنے "پاپا" کے لیے شام کو دروازہ پر کھڑے بے چینی سے انتظار کرتے ہیں اور پاپا کو دیکھتے ہی "پاپا" کی گردن میں جھول جاتے ہیں — اُسی طرح اپنے پیارے رسالے کے لیے مہینہ کے شروع میں انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور ملتے ہی چمٹ جاتے ہیں۔

رضی مجیدی بھوپال

میں "ماہنامہ پیام تعلیم" کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ آپ اِس میں بچوں کے لیے بھرپور مواد پیش کرتے ہیں۔ سبق آموز کہانیاں، بہترین نظمیں اور دیگر چیزیں آپ کے ماہنامہ میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ واقعی۔ آپ وہ کارِ خیر کر رہے ہیں جس کا بدلہ ہمیشہ آپ کو ملتا رہے گا۔ آپ کی اس گراں قدر محنت اور تعاون کا ہی نتیجہ ہے کہ "پیامِ تعلیم" نہ صرف بچّوں میں بلکہ بڑوں میں بھی مقبول ہے۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ "پیامِ تعلیم" ترقی اور کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہی چلا جائے۔

محمد فاضل کھتری۔ بمبئی۔

مارچ کا شمارہ بھی خوب سے خوب تر رہا۔ ادب اور تہذیب پر مبنی اس جریدے کے کالم "آدھی ملاقات" کے ذریعے میں آپ کو اور اُن تمام مضامین نگار حضرات کو جنھوں نے اپنے عمدہ مضامین سے پیامیوں کا دل جیتا ہے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

"لفظ "بقیہ صفحہ آگے" دیکھ کر اکثر نوآموز پیامی کچھ گھبرا جاتے ہیں۔ میرے خیال میں مضامین پریس میں بھیجنے سے قبل اگر اس جریدے کے صفحات کو بھی مدِّ نظر رکھا جائے تو اس کی تلافی ممکن ہے۔

محمد منصور عالم آروی

عرصہ ہوا آدھی ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ مدرسہ کی مصروفیات کے باعث میں نے کبھی خدمتِ گرامی میں کوئی عریضہ نہ گذرانا۔ خیریت طلبی کی بھی فرصت نہ رہی۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ دُعا ہے کہ خدائے عز و جل آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ "پیام تعلیم" کا سرپرست قائم و برقرار رکھے۔ یہ سن کر آپ کو خوشی ہوگی کہ مجھے سال حال نیشنل اوارڈ ملا ہے گزشتہ نومبر میں آوارڈ لینے دِلّی آیا تھا۔ سوچا کہ نیاز حاصل کروں لیکن کیمپ کی مصروفیات نے چھ دن تک باہر نکلنے کا موقع نہ دیا۔

خواجہ معین الدین

مارچ ۱۹۷۳ء کا پیام تعلیم ملا بہت پسند آیا۔ خصوصاً جناب ڈاکٹر امانت صاحب کا کھانی، گیت، جناب غلام ربانی صاحب کا مضمون "ہم بچّوں سے کیا کیا سیکھ سکتے ہیں" اور ڈاکٹر مشیر الحق کا لکھا ہوا امتحان بڑا دلچسپ ہے۔ خدا کرے ہمارے یہاں کے امتحان بھی ایسے ہی ہو جائیں۔

عبدالرب ملا استاد رس ام اسکول
نیر دال ضلع بیجاپور دمیسور اسٹیٹ

اِدھر اُدھر

ریل گاڑی اب مقناطیسی قوّت سے چلا کرے گی

آج کل ریل گاڑیاں، کوئلے، ڈیزل آئل اور بجلی سے چلتی ہیں۔ لیکن اب حال ہی میں جرمنی کی ایک فرم نے ایک ایسی گاڑی بنائی ہے جو مقناطیس کی طاقت سے چلائی جائے گی۔ اس نئی ریل گاڑی کی رفتار پانچ سو کلومیٹر فی گھنٹہ ہوگی۔ مغربی جرمنی میں جو ریل گاڑی اب تک چلتی ہے۔ اس کی رفتار ۱۳۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ یہ ریل گاڑی عام ہو جائے گی، تو پھر کوئلے، ڈیزل آئل اور بجلی کی ضرورت نہ رہے گی۔

شنگھائی۔ دنیا کا سب سے بڑا شہر

یونائٹڈ نیشنز (اقوامِ متحدہ) کی ایئربک ابھی حال میں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی رو سے ۱۹۷۰ء میں شنگھائی کی آبادی ایک کروڑ آٹھ لاکھ بیس ہزار تھی۔ ۱۹۵۰ء ایئربک کی رُو سے اُس وقت یہ شہر چوتھے نمبر پر تھا اس سے پہلے دُنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو (جاپان) تھا اب یہ دوسرے نمبر پر آگیا ہے۔ اس کی آبادی اٹھاسی لاکھ اکتالیس ہزار ہے۔ پھر نیویارک کا نمبر ہے اس کی آبادی اٹھتر لاکھ پچانوے ہزار ہے۔ پھر پیکنگ کا اس کی آبادی پچھتر لاکھ ستر ہزار ہے پھر لندن کا (آبادی تہتر لاکھ اناسی ہزار) پھر ماسکو کا (آبادی ستر لاکھ پچاس ہزار)

(ہندوستان ٹائمس)

جزیرۂ انٹارکٹا۔ کھسک رہا ہے

جزیرۂ انٹارکٹا نے کھسکنا شروع کر دیا یہ جزیرۂ ڈیوس کے شمال مشرق میں ہے۔

اب سے چودہ سال پہلے لوگوں نے اس جزیرہ کا پتہ لگایا تھا۔ سائنس والوں کا غالب گمان یہ ہے کہ یہ جزیرہ برف کی ایک بڑی چٹان ہے۔ جو برسوں سے سمندر کی ریتیلی سطح پر آکر رک گئی تھی۔

ہماری فضا کا وزن

اب جب کہ ہماری زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کمپیوٹروں کا استعمال ہونے لگا ہے تو انسان آگے قدم بڑھا کر کمپیوٹروں کی مدد سے نئی نئی تحقیق کرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک تحقیق کے ذریعے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہماری زمین کے چاروں طرف ہوا کی جو دبیز تہہ موجود ہے۔ اس کا وزن ۵۷۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن ہے۔

اس کے علاوہ کمپیوٹر کی مدد سے خلائی تحقیق اور زمین کی قوّتِ کشش و زمین سے متعلق دوسری کارآمد معلومات فراہم کرنے میں بھی کام لیا جا رہا ہے۔

PAYAM-I TALEEM



10 (6)

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۶

ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی

جون ۱۹۷۳ء

قیمت : ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ : چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر
جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین



بچّوں سے باتیں

پرچہ جس وقت آپ کے پاس پہنچے گا آپ امتحان سے فارغ ہوکر مزے سے چھٹیاں منا رہے ہوں گے۔ خدا کرے آپ سب کو سال بھر کی محنت کا اچھا پھل ملا ہو۔ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہوں۔ اور جن بچوں کا نتیجہ ابھی نہیں نکلا ہے۔ انھیں بھی کامیابی کی سرخ روئی حاصل ہو۔ آمین۔

ہماری جامعہ میں اور دہلی کے سبھی اسکولوں میں کالجوں میں یونی ورسٹیوں میں گرمی کی لمبی چھٹیاں شروع ہوگئی ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے سناٹا سا چھا گیا ہے — چھٹیاں ختم ہوجائیں گی تو وہی چہل پہل شروع ہوجائے گی۔

اس سال پچھلے سال کے مقابلے میں گرمی بھی خوب پڑ رہی ہے۔ گرمی اور لوہ سے لوگ بدحواس ہیں۔ ایسے میں محترم شفیع الدین نیرؔ کی نظم پڑھیے۔ بڑا لطف آئے گا۔ یہ انھوں نے ہمیں خاص طور سے مرحمت فرمائی ہے۔ اسی پرچے میں "حرکت میں برکت" کے عنوان سے ان کی دو کہانیاں بھی پڑھیے۔ یہ آپ کو پسند آئیں تو ان شاء اللہ آگے بھی سلسلہ چلے گا۔

جناب برکت علی فراق کا مضمون یا کہانی دلاّدو کے نام خط) چھوٹے بچّوں کو خاص طور پر اچھا لگا۔ آج کل برکت صاحب کی آنکھوں میں ذرا تکلیف ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد وہ اس سلسلے کی اور کہانیاں مرحمت فرمائیں گے۔

اور ہاں اس پرچے میں ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کا دلچسپ مضمون بھی پڑھیے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی مشہور کتاب "امریکہ کے کالے مسلمان" پر اُردو اکادمی اتر پردیش کی طرف سے انعام بھی ملا ہے۔ ہم اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہے۔

"حرفوں کا جادو" کا اگلا حصّہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے۔ خاں صاحب نے اسے دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی کہانی والی بات تو نہیں آسکتی۔ باوجود اس کے آٹھویں سے گیارھویں درجے تک کے بچوں نے انھیں شوق اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔ بڑوں نے تو اسے عام طور پر پسند کیا ہے اور بچوں بلکہ استادوں تک کے فائدے کے لیے اسے کتابی صورت میں چھاپنے پر اصرار کیا ہے۔

اور ہاں ابھی اتر پردیش کی اُردو اکاڈمی نے ہمارے خاں صاحب کو اچھا بڑا سا انعام دیا ہے۔ انھوں نے ناتیح

کا کلام بڑی چھان بین کے ساتھ ایڈٹ (مرتّب) کیا ہے اور اس پر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ مقدمہ اپنی جگہ خود ایک کتاب ہے۔ خوب غور اور توجہ سے لکھا گیا ہے۔ یہ انعام اسی محنت و کاوش کا صلہ ہے۔ یہ کتاب بھی مکتبے نے شائع کی ہے۔

ہماری پرانی بہت ہی پرانی سرپرست محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کو بھی اسی ادارے کی طرف سے نوازا گیا ہے۔ انھیں انعام ان کے دلچسپ ناول "اپنی اپنی صلیب" پر دیا گیا ہے۔ ہم محترمہ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

پیام تعلیم کے ایک اور مضمون نگار احسان الحق صاحب کو بھی ان کے ناول "کالا شہر گورے لوگ" کو بھی انعام کا مستحق قرار پایا ہے۔ برادرم احسان صاحب بھی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ہمارے محترم اور بہت پرانے دوست مالک رام صاحب کی کتاب "تذکرہ معاصرین" بھی اسی ادارے سے انعام کی مستحق قرار پائی ہے۔ یہ کتاب بھی مکتبے نے شائع کی ہے۔ مالک رام صاحب مبارکباد قبول فرمائیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ عزیزہ صغرا مہدی کو ان کی کتاب "پابہ جولاں" پر انعام ملا ہے۔ یہ ان کے لیے بہت نیک شگون ہے۔ امید ہے کہ آئندہ وہ اور اچھی اچھی کتابیں لکھیں گی۔

پر کبھی انعام کی مستحق کتابوں کی لمبی فہرست میں ہم نے
[illegible] تلاش کیا ہمیں [illegible] کبھی [illegible]

کوئی کتاب نظر نہ آئی۔ بچوں کا ادب اب تک کس مپرسی کا شکار رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے دانشور بچوں کے ادب کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ صرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

پرگتی میدان کا میلا بہت دن ہوئے ہمارے پاس آیا تھا۔ گنجائش کی کمی کی وجہ سے شائع ہونے کی نوبت اب آئی ہے۔ اس کا اگلا حصہ جولائی کے پیام تعلیم میں پڑھیے گا۔

محترم غلام ربانی صاحب کا مضمون ہتھیاروں کی کہانی بھی پچھلے پرچے میں نہ چھپ سکا تھا۔ ربانی صاحب کو معلوماتی مضمون بچوں کی زبان میں کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ یہ مضمون اس کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

نیّر صاحب کی نظم کے علاوہ اس پرچے میں پروفیسر ڈاکٹر امانت، حافظ باقوی اور دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی یہ بھی بہت اچھی زبان میں لکھی گئی۔ بہت مزے کی ہیں۔

پیام تعلیم کا پچھلا ٹائٹل آپ کو بہت اچھا لگا تھا ہم نے کہا تھا کہ جون کا ٹائٹل اس سے بھی اچھا ہوگا۔ لیجیے یہ حاضر ہے اور بتائیے کہ ہم نے غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ اس کا ڈزائن قیصر سرمست صاحب نے بنایا ہے اور اسے محترم شاہد علی خاں صاحب (جنرل منیجر) نے اپنے خاص طریقے سے تین رنگوں میں چھپوایا ہے۔

آخر میں ہماری ایک بات اور سن لیجیے۔ یہ بات ہم اکثر آپ کے کانوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اب یہ چھٹیوں کا زمانہ ہے ہماری مدد کیجیے پیام تعلیم کو اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں مقبول بنائیے۔ خریدار [illegible] آپ کے رسالے کو اچھی حالت میں باقی رکھنے میں مدد دیں گی۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

گرمی کی گرما گرمی

گرمی کا موسم آیا ہے، گرمی نے رنگ دکھایا ہے
گرمی کی گرما گرمی سے، دم ناک میں سب کا آیا ہے

جون اور مئی کی گرمی نے آکر وہ آفت ڈھائی ہے
دن کی گرمی کا ذکر ہے کیا، راتوں میں بھی تڑپایا ہے

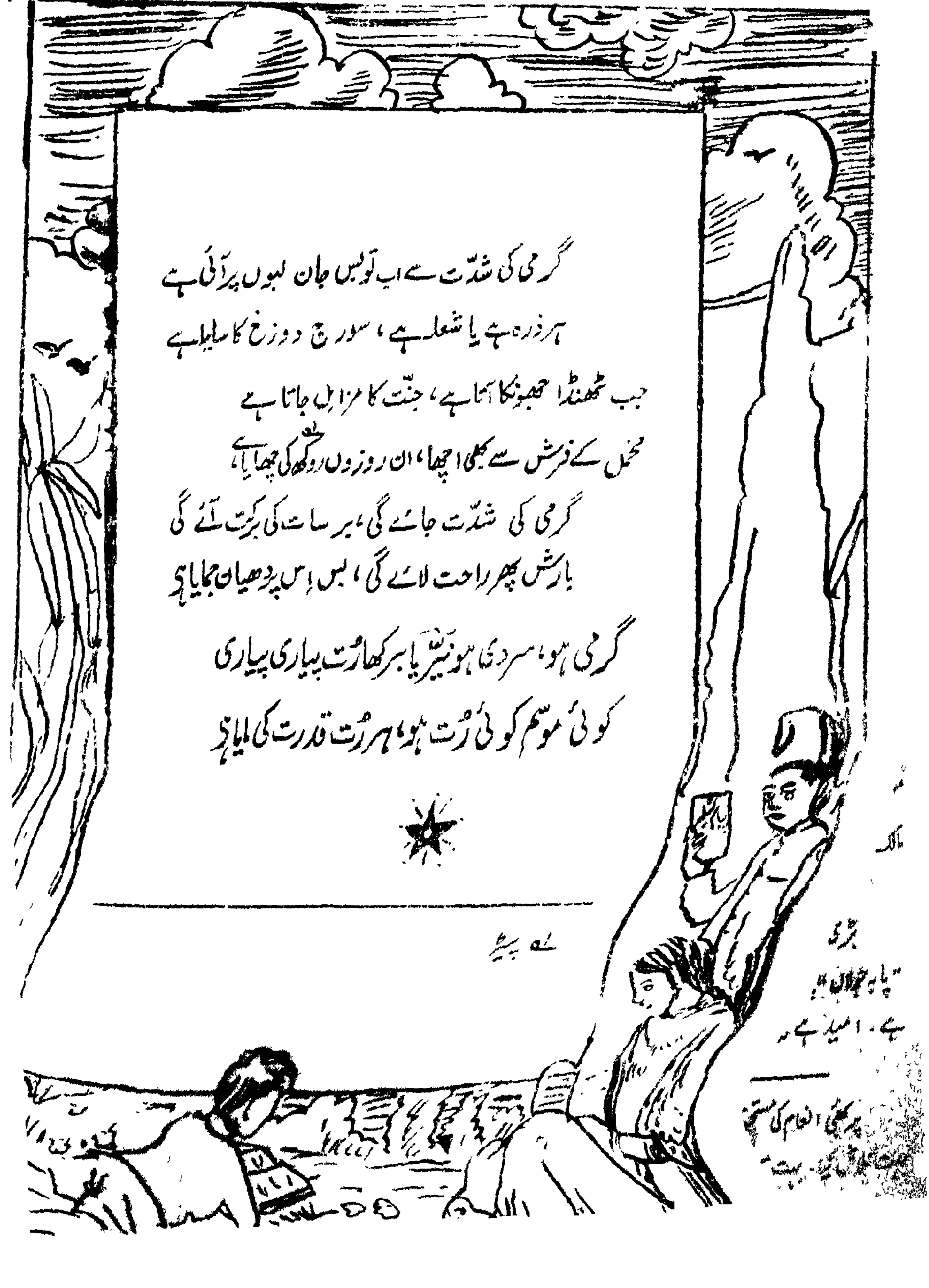
ہر وقت پسینہ بہتا ہے، ہر شخص پریشاں رہتا ہے
یہ ہاہا کار مچائی ہے، گرمی نے ظلم یہ ڈھایا ہے

کچھ ایسا جینا جیتے ہیں، پانی پر پانی پیتے ہیں
ہر کام سے جی ہولاتا ہے، ہر بات سے دل گھبرایا ہے

اون اور روئی اب چھپتی ہے شکھ چین کی دولت لٹتی ہے
اب روح بدن میں گھٹتی ہے۔ گرمی نے ناچ نچایا ہے

اب برف کا جادو چلتا ہے، قالودے کی بن آئی ہے
قلفی پر رال ٹپکتی ہے، اب ٹھنڈا شربت بھایا ہے

جب گھر سے باہر جاتے ہیں، ہم دھول سے اٹ جاتے ہیں
یہ موسم آندھی کے جھکڑ، لوؤں کے تھپیڑے لایا ہے



گرمی کی شدّت سے اب تو بس جان لبوں پر آئی ہے
ہر ذرہ ہے یا شعلہ ہے، سورج دوزخ کا سایہ ہے
جب ٹھنڈا جھونکا آتا ہے، جنّت کا مزا مل جاتا ہے
مخمل کے فرش سے بھی اچھا، ان روزوں روکھ کی چھایا ہے
گرمی کی شدّت جائے گی، برسات کی برکت آئے گی
بارش پھر راحت لائے گی، بس اس پر دھیان جمایا ہے
گرمی ہو، سردی ہو یا برکھا رُت پیاری پیاری
کوئی موسم کوئی رُت ہو، ہر رُت قدرت کی مایا ہے

گیارھویں قسط

مونگے کا جزیرہ

ہیروں کا غار

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن

تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی



ہمیں اپنے لمبے سفر سے واپس آئے تین ہفتے تھے اس عرصہ میں جیک اور پیٹر کن کشتی بنانے کی مشغول رہے تھے۔ ایک صبح جب جیک کشتی بنانے کے لیے اپنی کلہاڑی لے کر روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو پیٹر کن چلایا۔

بھئی جیک۔ اس ننھی کشتی کو بنانا تو ایسا ہی مشکل لگتا ہے۔ جیسے حضرت نوحؑ کی کشتی کو اس روزانہ کی ٹھک ٹھک اور کھٹ پٹ سے میری طبیعت تو جھک ہو کر رہ گئی ہے۔ کیوں نہ آج کچھ تفریح کی جائے۔ کوئی بھاگ دوڑ والی تفریح مثلاً پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا جائے یا سوروں اور جنگلی بطوں کا شکار کیا جائے۔ اس اکتا دینے والے کام سے تو طبیعت ایسی بیٹھ کر رہ گئی ہے کہ اب مجھے کسی ایسی تفریح کی ضرورت ہے جو میری طبیعت میں جولانی پیدا کر دے، مجھے اچھال دے تمھارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے" جیک کلہاڑی ایک طرف پھینکتا ہوا بولا "اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ تم پھر ایک بار ان بادل پیدا کرنے والی چٹانوں تک جاؤ۔ پچھلے بادل نے تمھیں خاصی اونچائی تک

اچھال دیا تھا کیا عجب جو اگلا اس سے بھی زیادہ اونچائی تک پہنچا دے۔

"میاں جیک" پیٹرکن نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم روز بروز زیادہ "ہنسوڑ" ہوتے جا رہے ہو اور میں تمھاری اس عادت کو قطعی پسند نہیں کرتا اگر تم اپنی یہ عادت نہ چھوڑو گے تو مجھے ڈر ہے کہ شاید ہمیں جدا ہونا پڑے"

"اچھا" جیک مسکرایا "پھر تم کیا کرو گے؟"

"کیا کرو گے!" پیٹرکن اس کے الفاظ دہراتا ہوا بولا "ارے بابا ابھی تو بتا چکا ہوں۔ کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں"

"اچھا بھئی اب بے تکی باتیں بند کرو" میں بولا "مجھے یاد آتا ہے کہ ہم نے ابھی تک بادل پیدا کرنے والی چٹانوں کے پاس والی عجیب شے کے بارے میں معلومات نہیں کیں۔ شاید اس مقصد کے لیے یہی سب سے مناسب ہو"

"ہم" پیٹرکن ہنسا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کیا ہے!"

"آخر کیا ہے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا

"بڑی عجیب چیز ہے! جی ہاں بڑی عجیب!" پیٹرکن نے ہاتھ ہلا کر یوں کہا گویا کوئی بہت بڑا انکشاف کر رہا ہو اور پھر لکڑی کے اس لٹھے پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جس پر ابھی تک بیٹھا تھا۔ اس نے پتلون کسی اور اس میں اپنی لاٹھی جیسے ٹھونس لی۔

"اچھا تو چلو پھر بادل والی چٹانوں کی طرف ہی چلیں" جیک بولا اور اٹھ کر سامان کی طرف اپنے تیر کمان لینے چلا۔ "پیٹرکن تم اپنا بھالا بھی لے لو۔ شاید اس کی ضرورت پڑے"

ہم لوگ تیار ہو کر تیزی سے بادل بنانے والی چٹانوں کی طرف چل پڑے۔ میں شاید پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ مقام ہمارے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ تیزی سے بادل والی چٹانوں کو پھلانگتے ہم اس مخصوص چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے ہم نے پہلے پہل اس عجیب چیز کو دیکھا تھا۔ ہم تینوں جھک کر سمندر میں جھانکنے لگے۔ وہ زردی مائل سبز شے اب بھی وہیں موجود تھی اور پانی میں ہلکے ہلکے اپنی دم ادھر سے ادھر ہلا رہی تھی۔

"کتنی عجیب ہے!" جیک بولا

"غیر معمولی!" میں نے کہا

"حیرت انگیز!" پیٹرکن چیخا۔

"جیک" پیٹرکن نے کہا۔ "پچھلی بار تم نے اس چیز کو چھونے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تھے۔ اب میرا مشورہ ہے کہ اس بار مجھے کوشش کرنے دو۔ اگر اس کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز ہے تو میرا دعویٰ ہے کہ میں اپنے بھالے کی نوک اس کے بیچ سے گزار دوں گا اور اگر اتفاق سے اس کے دل نہیں ہے تو اپنا بھالا وہیں پہنچا دوں گا جہاں اس کا دل ہو سکتا ہے"

"اچھا کرو کوشش" جیک ہنس کر بولا

پیٹرکن نے تیزی سے بھالا اٹھایا۔ ایک دو سیکنڈ اسے سر سے اوپر تانے رہا اور پھر کسی تیر کی طرح اسے سمندر میں پھینک دیا۔ نشانہ ٹھیک لگا اور بھالا اس عجیب چیز کے درمیان سے گزر گیا اور پھر فوراً ہی اوپر آ گیا بالکل بے داغ

اور وہ عجیب چیز! وہ اب بھی اسی اطمینان سے اپنی دم ہلا رہی تھی۔

"ارے" پیٹرکن سر ہلا کر سنجیدگی سے "یہ جانور تو بے دل کا ہے اس لیے اب میں

سکے میں مزید پڑ ... سکوں گا؟

"مجھے تو اب یقین ہو گیا ہے" جیک نے کہا "کہ یہ کسی قسم کی روشنی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ مستقل ایک مخصوص مقام پر ہی کیوں پڑتی رہتی ہے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا اس لیے میں نے جیک کی بات مان لی کہ یہ ضرور کسی قسم کی قدرتی روشنی ہے۔

"لیکن" میں نے کہا "اب جبکہ یہ بات تقریباً یقینی ہو گئی ہے کہ یہ شارک یا کوئی اور خوفناک جانور نہیں تو اس جگہ غوطہ لگا کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں" جیک نے جواب دیا اور اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف پھینکتا ہوا بولا۔ "پہلے میں غوطہ لگاؤں گا۔ رالف کیونکہ میں تم سے بہتر غوطہ خور ہوں۔ اچھا میاں پیٹرکن تم ذرا راستے سے ہٹ تو جاؤ۔"

پیٹرکن ایک طرف ہٹ گیا۔ جیک آگے بڑھا۔ دونوں ہاتھ ملا کر سر سے اوپر اٹھائے۔ چٹان پر جھکا اور سیدھا سمندر میں غوطہ مار گیا۔ ایک دو منٹ تک وہ اس پانی میں جو اس کے غوطے سے اچھل گیا تھا، چھپا رہا اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ اس سبز شے کے عین درمیان تیر رہا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ اس کے نیچے چلا گیا اور ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔

کوئی ایک منٹ ہم بڑی بے تابی بڑی بے چینی سے اس مقام کو گھورتے رہے جہاں جیک غائب ہوا تھا۔ ہر لمحہ ہمیں یہ امید ہوتی کہ جیک اب نکلے گا۔ اب نکلے گا۔ لیکن ایک منٹ گزر گیا اور وہ نظر نہ آیا۔ دو منٹ گزر گئے اور تبھی اس خیال نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجائی کہ اس تمام عرصہ میں جب سے جیک کا میرا ساتھ تھا، وہ پانی میں ایک منٹ سے زیادہ

کبھی نہیں رہا۔

"ارے پیٹرکن بھائی" میں نے خوف... آواز میں کہا۔ "ضرور کچھ ہوا ہے۔ اب تو تین... ہو گئے!"

پیٹرکن نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے چونک... تو وہ چٹان پر جھکا خوف زدہ نظروں سے پانی... تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی... اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور عجیب سی آواز... لگا۔

"آہ جیک! گیا۔ ختم ہو گیا۔ وہ ضرور کوئی ... اور جیک ہمیشہ کے لیے گیا!"

اگلے پانچ منٹ میں مجھے ہوش نہیں کہ ... سینے میں جذبات کا طوفان اٹھا ... اس طوفان نے سوچنے سمجھنے کی ... سلب کر لی تھیں۔ مجھے ہوش اس وقت آیا ... نے میرے کندھے پکڑ کر مجھے جھنجھوڑنا شروع... پاگلوں کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے ہوش... چیخا "رالف! رالف! جلدی کرو۔ ہو سکتا... صرف بے ہوش ہو گیا ہو۔ غوطہ لگاؤ رالف! ... لگاؤ۔"

مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوا کہ یہ خیال مجھے ... دوسرے ہی لمحہ میں اٹھ کر چٹان کے کنارے ... اور کپڑے اتارے بغیر سمندر میں کودنے ہی ... اچانک مجھے اس سبز شے کے درمیان کوئی ... چیز ابھرتی نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحہ جیک کا ... کی سطح پر نظر آیا۔ اس نے ایک زور کی چیخ ... بالوں سے پانی جھٹکنا شروع کر دیا وہ خو...

بعد ہمیشہ یہی کرتا تھا۔

ہم اس کے اس طرح زندہ سلامت ابھرنے پر اتنے ہی حیرت زدہ تھے جتنا چند منٹ پہلے اس کی حیرت انگیز گمشدگی پر۔ میرے خیال میں وہ کم از کم دس منٹ پانی کے اندر رہا تھا یا شاید زیادہ۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی فانی انسان کے لیے اتنی دیر پانی میں رہنا اور اپنی قوت اور ہوش و حواس قائم رکھنا کتنا مشکل ہے۔ اس لیے جب اسے چٹان پر چڑھنے میں مدد دینے کے لیے میں نے اپنا ہاتھ جھکایا تو مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا لیکن پیٹرکن پر شاید اس قسم کا کوئی احساس غالب نہیں آیا۔ جب جیک چٹان پر چڑھ آیا اور ایک طرف بیٹھ کر تیز تیز سانسیں لینے لگا تو پیٹرکن نے اچانک اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور زور زور سے رونے لگا۔

"ارے جیک۔ جیک" وہ بولا۔ "تم کہاں تھے؟ اتنی دیر تم پانی میں کیسے رہے؟"

چند منٹ کے بعد پیٹرکن کی حالت سنبھل گئی اور وہ اس قابل ہو گیا کہ خاموش بیٹھ کر جیک کی حیرت انگیز داستان سن سکے۔

(پھر کیا ہوا؟ جیک نے کیا کہانی سنائی؟ وہ اتنی دیر پانی میں کیسے رہا؟ وہ حیرت انگیز سبز شے کیا تھی؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے جولائی کا پیام تعلیم کا انتظار کیجیے)

★ لوگ بیماری کے ڈر سے غذا تو چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر عذاب الٰہی کے ڈر سے گناہ نہیں چھوڑتے

(حضرت علیؓ)

مانٹریال کی بھولی بسری یادیں

جناب ڈاکٹر مشیر الحق

ناواقفیت کے مزے

معلوم نہیں کہ یہ مثل کس زبان کی ہے کہ سچا عالم وہ ہوتا ہے جسے اپنی لاعلمی کا احساس ہو۔ مثالیں ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں لیکن ہمارا روزمرہ کا تجربہ یہ ہے کہ مثالیں کتابوں میں بند رہتی ہیں اور دنیا والے اپنی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔

ہم میں سے بہت سے لوگ اکثر باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن اس بات کا اظہار کرنے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ اگر کوئی اصلاح کرے تو اس طرح تیوری چڑھا کر اسے گھورتے ہیں۔ گویا اس نے کوئی بہت برا کام کیا ہے نتیجہ یہ کہ ہم لوگوں کو غلطیاں کرتے دیکھتے ہیں پھر بھی انھیں ٹوکنے کی ہمت نہیں کرتے۔

مانٹریال کے دورانِ قیام میں مجھے اس کے برعکس تجربے ہوئے یہ صحیح ہے کہ اس طرف کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ دوسروں کے مسئلوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے لیکن باوجود اس کے اگر وہ کسی شخص کو ایسا کام کرتے دیکھ لیں جس کا اثر پورے سماج پر پڑ سکتا ہے تو اجنبی ہونے کے باوجود ٹوکنے سے نہیں چوکتے۔

شروع شروع میں اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے سڑک کو سنسان دیکھ کر دوڑ لگائی اور اِس پار سے اُس پار پہنچ گئے۔ اگر کسی کی نظر نہ پڑی تو اپنی راہ چل دیے۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہیں روک کر نصیحت کرنے لگا کہ سڑک کو مقررہ اور متعینہ جگہوں کے علاوہ پار نہیں کرنا چاہیے۔ اچانک کوئی گاڑی آجائے اور حادثہ ہو جائے تو تمھیں تو خیر اپنی منزل مل جائے گی لیکن بے چارہ ڈرائیور بے قصور پھنسا پھنسا پھرے گا۔ ایک ہی بات جب بار بار کہی جائے تو کب تک اثر نہ کرے گی۔ جلد ہی یہ عادت چھوٹ گئی۔

کبھی کبھی تو ایسی باتوں پر لوگ ٹوک دیتے تھے کہ طبیعت جل کر رہ جاتی تھی۔ ایک واقعہ تو ابھی تک یاد ہے۔ ایک لفافہ رجسٹری کرانے کے لیے ڈاکخانے گیا۔ کلرک نے لفافے کو وزن کرنے کے بعد مجھے ٹکٹ دیے کہ انھیں لفافہ پر لگا دوں۔ میں ان ٹکٹوں کو لفافے کی پشت پر لگانے لگا۔ ابھی ایک دو ہی ٹکٹ لگائے تھے کہ کلرک کی نظر پڑ گئی اور اس نے ہائیں ہائیں کرنا شروع کیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا "غلط طرف ٹکٹ کیوں لگاتے ہو؟"

ہندوستان میں تو آپ لفافہ پر دائیں بائیں۔ آگے پیچھے، اوپر نیچے کہیں بھی ٹکٹ لگا دیجیے وہ صحیح مانا جاتا ہے اس لیے "غلط طرف" والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے کہا "اس میں غلط یا صحیح کی کیا بات ہے۔ میں پشت پر ٹکٹ اس لیے لگا رہا ہوں کہ لفافے کے کھل جانے کا خطرہ نہ رہے۔ ڈاک خانے کو تو اپنے ٹکٹ سے مطلب ہے، اس سے کیا غرض کہ ٹکٹ کہاں لگا ہے۔"

وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "کس ملک سے آئے ہو؟" میں نے جب اپنا وطن بتایا تو کہنے لگا۔ "تمھارے ملک کے محکمۂ ڈاک نے یہ نہیں بتایا کہ ٹکٹ لگانے کی جگہ کون سی ہوتی ہے۔"

میں ان معاملات میں اپنے کو بہت بڑا علامہ سمجھتا تھا۔ اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ میں نے کہا: "میرے ملک میں محکمۂ ڈاک کو آم کھانے سے مطلب ہوتا ہے پیڑ گننے سے نہیں، پوری رقم کا ٹکٹ لگا ہونا چاہیے، جگہ سے کوئی مطلب نہیں۔" درحقیقت میرا یہ جواب لاعلمی کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ ہندوستان کا محکمۂ ڈاک بھی یہی مشورہ دیتا ہے کہ ٹکٹ لفافے کے پتے والے رُخ پر اوپر دا ہنی طرف لگائے جائیں۔ لیکن کبھی کسی نے اس کے خلاف کرتے ہوئے ٹوکا نہیں تھا۔ اس لیے میں یہی سمجھتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی متعین قاعدہ نہیں ہے۔ بہرحال میرے جواب سے کلرک مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کہا "تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔ اگرچہ یقین نہیں آتا۔ لیکن جب تک تم اس ملک میں رہو اس بات کو یاد رکھنا کہ یہاں ٹکٹ ہمیشہ سامنے کے رُخ پر اوپر داہنی طرف لگایا جاتا ہے۔ اس میں مہر لگانے والے کو آسانی ہوتی ہے۔ اگر تم پشت پر ٹکٹ لگاؤگے تو یا تو وہ اسے بلا ٹکٹ سمجھ کر بیرنگ کر دے گا یا احتیاطاً لفافے کو پلٹ کر دیکھے گا۔ دونوں میں اس کا وقت ضائع ہوگا، اور ڈاک کی تقسیم میں تاخیر ہو جائے گی۔"

[illegible]

تک قبول نہیں کیا جب تک میں نے چپکائے ہوئے ٹکٹ اکھاڑ کر دوبارہ سامنے نہیں لگائے۔ ٹکٹ کو اکھاڑنے کے بعد اسے دوبارہ چپکانے کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ قریب میں کہیں گوند نہیں تھا۔ ایسا واقعہ اگر اپنے ملک میں پیش آیا ہوتا تو کلرک یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتا کہ گوند مہیا کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پیچھے لائن میں لگے ہوئے لوگ بھی دھکا دے کر الگ کر دیتے۔ لیکن یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ کلرک خود اٹھ کر گیا اور کہیں سے گوند لے کر آیا۔ اس طرح خدا خدا کر کے دو منٹ کا کام ۱۵ منٹ میں ختم ہوا۔

پیچھے لائن میں لگے ہوئے لوگ صبر سے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ جب میری چھٹی ہو گئی تو کلرک نے لائن میں کھڑے ہوئے لوگوں سے تاخیر کی معذرت چاہی اور کہا کہ یہ صاحب اس ملک میں اجنبی تھے۔ انھیں یہاں کے قاعدے کا پوری طرح پتہ نہیں تھا۔ اگر میں جلدی کی خاطر ان کا لفافہ لے لیتا تو آپ لوگوں کا وقت تو ضرور بچ جاتا لیکن یہ اپنے ملک میں جاکر کہتے کہ کناڈا میں بھی ہندوستان کی طرح ٹکٹ لگانے کی کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔

یہ تو مثال تھی ایک سبق آموز ناواقفیت کی۔ اس کے علاوہ ایسی ایسی مضحکہ انگیز ناواقفیتوں کے مزے بھی اٹھائے ہیں۔ جنھیں یاد کر کے کبھی ہنسی آجاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بول چال کی زبان کتابی زبان سے بہت کچھ الگ ہوتی ہے۔ کتابوں کے ذریعے انگریزی سیکھے ہوئے غیر ملکی طالب علم جب یورپ اور امریکہ پہنچتے ہیں کچھ دنوں تک ہکا بکا رہتے ہیں۔ خاص طور سے کم پڑھے لکھے لوگوں سے بات چیت کی نوبت آجائے تب تو

[illegible]

مانٹریال۔ پہنچے ہوئے مجھے ابھی آٹھ ہی دس دن ہوئے تھے کہ اپنے ایک پاکستانی ہم سبق کے ساتھ میں بسکٹ خریدنے ایک دکان پر گیا۔ دکان میں سب چیزیں اس طرح قرینے سے لگی ہوئی تھیں کہ خریدار ہر الماری کے پاس خود پہنچ کر اپنی پسند کی چیزیں نکال سکتا تھا۔ دو ایک مددگار لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں تاکہ کسی خریدار کو کوئی دشواری ہو تو وہ اس کی مدد کر سکیں۔ جب ہم لوگوں کو دکان میں کچھ دیر لگ گئی تو ایک لڑکی نے قریب آکر بہت ہی ملائمت سے پوچھا کہ ہمیں کس چیز کی تلاش ہے۔ میں نے کہا "بسکٹ"

لڑکی بولی "آج وہ چھٹی پر ہے کل آئیے گا"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی اور ہم دونوں دوست ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا تھا کہ بسکٹ بھی چھٹی پر جاتا ہے۔ جب بات سمجھ میں نہ آئی تو ہم لوگ پھر اس لڑکی کے پاس گئے۔ اور اس سے کہا کہ "ہم بسکٹ کی تلاش میں ہیں"

اس نے کہا "میں بتا تو چکی کہ آج وہ چھٹی پر ہے، کل آئیے گا"

یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اور ہم لوگ کسی دوسری دکان پر قسمت آزمائی کے لیے باہر جانے لگے۔ دروازے کے قریب ایک الماری میں قسم قسم کے بسکٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس لڑکی پر بہت غصہ آیا کہ وہ ہم لوگوں کو غیر ملکی جان کر بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی ہم لوگ کھڑے اندر ہی اندر کھول رہے تھے کہ وہی لڑکی ٹہلتی ہوئی آ گئی۔ ہم لوگوں نے ذرا ناگواری کے ساتھ بسکٹوں کے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو یہ کیا ہے"

بسکٹوں کے پیکٹ کو دیکھ کر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر بولی "معاف کرنا، میں بالکل بھول گئی تھی کہ اسے کچھ لوگ بسکٹ بھی کہتے ہیں۔ ہم لوگ عام طور سے اسے "کوکی" کہتے ہیں"

لیکن اس کے بعد بھی وہ چھٹی والی بات ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دکان میں ایک لڑکی کا نام "مسکٹ" ہے، ہم لوگ بسکٹ کہہ رہے تھے۔ وہ لہجہ کے فرق کی وجہ سے مسکٹ سمجھ رہی تھی، اور اتفاق سے مسکٹ اس دن چھٹی پر تھی۔ بہر حال بات ہنسی ہنسی میں ختم ہو گئی۔ لیکن روزمرہ کی بول چال کے الفاظ پر پورا قابو نہ ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر ناواقفیت کے مزے اٹھانے پڑتے تھے۔

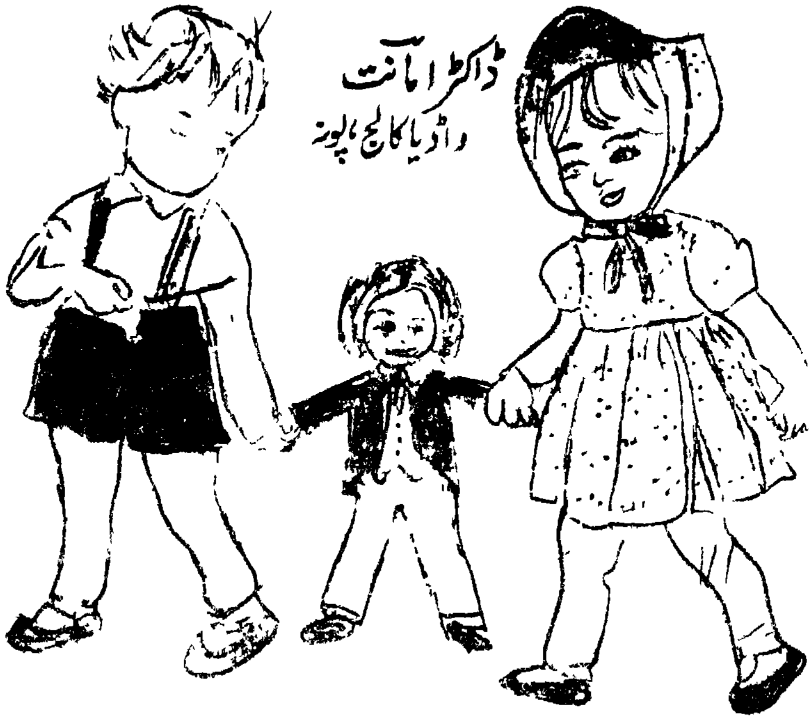
امریکہ کی انگریزی اور انگلینڈ کی اس انگریزی میں جس سے ہم لوگ واقف ہیں خاصا فرق ہے۔ الفاظ کے لہجے میں تو فرق ہے ہی؛ بہت سارے الفاظ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہاں ایک لطیفہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب امریکہ میں بسے ہوئے انگریزوں نے انگلینڈ کی حکومت سے لڑ بھڑ کر آزادی حاصل کر لی تو امریکہ کے بڑے بڑے لیڈروں کی ایک کانفرنس یہ طے کرنے کے لیے منعقد ہوئی کہ انگریزی زبان کو باقی رکھتے ہوئے کس طرح امریکہ کی زبان کو انگلینڈ کی زبان سے نمایاں کیا جائے۔

پہلا حملہ تو بہت سارے الفاظ کی ہجے۔(اسپیلنگ) پر ہوا۔ اور اس میں تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کے بعد خود الفاظ کو بدلنے کی تجویز ہوئی۔ نتیجہ میں ٹیکسی کا نام "کیب" پڑ گیا۔ پولیس کانسٹبل کو "کاپ" کہا جانے لگا۔ کوٹ اور پتلون کو "جیکٹ" اور "ٹراؤزر" میں بدل دیا گیا۔

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

گڑیا کی شادی

ڈاکٹر امانت
واڈیا کالج، پونہ



ننھّی گڑیا یہ جو ہماری ہے — کتنی دلکش ہے! کتنی پیاری ہے
ہم نے گھر میں اسے بنایا ہے — بن بیاہی ہے یہ، کنواری ہے
جلد شادی کریں گے ہم اس کی — بات کا سلسلہ تو جاری ہے
اپنا گڈّا ابھی تم سجا لاؤ — ہونے والی بہو تمہاری ہے
دھوم سے پھر برات نکلے گی — ساتھ گھوڑے کی بھی سواری ہے
ایک درجن تو اس کے جوڑے ہیں — اور بنارس کی عمدہ ساری ہے
اس کے زیور بھی کم نہیں آیا — اک سے اک قیمتی ہے، بھاری ہے
ایک چھوٹا سا ریڈیو دیں گے — جس کی آواز پیاری، پیاری ہے
قاضی صاحب بھی آنے والے ہیں — گفتگو ان سے بھی تو جاری ہے

شوق سے ہم بجائیں گے ڈھولک کیف سا اک فضا پہ طاری ہے
کیوں نہ مہندی لگائیں ہاتھوں میں اک اہم رسم یہ ہماری ہے
جاؤ کھانے کا انتظام کرو آج[1] ہم کل تمھاری باری ہے
ہم بھی بریانی اب پکائیں گے
رشتے داروں کو سب کھلائیں گے



[1] غالب کے مصرعہ : آج وہ کل ہماری باری ہے
کو قدرے بدل دیا گیا ہے

...ن خان صاحب

حرفوں کا جادو



اس سے پہلے آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ جن لفظوں میں ے ہوتی ہے اس ے پر ہمزہ نہیں آتا ... رائے، چائے، گائے، بجائے، ہائے۔ اسی طرح، جن لفظوں کے آخر میں واو ساکن ہے، تو اس واو پر بھی ہمزہ نہیں آتا۔ جیسے: ...، اُود بلاو، سجاو، پاو، پلاو، تاو، ...چاو، راو، کڑھاو، گھاو، کھاو، واو،

...حاصل مصدر بھی اسی طرح کے ہیں، جیسے: لگاو، بہاو، بچاو، چاو، گراو، ...جھکاو، گھٹاو، چل چلاو، بیچ بچاو، ...ڑاو۔

...سب لفظ اسی طرح لکھے جائیں گے، یعنی واو پر ... گا۔ مثلاً آپ لکھیں: ہم نے پلاو کھایا، ...ر رنگھو آنسے تھے، ان کا جھکاو تو دوسری ... غلط لکھاوٹ ہوئی۔ ہمزہ کبھی نہیں

...یہ بات سمجھ لیجیے۔ جیسے ایک ... ایک فعل ہے "لگاؤ" ... کیونکہ ایسے سب فعلوں پر

ہمزہ آتا ہے۔ جیسے: بچاؤ، پھراؤ، مگر جب اس لگانا کا حاصل مصدر ہے گا، تو اس پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ یہ دو الگ ... کر لیجیے کہ آپ مرزا غالب کا یہ شعر لکھا ہوا

لاکھوں لگاو، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں

اب آپ کو خوب معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہاں ... اور بناو جیسے فعلوں سے بالکل الگ معنی دے ... ہیں۔

یا جیسے میر انیس نے تلوار کی تعریف بے مثال شعر کہا ہے:

اشراف کا بناو، رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے

یہاں بھی بناو کا لفظ فعل بناؤ کے معنی دے رہا ہے۔ بناؤ، فعل ... مصدر ہے۔ کھلاؤ فعل ہے ... ہے۔ جھکاؤ، فعل ہے اور ... ان دو جملوں کو دیکھیے:

(۱) اپنے سر خدا کے سامنے ...

(۲) ہم ...

دونوں لفظوں کا فرق ذہن میں آگیا ہوگا۔ یہ دو جملے دیکھیے:

۱: کمرے میں پانی مت بہاؤ۔
۲: پانی کا بہاو بہت تیز ہے۔

اب تو بات پوری طرح صاف ہوگئی ہوگی۔

اگر کوئی صاحب لکھیں کہ بازار میں گیہوں کا بھاؤ بہت تیز ہے، یا یہ لکھیں کہ ایک پاؤ شکر لے آ، یا یہ لکھیں کہ اس لفظ میں واؤ نہیں آئے گا۔ یا یہ لکھیں کہ سردی سے بچاؤ کا کچھ سامان ہمارے پاس نہیں؛ تو خط کشیدہ لفظوں کی لکھاوٹ غلط ہوگئی۔ ان سب کو ہمزہ کے بغیر لکھنا چاہیے تھا۔

---

(۳) اوپر جتنے لفظ آئے ہیں، ان سب میں واؤ سے پہلے الف ہے۔ اب ایسے لفظ لکھے جاتے ہیں جن میں واؤ سے پہلے ی ہے۔ الف ہو یا ی، دونوں حرفِ علّت ہیں۔ جس طرح پہلی قسم کے لفظوں میں ہمزہ کی گنجائش نہیں، اسی طرح اِن لفظوں میں بھی ہمزہ کی کھپت نہیں ہوسکتی۔

دیو (دیوتا، مہادیو، بلدیو، دیوکی، جے دیو)
جنیو، خدیو، گیو، سیو، ریو، غزیو۔

سیو تو آپ نے بہت کھائے ہوں گے، نمکین بھی۔ میٹھے بھی اور جنیو، پنڈت جی کو پہنے دیکھا ہوگا۔ تلوار کے ایک وار کا نام بھی ہے۔ میر انیس کے ایک مشہور مرثیے کا یہ بند یاد آگیا، جس میں شروع کے چاروں لفظ نظم ہوگئے ہیں۔ حضرت علی اکبر نے ایک زبردست شامی پہلوان کو تلوار سے جس انداز اور شان کے ساتھ قتل کیا، اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

نہ وہ تہمتنی تھی، نہ وہ زورِ گیو کا
مُنہ پھر گیا طمانچۂ ضیغم سے، دیو کا
ظالم، شکار ہوگیا کیہاں خدیو کا
کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی ملا جنیو کا
نکلی بغل سے تیغ عجب کرّوفر کے ساتھ
ایک ہاتھ تن کے ساتھ گرا، ایک سر کے ساتھ

---

(۳) نیچے جو لفظ لکھے جاتے ہیں، ان کا تلفّظ اوپر والے لفظوں کے تلفظ سے ذرا سا مختلف ہے، مگر صورت ایک جیسی ہے۔ یہ سب لفظ بھی ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے:

پیو (پیا کی ایک صورت)، جیو (جیسے شیخ جیو)، میو، نیو، کرفیو، ریویو۔
پیورا، تیورا، نیولا، جیوڑا، سیوڑھا، ڈیولا،

---

(۴) اب تک جن لفظوں کو آپ نے دیکھا، ان میں واؤ سے پہلے صرف ایک حرف ساکن تھا، الف یا ی۔ اب کچھ ایسے لفظ لکھے جاتے ہیں، جن میں واؤ سے پہلے دو حرف ساکن ہیں۔ ایک نون اور ایک الف:

گانو، پانو، نانو، چھانو، دانو، ٹھانو، کھڑانو

ان میں بھی ہمزہ نہیں آئے گا۔ ان میں سے بعض لفظوں کو کئی طرح لکھ دیا جاتا ہے۔ جیسے کچھ لوگ تو پانو لکھتے ہیں، کچھ لوگ پاؤں، اور بعض لوگ پانوں اسی طرح گانو، گاؤں، گانوں۔ ان کی وہی ایک صورت اختیار کرنا چاہیے جو اوپر لکھی گئی ہے۔ یعنی آخر میں واؤ اور اس سے پہلے نون۔

ہندی میں بھی اِن کو اسی طرح لکھا جاتا ہے

दाँव ، गाँव ، पाँव ، छाँव -

جمع کی صورت یہ ہوگی

گانوؤں ، پانوؤں۔

---

(۵) دیکھیے یہ تین لفظ ہیں :

سِوا - ہَوا - شُوا -

پہلے لفظ میں واؤ سے پہلے والے حرف پر زیر ہے ، دوسرے میں زبر ہے - ان دونوں میں واو کا تلفظ صاف ہے - ان کے لکھنے میں عام طور سے کوئی غلطی بھی نہیں ہوتی -

تیسرے لفظ میں واؤ سے پہلے جو حرف ہے اس پر پیش ہے ، اور واؤ کے بعد الف ہے - اس طرح کے لفظوں میں واؤ کی آواز صاف صاف نہیں نکلتی - جس طرح کہ ہَوا اور دوا جیسے لفظوں میں نکلتی ہے - اس طرح کے لفظوں میں الف اور واؤ کی آواز ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک خاص طرح نکلتی ہے - ایسے لفظوں کے لکھنے میں کبھی یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ واؤ پر ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے - یہ درست نہیں - ایسے سب لفظوں میں بھی صرف واؤ لکھا جائے گا - اس پر ہمزہ ہرگز نہیں آئے گا - جیسے :

بُوا - بِھُوا - کھُوا - جُوا - چھُوا - شُوا - مُوا - ہُوا -

اوپر لکھے ہوئے لفظوں میں ہُوا اور چھُوا ، یہ دونوں فعل ہیں ، جو ہونا اور چھونا سے بنے ہیں -

ہونا سے ہوئے ، ہوئی ہوؤں اور چھونا سے چھوئے ، چھوئی بنیں گے - مگر ہُوا اور چھُوا میں ہمزہ نہیں آئے گا - اسی طرح شُوا سے سوئی بنے گی — مگر تھُوا اور جُوا سے تھُوے اور جُوے بنیں گے -

مُوا ، پُرانا فعل ہے اس کے معنی ہیں مرا - اب بہت کم استعمال ہوتا ہے - ہوئے اور ہوئی کی طرح اس سے بھی موئے اور موئی بنیں گے - چھوئی موئی کو آپ نے دیکھا بھی ہوگا - جس کی پتیاں ، ہاتھ لگتے ہی بند ہو جاتی ہیں - گویا مر جاتی ہیں -

عورتیں اب بھی اس لفظ کو بول جایا کرتی ہیں - جیسے : " موئے نوکر نے سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے ، کام چور ، نوالہ حاضر "

ان کی مشق بھی کر لیجیے

ہُوا - ہوئے ہوئی - ہوؤں

چھُوا - چھوئے - چھوئی -

مُوا ، موئے - موئی -

شُوا — سوئی

تھُوا - تھُوے

جُوا - جُوے

ان لفظوں میں جو فرق ہے ، اُس کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لینا چاہیے -

نیچے جتنے لفظ لکھے جا رہے ہیں ، ان میں سے بھی کسی میں ہمزہ نہیں آئے گا -

الف : دُوار ، جُوار ، بھُوار ، جواری

ب : جُوالا ، گُوالا - سوارت -

ج : شُور ، کنُور ، پرمیشُور ، راجیشور ، کملیشور -

د : بادلا ، باولی ، سانولی ، ساتولی ، اتاولا ، اتاوے ، بکاولی ، گھتاونا ، گھناونی - ستاوئی

جھانئی۔

ہ : بٹوا، بچھوا، تبرا، بھڑوا، بُڈھوا، بھگوا، پُروا، پڑوا، پُتوا، پھڑوا، پچھوا، تلوا، چھٹوا، جروا، کلوا، کچھوا، کہروا، کھڑوا، کڑوا، گڑوا، لہڑوا، للوا، ملوا، مہوا، مُنوا، نلوا، نتھوا۔

ز : بلوّا، پوّا، جھوّا، چڑوّا، کنکوّا، گلوّا، کوّا، کھوّا، ہوّا،

اب ذرا آخری دو قسم کے لفظوں کی جمعوں کی مشق بھی کر لیجیے:

بٹوا	بٹوے	بٹووں
بچھوا	بچھوے	بچھووں
بھڑوا	بھڑوے	بھڑووں
پڑوا	پڑوے	پڑووں
پھڑوا	پھڑوے	پھڑووں
تلوا	تلوے	تلووں
چھٹوا	چھٹوے	چھٹووں
کچھوا	کچھوے	کچھووں
کھڑوا	کھڑوے	کھڑووں
کڑوا	کڑوے	-
گڑوا	گڑوے	گڑووں
لہڑوا	لہڑوے	لہڑووں
مہوا	مہوے	مہووں

بلوّا	بلوّے	بلوّوں
پوّا	پوّے	پوّوں
جھوّا	جھوّے	جھوّوں
چڑوّا	چڑوّے	چڑوّوں
کنکوّا	کنکوّے	کنکوّوں
کوّا	کوّے	کوّوں
ہوّا	ہوّے	ہوّوں

یہاں پر ایک بات خاص طور سے سمجھ لیجیے:

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچھّو کی جمع "بچھوؤں" بنتی ہے۔ اور بچھوا کی جمع "بچھووں" ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے:

قاعدہ یہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں واو ہو، اور اس سے پہلے والے حرف پر پیش ہو اور وہ واو معروف ہو۔ جیسے بچھّو، گیسو، پہلو، بازو، جادو، ہندو، سادھو، وغیرہ، تو ایسے لفظوں کے آگے ہمیشہ "ؤں" بڑھایا جائے گا۔ یعنی ایک واو اس کے اوپر ہمزہ اور اس کے آگے نون۔ جیسے: بچھوؤں، سادھوؤں، لٹوؤں، ہندوؤں، گیسوؤں، بازوؤں، پہلوؤں، وغیرہ۔

لیکن بچھوا، جھوا، بٹوا، کچھوا جیسے لفظ، جن کی واو پر زبر ہے اور اس کے بعد الف ہے؛ ایسے لفظوں کے آگے صرف "وں" یعنی ایک واو اور ایک نون بڑھایا جائے گا۔ ہمزہ یہاں نہیں آئے گا۔ جیسے:

بچھووں۔ بٹووں۔ کچھووں، کنکوّوں، پوّوں وغیرہ۔

جب ان کی جمع "ے" سے بنائی جاتی ہے تب بھی ان میں ہمزہ نہیں آتا۔ جیسے: بچھوے،

ٹٹوے، کچھوے، لنگوٹے، لپٹے۔

---

(۷) ذرا ان لفظوں پر بھی دھیان دیجیے:

موافق، موثّر، موخّر، مودّب، موذّن، مورّخ، موقّر، موکّد، موکّل، مولّف، مونّث، موّید۔

ان سب لفظوں میں واؤ ہے اور جس طرح بلوا، چھٹوا، بٹوا، ہوا، اور شور، کنورا اور دیو۔ جنیو جیسے لفظوں میں واؤ کی آواز، الف (یا ہمزہ) کی آواز میں مل کر، اس طرح نکلتی ہے کہ صاف صاف پورا واؤ تلفظ میں نہیں آتا؛ اسی طرح ان لفظوں میں بھی واؤ کی آواز، آدھی کے قریب نکلتی ہے۔ ان سب لفظوں میں صرف واؤ لکھا جائے گا۔ بعض لوگ جو واؤ پر ایک عدد ہمزہ بھی چپکا دیا کرتے ہیں۔ وہ ٹھیک نہیں۔

ان میں سے جن لفظوں کی جمع بنے گی، اُن کے آگے "وں" بڑھا دیا جائے گا۔

موذّن	موذّنوں	مورّخ	مورخوں		
موکّل	موکّلوں	مونّث	مونثوں		
مولّف	مولّفوں	موّید	موّیدوں		

مورّخ ہی کے خاندان کا ایک لفظ ہے: مورّخہ۔ لکھتے ہیں کہ: "مورّخہ ۳۱ اکتوبر"۔ یہ بھی ہمزہ کے بغیر لکھا جائے گا۔ اسی طرح مولّفہ کو بھی مورّخہ کی طرح ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جائے گا۔

---

(۸) اضافت کا قاعدہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جن لفظوں کے آخر میں ی یا ے ہوتی ہے۔ اضافت کی صورت میں، اس ی یا ے کے نیچے زیر آجاتا ہے، ہمزہ نہیں آتا۔ جیسے:

زندگیِ بے وفا۔ رعنائیِ خیال۔ مےِ شبانہ۔ پےِ دنیا۔

اضافت ہی کی طرح ایک دوسرا قاعدہ ہے جسے عطف کہتے ہیں، اور اس کے لیے دو لفظوں کے بیچ میں ایک واوٗ آیا کرتے ہیں۔ جیسے:

دل و جان۔ دین و ایمان۔ سرخ و سبز۔ جلال و جمال۔

عطف کی صورت میں ہمزہ کہیں بھی نہیں آئے گا۔ اگر کسی لفظ کے آخر میں الف یا ی یا ے یا ہ ہو، تب بھی ہمزہ نہیں آئے گا، صرف واؤ آئے گا، اسی طرح جس طرح اضافت کے لیے ی یا ے کے اوپر ہمزہ نہیں آئے گا۔ بعض خاص صورتیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔

الف: وہ لفظ جن کے آخر میں الف ہو، جیسے:

دنیا و دین۔ خدا و رسول۔ جفا و وفا۔ دعا و دوا۔ ادا و ناز۔ فنا و بقا۔ ادا و قضا۔ جزا و سزا۔ املا و انشا۔ اخفا و اظہار، ابتدا و انتہا۔ آبا و اجداد۔ آقا و غلام۔ دنیا و مافیہا۔ تمنّا و حسرت۔ تماشا و حجاب۔ عطا و کرم

ب: وہ لفظ جن کے آخر میں ی ہو۔ جیسے:

زندگی و موت۔ بندگی و اخواجگی۔ آزادی و غلامی۔ ترقّی و تنزّل۔ تجلّی و حیرت۔ عاجزی و خواری و عزّت۔ بے چارگی و ذلّت۔ بے مائگی رعنائی و زیبائی۔ گرمی و سبزی۔ خشکی و نمی

ج: وہ لفظ جن کے آخر میں ے ہو۔

مے و جام۔ نے و سرود، پیالے و ...

د : وہ لفظ جن کے آخر میں ۃ ہو، جیسے :

گزشتہ و آیندہ - نغمہ و رقص - کعبہ و بُت خانہ ، بت کدہ و حرم - نالہ و زاری - جلوہ و پردہ - پیمانہ و صراحی - پاکیزہ و لطیف - آہستہ و تیز - نامہ و پیام - افسردہ و پژمردہ - اندیشہ و خیال - جادہ و منزل - کلمہ و کلام - افسانہ و حقیقت -

---

ھ : وہ لفظ جن کے آخر میں واو ہو، جیسے :

جستجو و تلاش - آرزو و تمنّا - گیسو و رخ - بازو و سینہ - جادو و اعجاز - ہندو و مسلمان - پہلو و بغل - سبو و جام - ہلاکو و چنگیز - گفتگو و خموشی - اردو و فارسی - آبرو و چشم - خوش بو و بدبو -

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے - جب دو لفظوں کے بیچ میں عطف کا واو آئے گا، تو کسی بھی صورت میں اُس واو پر ہمزہ نہیں آئے گا - اضافت کی صورت میں بھی عام طور پر یؔ یا ےؔ پر ہمزہ نہیں آتا - بس ایک صورت ہے جب اضافت کے لیے ہمزہ آتا ہے اور وہ اِس صورت میں جب لفظ کے آخر میں ۃ ہو - جن لفظوں کے آخر میں ہ ہو گی - اضافت کے لیے، اُس ۃ پر ہمزہ آئے گا - جیسے :

ذرّۂ بے مقدار - کعبۂ مقصود - قبلۂ دیدہ و دل - جلوۂ صورت - پردۂ مجاز - افسانۂ عشق - پیمانۂ مسرّت خانۂ درد - جادۂ پُر خار - اندیشۂ شہر - نغمۂ عیش عاشق - نامۂ دوست - جادۂ محبت - کلمۂ - شعلۂ تشنگی - مشغلۂ زندگی - مسئلۂ حیات ملۂ غیر - مجاہدۂ نفس - مشاہدۂ حق - بادۂ کوثر - ۂ فساد - آسودۂ ساحل - آشفتۂ غم - (باقی)

جناب شوکت پردیسی

پیارے بچّو!

بچّو! کرو خدا سے ہمیشہ دُعا پسند
انسان سے کرو نہ کبھی التجا پسند

اُس کو کرو کسی کے لیے کبھی نہ تم پسند
جو بات اپنے واسطے ہو تم کو ناپسند

محنت سے کام کرو، شادماں رہو
ہرگز کبھی کرو نہ کوئی آسرا پسند

ہر امتحاں میں پار اترتے چلے گئے
جو لوگ ابتدا سے رہے حوصلہ پسند

گر علم و فن کی راہ پہ چلتے رہو گے تم
خلقِ خدا کرے گی، کرے گا خدا پسند

اتنا بھی شور و غل نہ مچاؤ کلاس میں
تم کو کریں، تمہارے ہی احباب ناپسند

چھوٹے بڑے کا کچھ نہ کرو گے جب احترام
کیسے کرے گا تم کو زمانہ بھلا پسند

دنیا کے کاروبار میں یکساں نہیں کوئی
سب کا جُدا خیال ہے، سب کی جُدا پسند

رہ جائے تم کو ہوش نہ کچھ امتحان کا
اتنا بھی رات دن نہ کرو کھیلنا پسند

سائنس کا یہ دَور ہے، یہ دورِ تیز گام
ہر ذی شعور آج کا ہے ارتقا پسند

آؤ! کریں خدا سے ترقی کی التجا
یہ بھی دعا کریں کہ رہیں ہم رضا پسند

جناب حافظ باقوی

چڑیا اور کوّا

ایک تھی چڑیا ایک تھا کوّا   چڑیا ستھری کوّا گندا
کوّا بولا " چڑیا چڑیا   اُڑ کر میرے پاس تو آجا
گھروا ایک بنائیں پیارا   اس میں تیرا میرا ساجھا"
چڑیا بولی " نا نا بابا   میں ہوں ستھری تو ہے گندا
میں ہوں بھولی تو ہے چھلیا[ء]   پڑے نہ ہرگز تجھ سے پالا

ء فریبی ، مکّار



جناب محمد شفیع الدین نیّرؔ

حرکت میں برکت

حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کا نام اس قدر مشہور ہے۔ کہ شاید ہی دنیا میں کوئی لکھا پڑھا اُن کے نام اور ان کے کام سے واقف نہ ہو۔ ہر پڑھے لکھے شخص نے اُن کی کسی نہ کسی کہانی کا فارسی میں، اُردو میں یا اپنی کسی بھی معروف اور مروّج زبان میں اُس کا ترجمہ نہ پڑھا ہو۔

حضرت سعدی ایران کے مشہور شہر شیراز کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے علم و فضل، عقل و دانش اور تجربوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ خدا نے عمر بھی کافی طویل عطا فرمائی تھی۔ لگ بھگ سو برس زندہ رہے۔ اپنی یہ ساری زندگی علم و دانش کی تلاش حق کی جستجو، اور سیاحت کے تجربوں اور مشاہدوں سے دامن بھرنے میں صرف کی۔

آج یہاں ہیں تو کل وہاں سواری ملی تو ملی ورنہ پیدل ہی چل کھڑے ہوئے۔ گرمی سردی، بھوک پیاس، غریبی اور مفلسی کے دُکھ اُٹھائے۔ پھر بھی سیر و سفر سے طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، چمن چمن کی سبز رنگ رنگ کے پھول چنے۔ اور عقل و فہم کے تارے معلومات کے آسمان سے توڑ کر لائے۔

علم و دانش اور سیر و سیاحت کی پیاس کچھ اس درجے کی تھی کہ بس ایک لاٹھی ہاتھ میں لی۔ کمبل کاندھے پر ڈالا، درویشانہ کشکول ہاتھ میں لیا، اور خدا کے بھروسے اور اپنی ہمّت کے بل پر چل کھڑے ہوئے۔ جیسے سادھو سنت یا پیر فقیر ہوتے ہیں۔ مگر ایسے سادھو یا فقیر جو علم اور نیکی کی تلاش اور اس کی اشاعت اپنا فرض اور خدا کی خوشنودی کا موجب سمجھتے ہیں۔

عالم تو تھے ہی۔ سیر و سفر کے تجربوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دنیا کے بے مثل ادیب۔ بلند پایہ، اور بے نظیر شاعر تھے ذرا کہیں جم کر بیٹھتے تو دیوان کے علاوہ دو کتابیں اس پایے کی لکھیں کہ دنیا بھر میں ان کی دھوم مچ گئی۔

ایک نثر اور نظم پر مشتمل ہے اور گلستاں کہلاتی ہے اور دوسری محض نظم ہے جو بوستاں کے نام سے مشہور ہے ..... یہ کتابیں سدا بہار پھولوں کی طرح اپنی خوشبو برابر دنیا بھر میں پھیلا رہی ہیں۔

گلستاں نصیحت آمیز کہانیوں کی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ دُنیا کی قریب سبھی مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور قریب قریب ہر ملک کے شائستہ لوگوں نے اپنی اپنی مادری زبان میں اسے پڑھا ہے۔ سات آٹھ سو برس سے یہ سلسلہ جاری ہے اور اب بھی دنیا کے لاکھوں بچّے اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں کچھ اس درجے مقبول ہوئیں کہ سینکڑوں بار چھپ چکی ہیں کوئی شمار کرنا چاہے تو ان کے نسخوں کی تعداد لاکھوں سے کیا کم ہوگی۔

انھی کتابوں میں سے اِس وقت صرف دو کہانیاں

پیش کرتا ہوں۔ ایک گلستاں سے اور ایک بوستاں سے۔ موجودہ زمانے کی زبان اور ضرورت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور تفصیل میں کمی بیشی کر دی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کے کئی فرزند حسین و جمیل، تندرست و توانا، اور چست و چالاک تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا البتہ ظاہری وجاہت کے لحاظ سے ذرا پیچھے تھا۔ دبلا پتلا اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے ٹھنگنا اور دیکھنے میں ذرا بھدا اور کھونڈا سا لگتا تھا۔ اس کے بھائی اسے حقیر سمجھتے اور اس سے کچھ الگ الگ رہتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس کے والد یعنی بادشاہ نے بھی کچھ ایسی ہی نظر اور کچھ ایسے ہی انداز سے اُس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ شہزادے کے نازک دل پر چوٹ لگی لیکن ؎

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت بُری تو کیا
سرخ و سفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا

یہ لڑکا تھا بڑا ہونہار، عقلمند، اور محنتی۔ دولت اور بادشاہت کو چلتی پھرتی چھاؤں سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا۔ اُس سے نہ رہا گیا۔ بولا "ابا حضور! آدمی کی بڑائی اُس کے چام (چمڑے یا کھال) سے نہیں اُس کے کام سے ہوتی ہے۔ دیکھیے بیل کیسا ہی موٹا تازہ اور لمبا تڑنگا ہو لڑائی کے میدان میں اُسے کوئی نہیں پوچھتا۔ ضرورت پڑتی ہے اور کام آتا ہے تو دُبلا پتلا گھوڑا ہی کام آتا ہے۔"

"کیسے اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ مگر طور کا پہاڑ چھوٹا ہونے پر بھی بڑا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی ایک چوٹی پر حضرت موسیٰ نے خدا کی قدرت کی چکا چوند کر دینے والی روشنی دیکھی تھی۔ اس پہاڑوں کے پتھر کے ٹکڑوں کا سرمہ بنا بنا کر لوگ آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ یہ مرتبہ دنیا کے دوسرے پہاڑوں کی بڑی چٹانوں تک کو حاصل نہیں۔"

بادشاہ یہ باتیں سن کر ذرا سے مسکرایا مگر کھرے سونے کی پرکھ کسوٹی پر اور ہمت اور دلاوری کا تجربہ لڑائی کے میدان میں ہوتا ہے۔

خدا کا کرنا کہ اس پرکھ کی گھڑی بھی جلد آگئی۔ کسی زبردست دشمن نے اس کے باپ (بادشاہ) کے ملک پر اچانک حملہ کر دیا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔ عجیب پریشانی اور سراسیمگی کا موقع پیش آیا۔ پھر بھی سب سے پہلے لڑائی کے میدان میں جو ہمت کا گھوڑا کداتا، دلاوری اور شجاعت کا پرچم اڑاتا ہوا آیا۔ وہی دُبلا پتلا ٹھنگنا اور ناٹا، حقیر لڑکا تھا۔ دوسرے اور سپاہی بھی آئے۔ اور بڑے بھائی بھی چمکتی اور جھمکتی وردیاں ڈانٹے اور گھوڑوں پر شہسواری کے کرتب دکھاتے ہوئے آموجود ہوئے۔ بادشاہ بھی لڑائی کا یہ بھیانک منظر دیکھنے کے لیے ایک اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

دیکھتے دیکھتے لڑائی شروع ہوئی۔ ہزاروں سپاہی آن کی آن میں خاک اور خون میں لتھڑ گئے۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ بادشاہ کی فوج کا پلّا ہلکا ہونے لگا تو بہت سے بُزدل سپاہی، کم ہمت افسر، اور اُس کے بلند بالا بھائی یہ صورتِ حال دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ بھاگے۔ مگر جرأت کا یہ دھنی لوہے کی لاٹھ کی طرح اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا۔ یہی نہیں بلکہ بھاگتوں کی ہمّت بندھائی۔ چیخا "بہادرو! یہی وقت ہمّت کا ہے! مردانگی دکھاؤ اور اپنے ملک کی آن پر جان قربان کردو!!"

اُس کی للکار سن کر سپاہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔

دیکھ کر اُس نے باقی ماندہ سپاہیوں کو لے کر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ اور سب کے سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ آخر ہمّت کی جیت ہوئی۔ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُس کے قدموں پر گر پڑا۔ بادشاہ نے اٹھا کر بڑے پیار سے اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اور اُس آنکھوں اور پیشانی کو بار بار چوما۔

بھائیوں نے اُس کا جو یہ چاؤ دیکھا تو بس جل ہی تو گئے۔ انھوں نے کیا کیا؟ اس کے کھانے میں زہر ملا دیا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

اتفاق کی بات اُس کی بہن کہیں کھڑکی میں کھڑی سی جھانک رہی تھی۔ کھانے کے لیے دسترخوان پر جب سب بیٹھے اور زہر ملے کھانے پر چھوٹے شہزادے نے ہاتھ بڑھایا تو بہن نے کھڑکی کا پٹ اس جھٹکے سے بند کیا کہ کھٹ پٹ کی آواز صاف سنائی دی۔ شہزادہ اتنی سمجھدار تھا۔ کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بس اتنا کہا "ممکن نہیں کہ عقلمند مرجائیں اور بے وقوف اُن کی جگہ لے لیں۔ اگر ہُما جیسا مبارک پرندہ دنیا سے نابود بھی ہوجائے تب بھی کوئی اُلّو کے منحوس سائے میں آنا پسند نہیں کرتا۔"

مختصر یہ کہ آناً فاناً یہ بات پھیل گئی۔ سب نے بڑے شہزادوں کو لعنت ملامت کی آخر بادشاہ نے یہ کیا کہ اپنے بڑے بیٹوں کو تھوڑا تھوڑا علاقہ دے کر ان کو اپنے اپنے علاقے میں بھیج دیا اور بادشاہی کا تاج اُسی بیٹے کے سر پر رکھا جو دُبلا پتلا، ٹھگنا، ناٹا اور حقیر دکھائی دیتا تھا۔ دیکھیے چھوٹے شہزادے کی حرکت میں کیسی برکت ہوئی۔

بوستاں کی کہانی اس سے بھی عجیب اور دلچسپ ہے۔

ایک صاحب نکھٹو تھے۔ بس گھر میں گھسے رہتے تھے۔ بزرگوں کی بچی کھچی کمائی سے بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ تنگی اور فقر و فاقہ کا بھوت آئے دن ڈراتا رہتا تھا۔ ایک دن ان میاں کی بیوی بولی "آخر اس طرح کب تک گزر ہوگی۔ گھر سے نکلو۔ اللہ میاں نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں کچھ کام کاج دیکھو بھالو"

بہت کہنے سننے سے یہ حضرت راضی ہوگئے۔ اور کچھ زادِ راہ لے کر کسی دوسرے شہر، معاش کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

چلتے چلتے ان کا گزر ایک گھنے جنگل میں ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لومڑی ہے جا رہی کا پچھلا دھڑ رہ گیا ہے۔ گز دو گز بھی چلنا اس کے لیے دشوار ہے۔ سوچا یہ لومڑی اپنا پیٹ کیسے بھرتی ہوگی!

ابھی یہ اسی سوچ میں تھے ایک شیر کی ڈراونی دہاڑ سنتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ مرتا کیا نہ کرتا اور تو کچھ بن نہ پڑی ایک اونچا اور گھنا سا پیڑ پاس تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پٹ اُس پر چڑھ گئے۔ اور ایک موٹے سے ٹہنے پہ اونچائی پر جا بیٹھے کہ شیر چھلانگ بھی مارے تو ان تک نہ پہنچ سکے۔

خیر صاحب! شیر آیا۔ ہرن کا شکار کرکے لایا تھا۔ وہیں بیٹھ کر اُس کا تیا پانچا کیا اور تکّا بوٹی کرکے اس کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرا۔ جو کچھ بچا اُسے وہیں چھوڑ چھاڑ چلتا بنا۔ لومڑی گھسکتی گھسکتی آئی اور اُس بچے کھچے گوشت سے اس نے اپنا پیٹ بھر لیا۔

ان نکھٹو کو سنبھلنے کا بہانہ۔ اُنھوں نے جو دیکھا کہ خدا اپنی رحمت سے ایسے اپاہج جانور کو بھی روزی

پہنچاتا ہے۔ میں اُسی کی ذات پر تکیہ کرکے اپنے گھر ہی پر کیوں نہ بیٹھا رہوں۔ خدا رزّاق ہے۔ رزق پہنچ کر رہے گا۔

اس خیال کو بہانہ بناکر وہ الٹے پاؤں اپنے گھر لوٹ آئے اور خدا کے آسرے پر کئی دن بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ مگر خدا کا دستور اس طرح سے خوان لگاکر بھیجنے کا نہیں ہے۔

آخر خدا ہی کو ان پر رحم آیا۔ شاید اُسی کے حکم سے اُس زمانے کے کوئی بزرگ اُس کے پاس آئے اور اُسے سمجھایا کہ:

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا
ٹھیک نہیں۔ یہ خدا کی ناشکری ہے۔
خدا کا قانون یہ ہے کہ آدمی کو جو کچھ
ملتا ہے وہ اس کی دوڑ دھوپ،
محنت اور کوشش کا پھل ہوتا ہے۔
ارے نادان! تو نے اپاہج لومڑی
کو شیر کا جھوٹا کھاتے دیکھ کر تو
خدا کی رحمت پر بھروسا کیا اور ہاتھ
پاؤں توڑ کر گھر میں آکر بیٹھ گیا۔ تو
نے یہ کیوں نہ سوچا کہ میں شیر بنوں۔
شیر کی طرح شکار کروں۔ آپ بھی
کھاؤں اور گھر بھر ہی کو نہیں اللہ
توفیق دے تو دوسرے حاجتمندوں
اپاہجوں کو بھی کھلاؤں۔"

یہ بات اُس نکھٹو کی سمجھ میں آگئی۔ اور کیوں نہ آتی۔ آخر ہاتھ پاؤں ہلائے محنت کی۔ مشقت برداشت کی، اُس کا پھل یہ ملا کہ زندگی بڑے آرام اور بڑی عزّت سے بسر ہونے لگی۔

گلستاں اور بوستاں میں ایسی ہی سینکڑوں کارآمد کہانیاں ہیں۔ ہندی، انگریزی، اردو اور ہمارے ملک کی دوسری زبانوں میں اُن کا ترجمہ ضرور ملے گا۔ یہ کہانیاں ضرور پڑھیے۔ زندگی کو کامیاب بنانے میں یہ کہانیاں آپ کے بہت کام آئیں گی۔ آپ کو ضرور اندازہ ہوگا کہ حضرت سعدی کیسے اور کتنے بڑے شاعر ادیب اور مصلح تھے۔ اور آدمی ہاتھ پاؤں ہلائے اور کچھ کرنے پر تیار ہو تو خدا کی برکت کس حد تک اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔

★★

جناب غلام ربّانی

ہتھیاروں کی کہانی

لڑنا اچھا نہیں، یہ کام جانوروں کا ہے، لیکن انسان اس معاملہ میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ انسانوں نے جتنے انسانوں کو قتل کیا ہے۔ جانوروں نے اپنے ہم جنس جانوروں کو اتنا نہیں مارا۔ آئے دن نئے نئے ہتھیار نکل رہے ہیں۔ ایک سے ایک خطرناک، ایک سے ایک تباہ کرنے والا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ ایک بم سارے شہر کو بلکہ پورے علاقے کو تباہ کرسکتا ہے۔

ہزاروں برس ہوئے جب دنیا میں شہر اور قصبے آباد نہیں ہوئے تھے، چھوٹی چھوٹی بستیاں اور کھیڑے تھے۔ لوگ گھاس پھوس کی جھونپڑیوں اور مٹی کے گھروں میں رہتے تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ مگر لڑنا ضرور جانتے تھے۔

اس زمانہ میں سب سے بڑا ہتھیار لکڑی تھی۔ کوئی سخت دھات اس وقت تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔ لاٹھیاں، ڈنڈے، ہرن اور بارہ سنگھے کے سینگ ہتھیار تھے۔

لکڑی بڑی کارآمد چیز تھی، نوکدار لکڑیوں سے زمین کھودتے تھے۔ لکڑی کے ہل تھے جن کو آدمی کھینچتے تھے اگرچہ ان سے زمین پر معمولی خراش سی پڑتی تھی۔ مگر اسی سے ان کا کام چل جاتا تھا۔

لکڑی کے بعد پتھروں کا استعمال شروع ہوا چقماق سخت قسم کا پتھر تھا۔ چنانچہ پتھر کا چاقو پتھر کی چھریاں اور پتھر کی کلہاڑیاں بننے لگیں۔ لکڑی کے دستے میں پتھر کے پھل لگا لیتے تھے۔ برچھیوں کی انی بھی پتھر کی ہوتی تھی۔ تاریخ میں یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔ کھدائیوں میں جگہ جگہ پتھروں کے ہتھیار پائے جاتے ہیں۔

آج سے چھ ہزار سال پہلے تانبا دریافت ہوا۔ یہ پہلی دھات آسانی سے پگھل سکتی تھی۔ اس کا رواج عراق اور فلسطین میں ہوا اب تانبے نے پتھر کی جگہ لینی شروع کردی اور تانبے کے ہتھیار اور اوزار بننے لگے اس میں شبہ نہیں کہ تانبے کے چاقو اور کلہاڑیاں پتھر کے پھلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔ لیکن تانبے کے چاقوؤں میں یہ خوبی تھی کہ جب وہ کند ہوجاتے تو ان کو پگھلا کر دوسرا پھل تیار کرلیتے تھے یا ان کو کوٹ کر ان کی دھار تیز کرلیتے تھے پتھر کے پھل ٹوٹ کر بےکار

ہو جاتے تھے۔

تانبے کے ہتھیاروں اور اوزاروں کا رواج ایک ہزار سال تک رہا۔ یہ "تانبے کا زمانہ" کہلاتا ہے۔ حیدرآباد کے عجائب خانے میں تانبے کی تین تلواریں موجود ہیں جو ایک کھدائی میں نکلی تھیں۔

تانبے کے بعد کانسے کا رواج ہوا یہ تانبے اور رانگ کو ملا کر بنائی جاتی تھی۔ یہ دھات زیادہ سخت تھی۔ چنانچہ اب کانسے کے چاقو، برچھیاں، تلواریں، کلہاڑیاں اور آریاں بننے لگیں۔ کانسے کے اوزاروں کا رواج یورپ میں بہت تھا۔ وہاں کھدائیوں میں کانسے کی چیزیں بہت ملتی ہیں۔ یہ زمانہ کانسے کا زمانہ کہلاتا ہے۔

کانسے کے بعد لوہے کا استعمال شروع ہوا۔ دنیا میں سب سے پہلے جس قوم نے لوہے کے ہتھیار استعمال کیے وہ ہٹّٹ (Hittites) تھے۔ یہ جنگجو قوم لیڈیا (ترکی) میں رہتی تھی جنگ میں لوہے کے ہتھیار زیادہ اچھے ثابت ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے شام اور عراق کو فتح کیا۔ یہ واقعہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے ڈیڑھ ہزار سال (۱۵۰۰) پہلے کا ہے۔

ہٹّٹس کے ہتھیاروں کی شہرت بہت دور دور تک پہنچ گئی۔ چنانچہ مصر کے ایک فرعون نے ان کے بادشاہ کو لکھا کہ کچھ لوہا اس کو بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے جواب دیا "بھائی صاحب لوہا نہیں بھیجا جا سکتا"، اور تحفے کے طور پر لوہے کا ایک خنجر فرعون کو بھیج دیا۔

لوہے کے ہتھیار بنانے کا طریقہ "مدتوں" ایک راز بنا رہا۔ مگر کہاں تک، آخرکار یہ طریقہ دوسروں کو بھی معلوم ہو گیا اور ملکوں ملکوں میں لوہے کے ہتھیار بننے لگے۔ جن کے سامنے تانبے اور کانسے کے ہتھیار ماند پڑ گئے اب ہر جگہ لوہے کی برچھیاں برچھے، گرز، تلواریں، خنجر، جمدھر، تبر، گپتی، کٹار، کھانڈے اور طرح طرح کے ہتھیار بننے لگے۔

بارود کی ایجاد نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا رائفل، مشین گن، دبابے، دور مار توپیں بن گئیں۔ اب جنگ کے میدان سے تلوار غائب ہو گئی اب تلوار کا شمار ہتھیاروں میں نہیں رہا۔

ہتھیاروں کے علاوہ لوہے کے بے شمار اوزار اور آلات بن گئے۔ یہ لوہے کا زمانہ ہے۔ اب یہ حال ہے کہ ہم جتنی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ سب کسی نہ کسی طرح لوہے کی مدد سے بنتی ہیں۔ ذرا سوچو کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے بنانے میں لوہا استعمال نہ ہوا ہو۔ ★★

لطیفہ

سائنس کے استاد: دودھ اور مچھلی ایک ساتھ نہیں کھانا چاہیے؟ اس کی وجہ بتاؤ؟

ایک لڑکا: اس لیے کہ ہضم ہونے سے پہلے مچھلی دودھ پی لیتی ہے۔

میر فاروق علی ذاکر

جناب خلیق انجم اشرفی

پرگتی میدان کا میلا



نومبر کی ایک کہر آلود صبح تھی میں نے منہ ہاتھ دھوکر، کمرے کا رخ کیا تو دیکھا کہ رعنا ابھی تک سو رہی ہے۔ میں نے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا اور آواز دی "رعنا۔ رعنا۔ اٹھو بھئی۔ صبح ہو گئی۔ اس نے جواب میں اُونھ کہہ کر دوسری طرف کروٹ لے لی۔ مجھے شرارت سوجھی۔ ایک گلاس میں پانی لے آیا اور اور دو چار بوندیں اس کے منہ پر ٹپکا دیں۔

ارے ۰ کا نعرہ مار کر وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کی نظر میرے مسکراتے چہرے اور گلاس پر پڑی تو بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ اتنے دن ہوتے کہتے ہو گیے ابھی تک نمایش نہیں دکھائی اور آج ہم خواب میں نمایش دیکھنے اس کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے تو ہمیں اس طرح جگا کر یہ سنہرا موقع بھی ہاتھ سے نکلوا دیا۔

"ارے، تو اس میں اس قدر ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم آج ہی دکھا دیں گے پرگتی میدان کا میلا اپنی پیاری بہن کو" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واہ ہم نہیں دیکھیں گے پرگتی ورگتی میدان کا میلا۔ ہمیں تو ایشیا ۷۲ء کی نمایش دکھایئے۔

"ارے واہ" میں پھر ہنس دیا "ایشیا ۷۲ء پرگتی میدان کا میلا ہی تو ہے"

"وہ کیسے؟ رعنا حیران ہو کر بولی۔

"ارے بھئی" میں نے کہا۔ "اگر یبیشن گراونڈ جہاں ایشیا ۷۲ء کا میلا لگا ہے اس کا نام بدل کر اب

پرگتی میدان یا ترقی کا میدان رکھ دیا گیا ہے۔ اب اس میں لگنے والے میلے کو پرگتی میدان کا میلا نہیں کہیں گے اور کیا کہیں گے۔ اور تمھیں میلا دیکھنے کا تو اتنا شوق ہے لیکن اس کے بارے میں معلومات صفر کے برابر بھی نہیں۔"

"واہ ہیں کیوں نہیں، آپ پوچھیے تو سہی" رعنا چہک کر بولی۔

"خیر ابھی امتحان ہوا جاتا ہے۔ آپ ذرا جا کر منہ ہاتھ تو دھو دیجئے۔ پھر ناشتے پر باتیں ہوں گی۔"

ناشتے پر رعنا کے علاوہ عتیق، تسنیم، نگہتی اور شاہدہ بھی موجود تھیں۔ گرم گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے پوچھا "ہاں تو رعنا بی۔ اپنا ذرا اس میلے کا پورا نام ہی بتا دیجئے۔"

"ایشیا ۷۲" رعنا نے جھٹ جواب دیا۔

بس یہی معلومات ہیں آپ کی۔ ارے بھائی یہ تو اس کی عرفیت یا پکارنے کا نام ہے۔ جیسے تمہاری عرفیت ہے رعنا۔ اس میلے کا پورا نام ہے انگریزی میں تھرڈ ایشین انٹرنیشنل ٹریڈ فیئر، اردو میں تیسرا ایشیائی بین الاقوامی تجارتی میلا اور راشٹر بھاشا یعنی ہندی میں اسے ترتیہ ایشیائی انتر راشٹریہ ویاپار میلا" کا نام دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ تیسرا میلا ہے۔ اس سے پہلے دو میلے کہاں ہوئے تھے۔ بھائی صاحب ؟" تسنیم نے جھٹ سوال کر دیا۔

"پہلا میلا ۱۹۶۶ء میں تھائی لینڈ کی راجدھانی بنکاک میں اور دوسرا ۱۹۶۹ء میں ایران کی راجدھانی تہران میں ہوا اور ......"

"اور تیسرا ہمارے ہندوستان کی خوب صورت راجدھانی دلّی میں ہو رہا ہے۔" نگہتی نے میرا جملہ پورا کر دیا۔

بھائی صاحب ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ میلا ایک ہی وقت میں ایشیائی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی۔ یہ کیسے ؟"

بڑا عمدہ سوال کیا ہے بھئی تم نے عتیق۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ میلے برِاعظم ایشیا ہی کے کسی ملک میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ایشیائی میلے ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے براعظموں کے ملکوں کے لیے اس میں شامل ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ بلکہ انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیے یہ ایشیائی ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی بھی ہو گئے۔ اب تم نے یہ سوال پوچھا ہے تو ان میلوں کے شروع ہونے کی کہانی بھی سن لو اقوام متحدہ یا یونائیٹڈ نیشنس سے تم سبھی واقف ہو ؟"

"جی ہاں۔" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔

"تو یہ میلے اسی کی ایک شاخ نے (جسے "ایکیفے" کہتے ہیں) شروع کیے ہیں۔

اس شاخ کا پورا نام ہے 'اکنامک کمیشن فار ایشیا اینڈ فار ایسٹ'، یعنی ایشیا اور مشرقِ بعید کے ممالک کے لیے اقتصادی کمیشن فار ایشیا اینڈ فار ایسٹ، یعنی ایشیا اور مشرقِ بعید کے ممالک کے لیے اقتصادی کمیشن"

"ایکیفے" اس کا مخفف یا مختصر نام ہے۔ یہ طے پایا گیا ہے کہ یہ میلے ہر تین سال کے بعد کسی نہ کسی ایشیائی ملک کی راجدھانی میں لگائے جائیں گے۔

ان میلوں کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ایشیائی ملک اور ایشیا سے باہر کے ملک آپس میں تجارتی لین دین ہی نہ بڑھائیں بلکہ ان میلوں کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ پچھلی دو عالمی لڑائیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی مسئلہ جنگ سے حل نہیں ہو سکتا۔ جنگ تو

خود ہی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے یہ تو صرف تباہی اور غارت گری لاتی ہے۔ نہ صرف لاکھوں انسان ختم ہو جاتے ہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی برسوں کی محنت چند دنوں میں غارت ہو جاتی ہے۔ صرف امن اور مکمل امن ہی خوشیاں اور مسکراہٹیں لاتا ہے۔

کوئی ملک اکیلا اور الگ تھلگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان میلوں کا مقصد یہی نہیں کہ بہت سے ملک اپنا اپنا تجارتی سامان لاکر نمایش کے لیے لگا دیں بلکہ ان میلوں کے ذریعے پچھڑے ہوئے غیر ترقی یافتہ اور ترقی کی راہ پر قدم بڑھاتے ہوئے ملکوں کو ترقی یافتہ ملکوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور سیکھنے سکھانے ہی سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

اسی لیے ایشیا ۷۲ء کے اس میلے کا مرکزی خیال ہے "ایشیا میں امن اور ترقی، اقتصادی تعاون کے ذریعے" اسی خیال سے اس میلے کے چاروں دروازوں کے نام ہیں۔ بابِ دوستی یعنی دوستی کا دروازہ۔ بابِ انسانیت۔ یعنی انسانیت کا دروازہ بابِ اُمید یعنی اُمید کا دروازہ۔

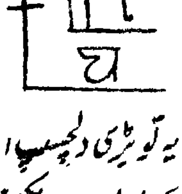
"ارے! ہمیں تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان میلوں کا مقصد اتنا اچھا ہے۔ ہم تو اسے بس تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے"، سب ایک زبان ہو کر بولے۔

"ہاں یہ تفریح کا بھی ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصل مقصد وہی ہے جو میں نے ابھی تم لوگوں کو بتایا"، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "اس سال اس میلے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ اس سال ہم اپنی آزادی کی پچیسویں سالگرہ بھی منا رہے ہیں۔

آزادی کی سالگرہ منانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس آزادی کو قائم رکھنے اور ملک کو امن۔ ترقی اور خوش حالی کے راستے پر چلانے کا عہد بھی کرنا ہے اسی لیے اس میلے کا نشان ہے گوتم بدھ کا پنجہ "ابھے مدرا" کی حالت میں۔ یعنی سکون اور شانتی کی تلقین کرتا ہوا۔ یہ نشان جو نویں صدی عیسوی کی پتھر پر بنی ہوئی ایک نقاشی سے لیا گیا ہے اسے ایک مقابلے میں (جس میں ہندوستان بھر کے آرٹسٹوں نے شرکت کی تھی) چنا گیا ہے اسے بنایا ہے نریندر سریواستوا نام کے ایک آرٹسٹ نے۔ اب تم لوگ یہ بتاؤ کہ تم نے اس ہاتھ میں کوئی خاص بات دیکھی؟"

"نہیں بلکہ ہمیں تو وہ کچھ عجیب سا لگا"، سب بول اُٹھے۔

"ہاں۔ یہی عجیب لگنے والی بات ہی تو اس کی خاص بات ہے۔ اس نشان میں میلے کا نام سمویا گیا ہے۔ دیکھو میں بتا چکا ہوں کہ میلے کا پورا نام ہے "تھرڈ ایشین انٹرنیشنل ٹریڈ فیر" اس کے پہلے حروف ہوئے۔ ٹی۔ اے۔ آئی۔ ٹی اور ایف۔ اس میں سے آرٹسٹ نے پنجہ کا بایاں حصہ چھوٹے ٹی کی شکل کا بنایا۔ ہتھیلی چھوٹے اے سے اور اوپر کے حصّوں میں سمو دیا بڑا الف اور چھوٹا آئی۔



"واہ یہ تو بڑی دلچسپ اور عجیب بات بتائی آپ نے" رعنا خوش ہو کر بولی۔ "دیکھنے سے تو اس کی اس خصوصیت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"ہاں بھئی اسی خصوصیت کی بنا پر تو ہزاروں نشانوں میں سے یہی نشان چن لیا گیا۔ اور بھئی اس

کا سرکاری رنگ ہے نارنجی یا بسنتی۔ بسنتی یا نارنجی رنگ کی ہمارے یہاں بڑی اہمیت ہے۔ یہی میلے کا رنگ ہے۔ خوشی اور امنگ کا نشان ہے۔ بسنت کے میلے میں بسنتی کپڑے پہنے مرد۔ عورتیں اور بچے بیسے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ڈیزائننگ کے قومی ادارے نے میلے کے اشتہارات۔ پوسٹر۔ کتابچوں۔ بلّوں۔ سرٹیفکیٹ۔ تمغوں اور ٹکٹوں کے لیے یہی رنگ چنا۔ تین نومبر سے سترہ دسمبر تک چلنے والے اس میلے میں ہندوستان کے علاوہ چھ براعظموں کے سینتالیس ملک حصّے لے رہے ہیں۔

"کون کون سے ملک ہیں بھائی صاحب؟"

گنّی نے سوال کر دیا۔

"ایشیا سے انڈونیشیا، افغانستان، بنگلا دیش، بھوٹان، برما، ترکی، تھائی لینڈ، جاپان، عمّان، عراق، فلپائنس، کویت، کوریا، لنکا، منگولیا، ملیشیا، نیپال۔

افریقہ سے الجیریا، کینیا، گنی، لیبیا، ماریشس، سوڈان، تنزانیا اور زمبیا۔

یورپ سے آسٹریا، بلجیم، بلغاریہ، سائپرس، زیکوسلواکیہ، فیڈرل ریپبلک آف جرمنی، فرانس، جرمنی ڈیموکریٹک ریپبلک، ہنگری، اٹلی، پولینڈ، رومانیہ، اسپین، سویڈن، روس اور یوگوسلاویہ۔

امریکہ سے برازیل، پیرو اور کینیڈا اور اوشیانا سے آسٹریلیا، فجی اور نیوزی لینڈ۔

ایک سو ساٹھ ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے اس میلے کی تعمیر میں چالیس ہزار مزدوروں نے کل چھ کروڑ گھنٹے کام کیا۔ سیمنٹ کی آٹھ لاکھ بوریاں، ایک لاکھ ٹن ریت۔ دو لاکھ ٹن لوہا۔ بیس ہزار ٹن فولاد۔ پانچ کروڑ اینٹیں اور چھ لاکھ لکڑی کے ٹکڑے لگے ہیں۔

میلے کے میدان میں دو ہزار درخت اور چھ ہزار جھاڑیاں لگائی گئی ہیں۔ ہندوستان کی تمام ریاستوں کے علاوہ دو ہزار پانچ سو ہندوستانی تجارتی ادارے اس میلے میں حصّے لے رہے ہیں۔ اس میلے کی عمارتیں بھی اپنی تعمیر اور ڈیزائن کے لحاظ سے عجیب و غریب اور قابلِ دید ہیں۔ چند اہم عمارتوں کے بارے میں سن لو۔

ہال آف نیشنس (HALL OF NATION)

یا قوموں کا ہال ایک سو دو فٹ اونچا یہ ہال ایک لاکھ بیس ہزار مربع فٹ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس میں سہارے کے لیے کوئی کھمبا یا ستون نہیں ہے۔ یہ مصری اہراموں کی شکل میں بنایا گیا ہے اور اس میں تیس چھوٹے چھوٹے ملکوں نے اپنی مصنوعات نمایش کے لیے لگائی ہیں۔

ہال آف انڈسٹریز (HALL OF INDUSTRIES)

یا صنعتوں کا ہال۔ یہ عمارت بھی ہال آف نیشنس کے نمونے پر لیکن اس سے چھوٹی ہے۔ اس کے چار حصّے ہیں۔ جن میں مختلف ملکوں اور ہندوستان کی بڑی بڑی تجارتی فرموں نے اپنا اپنا بنایا ہوا سامان نمایش کے لیے لگایا ہے۔

ٹیکسٹائل پویلین: یہ ایک بہت بڑا ہال ہے اس میں ہندوستان کی مشہور کپڑا ملوں کے بنائے ہوئے کپڑے نمائش کے لیے رکھے گیے ہیں

تھیم پویلین یا ہندوستان ۷۲ء: یہ ایک خوبصورت اور عظیم الشان آڈیٹوریم ہے جس میں ہندوستان کی پچیس سالہ ترقی (جو اس نے آزادی کے بعد کی ہے) بڑی بڑی تصویروں، نقشوں، تیس ہزار سلائڈس اور تینتیس ہزار

فٹ لمبی ایک فلم کے ذریعہ دکھائی گئی ہے۔"

"یہ تمام عمارتیں میلہ ختم ہونے کے بعد بھی اسی طرح باقی ہیں۔ یہ عمارتیں جو کل چھ لاکھ مربع فٹ کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں ایک مستقل نمائش گاہ کا کام دیں گی۔ ان ہی عمارتوں کی وجہ سے اس سال ہندوستان کو تجارتی میلوں کی بین الاقوامی یونین کا ممبر بھی بنا لیا گیا ہے جو ایک بڑا اعزاز ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پوری دنیا میں کہیں بھی اتنی بڑی نمائش گاہ نہیں اور اس طرح اس کی عظیم اور خوبصورت نمائش گاہ بنانے کا سہرا ہندوستان ہی کے سر ہے۔" یہ کہتے کہتے اچانک میری نظر گھڑی پر پڑی "اوہ۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔ دفتر کا وقت ہو گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"اور نمائش؟" سب نے یاد دلایا۔

"بس کل اتوار ہے کل ہی چلیں گے۔ میری بتائی ساری باتیں یاد رکھنا۔ تبھی نمائش دیکھنے میں مزا آئے گا۔" یہ کہتا ہوا میں کمرے سے باہر نکل آیا اور دفتر کی تیاری کرنے لگا۔

(میلے کی سیر کا دلچسپ حال اگلے شمارے میں پڑھیے گا۔)

ذرا مسکرایئے

دیہاتی: (گارڈ سے) یہ گاڑی اتنی دیر سے کیوں کھڑی ہوئی ہے۔

گارڈ: انجن میں کوئلہ ڈل رہا ہے۔

دیہاتی: اس میں گاڑی روکنے کی کیا بات تھی۔ انجن کو روک دیتے۔

(بشیرالدین)

بقیہ ص ۱۳ سے ناواقفیت کے مزے

موٹر "آٹوموبیل" بن گئی اور اس میں پٹرول کے بجائے "گیس" یا "گیسولین" ڈالا جانے لگا۔ فلیٹ کو "اپارٹمنٹ" کہنے لگے اور اوپری منزلوں میں جانے کے لیے لفٹ کی بجائے "ایلیویٹر" کا استعمال ہونے لگا۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ کانفرنس کا وقت ختم ہونے تک بہت سارے الفاظ کی شدھی کر دی گئی۔

جب ممبران جانے لگے تو کسی نے یاد دلایا کہ سب کچھ تو ہو گیا لیکن دونوں ملکوں کی انگریزی کے حروف تہجی (اے۔ بی، سی، ڈی) تو ایک ہی رہ گئے۔ اس وقت تک لوگ بالکل تھک چکے تھے اور مزید غور و فکر کے موڈ میں نہیں تھے، لیکن کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے صدر نے یہ رائے دی کہ تمام حروف کا بدلنا تو مشکل ہے۔ اس لیے امتیاز کی خاطر کوئی ایک حرف بدل دیا جائے۔ اس طرح "زیڈ" کو بدل کر "زی" کر دیا گیا۔ اس ڈر سے کہ لوگ بھولنے نہ پائیں۔ امریکہ کے ایک ٹیلیویژن اسٹیشن نے اپنا نام "اکس وائی، زی" اسٹیشن رکھ چھوڑا ہے۔

بہر حال یہ تو ایک لطیفہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور کناڈا میں بول چال والی زبان کتابی انگریزی سے اس حد تک مختلف ہے کہ نئے لوگوں کو اکثر و بیشتر ناواقفیت کے مزے اٹھانے پڑتے ہیں۔ ★★

لطیفہ

بیٹا: (باپ سے) ہمالیہ کہاں ہے۔

باپ: اپنی والدہ سے پوچھ لو۔ وہیں کہیں باورچی خانے میں پڑا ہوگا۔

(نذیر احمد)

فیروز بخت احمد

کس کی زندگی بے کار ہے

بچوں کی کوششیں

ایک دفعہ ایک عالم کشتی میں دریائے گنگا پار کر رہے تھے۔ کشتی میں بیٹھے بیٹھے عالم صاحب نے سوچا: ملاح پر پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا چاہیے۔

عالم صاحب بولے ”کیا تم نے تاریخ پڑھی ہے؟ تاریخ سے ہمیں بیتی ہوئی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ بڑی بڑی لڑائیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہمیں پرانی حکومتوں کے بارے میں بتاتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ وہ لوگ کیسے رہتے سہتے تھے۔ کیا کھاتے تھے۔ کیا پہنتے تھے تم نے تاریخ پڑھی ہے؟“

”حضور میں ٹھہرا غریب آدمی۔ میں تاریخ وارتخ کیا جانوں!“ ملاح نے جواب دیا

موسم ٹھیک نہیں تھا۔ بادل سارے آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ تیز ہوا کے جھکڑوں سے کشتی بار بار ٹیڑھی ہو جاتی تھی

تھوڑی دیر تک تو خاموشی رہی۔ کچھ دیر بعد عالم صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

”کیا تم نے جغرافیہ پڑھا ہے؟“

”نہیں بابوجی بھلا مجھے جغرافیہ سے کیا مطلب!“ ملاح نے کہا۔

”جغرافیہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں کتنے برّاعظم ہیں۔ جغرافیہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں کتنے ملک ہیں۔ کون کون سی ندیاں ہیں۔ کون کون سے پہاڑ ہیں۔ کس ملک میں کیا پیدا ہوتا ہے۔ جغرافیہ سے ہمیں ہواؤں کا، بارش اور آندھیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے ہمیں زمین کی قسموں کے بارے میں باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کیا تم بھی یہ سب باتیں جانتے ہو؟

”نہیں بابوجی۔“ یہ کہہ کر ملاح چپ ہو گیا۔

”ان چیزوں کے جانے بغیر تمہاری زندگی بالکل بے کار ہے۔“ عالم صاحب بگڑ کر بولے

تھوڑی دیر تک پھر خاموشی رہی

تیز ہوائیں برابر چل رہی تھیں۔

عالم صاحب تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر بولے ”کیا تم نے سائنس کے بارے میں پڑھا ہے؟“

”جی نہیں بابوجی۔“

”کیا تمہیں اِس کے معنی معلوم ہیں؟“ عالم صاحب نے پوچھا۔

”سائنس سے ہمیں سورج، چاند، ستارے اور دوسرے سیّاروں کے متعلّق پتہ چلتا ہے۔ انسان سائنس کے بغیر آج کل کے زمانے میں ترقی ہی نہیں کر سکتا۔ آج کل سائنس بہت ضروری ہے۔ تمہاری زندگی تو بالکل بے کار ہے۔ جب تمہیں ان چیزوں کے بارے میں نہیں پتہ تو تم ایک مرے ہوئے انسان کی طرح ہو۔

مجھے دیکھو میں ان سب چیزوں کے بارے میں جانتا ہوں "

یہ کہہ کر عالم خاموش ہوگیا۔ موسم بہت خراب ہوگیا تھا۔ آندھی چلنے لگی تھی۔ ہوا بہت زور سے سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے طوفان آنے والا ہے۔ ہلکی ہلکی بونداباندی بھی شروع ہو چکی تھی۔

تبھی ملّاح عالم سے بولا " بابوجی کیا آپ تیر سکتے ہیں ؟ "

" کیوں ؟ " عالم گھبراتے ہوئے بولا

" بابوجی وہ دیکھئے کالے بادل۔ طوفان آنے والا ہے۔ اگر ہم ابھی تیر کر کنارے تک نہیں چلے گیے طوفان میں پھنس جائیں گے۔ جلدی کیجیے بابوجی وہ دیکھیے طوفان آگیا "

" اوہو! مجھے تو تیرنا نہیں آتا " عالم بولا۔

وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔

اب ملّاح کی باری تھی۔ وہ بولا " کیا کہا آپ کو تیرنا نہیں آتا۔ آپ کو تو سب کچھ آتا ہے، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس سب کچھ۔ مگر آپ کو تیرنا نہیں آتا۔ ابھی آپ کو خود پتہ چل جائے گا۔ کہ کون ایک مرے ہوئے انسان کی طرح ہے کس کی زندگی بے کار ہے۔ "

یہ کہہ کر وہ ملّاح پانی میں کودا اور دیکھتے دیکھتے کنارے تک پہنچ گیا۔ مگر وہ مغرور عالم دریا میں ڈوب گیا۔ ★

آدھی ملاقات

مئی کا پیام تعلیم بھی آج ہی ملا۔ سرورق واقعی بہت پیارا اور بہت عمدہ کاغذ پر ہے۔ بہت پسند آیا۔ اگلے سرورق کی تعریف کرکے آپ نے ابھی سے اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا ہے۔

کوپرنکس والے مضمون میں چند باتیں درست نہیں مثلاً کوپرنکس گرجا کی چھت پر بنے سائبان سے ستاروں کا مشاہدہ کرتے تھے اپنے مکان کے ساتھ بنے مینار سے نہیں۔ (۲) دوسرے کتاب کی اشاعت کے لیے انھوں نے خود اصرار نہیں کیا تھا بلکہ ان کے دوستوں نے اصرار کیا تھا اور کتاب شائع کرانے میں ان کے ایک جرمن شاگرد کا ہاتھ تھا۔ ان کی تھیوری تو ان کے مرنے کے بعد پادریوں کے علم میں آئی۔ ان کی زندگی میں نہیں۔ اور ہاں۔ دگیان کبھون کے سیمنار میں صرف روس۔ پولینڈ اور ہندوستان کے سائنس داں شریک ہوئے تھے۔ ساری دنیا کے نہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر مضمون مفید ہے۔ امید ہے کہ محترم اکرام صاحب آئندہ بھی اس طرح کے مضامین مرحمت فرماتے رہیں گے۔

محترم رشید صاحب کا مضمون دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اس بار کا مضمون بہت کام کا ہے۔

رؤف خیر صاحب کی نظم پسند نہیں آئی۔ اس میں نہ تو روانی ہے نہ کوئی خاص بات۔ قافیہ کا خیال بھی نہیں رکھا ہے "بیل" "جیل اور کھیل"، کا قافیہ نہیں ہے۔ رؤف صاحب جیسے شاعر سے ایسی تک بندی کی امید نہیں تھی۔ انھیں آئندہ احتیاط کرنی چاہیے۔

ذاکر صاحب پر مضامین اور رباعیاں اچھی ہیں۔ کتابت کی غلطیاں البتہ جگہ جگہ ہیں۔ میرے مضمون" مونگے کے جزیرہ" پر بنی تصویر بھی صاف نہیں آئی

خلیق انجم اشرفی

"پیام تعلیم" شمارہ اپریل موصول ہوا۔ نوازش کے لیے شکریہ۔ شروع سے آخیر تک پڑھ گیا، بچّوں کے لیے میں جتنا قیمتی اور صاف ومعیاری اردو ماہنامہ" پیام تعلیم"، کو مانتا ہوں اور کسی کو نہیں۔ میں نے پیام تعلیم" خوب پڑھا ہے۔ برسوں پڑھا ہے، ہر زاویہ نگاہ سے اس کے نثری و منظوم تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس وقت بھی جبکہ اپنا معیار" پیام تعلیم" سمجھنے کا بھی نہیں تھا اور اس وقت بھی جب پیام تعلیم کا کچھ دنوں تک فن کار بھی رہا۔ ہر زمانے میں اس کی بے پناہ جاذبیت کا مدّاح رہا، ادھر کچھ دنوں سے پرچہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مطالعہ سے دور ہو گیا تھا۔ اب زیرِ نظر شمارہ سے پھر قریب تر ہو رہا ہوں۔ انشاء اللہ پھر لکھوں گا بھی تاکہ" پیام تعلیم"، کے قارئین سے بھی قریب ہو سکوں۔ تازہ شمارہ نثری اور منظوم تخلیقات کے گرانقدر مواد سے بھرپور ہے۔ مجھے نظموں میں" خموشی ہے سونا" "بچّوں کی غزلیں" اور" ہیلو" بے حد پسند آئے، اسی طرح نثری حصّے میں" مونگے کا جزیرہ"، " ہاتھی کے پیٹ میں لومڑی"، اور " اور غنچے کھل اٹھے"، خوب خوب پسند آئے۔ امید ہے آئندہ بھی اس طرح کی معیاری و معلومات افزا تخلیقات پڑھنے کو ملیں گی۔

طباعت کے سلسلے میں ایک مشورہ یہ ہے کہ مضامین میں طباعت کا کالا حصّہ کچھ پڑھنے میں دقت طلب ہے بہتر تو یہ ہوتا کہ مضامین مکمل سفید ہی پر طبع کیے جاتے اور مضمون کی کچھ خاص باتیں اس طرح کے کالے حصّے دے کر چھاپی جاتیں،

میرے اس مشورے پر ضرور غور فرمائیں گے۔ اس لیے کہ بچّوں کو پڑھتے وقت یہ دھیان ہی شاید نہ رہے۔ کہ یہ سیاہ حصّہ بھی اسی مضمون کا ایک ٹکڑا ہے اور وہ نیچے سے پڑھنا شروع کر دیں۔ اس لیے مضمون کا تسلسل خراب ہو جائے گا۔

ہاں صاحب ایک ضروری بات یہ دریافت طلب ہے کہ کیا اب "سفر نامہ ابن بطوطہ" کا سلسلہ بند کر دیا گیا؟ کیا پورا کا پورا سفرنامہ شایع ہو چکا ہے؟ چونکہ میں بہت دنوں کے بعد "پیام تعلیم" پڑھ رہا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی واقفیت نہیں ہے۔ اگر پورا سفر نامہ شایع نہیں ہوا ہے تو اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھیں بڑا قیمتی سلسلہ ہے۔ اس سے بچّوں کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔

مقیم شاد۔ ڈالٹن گنج۔ (بہار)

پرچہ ٹائیٹل، ترتیب، انتخاب، کتابت اور طباعت ہر لحاظ سے خوبصورت اور کامیاب ہے منظومات میں "بچھڑا"، "انسانیت کا دیوتا" اور "ببلو"، بہت پسند آئے۔ ڈاکٹر مشیر الحق کا مضمون خرید و فروخت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ م۔ ندیم صاحب نے اپنے ڈرامے "دور کا دوست" کو نام نہاد دوستوں کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ احمد جمال پاشا کی لوک کہانی اور قیصر سرمست صاحب کے بیربل دونوں کافی پر مزاح ہیں۔ خلیق انجم اشرفی صاحب کی سبھی تخلیقات قابلِ قدر و تحسین ہیں۔ وہ دیگر زبانوں اور لوک کی کہانیوں سے "بچّوں کے ادب" میں واقعی اضافہ فرما رہے ہیں۔

(شاغل ادیب ایم اے حیدرآباد)

دل بے چین تھا۔ طبیعت بیتاب تھی اور نگاہیں بے قرار! کہ نہ جانے کب "پیام تعلیم" ہمارے ہاتھوں میں پڑتا ہے اور حضور والا کی نظر کرم ہم مشتاقان "پیام"، کی جانب ملتفت ہوتی ہے تا خیر کے بنا بر ہم لوگ امید و نا امیدی اور یاس و رجا کے تلاطم میں تھے مگر چند ایام قبل ہمارا محبوب پرچہ "پیام تعلیم" ایک نعمت غیر مترقبہ کی شکل میں ملا۔ اور پیام تعلیم پیام تعلیم ہی نہیں بلکہ پیغام مسرت اور پیغام فرحت بنکر نازل ہوا۔ ہم لوگ اسے لے کر بہت خوش اور مسرور ہیں۔ نیز آپ کی کرم فرمائی اور ہمت افزائی کے شکر گزار! بلکہ آپ کے اس گرانقدر سلوک کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔ آپ نے ہمارے مقدّس جذبات کو محفوظ رکھا ہے اور ہماری خواہشات کے بے جان پتلے میں زندگی و حیات کی روح پھونک دی ہے اور مجھے امید ہی نہیں بلکہ کامل یقین ہے کہ آپ ہر موقعہ پر ہم لوگوں کا تعاون فرماکر شکریہ کا موقعہ دیں گے! ہم طلبہ انجمن کی دعا آپ کے پرچہ کے ساتھ ہے۔ خدا اس پیمبر کو زندہ و پائندہ رکھے اور ہم لوگوں کے لیے درس و عبرت اور سبق!

محمد شبیر احمد خاں رحمانی

ناظم انجمن بادیۃ الادب خانقاہ رحمانی مونگیر (بہار)

میں ایک خط آپ کے نام ارسال کر رہا ہوں جو قلمی دوستی کے لیے ہے۔ بہت دنوں سے میں خواہاں تھا کہ آپ کے رسالے میں اپنے کو قلمی دوستی کے لیے پیش کروں۔ امید کہ آپ "پیام تعلیم" میں چھاپ کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ یہ خواہش مجھے اس لیے پیدا ہوئی کہ میں نے خود بھی جامعہ میں چار سال تک تعلیم حاصل کی ہے ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک مگر بدقسمتی سے آگے نہ جا سکا۔ اس لیے سوچا کیوں نہ قلمی دوستی کے ذریعے اپنے پرانے دوستوں سے پھر دوستی تازہ کروں اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ میری خواہش کو نظر انداز نہ کریں۔

نام ... محمد عمران غفاری شاہ ... عمر ۱۷ سال تعلیم ۸۔۹ میں حاصل کر رہا ہوں۔ مشغلہ قلمی دوستی کرنا۔ ہر خطوط کا پابندی سے جواب دینا۔ ناول پڑھنا۔ فوٹو جمع کرنا اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنا بڑا دلچسپ مشغلہ ہے کراف، محمد تسلیم، شکر ٹولی عالم گنج پٹنہ ۷ پن نمبر ۸۰۰۰۰۷

محمد عمران شاہ

ادھر ادھر سے

اٹلی کے مہم بازوں نے ایوریسٹ کی چوٹی سر کرلی

ایوریسٹ کی چوٹی اس سال اٹلی کے مہم بازوں نے سر کرلی۔ ایک بار نہیں دو بار۔ پہلے تین اٹلی والے ایک شرپا تھا۔ دوسری بار اٹلی کا ایک مہم باز تھا۔

ذرا اسٹیشن کا تو نام لیجیے۔

لندن ۷۔ مئی۔ دنیا میں سب سے لمبے نام کا اسٹیشن ۱۹۵۴ء میں بند ہوگیا تھا اس سال یہ پھر قائم ہوگیا ہے۔ اور کبھی اس اسٹیشن کا نام ہے: "لان فیئر پ ول دن جی گر جری جرنڈ دری لا نیتا سلی، اوگو گوچ" ذرا آپ جلدی جلدی اس کا نام تو لیجیے

اور ہاں اس کا پلیٹ فارم ٹکٹ چھ انچ لمبا ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ آدھا فٹ۔

چلتی پھرتی عمارتیں

ماسکو کے تعمیراتی میوزیم کی عمارت کو عنقریب ایک دوسرے مقام پر لے جایا جائے گا۔ یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ زمین کے اندر اتنی گہری بنیادوں کی وجہ سے مکانوں سے زیادہ استواری کے ساتھ کوئی دوسری شے زمین پر قائم نہیں ہے۔ مگر ان دنوں عمارتیں بھی سفر کر سکتی ہیں۔ بس انجینیروں کو ایسی عمارت کے قطعی درست وزن کا علم ہونا چاہیے۔

اینٹ کے مکان ہزاروں ٹن وزنی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماسکو کے تعمیراتی میوزیم کا وزن ۱۵ ہزار ٹن ہے ایسی عمارتوں کو کس طرح منتقل کیا جاتا ہے؟ سب سے پہلے عمارت کو دھات کے ڈھانچے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے نیچے رولروں پر آہنی پٹریاں وغیرہ لگادی جاتی ہیں۔ جب عمارت اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے تو بوجھ اٹھانے والی بجلی کی طاقتور کلیں اسے نئی جگہ تک فی گھنٹہ دس تا بارہ میٹر کی رفتار سے کھینچ کرلے جاتی ہیں۔

۱۹۴۱ء سے پہلے راجدھانی کی تقریباً ۲۰ بڑی عمارتوں کو ان کی جگہ سے منتقل کیا گیا تھا۔ ان میں ماسکو سوویت کی عمارت بھی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے وسیع حساب کتاب اور پیچ در پیچ انجینئرنگ تیاریاں درکار تھیں۔ ماسکو کے باشندے اور اس کے مہمان گورکی اسٹریٹ پر واقع مکان نمبر ۹ کی عمارت سے بخوبی واقف ہیں جس میں لذیذ کھانوں کا ایک ریستوران اور ماسکو فسکوٹے کیفے موجود ہے۔ چوتھی دہائی میں اس مقام پر یا اس سے ذرا آگے ایک قدم لمبی چوڑی عمارت واقع تھی۔ یہ عمارت آج بھی اپنے احاطے میں موجود ہے۔ البتہ شاہراہ کو چوڑا کرنے کی خاطر یہ عمارت کچھ پیچھے ہٹ گئی۔

آج نئے ماسٹر پلان میں ماسکو کے مرکزی حصے کی نئے سرے سے تعمیر کی تجویز شامل ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے یہاں کئی نادر عمارتیں کھڑی ہیں۔ یقیناً انھیں منہدم کرنے کی بجائے دوسرے مقامات پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔

ماسکو میں تقریباً ۴۰ عمارتوں کو منتقل کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر کالینن ایونیو کی تعمیر نو کے پیش نظر [illegible] لمبی چوڑی

عمارت کو منتقل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ جس میں فن تعمیر ا اے ۔ وی ۔ شیچولیف میوزیم واقع ہے ۔ یہ عمارت محض کئی درجن میٹر پیچھے ہی نہیں ہٹائی جائے گی بلکہ ایک میٹر زیادہ اونچی بھی ہو جائے گی ۔

ایرانی شہنشاہ داریوس کا مجسمہ ملا !

۱۳۰ افراد پر مشتمل فرانسیسی آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایران کے شش شہر میں داریوس اعظم کا دو میٹر اونچا مجسمہ کھود نکالا ہے ۔ یہ بادشاہ موجودہ شاہ ایران کے جد اعلا ہیں ۔

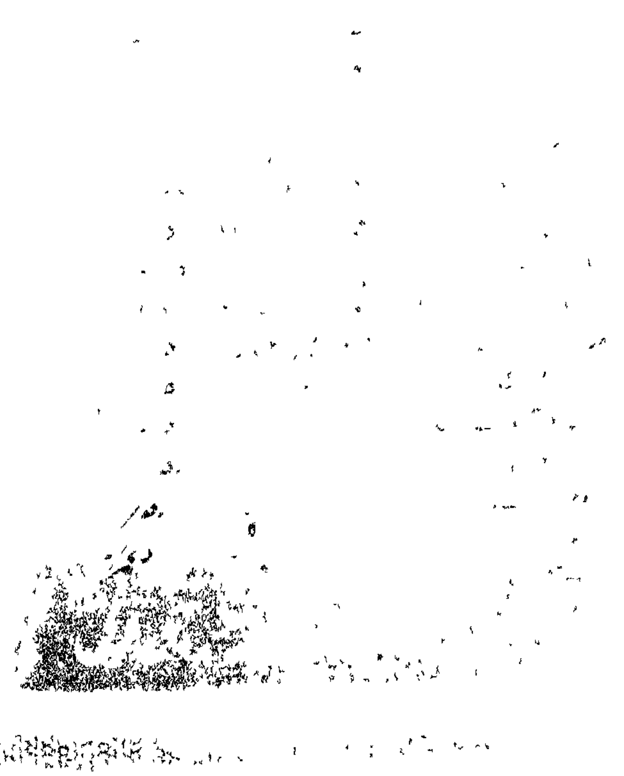
ایرانی ہفتہ وار کیہان انٹرنیشنل نے خبر دی ہے کہ یہ تحقیقاتی پارٹی دراصل اپادان محل کے قدیم نوادرات کو درست کرنے میں مصروف تھی تاکہ اس محل کو سیاحوں کی دلچسپی کا ایک مرکز بنایا جا سکے کہ کھدائی کے دوران اچانک انھیں یہ مجسمہ مل گیا ۔ اس مجسمہ کا سر ٹوٹ چکا ہے ۔ باقی سب ٹھیک حالت میں ہے ۔ اس بادشاہ کو شاہی چوغہ میں دکھایا گیا ہے اور ان کی کمر سے بندھی پیٹی پر جو عبارت کندہ ہے اسے بھی یہ تحقیقاتی کمیٹی پڑھنے میں کامیاب ہو گئی ہے اس پر لکھا ہے ۔ " میں ایران کا شہنشاہ داریوس ہوں " چوغے پر جو عبارت لکھی ہے وہ ابھی تک نہیں پڑھی جا سکی ہے بہرحال اس کو پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

No. D. 1457

پیام تعلیم

عمارت کو نشقا JUNE

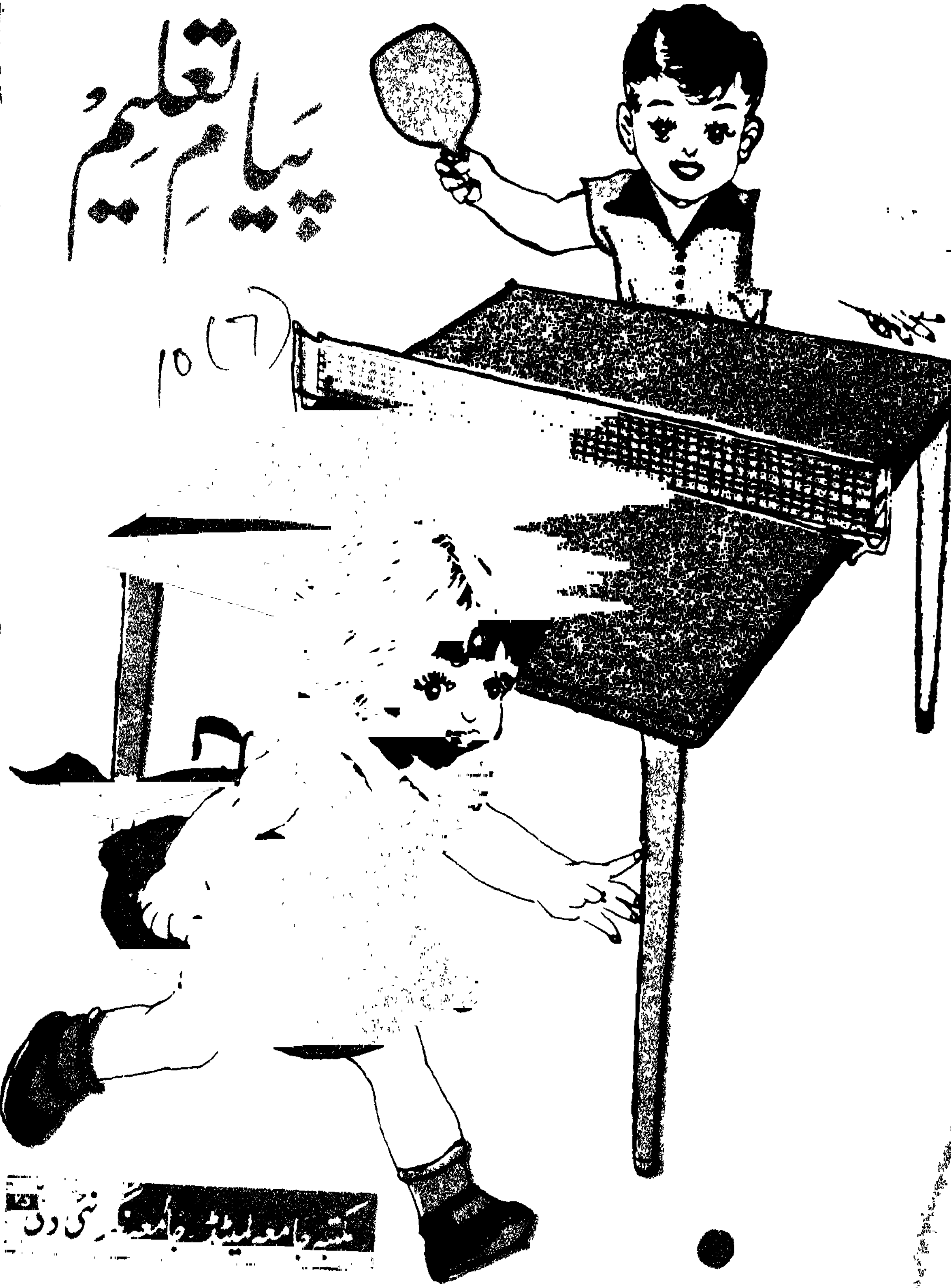
اے۔



لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۵۲۸ پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی

پیام تعلیم

۱۵ (٦)



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلی

ماہنامہ پیام تعلیم

نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۷

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

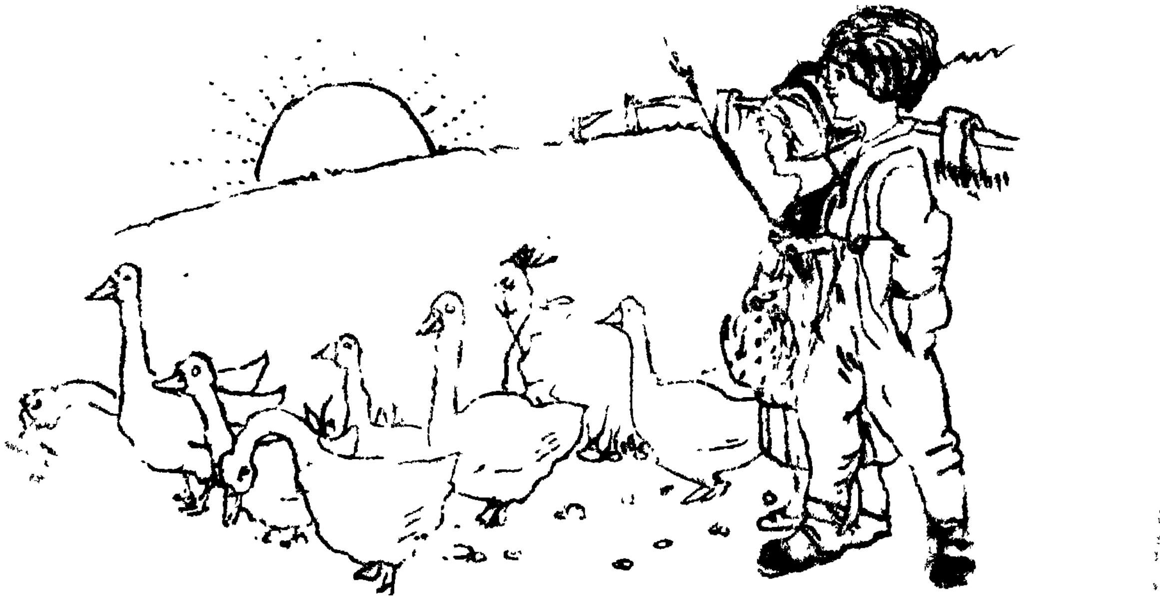
جولائی ۱۹۷۳ء

قیمت : ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ : چھ روپے

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر سیّد احمد دہلوی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔



بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — 1/50
آن حضرت — الیاس احمد مجیبی (اُردو) — -/65
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں) — مقبول احمد سیوہاروی — 2/25
چار یار — الیاس احمد مجیبی — 1/30
خلفائے اربعہؓ — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — 2/25
رسول پاکؐ — عبدالواحد سندھی — 1/80
عقائدِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — -/50
مسلمان بیبیاں — مولانا اعجاز الحق قدوسی — -/75
نبیوں کے قصّے — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — 1/25
ہمارے رسول — " " " — 1/65
ہمارے نبی — سیّد نواب علی رضوی اُردو ہندی — -/40 -/45

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد — 1/75
انوکھا عجائب خانہ — محمد حسین حسان (چار حصّے) — 1/80
بجلی کی کہانی — علی احمد خاں — -/50
پڑدادا کی کہانی — محمد عبدالغفور — -/56
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل — خسیمہ سلطان — -/80
" " " دوم — ضیاء الرحمٰن — 1/-
" " " سوم — مشتاق احمد اعظمی — 1/80
" " " چہارم — " " " — -/95
چٹانوں کی کہانی — محمد امین — 1/75
خبر رسانی کے طریقے — رفیعہ منظور الامین — -/85
دُنیا کے بچے — محمد حسین حسان — 1/-
ننھی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی — 1/80

رابندر ناتھ ٹیگور — صفدر حسین — 1/25
سماجی زندگی اوّل — احمد سعید ملیح و غلام ابرار — -/56
" دوم — " " " — -/81
" سوم — " " " — -/81
سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی — 1/30
سمندر کے نیچے — " " " — 2/-
قدرت کے کرشمے — ادارہ — -/62
میر انیس — محمد حسین حسان — 1/25
ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر — 1/25

کہانیاں، ڈرامے، ناول

حی بن یقظان عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے — 4/-
اس نے کیا کر ڈالا (کہانیاں) — آصفیہ مجیب — -/37
پریم کی جیت (ڈراما) — اسد اللہ کاظمی — -/37
تانبیل خاں (کہانی) — محمد حسین حسان — -/30
ترکوں کی کہانیاں (") — مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — -/55
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) — م۔ ندیم — 1/50
تین اناڑی (") — عصمت چغتائی — 1/4
چقماق کی ڈبیا (کہانی) — برکت علی فراق — -/40
چمپاوت کا آدم خور شیر (") — محمد معین — -/35
چنبیلی — محمد حسین حسان — -/50
ستاروں کی سیر (ناول) — کرشن چندر — 1/75
کورے دادا (سچا ناول) — مجیب احمد خاں — 1/75
لال مرغی (کہانی) — عبدالواحد سندھی — -/50
مزہ چکھائیں گے (") — مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — -/35
مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں) — محمود علی خاں — -/65
ننھا شہزادہ (کہانی) — خورشید سلطان — -/30

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

بچوں سے باتیں

شکر ہے۔ جون کا پیامِ تعلیم کیا بچوں کیا بڑوں سب کو بہت ہی پسند آیا۔ مضمون، کہانیاں نظمیں سب ہی کی تعریف کی گئی۔ نیرؔ صاحب کی نظم "گرمی کی گرما گرمی" تو واقعی مزا دے گئی۔ اور ہاں ٹائٹل دیکھ کر تو سب کے منھ سے بے ساختہ واہ واہ نکل گیا، ہر ایک کے دل سے دعا نکلی کہ پیامِ تعلیم کا ٹائٹل ہمیشہ ایسا ہی پیارا پیارا ہو ایسا ہی خوب صورت ہو اور کچھ ہو یا نہیں، اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہو۔

بہت سے پیامیوں نے ایک اور خواہش کی ہے سارا پرچہ لیتھو کی جگہ آف سیٹ پر چھپے۔ ہمارا دل بھی یہی چاہتا ہے۔ پر بھئی خالی دل کے چاہنے سے تو بات بنتی نہیں اس کے لیے تو کچھ اور چاہیے۔ اور "یہ کچھ اور" آپ کی توجہ اور کوشش ہی سے مل سکتا ہے۔

ہم انھی صفحوں پر پیامِ تعلیم کے خریدار بڑھانے کی آپ سے درخواست کر چکے ہیں۔ آپ اپنے پیامِ تعلیم کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اُسے دل سے چاہتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ برابر ترقی کرے مگر یہ کیسے ممکن ہے جب تک آپ کا رسالہ اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو اس کے پاس کافی سرمایہ نہ ہو۔ اگر آپ ہمت کر کے ایک ایک دو دو خریدار بھی فراہم کر دیں تو بات بن جائے پھر دیکھیے رسالے کی ظاہری شان و شوکت بھی ہم کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں پیامِ تعلیم جو خدمت کر رہا ہے۔ بہت سے لوگوں پر اس کا اثر ہوا ہے اور وہ وقتاً فوقتاً اپنی نوازشوں سے ہمیں ممنون بھی فرماتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک سرپرست نور محمد صاحب (کشمیر) کو پیامِ تعلیم ایسا پسند آیا کہ اپنے اسکول کے گیارہ بچوں کو پیامِ تعلیم کا خریدار بنوا دیا۔

ہمارے عزیز دوست اور پرانے ساتھی اسرار ندوی صاحب تو تقریباً ہر مہینے ایک دو خریداروں کے چندے بھجواتے رہتے ہیں۔ اسرار صاحب نے پیامِ تعلیم کے لیے کہانیاں اور مضمون بھیجنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ آپ نے مشہور شاعر میر حسن دہلوی کی مثنوی کا خلاصہ نثر میں کیا ہے بہت مزے کی بہت دلچسپ چیز ہے۔ پیامِ تعلیم میں چھپے گی۔

ہمارے بمبئی کے اخبار خاص طور پر روزنامے پیامِ تعلیم پر اپنے تبصروں کے ذریعے ہماری ہمت

پڑھاتے رہتے ہیں۔ ہم جناب عبدالعزیز نشتر صاحب کے خاص طور پر ممنون ہیں۔ آپ نے اپریل اور مئی کے پرچوں پر اپنے اخبار کے الگ الگ پرچوں میں تبصرہ فرمایا ہے۔ پیام تعلیم کی مدد کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ بہت اچھا طریقہ۔ سنتے ہیں بمبئی سے شام کے وقت چھپنے والے روزناموں میں "آج" سب سے زیادہ مقبول اخبار ہے۔

افسوس ہے کہ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون (حرفوں کا جادو) وقت پر نہ مل سکا۔ یہ اب اگلے پرچے میں چھپے گا۔

رشید حسن خاں صاحب کے مضمون کا یہ سلسلہ عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے۔ اردو اسکولوں کے استاد خاص طور پر اسے سراہ رہے ہیں اب تک ان مضامین کی مخالفت میں صرف ایک خط آیا ہے۔ یہ خط آگے "آدھی ملاقات" میں پڑھیے۔

اور ہاں ہمیں بڑا دکھ ہے کہ خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کے بارے میں خبر غلط چھپ گئی۔ وہ ماشاء اللہ زندہ سلامت موجود ہیں اصل میں اُن کے گھر سے جو تار آیا تھا وہ کچھ ایسا تھا کہ خود خاں صاحب کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے اور گھبرا کر وطن کی طرف دوڑ پڑے۔ وہاں جا کر حقیقت معلوم ہوئی۔ ہم محترمہ سے خاص طور پر معذرت خواہ ہیں۔

اس پرچے میں بھی محترم شفیع الدین صاحب نیّر کی دو نظمیں پڑھیے۔ برسات اور (۲) چھٹیوں کے بعد دونوں بڑی بانکی نظمیں ہیں۔ دوسری نظم خاص طور پر آپ میں ایک امنگ اور ولولہ پیدا کرے گی۔

مختلف ریاستوں میں نصابی کتابیں تیار کرنے کا کام مقامی سرکاروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے مہاراشٹر اس میں پیش پیش ہے۔ ان صوبوں کی نصاب بنانے والی کمیٹیوں نے پیام تعلیم کے بہت سے مضامین اپنی درسی کتابوں میں شامل کیے ہیں۔ جن مضمون نگاروں کے مضمون انتخاب کیے گئے ہیں ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ محترم غلام ربانی صاحب (حیدرآباد) مولانا عبدالسلام ندوی۔ عزیزی غلام حیدر ایم اے۔ جناب اکرام احمد صاحب ایم اے لکچرر ٹیچرس کالج جامعہ۔ عزیزہ سلمٰی جاوید (ایڈیٹر زیور پٹنہ)۔ ید الدین صاحب (استاد جامعہ) جمیل قریشی صاحب (اسسٹنٹ لائبریری جامعہ) وغیرہ ان حضرات کو حکومتوں سے رائلٹی بھی ملے گی۔

آپ کا کام

یہ ہے کہ اپنے پیام تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں موجود نہیں ہے تو ہمیں لکھیے۔ ہم آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔ ان مشوروں کی روشنی میں پیام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

اپنے دوست احباب میں پیام تعلیم کا چرچا کیجیے۔ ایسے دوستوں کے پتے ہمیں بھیجیے جن کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ پیام تعلیم سے دلچسپی ہوگی ہم انھیں نمونے کے طور پر پیام تعلیم بھیجیں گے۔

پیام تعلیم کے خریدار بنا کر سہارا دیجیے۔ اور اس طرح پرچے کو زیادہ شاندار زیادہ خوبصورت اور زیادہ کار آمد بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

(منیجر)

جناب آزاد تونمی ٹوڈیلوی

بچّوں کی دُعا

جن کا نہیں ہے کوئی ان کا ہے تُو سہارا
تجھ سے ہی مانگتے ہیں تو ہے خدا ہمارا
ہوتی ہے دُور مشکل لیتے ہی نام تیرا
پروردگارِ عالم ہے فیض عام تیرا
سب سے نہاں بھی تو ہے سب میں عیاں بھی تو ہے
راحت رساں بھی تو ہے، روزی رساں بھی تو ہے
ذرّوں کو مہرِ تاباں ذرّہ نواز کر دے
علم و ہنر عطا کر یوں سرفراز کر دے
دُنیائے رنگ و بو میں پھیلیں بہار بن کر
خدمت کریں وطن کی ہم جاں نثار بن کر
شیوہ رہے ہمارا مظلوم کی حمایت
کرتے رہیں ہمیشہ خلقِ خدا کی خدمت
ایثار وہ عطا کر لطف و کرم سے کھیلیں
ہم دردیوں کی خاطر رنج و الم سے کھیلیں
یارب ہمارے دم سے ہمّت بڑھے وطن کی
عظمت بڑھے وطن کی عزّت بڑھے وطن کی
اے کارسازِ عالم کھل جائے بابِ رحمت
لہرائے کل جہاں پر پرچم صداقت
اپنی عنایتوں سے دامن ہمارا بھر دے
جو بات منہ سے نکلے اس بات میں اثر دے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو صبر و سکوں عطا کر
تیرا ہی دم بھریں ہم، ایسا جنوں عطا کر
انسانیت کی دولت انسان کو عطا ہو
بچّوں کی یہ دعا ہے مقبول اے خدا ہو



جناب پروفیسر آفاق احمد

کاغذ کی ناؤ



ہمارے دیس کو اگر قصّوں، کہانیوں اور کہاوتوں کا دیس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بہت پرانے زمانے سے ہمارے بزرگ ایسی کہانیاں لکھتے آئے ہیں جنھیں سُن کر ہم نے اپنی زندگی کو سنوارا ہے۔ وہ ایسے قصّے لکھتے تھے۔ جن سے اخلاقی نتیجے نکلتے تھے اور ہم میں ایمان داری، بہادری، ہمدردی اور اچھی چیزوں کو اپنانے اور بُری چیزوں کو چھوڑنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

ان کے قصوں اور کہانیوں سے جو نتیجے نکلتے تھے وہ کہاوت بن کر مشہور ہو جاتے تھے اور ان کہاوتوں سے زندگی سنوارنے کے بہت سے سبق ہمیں ملتے تھے۔

بہت سی کہاوتیں تو ایسی ہیں جو ہر ایک کو یاد ہیں۔ جیسے "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" یا "نو سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی" یا "نیکی کر دریا میں ڈال" "بیٹھا بنیا کیا کرے اِس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی دھرے" وغیرہ

ہر کہاوت کا اپنا ایک مطلب ہوتا ہے۔ بس ادھر کہاوت سُنی اُدھر مطلب سمجھ میں آیا۔ مثلاً یہ آخر والی کہاوت کہ "بیٹھا بنیا کیا کرے اِس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی دھرے" کا مطلب یہ ہوا کہ بیکار آدمی جسے کوئی کام نہ ہو، وہ فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کرنے لگتا ہے۔

ایسی ہی ایک کہاوت ہے "کاغذ کی ناؤ آج کل ڈوبے گی" یعنی کاغذ کی ناؤ سدا چلتی نہیں

...نہ ایک دن ڈوب جاتی ہے۔ اس کہاوت کو لے کر
...طرح کے قصے کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ کوئی بھی ایسی چیز
...ہے بہر حال ختم ہوتا ہے۔ اُسے کاغذ کی ناؤ سے مثال دیتے ہیں۔
مجھے اس وقت اپنے بہت بچپن کا ایک قصہ یاد آرہا ہے اس وقت
تیسرے درجے میں پڑھتا تھا۔ ہمارے کورس میں ایک
...تھی۔ جس کا نام تھا "اُردو زبان کی دوسری کتاب"
کتاب کو خان صاحب مولوی محمد اسماعیل مرحوم نے لکھا
اس میں بڑے مزے کے قصے تھے۔ اُن میں بڑا
لکھا تھا اور وہ فوراً یاد بھی ہوجاتے تھے۔ اُن میں
قصہ ایک کتے اور بلی کا بھی تھا۔ وہ قصہ مجھے آج
یاد ہے۔ یہ مولوی صاحب کا کمال تھا کہ جو انھوں
لکھا وہ سدا کے لیے یاد ہوگیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک کتے نے ایک بلی پر حملہ کیا اور
چیر پھاڑ ڈالا۔ یہ بلی بھی کچھ کم ظالم نہ تھی۔ یہ اپنے
زور پر چوہوں کو اسی طرح چیرا پھاڑا کرتی تھی۔ اب
اپنے سے طاقتور کتا ملا اور اس نے چیر پھاڑا تو بلی کو
چوہوں پر ظلم کرنا یاد آیا۔ بڑی پچھتائی۔ مگر "جب
کھیت چگ جائیں تو پچھتانے سے کیا ہوتا ہے"
یا تھا اُس کا پھل ملا۔ مرتے مرتے پچھتا کر کہنے لگی ؎

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

اس پورے قصے کو میں نے نظم میں پڑھا تھا۔
یوں ہے۔

ڈالا ایک کتے نے ایک بلی کو چیر
سانس ٹھنڈی بھر کے وہ بولی حقیر
رحم کھاتی میں اگر چوہے پہ گاہ
تو مرا کیوں حال ہوتا یوں تباہ
جو کیا تھا اُس کا پھل مجھ کو ملا
آہ میں کس سے کروں اپنا گلا
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

اس نظم کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے سے کمزور کو مت ستاؤ، اُس پر ظلم نہ کرو۔ ورنہ جو تم سے طاقتور ہے وہ تمھیں ستائے گا۔ تم پر ظلم کرے گا۔ جس طرح کاغذ کی ناؤ ایک دن ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح تمھارے ظلم کا بھی خاتمہ ہوگا۔ یہ ہمیشہ چلنے والا نہیں ہے۔

اس وقت مجھے ایک اور قصہ یاد آرہا ہے اس میں بھی کاغذ کی ناؤ کا ذکر ہے۔ اردو میں ایک مشہور مثنوی ہے "مثنوی سحر البیان"۔ اسے اُردو کے مشہور شاعر میر حسن نے لکھا ہے۔ اس مثنوی میں ایک شہزادے تھے جن کا نام تھا بے نظیر اور ایک دوسرے ملک کی شہزادی تھی اس کا نام تھا بدر منیر۔ شہزادہ بے نظیر چاہتا تھا کہ بدر منیر سے اس کی شادی ہوجائے۔ اس نے شہزادی بدر منیر کے باپ کو جو ایک بڑا بادشاہ تھا شادی کا پیام بھیجا۔ اس پیام کے ساتھ اس نے اپنی فوج اور مال و دولت کے بارے میں بھی لکھا۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر بادشاہ سلامت نے شادی نہیں کی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ آئے گا۔

شہزادی کا باپ بھی چھوٹا موٹا بادشاہ تو تھا نہیں۔ اُس کے پاس بھی بڑی فوج تھی اسے اس دھمکی پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن اس نے غصے پر قابو پایا اور شہزادے کا پیام منظور کرلیا۔ مگر شہزادے بے نظیر کو یہ ضرور لکھا کہ:
" میاں ابھی لڑکے ہو۔ اس لیے بڑھ چڑھ کر بولتے ہو۔ اچھا بُرا سمجھتے نہیں۔ ورنہ یہ فوج، یہ دولت کسی کے پاس سدا رہی ہے۔ جو تمہارے پاس رہے گی!"

اور پھر یہ شعر لکھا

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

یعنی دنیا کی ہر چیز ایک دن مٹ جائیگی۔ جس طرح کاغذ کی ناؤ پانی میں تھوڑی دور بہتی ہے اور پھر ڈوب جاتی ہے۔

ناؤ کے بہنے پر ہمیں یاد آیا کہ چھوٹی چھوٹی کاغذ کی ناؤں جب پانی میں چلتی ہیں تو کتنی بھلی لگتی ہیں۔ بہت سی کاغذ کی ناویں بنا کر پانی میں چھوڑ دو اور پھر ناووں کا یہ بیڑا اگر بہاؤ ہلکا ہو تو دھیمے دھیمے چلے اور بہاؤ تیز ہو تو تیز تیز بھاگے۔ کتنا مزا آتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کا کھیل! پھر یہ ناویں پانی میں بھیگ جاتی ہیں۔ کچھ دور چلتی ہیں اور ڈوبنے لگتی ہیں۔ انھیں ڈوبتے دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے۔ مگر ان کی قسمت میں تو ڈوبنا ہی لکھا ہے۔ پھر اس کے لیے دکھ کیسا!

ہاں ایک بات ضرور یاد رکھنے کی ہے۔ جس طرح کاغذ کی ناؤ سدا چلتی نہیں ہے، اسی طرح جھوٹ ہے جس کا پول ایک دن کھل جاتا ہے۔ اسی طرح مال اور دولت ہے کہ ہمیشہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتا۔ اسی طرح ہماری زندگی ہے کہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔

یہ سب کاغذ کی ناؤ کی طرح ہیں۔ جنہیں ختم ہونا ہے۔ اس لیے ہم کیوں نہ سچ بولیں کہ اس کی خوشبو ہمیشہ باقی رہے۔ کیوں نہ اپنی زندگی کو اچھے کاموں میں لگائیں۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کریں۔ نیکی کریں۔ کیوں نہ ان کے بھلے برے میں کام آئیں تاکہ سب کہ ہماری باتیں یاد کریں۔ جیسے ہمارے بزرگوں کی اچھی باتیں ہمیں یاد



ہیں۔ کاغذ کی ناؤ کا کیا وہ ابھی نہ ڈوبی تو کچھ دیر بعد میں ڈوبے گی۔ اس میں بیٹھ کر ہم چاہیں کہ دریا پار کر جائیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس لیے ہمیں جو کام کرنا چاہیے وہ ایسا ہو کہ ہمیشہ باقی رہے۔ ٹھیک ہے نا؟

(آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے شکریہ کے ساتھ)

لطیفہ

ڈاکٹر: (مریض سے) تم فکر نہ کرو، میری دوا پیتے ہی اچھے ہو جاؤ گے۔ آج تک میرا کوئی مریض دوا لے جانے کے بعد واپس شکایت کرنے نہیں آیا۔

مریض: (ڈر کر) تو پھر ڈاکٹر صاحب مجھے معاف رکھیے میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

(محمد رضا)

جناب محمد شفیع الدین نیّر



برکھا رت

موسم بدلا، پھر رُت بدلی　　گرمی کی بھی شدّت بدلی
آئی ہیں پورب کی ہوائیں　　چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں
بادل گرجے گڑ گڑ گڑ گڑ　　بوندیں آئیں تڑ تڑ تڑ تڑ
بجلی چمکی چم چم چم چم　　بارش برسی چھم چھم چھم چھم
پانی سے پھر بھر گئے جل تھل　　ہو گئے کل سے تھے جو بے کل
سبزے نے بھی رنگ جمایا　　دیکھ کے اُس کو جی لہرایا
کھیتی میں ایک جان سی آئی　　پیڑوں پر اک شان سی آئی
سکھیوں نے یہ گانا گایا　　ساون آیا ساون آیا
باغوں میں جھولے ڈلوائے　　سیریں کیں پکوان پکائے
گلیوں میں بھی ہو گئی کیچڑ　　لوگ گریں گے دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ
اک بچے کا پاؤں جو پھسلا　　دھم سے گرا بے چارہ اوندھا
سب بچوں نے شور مچایا　　اُس بچے کو خوب چڑایا

کیسی کچھ سوغاتیں آئیں　　ٹھنڈی ٹھنڈی راتیں آئیں
قدرت کے نظارے دیکھو　　منظر پیارے پیارے دیکھو
نیّر تم بھی سیر کو جاؤ
برکھا رت کا لطف اٹھاؤ

**



بارھویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ۔ ظلیق انجم۔ اشرفی

مونگے کا جزیرہ

غار کے عجائبات



"بچھو" جیک بولا۔ "یہ سبز شے شارک نہیں، روشنی کی ایک شعاع ہے جو پانی کے نیچے چٹانوں میں موجود ایک غار سے نکلتی ہے۔ غوطہ لگاتے ہی میں نے دیکھا کہ یہ روشنی اس چٹان کے ایک کونے سے نکل رہی ہے جس پر ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اس طرف بڑھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ سوراخ بنے ہیں جن کے اندر روشنی سی معلوم ہو رہی ہے ایک لمحہ کو میں ٹھٹکا اور سوچنے لگا کہ اندر جاؤں کہ نہ جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر جو ہوگا دیکھا جائے گا، میں اندر گھس گیا۔

میاں پیٹرکن۔ یہ بات بتانے میں تو مجھے کچھ وقت لگا۔ لیکن ہوا یہ سب کچھ، چند سیکنڈ کے اندر ہی اندر کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ مجھے اتنی ہوا چاہیے کہ میں سوراخ سے نکل کر سطح تک آسکوں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی اور میں سوراخ سے نکلنے کے لیے

مرنے ہی والا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے سر کے عین اوپر ایک مدھم سی روشنی ہے۔ میں اوپر کی طرف تیرا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا سر پانی کی سطح سے اوپر ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اب میں کافی ہوا لے کر لوٹ سکتا تھا لیکن اسی وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ شاید میں واپسی کا راستہ نہ تلاش کر سکوں۔ پھر یہ دیکھ میں مطمئن ہو گیا کہ میرے نیچے وہ سبز روشنی غار کے اندر کا راستہ دکھا رہی تھی اسی طرح جیسے اوپر سے ہم اس میں روشنی نکلتے دیکھتے ہیں!

" شروع شروع میں تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دیا لیکن جب رفتہ رفتہ میری آنکھیں اس کی عادی ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک لمبا چوڑا غار تھا۔ اس کی دیواروں کو میں نے اپنے دونوں طرف محسوس کیا مجھے اس کی چھت جو میرے سر کے بالکل اوپر تھی۔ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر خوب صورت چمک دار پتھر جڑے تھے لیکن غار کا دوسرا سرا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا میں اپنے چاروں طرف حیرت سے تک رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں تم دونوں یہ نہ سمجھ لو کہ میں ڈوب گیا ہوں۔ بس یہ سوچ کر میں نے تیزی سے غوطہ لگایا اور سطح پر ابھر آیا اور اب تمھارے سامنے ہوں،

جیک نے اپنی داستان ختم کی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا وہ ساری چیزیں جو جیک دیکھ آیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے میں نے بھی غوطہ لگایا لیکن وہاں اس قدر اندھیرا تھا کہ میں کچھ نہ دیکھ سکا اور گھبرا کر اوپر چلا آیا۔ میرے واپس ہونے کے بعد جیک نے اور میں نے اس غار کے بارے ایسی چوڑی گفتگو چھیڑ دی۔ میں نے دیکھا کہ ہماری اس گفتگو کے دوران پیٹرکن بہت افسردہ سا چہرہ بنائے رہا۔

" کیا بات ہے پیٹرکن؟" میں نے پوچھا

" بات؟" اس نے جواب دیا " تم دونوں کو تو مچھلیوں کی طرح اس غار کے عجائبات بیان کرنے میں بڑا مزا آ رہا ہے لیکن تمھیں معلوم ہی ہے کہ مجھے خالی اس کا ذکر سن کر ہی دل خوش کرنا ہوگا جب کہ تم دونوں پاگل شارک مچھلیوں کی طرح مزے کرو گے کتنی بری بات ہے یہ!"

" مجھے سچ مچ بڑا افسوس ہے پیٹرکن" جیک بولا " لیکن ہم تمھاری مدد بھی تو نہیں کر سکتے۔ بس اگر تم تیرنا سیکھ لو تو......"

" اڑنا سیکھ لو۔ یہ کیوں نہیں کہتے" پیٹرکن جیک کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے۔ انتہائی غصیلی آواز میں بولا اور ہم دونوں ہنس پڑے اور سر ہلانے لگے ہمیں معلوم تھا کہ پیٹرکن کے لیے تیرنے سے زیادہ مشکل کوئی کام نہیں۔ لیکن ہم تو اس غار کی اچھی طرح سیر کیے بغیر مطمئن ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کافی بات چیت کے بعد میں نے اور جیک نے طے کیا کہ اگر ہو سکے تو ہم ایک لکڑی غار کے اندر لے چلیں اور اسے جلا کر غار کا جائزہ لیں۔

یہ کام خاصا دشوار تھا۔ لیکن ہم نے کسی نہ کسی طرح اسے کر ہی لیا۔ پہلے تو ہم نے ایک درخت کی چھال کے ٹکڑے بنائے اور انھیں دوسرے درخت کے گوند سے آپس میں جوڑ دیا۔ ان دونوں درختوں کے نام جیک کو بھی معلوم نہ تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس کو ناریل کے اتنے بہت سے ٹکڑوں سے لپیٹ دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ پانی میں گیلا نہ ہوگا۔ پھر ہم نے تھوڑی سی خشک گھاس اور لکڑی کے ننھے ننھے ٹکڑے اور اس کے ساتھ ایک ایسی کمان جس کا ذکر میں اس کتاب کے شروع میں کر چکا ہوں، لے کر۔ انھیں بھی ناریل کے کپڑے میں لپیٹ لیا۔ جب یہ سارا سامان تیار ہو گیا تو ہم نے

پتلونوں کے علاوہ دوسرے تمام کپڑے اتار کر ایک طرف ڈال دیئے۔ پتلونیں ہم نے اس خیال سے چڑھائے رکھیں کہ نہ معلوم چٹانیں زیادہ کھردری ہوں اور ان پر چڑھتے وقت ہم رگڑ سے زخمی ہو جائیں۔

ہم چٹانوں کے کنارے پہنچے۔ جیک کے ہاتھ میں وہ بنڈل تھا جس میں لکڑی تھی اور میرے پاس دوسرا جس میں آگ پیدا کرنے والی چیزیں تھیں۔

"اگر ہمیں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا پیٹرکن" جیک بولا "ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں واپس آجائیں گے خواہ اس غار کے عجائبات کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں۔"

"خدا حافظ" پیٹرکن نے چہرے پر مصنوعی رنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا اور پھر آگے بڑھ کر ہم سے ہاتھ ملایا۔ ہمارے رخساروں کا بوسہ لیا۔

"خدا حافظ!" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "جب تم لوگ چلے جاؤ گے تو میں اس جھاڑی کے سائے میں لیٹ کر اپنی تھکی ٹانگوں کو آرام دوں گا اور انسان کی زندگی میں پیش آنے والے خطرات کے بارے میں سوچوں گا خاص طور سے ایک ملاح لڑکے کی زندگی کے خطرات کے بارے میں!"

یہ کہتے ہوئے پیٹرکن نے ایک بار اور ہاتھ ہلایا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ ایسا کرتے وقت اس نے اپنے چہرہ کو ایسا افسردہ بنا لیا تھا کہ ایک لمحہ کو تو ہم دونوں اسے سچ مچ سمجھے لیکن دوسرے ہی لمحے سمجھ گئے کہ یہ محض اس کی اداکاری اور مسخرہ پن ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم ساتھ ساتھ آگے بڑھے، اچھلے اور سر کے بل پانی کے اندر چلے گئے۔

میں اور جیک بغیر کسی دشواری کے اس زیر آب غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ لہروں سے باہر آکر ہم چند منٹ تک پانی میں کھڑے رہے اور وہ دونوں بنڈل اپنے سروں سے اونچے اٹھائے رہے۔

ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں۔ جب ہمیں کچھ کچھ نظر آنے لگا تو ہم تیر کر ایک چٹان تک پہنچے اور اس پر بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنی پتلونیں نچوڑیں اور جہاں تک ہو سکا اپنے جسم کو بھی خشک کرنے کی کوشش کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے آگ جلانا شروع کی اور بغیر کسی خاص دقت کے اس لکڑی کو جلانے میں کامیاب ہو گئے۔

روشنی غار میں پھیلی تو ہم غار کے عجائبات دیکھ کر دنگ رہ گئے اور خاموشی سے ادھر ادھر تکنے لگے۔ غار کی چھت کوئی دس فٹ اونچی ہوگی لیکن اس کی اونچائی آگے جا کر بڑھتی گئی تھی۔ آگے جا کر یہ مکمل تاریکی میں کھو گئی تھی۔ یہ چھت مونگے کی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور اسی کے بنے ہوئے بڑے بڑے ستونوں کے سہارے ٹکی تھی۔ بھالے کی شکل کے یہ بڑے بڑے عجیب و غریب ستون اس چھت سے لٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ اس طرح کے مونگے سے بنے تھے جو پانی کی کسی دھار کی طرح فرش تک آتا معلوم ہوتا تھا۔ آخر میں آ کر یہ ستون نوکدار ہو گئے تھے اور فرش پر بھی ایسے ڈھیر بنے تھے جن کی نوکیں اوپر کو اٹھی تھیں۔ ان میں سے کچھ نوکیں اوپر ستونوں کی نوکوں سے مل گئی تھیں اور اس طرح ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ستون جو پہلی نظر میں ایسے معلوم ہوتے تھے گویا انسانی ہاتھوں نے انھیں اس غار کی چھت کو سہارا دینے کے لیے بنایا ہو، کیسے بنے ہوں گے۔

ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ غار کا فرش بھی مونگے ہی کا بنا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے خم کھاتی لہریں جو پانی

کی سطح پر اس وقت بن جاتی ہیں جب ہلکی ہوا اس سے اٹھکیلیاں کرتی ہے ۔ دیواروں میں جگہ جگہ سوراخ تھے جو ایسا لگتا تھا کہ دوسرے غاروں میں جانے کے راستے ہیں ۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ دیواروں پر جا بجا ایسے نقوش بنے تھے جیسے وہ کسی چرچ کی دیواریں ہوں ۔ دیواریں اور چھت روشنی میں چمک رہے تھے اور روشنی منعکس بھی کر رہے تھے ۔ ایسا لگتا تھا کہ دیواروں اور چھت پر قیمتی پتھر جڑے ہوں ۔ وہ غار ایسا خوب صورت تھا جیسے روایتی جل پریوں کا محل ۔ غار کی خوبصورتی اور اس کا خواب ناک ماحول جیسے ہم پر جادو کیے دے رہا تھا۔ ہم کافی دور تک چلے گئے لیکن اس عجیب وغریب غار کے دوسرے سرے تک نہیں پہنچ سکے اور پھر ہمیں جلدی ہی تیزی سے واپس ہونا پڑا کیوں کہ ہماری لکڑی اب تقریباً جل چکی تھی ۔ ہمیں چھت میں نہ تو سوراخ نظر آئے نہ کوئی ایسی جگہ جہاں سے روشنی اس غار میں داخل ہو سکتی لیکن اس غار کے منہ کے قریب سفید مونگے کی ایک چٹان کھڑی تھی جو غار میں داخل ہونے والی ہلکی سی روشنی کو بھی منعکس کر دیتی تھی ۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ زردی مائل سبز شے جس نے پہلے پہل ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی ، اسی طرح بنی تھی ۔ ہم نے سوچا کہ یہ اسی چٹان کی روشنی کو منعکس کر دینے والی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہمیں غار کے اگلے حصے میں ہلکی سی روشنی نظر آئی تھی ۔

غار سے نکلنے سے پہلے ہم نے اپنی لکڑی بجھا دی اور اس کے باقی ماندہ ٹکڑے کو ایک خشک جگہ پر رکھ دیا ۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر کبھی اتفاقاً غوطہ لگاتے ہوئے ہماری جلانے کی لکڑی گیلی ہو گئی تو اس وقت یہ خشک لکڑی کام دے گی ۔

اسے بجھانے کے بعد جب ہم چند منٹ کھڑے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک بار پھر ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو ہم نے محسوس کیا کہ غار میں چھائی مکمل خاموشی اور غیر ارضی تاریکی ایک عجیب سا احساس بن کر ہماری روحوں میں داخل ہو رہی ہے ۔

" اچھا رالف تم تیار ہو نا ؟ " ، جیک نے سرگوشی کے انداز میں کہا لیکن اس کی صدائے بازگشت غار میں گونج اٹھی ۔

" بالکل تیار "

" پھر آؤ " اس نے کہا اور چٹان سے پانی میں چھلانگ لگا دی ۔ ہم اس تنگ سی گزرگاہ سے تیر کر نکل آئے ۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم اوپر کی چٹان پر بیٹھے تھے ۔ اور ہمارا دوست پیٹرکن ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا ۔

(پھر کیا ہوا ؟ کیا جیک اور رالف نے موتیوں کے غار کے دوسرے سرے تک پہنچنے کی کوشش کی ؟ کیا پیٹرکن بھی اس کی سیر کر سکا ؟ کیا جیک اور پیٹرکن کشتی بنانے میں کامیاب ہو سکے ؟ یہ اور اسی طرح کے سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے اگست کا پیام تعلیم پڑھیے ۔ اس قسط میں مسخرے پیٹرکن کے ایک عجیب وغریب کارنامے کا دلچسپ حال بھی ہے)

اقوال

★ عورت گھر کی زینت ہی نہیں گھر کی روح بھی ہے ۔
(ارسطو)

★ قناعت بدن کو تازگی بخشتی ہے اور حسد بدن کو گلا دیتا ہے ۔
(حضرت سلیمانؑ)

★ صدق دلی سے سو رہنا اس نماز سے کہیں اچھا ہے جو شک کے ساتھ ادا کی جائے ۔
(حضرت علیؓ)

بڑی چھٹیوں کے بعد

جناب محمد شفیع الدین نیّر

(مدرسہ کھلنے پر)

یہ آرزو تھی اپنی یارب! وہ دن پھر آئیں
چھٹّی کا دَور جائے، پھر مدرسے کو جائیں
خوش ہو کے ساتھیوں سے اپنے ملیں ملائیں
اسکول کا ترانہ، آپس میں مل کے گائیں
توفیقِ علم و حکمت یارب! ہمیں عطا کر

اب ہو گئی ہے پوری یہ آرزو ہماری
قدرت کی یاوری سے قسمت نے کی ہے یاری
الفت سے مل رہے ہیں سب دوست باری باری
ہو گا نئے سرے سے پڑھنے کا شغل جاری
اچھے عمل کی قوّت یارب! ہمیں عطا کر

آؤ خدا سے اپنے یہ مانگ لیں دعائیں
ہم علم میں عمل میں کچھ کام کر دکھائیں
اخلاق اور ادب کی دنیا میں نام پائیں
جھیلیں خوشی سے ساری اس راہ کی بلائیں

محنت کی نیک عادت یارب! ہمیں عطا کر

اس سال میں رہیں ہم علم وہنر میں بڑھ کر
ظاہر ہو جو خدا نے بخشا ہے ہم کو جوہر
بن جائیں ہم گلِ تر، بن جائیں ماہ واختر
کی دل سے ہم نے کوشش، اللہ ہوگا یاور

علم وہنر کی دولت یارب! ہمیں عطا کر

ایتھوپیا کی سرزمین سے

کہانی نمبر ۳

گنہگار خچر

جناب محمد امین ۔ ایم ۔ اے



ایک دن جنگل میں شیر، چیتا، لکڑبگھا اور خچر ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ آپس میں باتیں ہونے لگیں باتوں باتوں میں انھوں نے کہا ان دنوں حالات کتنے خراب ہیں۔ بارش نہ ہونے سے ہر چیز کی قلت بڑھتی جا رہی ہے اور کھانا ملنا محال ہوتا جا رہا ہے کچھ ایسا لگتا ہے کہ قحط پڑے گا۔

باتیں کرتے کرتے وہ بار بار یہی کہتے کہ آخر اس سال اتنے بُرے دن دیکھنے کو کیوں مل رہے ہیں؟۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے کسی نے بڑا گناہ کیا ہے ورنہ قدرت ایسی سزا ہمیں کیوں دیتی۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"پھر کیوں نہ ہم اپنے گناہ کا اعتراف کریں اور توبہ مانگیں۔" دوسرے نے مشورہ دیا۔

یہ تجویز سب کو پسند آئی اور ہر ایک نے باری باری اپنے گناہ بتانے شروع کیے۔ سب سے پہلے شیر نے کہا:۔

"میں نے ایک دن واقعی بڑا زبردست گناہ

گیا۔ ہوا یہ کہ گاؤں کے قریب مجھے ایک بانکا سانڈ مل گیا۔ اسے گھیر گھار کر میں نے دبوچ لیا اور پھر اسے کھا پی کر ہضم کر گیا۔"

دوسرے جانوروں نے شیر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی سے اس سے خوفزدہ تھے۔ انھوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "نہیں، نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی گناہ ہے۔"

اب چیتے کی باری تھی۔ اس نے کہا:

"میں نے ایک بڑا خطرناک گناہ کیا۔ ہوا یہ کہ میں وادی میں چھپا بیٹھا تھا۔ اپنے گلّے سے بھٹک کر ایک بکرا وہاں آ گیا۔ میں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا اور دبوچ کر بہت اطمینان سے اسے میں نے اپنا لقمہ بنایا۔"

دوسروں نے چیتے کی طرف دیکھا۔ شکار کرنے میں جو اُسے کمال حاصل ہے سب پہلے ہی سے اُس کے قایل تھے۔ اس لیے انھوں نے کہا:

"نہیں، نہیں۔ یہ کوئی گناہ نہیں۔"

اب لکڑبگھے کی باری تھی۔ اس نے کہا: "میں نے تو بڑا بے ڈھب گناہ کیا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ چوری چھپے میں گاؤں میں گھس گیا۔ وہاں سے میں نے ایک چوزے کو پکڑا اور اسے لے کر سیدھا بھاگا۔ اس کے بعد میں نے اُسے ڈٹ کر کھایا۔"

جانوروں نے ایک زبان ہو کر کہا: "نہیں، نہیں۔ یہ تو معمولی بات ہے اور کوئی بری حرکت نہیں۔"

آخر میں خچر صاحب نے فرمایا:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرا مالک سیدھی سڑک سے مجھے کہیں لے جا رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک دوست مل گیا۔ اس نے اس سے کچھ باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ باتوں میں معروف تھا تو مجھے موقع مل گیا اور میں سڑک کے کنارے جا کر گھاس چرنے لگا۔

سب نے خچر کو غور سے دیکھا۔ اُس سے نہ تو کوئی ڈرتا تھا۔ نہ اس کا کوئی خاص رعب تھا۔ ایک سکنڈ کے لیے بالکل سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد ایک ساتھ سب نے افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا اور کہا:

"یہ گناہ ہے۔ واقعتاً بڑا زبردست گناہ ہے۔ اب پتہ چلا کہ تمھاری وجہ سے یہ ساری مصیبت ہے۔"

اور اس طرح شیر، چیتے اور لکڑبگھا تینوں اس پر پل پڑے۔ بے چارے کی تکا بوٹی کر کے ہڑپ کر گئے۔

(اگلی کہانی ایک لکڑہارا، آیندہ شمارے میں پیش کی جائے گی)

برسات کی رات

یہ سر شام ابر کی چادر
چاند تاروں کو ڈھانپ جاتی ہے
ابر کی اوٹ سے کہیں تھم کر
برق رہ رہ کے کانپ جاتی ہے

حمید قیصر دھولیہ



جناب شوکت پردیسی



خوداعتمادی
یا
اپنے پر بھروسا

جو راہ کی مشکل سے کنارا نہیں کرتے
مڑ مڑ کے وہ پیچھے کبھی دیکھا نہیں کرتے

رہتی ہے جنھیں دُھن کر رہیں سب سے نمایاں
سورج کے نکلنے پہ وہ سویا نہیں کرتے

مجبوریٔ تقدیر فقط ان کے لیے ہے
تدبیر پہ جو اپنی بھروسا نہیں کرتے

کرتے ہیں زمانے میں بڑا کام وہی لوگ
بیٹھے جو فقط بات کو سوچا نہیں کرتے

وہ جن کی نگاہوں میں ہے دنیا کی ترقی
گذرے ہوئے لمحات کا پیچھا نہیں کرتے

کھیلوں میں بھی ہے اُن کا نہیں کوئی مقابل
پڑھنے میں کبھی جی جو چرایا نہیں کرتے

چہرے پہ کبھی اُن کے اداسی نہیں رہتی
جو وقت کو بیکار گذارا نہیں کرتے

اپنے پہ بھروسا جنھیں رہتا ہے جہاں میں
شوکتؔ! وہ سہاروں کی تمنّا نہیں کرتے

کہانی

جناب ولی تنویر - بی - اے (عثمانیہ)

بادشاہ کی نیّت میں کھوٹ



(ایک پرانی کہانی)

کل ہی کی تو بات ہے۔ انیسہ، فریبہ اور ارشد بابا نے دادی امّاں کو گھیر لیا کہ آج تو کہانی سن کر ہی رہیں گے۔ دادی ماں انھیں دو دن سے ٹال رہی تھیں۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ تینوں بچے گھر ہی پر تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھوں نے دادی اماں کو اُن کا پان دان لاکر دیا اور ارد گرد بیٹھ گئے۔ دادی اماں نے کہا:-

"بچو! دن کے وقت کہانی نہیں سنایا کرتے۔ راہ چلتے مسافر راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ اس لیے میں آج رات کو تمھیں ایک اچھی سی کہانی سناؤں گی۔"

"دادی اماں آپ بھی عجیب ہیں! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اور آپ ہیں کہ پرانی باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتیں، اُن پر عمل بھی کرتی ہیں۔ چھوڑیئے ان باتوں کو، وہ زمانہ گیا جب مسافر راستے بھٹک جاتے تھے۔ یہ تو ریل گاڑیوں، موٹروں، بسوں اور ہوائی جہازوں کا دور ہے کبھی کوئی ہوائی جہاز یا ریل گاڑی اپنے راستے سے نہیں بھٹکتی۔ اب چھوڑیئے اس ٹال مٹول کو اور جلدی سے ایک کہانی سنا دیجیے۔"

انیسہ نے کہا۔ فریبہ اور ارشد نے بھی ان کی تائید کی۔

"بھئی تم لوگ تو نئے زمانے کے ہو پھر مجھ سے پرانے وقتوں کی کہانیوں کی فرمائش کرتے ہو؟" دادی اماں نے کہا

"بات دراصل یہ ہے دادی امّاں! ہم کو ان قصّے کہانیوں سے پُرانے دَور کے لوگوں کے خیالات اور احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کہانیوں سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے دادی امّاں ہم اسکول

ں تاریخ پڑھتے ہیں۔ اس میں کیا ہوتا ہے۔ وہی
انے قصّے کہانیاں!" - فریبہ نے رُکتے ہوئے کہا۔
دادی امّاں ان کہانیوں کی اس مشینی دور میں اوروں
لیے کوئی اہمیت نہ ہو ہمارے لیے تو اُن کی بہت
یادہ اہمیت ہے!!"

"اچھا بابا لو سناتی ہوں!!"

لیکن سن لو! - میں جو کہانی سنا رہی ہوں وہ بہت
رانی ہے۔ میں نے وہ اپنی دادی اماں سے سنی تھی وہ کہا
تی تھیں کہ انھوں نے اپنی دادی اماں سے سنی ہے اور
انہ ان کی دادی ماں نے اپنی دا.....!!"

واہ پھر تو یہ بڑی مزے دار بہت دلچسپ ہو گی!
رشد کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ فریبہ نے اپنا مُنہ اس کے
ن کے قریب لے جاکر آہستہ سے کہا "اب چپ بھی
ر جاؤ۔ بڑی دیر میں دادی اماں راضی ہوئی ہیں اگر تم
حث شروع کردو گے تو پھر یہ معاملہ رات پر ٹل جائیگا
ر پھر رات کو دادی اماں کسی کام کا بہانہ بنا کر کل پر اٹھا
ھیں گی۔" ارشد چپ ہو گیا۔

دادی ماں نے پہلے اپنا پان دان کھولا، گلوری
کر مُنہ میں دبائی اور کہانی شروع کی: "بچّو! یہ بہت
رانی کہانی ہے۔ کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ رعایا
ہت خوش تھی اس سے ہر طرف امن چین، سکون اور
وش حالی تھی، نوکر چاکر کسان اور سپاہی تک سب خوش
ھے۔ اس ملک کی خوش حالی کے دُور دور تک چرچے
ے۔ بادشاہ سے رعایا اور رعایا سے بادشاہ خوش تھا۔
ور بادشاہ کو ہر وقت اپنی رعایا کی فکر رہتی تھی۔

ایک دن بادشاہ تفریح کی غرض سے باہر نکلا۔ اس
ساتھ اس کا وزیر بھی تھا۔ دونوں گھوڑوں پر
سوار شہر سے بہت دور نکل گئے۔ چلتے چلتے جب وہ
ایک باغ کے قریب سے گزر رہے تھے تو بادشاہ کو
پیاس لگی۔ وزیر نے سوچا اس باغ میں پینے کا پانی مل سکتا
ہے۔ دونوں باغ میں داخل ہوئے اور مالی سے پانی
پلانے کو کہا۔

مالی بادشاہ اور وزیر کو پہچان نہ سکا۔ دونوں
شکاریوں کے لباس میں تھے۔ پھر بھی مالی نے انھیں کوئی
بڑا سرکاری افسر سمجھا اور بہت آؤ بھگت کی۔ وہ انھیں اپنے
ساتھ اندر باغ میں لے گیا۔ کمبل بچھایا۔ بادشاہ اور
وزیر کمبل پر بیٹھ گئے تو مالی باغ میں جاکر دو بڑے بڑے
انار توڑ لایا۔ ان اناروں کا رس نکالا اور دو گلاسوں
میں بھر کر دونوں کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو بڑا
تعجب ہوا بھلا اس کے ملک میں ایسے باغ بھی ہیں جن
میں اتنے بہترین پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی انار سے
ایک گلاس رس نکل سکتا ہے۔ اس کا دل خوشی سے پھول
گیا۔

اس نے مالی سے پوچھا "تم سرکار کو سالانہ کتنا
لگان ادا کرتے ہو؟"

مالی نے کہا "حضور ہمارے بادشاہ بڑے نیک
دل ہیں وہ غریبوں کا بڑا خیال کرتے ہیں۔ میں اپنے
اس باغ کا سالانہ لگان صرف دس روپے دیتا ہوں"

"صرف دس روپے! اتنے بڑے باغ کا لگان
صرف دس روپے!" بادشاہ نے تعجب سے کہا۔

"جی ہاں حضور صرف دس روپے۔!"

بات آئی گئی ہوئی۔ بادشاہ اور وزیر وہاں سے
نکل کے چلے آئے۔ راستے میں بادشاہ نے وزیر سے کہا
"ہمیں آج پتہ چلا کہ ہمارے ملک میں بھی اتنے اچھے

باغ میں جن کے ایک انار سے ایک گلاس رس نکل سکتا ہے۔ اور یہ کسان لوگ سرکار کو بہت کم لگان ادا کرتے ہیں۔ ہم شہر پہنچ کر لگان بڑھانے کا اعلان کر دیں گے۔ یہ تو ان لوگوں کی زیادتی ہے کہ خوب کماتے ہیں اور سرکار کو بہت کم لگان دیتے ہیں "

بادشاہ کی اس تجویز پر وزیر خاموش رہا۔

" دادی امّاں۔! یہ "لگان" کیا بلا ہوتی تھی؟" ارشد نے پوچھا۔

" لگان اس رقم کو کہتے ہیں جو کسان سرکار کو سالانہ ادا کرتا ہے"! دادی اماں نے کہا " ارے آپ ٹیکس کیوں نہیں کہتیں۔ یہ لگان لگان کیا کہہ رہی ہیں !"

" اچھا تو پھر آگے ؟ " انیسہ اور فریبہ بہت بے چین نظر آ رہی تھیں !" ہاں تو میں کہہ رہی تھی " دادی ماں نے پان کی پیک اگالدان میں تھوک کر کہنا شروع کیا " اور ہاں میں کر رہی تھی۔ وزیر بادشاہ کی بات پر خاموش رہ گیا۔ جب وہ شکار کھیل کر شہر پہنچے تو بادشاہ نے لگان میں اضافہ کا اعلان کروا دیا اور اس پر سختی سے عمل شروع ہو گیا اس طرح ایک سال بیت گیا۔

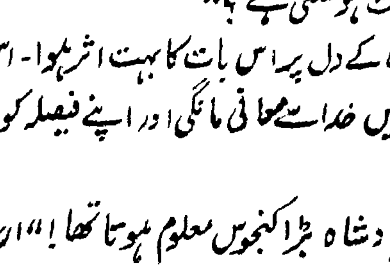
دوسرے سال جب بادشاہ اور وزیر شکار کھیلنے نکلے تو اتفاق سے ان کا گزر اس باغ کی طرف سے ہوا۔ بادشاہ کو پچھلے سال کا واقعہ یاد آیا اور وہ باغ میں داخل ہوئے انھیں دیکھ کر مالی بہت خوش ہوا۔ اور اپنا کمبل بچھایا۔ بادشاہ بیٹھ گئے تو مالی باغ سے انار لانے چلا گیا۔ وہ حسب سابق دو بڑے بڑے انار توڑ لایا اور اُن سے رس نکالنے لگا۔ لیکن اس وقت بادشاہ کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ان اناروں سے پاؤ گلاس بھی رس نہیں نکل سکا۔ مالی پھر باغ میں گیا کچھ اور انار توڑ لایا ان کا رس نکال کر رس بھرے گلاس انھیں پیش کیے۔ بادشاہ پریشان تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ اس نے مالی سے دریافت کیا۔ تم وہی باغبان ہو باغ بھی وہی ہے، انار کے پیڑ بھی وہی ہیں، ہم وہی ہیں پھر اُس دن ایک انار سے ایک گلاس رس نکل آیا تھا آج چار چھ انار بھی گلاس نہ بھر سکے ؟"

مالی نے سنجیدہ لہجے میں کہا " حضور ہمارے بادشاہ کے دل میں کوئی کھوٹ آ گیا ہے۔ انھوں نے اس سال سے لگان بڑھا دیا ہے۔ ہو نہ ہو یہ بادشاہ کی نیت کا اثر ورنہ اور کیا بات ہو سکتی ہے ؟"

" بادشاہ کے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ اس دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگی اور اپنے فیصلہ کو بدل دیا "

" یہ بادشاہ بڑا کنجوس معلوم ہوتا تھا !" ارشد نے کہا۔

" ہاں بیٹا اسی لیے کہتے ہیں نیتیں صاف رکھو ، جب حکومت رعایا کے لیے بُرا سوچتی ہے تو خدا کو بہت بُرا معلوم ہوتا ہے " اور وہ مختلف طریقوں سے اپنا غصہ ظاہر کرنے لگتا ہے۔ ہم کو ہمیشہ خدا سے ڈرنا چاہیے اور اچھے کام کرنے چاہئیں ! ★



مسکراتے چلو

جناب نثار گورکھپوری



ہر روش ہر قدم مسکراتے چلو
حق پرستی کا پرچم اڑاتے چلو
جادۂ[1] زیست کو جگمگاتے چلو
خوابِ غفلت سے سب کو جگاتے چلو
منزلِ شوق میں دندناتے چلو

جستجوئے[2] طلب خواہ دشوار ہو
خواہ گردن تمھاری سرِ دار ہو
خواہ کتنی بھی مشکل ہو، آزار ہو
خواہ کوچہ، گلی خواہ بازار ہو
چار سو حق کی شمعیں جلاتے چلو

علم و حکمت کے سانچے میں ڈھلتے رہو
ٹھوکریں کھا کے گرتے سنبھلتے رہو
مڑ کے پیچھے نہ دیکھو مچلتے رہو
اور آگے بڑھو اور چلتے رہو
خیر و برکت کے موتی لٹاتے چلو

سچ کی شمع سے جگ میں اجالا رہے
سچ کا چاروں طرف بول بالا رہے
سچ سے معمور دل کا شوالہ رہے
سچ نہ بولے جو منھ اس کا کالا رہے
نور ذرا نورِ حق کی بڑھاتے چلو

سکھ ہو، ہندو ہو یا تم مسلمان ہو
تم ہی اپنے چمن کے نگہبان ہو
آدمیت ہے تم میں تم انسان ہو
مشکلوں سے نہ ہرگز پریشان ہو
عزم و ہمت کے جوہر دکھاتے چلو

تم سے روشن ہے امید کی اک کرن
تم سے سیکھے گی الفت کے دنیا چلن
کام کی تم میں ہو گی جو سچی لگن
پھر سے آباد ہو گا یہ ویران چمن
ملک و ملت کے بھی کام آتے چلو

تم پہ سایہ کرے رحمتوں کی گھٹا
تم میں باقی رہے رنگ و بوئے وفا
گونج اٹھے تمھارے سروں سے فضا
ہے نثارِ حزیں کی بس اک التجا
خارِ[3] عصیاں سے دامن بچاتے چلو

---

[1] زندگی کی راہ
[2] یعنی تمھیں جس بات کی جستجو ہے
[3] گناہوں کے کانٹے سے۔

شبراتن چچی

جناب رضی مجیدی



شبراتن چچی کو سارا محلہ جانتا پہچانتا تھا۔ یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوں گی۔ شوہر کو مرے دس سال ہو گئے تھے۔ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں خیر سے گھر والی ہو گئی تھیں۔ ایک جوان بیٹا تھا جو کلکتہ میں کلرکی کرتا تھا اور جو کچھ کماتا تھا وہیں اڑا دیتا تھا۔ وہ تو کہیے شبراتن چچی کی آمدنی اتنی تھی کہ اطمینان سے گزر بسر ہو جاتی تھی کسی کی محتاج نہ تھیں۔

محلے کی سب بوڑھی عورتوں سے اُن کا میل جول تھا۔ جوان بہو بیٹیاں اُن کی عزیز تھیں۔ لیکن وہ بے تکلف سب سے تھیں۔ بلا امتیاز عمر سب سے ہنسی مذاق کرتیں خود خوش رہتیں۔ دوسروں کو خوش رکھتیں۔ ہم بچّوں کو بھی وہ بے حد پیار کرتیں مزے مزے کی کہانیاں سنایا کرتیں۔

ہماری عمر تقریباً سات سال تھی اور مکتب میں پڑھتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب استاد بچّوں کو بار بار نصیحت کرتے تھے۔ "بچّو! چوری کرنے سے خدا ناخوش ہوتا ہے۔

اور سزا دیتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے قیامت کے دن منھ میں سانپ نکلے گا وغیرہ

ماں تو کہنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ہمارے دوستوں نے پلان بنایا کہ ہم سب اپنے اپنے گھر سے چیزیں چوری کرکے لائیں اور شبراتن چچی کے گھر پکا کر کھائیں۔

جمعے کو ہمارا مکتب بند تھا۔ شبراتن چچی سے اپنا پلان بتایا۔ بھلا اُن کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔

منہاج گھی لائے۔ علی آٹا لے آئے۔ سعید گوشت لے آئے اور ہم چاول چوری کر لائے۔ شبراتن چچی نے ہر اک سے پوچھا "کون کیا لایا۔"

کھانا پکا۔ شبراتن چچی نے رہنمائی کی۔ ہم سب نے مِل کر کھانا کھایا۔ کھانا بہت ہی مزے کا پکا تھا شبراتن چچی نے اپنے گھر کا مصالحہ ڈالا تھا اس لیے شبراتن چچی بھی دعوت میں شریک ہوئیں۔

دوسرے دن ہم اپنے کمرے میں بیٹھے، سبق یاد کر رہے تھے کہ شبراتن چچی آئیں امّی سے باتیں کرنے لگیں اور باتوں باتوں میں بولیں " دلہن! تمہارے گھر میں اتنا بڑا تا خوشبودار چاول ہے۔ لیکن تم نے کبھی ذکر بھی نہ کیا۔ کل رضی کے دوستوں نے میرے گھر میں کھانا پکایا تھا۔ رضی چاول لے گئے تھے تب ہی معلوم ہوا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ جلدی میں ہوں" وہ تو اُٹھ کر چلی گئیں اور ہماری چوری پکڑی گئی۔

جب ہم سب مکتب میں ملے تو ہر اک شبراتن چچی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ "ان بڑی بی نے ہم سب کے گھر جا جا کر شکایت کی۔

منہاج بولے "میری ممی سے بڑی بی نے آکر کہا۔ تمہارے گھر میں گھی کہاں سے آتا ہے۔ اتنا خالص اور خوشبودار گھی تو بازار میں ملتا ہی نہیں۔ جب منگوانا تو میرے لیے بھی منگوا دینا۔ کل منہاج کے دوستوں نے ہمارے ہی گھر میں کھانا پکا کر کھایا۔ یہ بچّہ گھی لے گیا تھا تب ہی معلوم ہوا۔ ورنہ میں کیا جانتی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں سارا کام جیوں کا تیوں پڑا ہے"

وہ تو چلی گئیں اور ہماری شامت آگئی۔

علی نے کہنا شروع کیا۔ جانتے ہو میری اماں سے بڑی بی نے کیا کہا۔

"بہو! تم کس چکّی سے آٹا پسواتی ہو۔ کل علی کے دوستوں نے میرے ہی گھر میں کھانا پکایا تھا۔ علی آٹا لے گئے تھے۔ چٹکی لگا کر دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ پان کسی اور دن کھا لوں گی۔ رہنے دو"

بس پوچھو مت۔ ہم پر کیا گذری۔

سعید کو بھی بے حد غصّہ آ رہا تھا۔ بولا۔ ان بڑی بی صاحبہ نے میری ممی سے جا کر کہا "سعید بیٹا کے دوستوں نے ہمارے گھر کل کھانا پکا کر کھایا تھا گوشت سعید بیٹا لایا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں گوشت کی پہچان اب تو میں اسی سے گوشت منگواؤں گی۔ اچھا ذرا جلدی میں ہوں ایک پان تو دے دو" وہ پان کھاتے ہی چلی گئیں اور مجھ سے پوچھ تاچھ شروع ہو گئی۔

میں نے بتایا "ابّا کی جیب سے پیسے چوری کرکے لایا تھا"، پھر تو ہماری وہی حالت ہوئی جو تم لوگوں کی ہوئی۔

ہم سب بے حد خفا تھے۔ چھٹی ہوتے ہی بڑی بی کے پاس پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولیں۔ آؤ بیٹا۔ تم ہی

لوگ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ دیکھ لیتی ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔"

ہم سب چڑ کر بولے۔ "اب ہم لوگ کبھی نہ آئیں گے۔ آپ نے ہماری شکایت کی ہے۔"

بیٹا، گالی مت بکو، قیامت کے دن منھ میں سانپ لٹکے گا۔ شکایت کس کی۔ تم سب تو میرے دل کے ٹکڑے ہو، سوچا کہ تم سب ابھی بچے ہو اور چوری کی عادت اچھی نہیں۔ سلطانہ ڈاکو بھی معمولی سی چوریاں کرکے ڈاکو بن گیا تھا نا!

اس لیے سوچا کہ تم لوگوں کی ذرا تنبیہ ہو جائے تاکہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرو۔ بیٹا چوری سے خدا ناخوش ہوتا ہے اور بڑی بڑی سزائیں دیتا ہے۔

میں چڑ کر بولا۔ "پہلے ہی آپ نے کیوں نہ روکا۔؟

بیٹا! تم لوگوں کا دل کیسے توڑتی۔

ہم سب پاؤں پٹکتے باہر نکل آئے۔ مگر اس دن کے بعد ہمیں پھر کبھی کبھی چوری کرنے کا خیال نہ آیا۔



جناب وقار خلیل

منّے کی آنکھیں

شام اپنے آنچل میں — چاند تاروں کی جگمگاہٹیں لے کر
پھول کھِلم کرتی۔ ہلکے ہلکے چپکے سے — روز میرے منّے کا پالنا ہلاتی ہے

گال تھپ تھپاتی ہے لوریاں سناتی ہے

اور میرے منّے کی مسکراتی آنکھوں میں — ڈوب ڈوب جاتی ہے
ایک شام منّے نے مجھے جاگتا پاکر — رات آنکھوں میں خود بھی جاگنے کا ٹھانی
صبح اس کی آنکھوں میں پیار کی تھکن دیکھی — اک نئی لگن دیکھی، نور کی کرن دیکھی

جناب حافظ باقوی

اُردو زباں ہماری



کیسی ہے پیاری پیاری اُردو زباں ہماری
پھولوں کی جیسے کیاری اُردو زباں ہماری
پھولے پھلے ہمیشہ باغِ جہاں میں یارب!
ہو ہر زباں پہ جاری اُردو زباں ہماری
بھارت ہے اس کا مسکن بھارت ہے اس کا گلشن
بھارت کی ہے دُلاری اُردو زباں ہماری
سارے جہاں میں اس کا ہے خوب بول بالا
کرتی ہے حمدِ باری، اُردو زباں ہماری
جھڑتے ہیں پھول مُنہ سے گھلتا ہے رس فضا میں
جب ہو زباں پہ جاری، اردو زباں ہماری
یہ زندہ باد یارب! پائندہ باد یارب
اُردو زباں ہماری، اُردو زباں ہماری
ہوتا ہے اس کا شیدا، ہر دلعزیز جگ میں
حافظ ہے فضلِ باری، اُردو زباں ہماری

جناب حسین حسّان ندوی

اُونٹ کی پیٹھ پر کُب؟



یہ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے جنگل کے بیچوں بیچ ایک صاف ستھرے کھلے میدان میں دربار لگا تھا ۔ بڑا شان دار دربار تھا یہ ۔ کیا پرندے کیا چرندے، کیا درندے ، سب دربار میں حاضر تھے۔ بادشاہ سلامت پوری شان سے ایک بڑے پتھر پر تشریف رکھتے تھے۔ آج بادشاہ کا جنم دن تھا اس لیے دربار میں ہر ایک کو اپنی نذر پیش کرنا تھی ۔ بادشاہ سلامت نے شاہانہ دبدبے کے ساتھ غرا کر پوچھا " کیا سب اپنی اپنی نذریں لائے ہیں ؟"



وزیر اعظم جلالت مآب ہاتھی نے اپنے بڑے بڑے کان ہلا کر کہا ، " میری آنکھیں میرے دماغ کے مقابلے میں کمزور ہیں ، اس لیے سپہ سالار چیتے صاحب اس کام کو انجام دیں ۔"

چیتے صاحب نے حکم کی تعمیل کی ۔ دربار میں کرنل ریچھ صاحب موجود تھے ۔ کیپٹن بھیڑیئے صاحب بھی تھے ۔ لمبی گردن والا جاسوس یعنی زرافہ بھی تھا ۔ جاسوسوں کی افسر بی لومڑی بھی تھیں ۔ میاں خرگوش بھی تھے ۔ بی گلہری بھی نظر آرہی تھیں ۔ سب اپنی اپنی نذر پیش کر رہے تھے ۔ بڑے جانوروں نے اپنے شکار کا کچھ حصہ پیش کیا ، چھوٹے جانوروں میں خرگوش نے ایک خوب پکی ہوئی ناشپاتی اور بی گلہری نے مٹھی بھر اخروٹ پیش کیے ۔ یہ سب وزیر خزانہ دریائی گھوڑے صاحب کے پاس جمع کیے گیے ۔

بادشاہ سلامت پھر غرّائے "وقت مت ضائع کرو۔ مابدولت کو بہت کام ہیں۔"

سپہ سالار چیتے صاحب نے جلدی جلدی جانوروں کی فہرست تیار کرکے عرض کیا "بادشاہ سلامت، میں دربار کے تمام جانوروں کو اعلیٰ حضرت کا وفادار پاتا ہوں اور مجھے اس بات کا اظہار کرنے میں بڑی خوشی ہے کہ میرے دبدبے اور طاقت کی بدولت حضور کی بادشاہت کا انتظام بالکل چوکس ہے۔ مگر ــــ مگر چوپایوں کی نسل کا ایک فرد مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔"

"وہ کون بے وقوف ہے؟" وزیرِ اعظم نے چنگھاڑ کر کہا۔ "میرا خیال ہے وہ ــــ کتّا ہے۔ میں اس پر غداری کا جرم عائد کرتا ہوں۔ وہ اب انسان کا دوست بن گیا ہے۔"

دربار میں ایک شور مچ گیا۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "غدار ہے، غدار ہے۔"

مگر سپہ سالار نے درباریوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا "نہیں نہیں میں کتّے کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ کچھ جنگلی کتے تو یہاں موجود ہیں۔ ہاں اونٹ نہیں ہے۔"



شاہی آواز پھر گونجی۔ "کیا کہا اونٹ؟ جاؤ اسے تلاش کرو اور جہاں ملے پکڑ لاؤ۔ میں اس غدار کا خون پیتا ہوں اور گوشت کھاتا ہوں!"

بادشاہ سلامت کو بہت غصہ آگیا تھا اور ان کی دہاڑ سے سارا جنگل گونج رہا تھا۔ شاہی حکم ملتے ہی کئی ٹولیاں چاروں طرف اونٹ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔

اُدھر اونٹ صاحب کا حال سنیے۔ وہ ایک گھنیرے پیڑ کے سائے میں آرام فرما رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا سے پتوں کی سرسراہٹ نے اور جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے کچھ سرور کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور آپ اُونگھ رہے تھے۔

درخت کے پاس ہی ایک پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی سامنے کے گاؤں کو جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی پر ایک کبڑی بڑھیا پیٹھ پر ایندھن کا گٹھا لادے ہانپتی کانپتی چلی آرہی تھی۔ وہ اونٹ کو اس طرح آرام سے بیٹھا دیکھ کر بولی "کیوں بیٹا، میرا ذرا سا کام کر دو گے؟ مجھ دکھیا سے یہ بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ ذرا تم اسے میرے گھر تک پہنچا دیتے!"

بڑی بی نے یہ بات ایک بار نہیں تین بار کہی، تب کہیں اونٹ صاحب نے بڑی بے رخی سے جواب دیا "دیکھتی نہیں ہو، میں اس وقت آرام کر رہا ہوں، جاؤ اپنا راستہ لو!"

بڑی بی نے کہا "ہاں ہاں تم آرام کر رہے ہو، پر ذرا مجھے تو دیکھو کیسی پسینہ میں نہائی ہوئی ہوں۔ یہاں آگے پیچھے تمہارے سوا کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا۔ مجھے یہ گٹھا گھر لے جانا ہے۔ میرے بچے بھوک سے بے قرار ہوں گے اس گٹھے کو بیچ کر ان کے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔ کیا تمہیں ایسے موقع پر میری مدد نہیں کرنی چاہیے؟"



مگر اونٹ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ بیٹھے بیٹھے بڑے زور سے بڑبڑانے لگے،

یں دور ہو جیٹر یل۔ بڑی آئی اینڈھن کا گٹھا لے سے ہونہہ!"

بڑی بی نے نا اُمید ہو کر گٹھا اپنی پیٹھ پر لادا اور اونٹ کی طرف دیکھ کر بولیں، "اے ہے کیسا بے رحم جانور ہے۔ اللہ کرے میری طرح اس کی پیٹھ پر بھی بڑا سا کُب نکل آئے!"

نہ جانے اس دکھیاری بڑھیا کی دعا قبول ہو گئی یا کیا بات ہوئی کہ اونٹ صاحب کی پیٹھ پر سوجن چڑھنا شروع ہوئی اور سوجتے سوجتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک بے ڈھنگے قسم کا بڑا سا کُب اُوپر اُٹھ آیا۔

اور ابھی انھیں کچھ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ شاہی حکم سے جو ٹولیاں انھیں تلاش کرنے نکلی تھیں، ان میں سے ایک اِدھر آنکلی اس نے انھیں ڈھونڈ نکالا اور گرفتار کر کے بادشاہ سلامت کے حضور میں پیش کیا۔

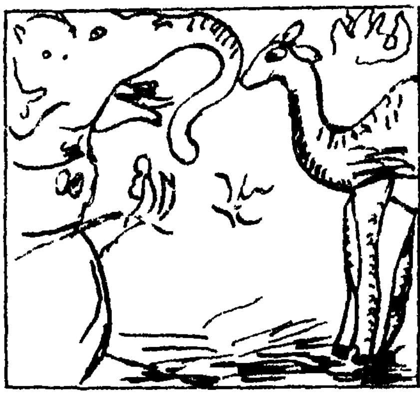
بادشاہ سلامت اُسے پہچان نہ سکے اور وہیں تخت سے دہاڑ کر بولے "ارے یہ کیا جانور ہے اسے تم کہاں سے پکڑ لائے؟"

سپہ سالار چیتے صاحب نے ادب سے عرض کیا "جہاں پناہ شکل تو اس کی اُونٹ کی سی معلوم ہوتی ہے!"

بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "کیا ہم نے اِسے مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا ہے؟"

سپہ سالار نے جواب دیا "جی ہاں جہاں پناہ دیا ہے" اور دانت تیز کرتے ہوئے اونٹ کی طرف لپکے مگر وزیر اعظم ہاتھی صاحب نے فوراً مداخلت کی اور پوری آواز سے چنگھاڑ کر بولے "ذرا ٹھیرو!" اور

پھر بادشاہ سلامت کی خدمت میں عرض کیا "جہاں پناہ! ہم نے اونٹ کی پیٹھ پر کُب آج تک نہیں دیکھا ہے، یہ اونٹ ہرگز نہیں ہے بلکہ اس جنگل سے باہر کا کوئی اجنبی جانور ہے۔ میں اس جنگل کے قانون کا اور بادشاہ سلامت کے نیک نام کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ اس کی جان بخشی کی جائے!"



بادشاہ سلامت کو اپنے وزیر کا یہ مشورہ بہت بھایا اور ایک بڑی سی ہڈی چباتے ہوئے فرمان جاری کیا۔ "اس کم بخت کو ریگستان کی طرف بھگا دو!"

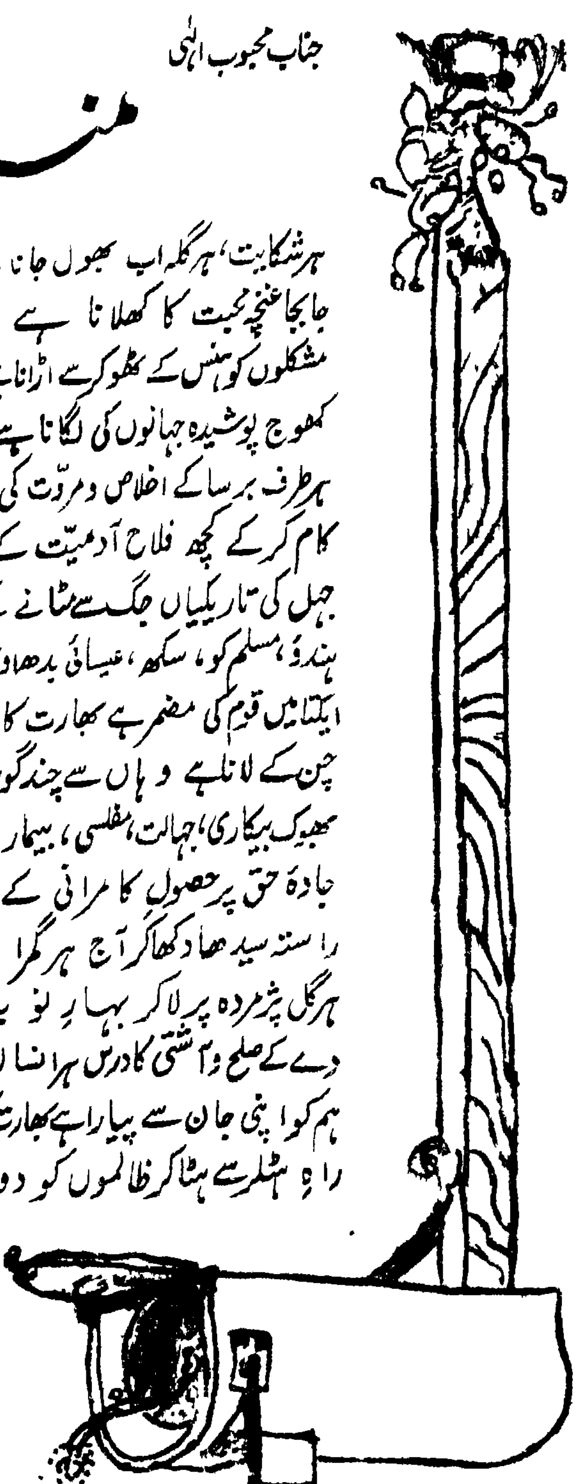
سپہ سالار کو بادشاہ سلامت کا یہ فرمان بہت کھلا، مگر سرتابی یا حکم عدولی کیسے کر سکتے تھے۔

اونٹ صاحب کی جان بال بال بچی اور انھیں بہ خیریت تمام ریگستان پہنچا دیا گیا۔ اب یہی ان کا وطن ہے۔ انھیں اپنی پچھلی حماقت اب تک یاد ہے اور اب کوئی بھی ان کی پیٹھ پر چاہے کتنا ہی بوجھ لادے، یہ برا نہیں مانتے۔

* * *

جناب محبوب الٰہی

منزلِ مقصود



ہر شکایت، ہر گلہ اب بھول جانا ہے ہمیں
بڑھ کے آگے، سب کو سینے سے لگانا ہے ہمیں

جا بجا غنچۂ محبت کا کھلانا ہے ہمیں
ہند کو ایک پیار کی جنت بنانا ہے ہمیں

مشکلوں کو ہنس کے ٹھوکر سے اڑانا ہے ہمیں
آندھیاں کتنی ہی ٹوٹیں، مسکرانا ہے ہمیں

کھوج پوشیدہ جہانوں کی لگانا ہے ہمیں
یعنی نا ممکن کو ممکن کر دکھانا ہے ہمیں

ہر طرف برسا کے اخلاص و مروّت کی پھوار
نفرتوں کی آگ ہر دل سے بجھانا ہے ہمیں

کام کر کے کچھ فلاحِ آدمیت کے لیے
دوستو کچھ نام دنیا میں کمانا ہے ہمیں

جہل کی تاریکیاں جگ سے مٹانے کے لیے
علم کا خورشید بن کر جگمگانا ہے ہمیں

ہندو، مسلم کو، سکھ، عیسائی بدھ اور جین کو
بھائی بننے کا سبق سب کو پڑھانا ہے ہمیں

ایکتا میں قوم کی مضمر ہے بھارت کا وجود
قوم کے ذہنوں میں یہ نکتہ بٹھانا ہے ہمیں

چن کے لانا ہے وہاں سے چند گوہر آبدار
بحر علم و آگہی میں ڈوب جانا ہے ہمیں

بھوک، بیکاری، جہالت، مفلسی، بیماریاں
صفحۂ ہستی سے ان سب کو مٹانا ہے ہمیں

جادۂ حق پر حصولِ کامرانی کے لیے
جذبۂ دل کو بروئے کار لانا ہے ہمیں

راستہ سیدھا دکھا کر آج ہر گمراہ کو
قعر[۵] گمراہی میں گرنے سے بچانا ہے ہمیں

ہر گلِ پژمردہ پر لا کر بہارِ نو بہ نو
دامنِ گیتی کو پھولوں سے سجانا ہے ہمیں

دے کے صلح و آشتی کا درس ہر انساں کو
جنگ کے شعلوں سے دنیا کو بچانا ہے ہمیں

ہم کو اپنی جان سے پیارا ہے بھارت کا وقار
سر کو اپنے دیش کی خاطر کٹانا ہے ہمیں

راہِ ہٹلر سے ہٹا کر ظالموں کو دوستو
گاندھی اور نہرو کے رستے پر چلانا ہے ہمیں

غم کی چٹانوں سے راہی لاکھ ٹکرانا پڑے
خواہ کچھ ہو، منزلِ مقصود پانا ہے ہمیں

★

۵ قعر - گڑھا

مالوی لوک کہانی

مناظر عاشق ہرگانوی

مغرور گیدڑ

ایک گیدڑ تھا۔ بڑا مغرور اور بڑا ہی شیطان۔ بہتوں کو اس نے ستایا تھا اور ان کی بددعائیں لی تھیں۔

ایک دن اس نے کھٹا انگور کھایا۔ جب اس کے دانت کھٹے ہو گئے تو وہ آگے بڑھ گیا۔

راستے میں املی کے پیڑ کے نیچے اس نے بہت ساری املیاں پڑی دیکھیں۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ املی کھانے لگا۔ اس کے دانت اور کھٹے ہو گئے۔

اور آگے بڑھنے پر ایک جگہ شہد کا چھتہ لٹکا ہوا نظر آیا۔ اس کا جی للچایا اور اس نے جیسے ہی کھانے کے لیے چھتے پر منہ مارا شہد کی مکھیاں اسے لپٹ پڑیں۔

وہ درد سے کراہتا ہوا بھاگا۔ دو چار مکھیاں اب بھی اس کی ناک سے چپکی ہوئی اسے ڈس رہی تھیں۔ سامنے مٹی کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ وہ اسی میں ناک رگڑنے لگا۔ مٹی کے اس ڈھیر میں ایک بچھو رہتا تھا۔ جیسے ہی گیدڑ نے ناک رگڑی۔ بچھو نے ڈنک مار دیا درد سے گیدڑ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بیٹھا تھا وہاں سے بھاگا۔ آگے بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ وہ اس پتھر سے ٹکرا گیا تو اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

دوسری سمت سے ایک دوسرا گیدڑ چلا آ رہا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اس نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

وہ بڑے دکھ سے بولا: "کسی کی بددعا مت لینا۔ بددعا لے کر بھی کسی کو ستانا مت۔ اکٹر میں انگور چوس لینا مگر شہد مت کھانا۔ شہد جو کھا لیا تو ناک مت رگڑنا، ورنہ بچھو کاٹ کھائے گا۔ بچھو کاٹے گا تو آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اور آنکھیں بند ہو گئیں تو بھاگنا مت۔ نہیں تو سر پھٹ جائے گا۔ آہ!" اور وہ گیدڑ بلک بلک کر رونے لگا۔

★★

دریا کی روانی

نیند میں مست ہے سارا عالم
دریا لیکن جاگ رہا ہے
ایسے رواں ہے پانی اس کا
ریت پہ جیسے بھاگ رہا ہے

حمید قیصر دھولیہ

جناب ناظم میواتی سہسرامی

وطن کے عزیزوں سے

قفس[1] کو گلستاں بنا کر دکھا دو
بہار اپنے گلشن میں لا کر دکھا دو

اٹھو، سینچو آنسو سے تنکے قفس کے
کلی تیلیوں میں کھلا کر دکھا دو

لگی آگ نفرت کی سارے چمن میں
اسے چشمِ تر سے بجھا کر دکھا دو

ذرا حسنِ احساس سے خود سنور کر
ہر اک خار[2] کو گل[3] بنا کر دکھا دو

محبت کے پھولوں کی رنگینیوں سے
وطن کے چمن کو سجا کر دکھا دو

ہے پیاسوں کے ہونٹوں پہ صدیوں[4] کی تشنگی
شرابِ محبت پلا کر دکھا دو

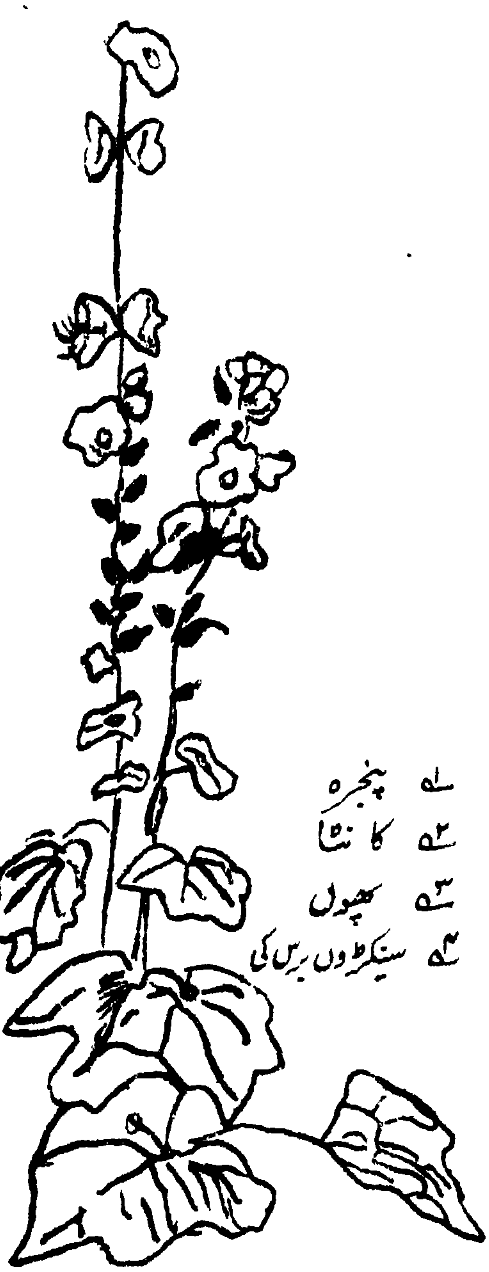
طلسمِ فرنگی سے جھگڑا ہے گھر میں
محبت کا جادو جگا کر دکھا دو

وطن سے ہو تم اور تم سے وطن ہے
نظیر اس کی خود کو بنا کر دکھا دو

جہاں عظمتِ ہند کو ہو ضرورت
وہاں خون اپنا بہا کر دکھا دو

وطن کے لیے مال و زر کیا؟ جوانو!
جوانی بھی اپنی مٹا کر دکھا دو

کھنڈر ہی سہی گھر یہ اپنا ہے ناظم
اسے رشکِ جنت بنا کر دکھا دو



[1] پنجرہ
[2] کانٹا
[3] پھول
[4] سینکڑوں برس کی

کتابوں کی باتیں

ہاکی کھیل: مصنف : جناب سرویندر پال سانیال۔
اُردو میں ترجمہ کرنے والے : جناب پریتم لال۔
سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۴۴ صفحے۔
لکھائی چھپائی آفسیٹ کی دو رنگی تصویریں تقریباً ہر صفحے پہ۔ ٹائٹل بہت خوبصورت، کئی رنگ کا۔
ناشر یا چھاپنے والے نیشنل بک ٹرسٹ
قیمت ۱/۵۰
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ہاکی، فٹ بال، کرکیٹ ہمارے دیس کے لیے نسبتاً نئے کھیل ہیں ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت ان کا رواج ہوا۔ اور اب ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسکول کالج یا تعلیمی ادارہ ہو جہاں ان کا رواج نہ ہو۔

محترم مصنف نے یہ کتاب لڑکوں کے لیے لکھی ہے۔ لیکن تحقیق اور جستجو کا حق ادا کردیا ہے۔ سراغ لگاتے لگاتے دو ہزار قبل مسیح تک پہنچ گئے ہیں۔ یعنی ہاکی کا کھیل چار ہزار سال پرانا ہے۔ پھر یہ کن کن ملکوں میں کن کن ناموں سے مشہور تھا۔ اور کہاں کہاں کس حد تک اس نے ترقی کی یہ سب باتیں بڑی خوبصورتی بہت اختصار کے ساتھ لکھی ہیں۔ ہندوستان میں کس طرح ہاکی نے رواج پایا۔ کس طرح رفتہ رفتہ یہ کھیل آگے بڑھا۔ بچوں اور بڑوں میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ یہ سب باتیں ذرا تفصیل سے لکھی ہیں۔ ہندوستانی کھلاڑیوں میں دھیان چند اور دوسرے اہم اور اولمپک کھلاڑیوں کا ذکر ہے۔ اولمپک کھیلوں میں ہندوستان کی فتح و شکست کی تفصیل ہے۔ غرض ۴۴ صفحوں کی اس مختصر سی کتاب میں لائق مصنف نے کوزے میں دریا بند کردیا ہے۔ خوش قسمتی سے مصنف کو اپنے دعووں کے ثبوت میں پرانی سے پرانی تصویریں مل گئی ہیں ن تصویروں نے کتاب کو اور بھی مفید، کارآمد اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ قریب قریب ہر تصویر دو رنگوں میں ہے۔ غرض یہ چھوٹی سی کتاب لڑکوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے ایک نئی چیز ہے۔ جہاں تک ظاہری خوش نمائی اور گیٹ اپ کا تعلق ہے نیشنل بک ٹرسٹ کا نام کافی ہے۔

البتہ ترجمے کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے بڑی جھجک سی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ محترم مترجم صاحب نے ترجمہ کرتے وقت غالباً یہ بات ذہن میں نہیں رکھی کہ کتاب بچوں کے لیے لکھی جارہی ہے۔ یا شاید کم فرصتی کے سبب انھیں مسودے پر نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

بچوں کی کتابوں کی زبان بہت آسان، سادہ اور آسان ہونی چاہیے۔ لمبے لمبے جملے مشکل اور ثقیل لفظ پڑھنے والے میں خاص کر بچوں میں جلد بے زاری اور اکتاہٹ پیدا کردیتے ہیں۔

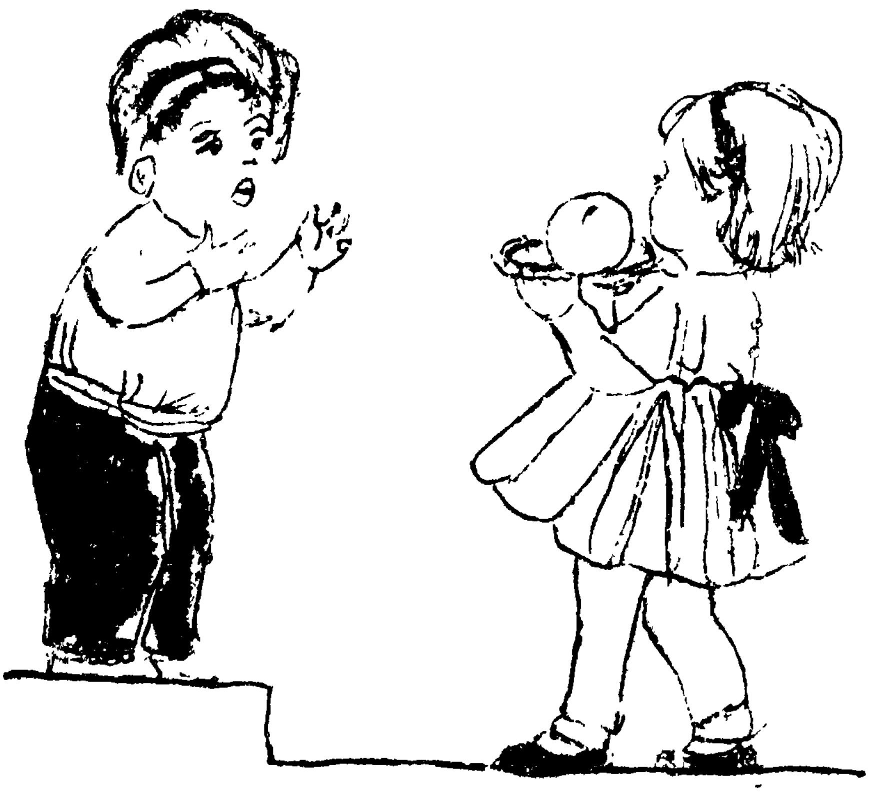
●●



گڑیا

جناب شاغل ادیب ایم۔ اے

میری اچھی پیاری گڑیا
میری راج دلاری گڑیا
آ تجھ کو مکتب لے جاؤں
لکھنا اور پڑھنا سکھلاؤں
دھیان لگا کر پڑھنا لکھنا
پڑھنا لکھنا آگے بڑھنا
پھر دولہا اک ڈھونڈ نکالوں
دھوم سے تیری شادی کر دوں
ناچ اٹھے گا تیرا تن من
ناچ اٹھے گی دھڑکن دھڑکن
راج کرے گی پیاری گڑیا
پوری ہو گی میری آشا



بھارت ایک مرقع ہے رسموں اور رواجوں کا،
مذہبوں کا، روایتوں اور جدتوں کا،
تہذیبوں کا، آدرشوں اور اُمنگوں کا،
زبانوں اور پہناووں کا، کاوشوں اور کامیابیوں کا۔



بھارت ایک گلدستہ ہے
جس میں آراستہ
بھانت بھانت کے پھول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دلوں کو لبھاتے ہیں،
دماغوں کو معطر بناتے ہیں۔

davp 73/125

آدھی ملاقات

جناب۔ اس۔ یو، ملا۔ ام۔ اے۔ بی ٹی ہیڈ ماسٹر انجمن ہائی اسکول بال کوٹ (ضلع بیجاپور) اپنے ایک خط میں پیام تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"واقعی پیام تعلیم اسم بامسمیٰ رسالہ ہے۔ میری نظر میں یہ واحد رسالہ ہے جو تعلیم کا پیام پہنچاتا ہے۔"

محترم ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اُردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب گاہے بگاہے پیام تعلیم پر بھی نظر التفات فرماتے ہیں۔ نیچے کا خط اس کا گواہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خط میں رشید حسن خاں صاحب کے ایک مضمون کو دیکھ کر اپنی قیمتی رائے سے نوازا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اردو املا پر مضمونوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اب تک سات آٹھ قسطیں شایع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے اس کی صرف دوسری قسط گزری ہے۔ جن لوگوں نے ان قسطوں کو پابندی اور غور سے پڑھا ہے۔ انھوں نے عموماً ان مضامین کی تعریف کی ہے۔ خاص کر اسکولوں کے اُستادوں نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور کوئی عجب نہیں جو ڈاکٹر صاحب بھی اس پورے سلسلۂ مضامین کو پڑھ کر اپنی رائے تبدیل فرمالیں۔

(اڈیٹر)

پیام تعلیم میں اُردو املا پر رشید حسن خاں صاحب کی دوسری قسط پڑھی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اس طرح کے مضامین کیسے شایع کر رہے ہیں۔ حضرت اس املا کے ماننے والے پورے ہندوستان اور پاکستان میں دو سو اور ڈھائی سو آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اوروں کو تو چھوڑیے۔ خود پیام تعلیم املا کے ان اصولوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ بچّے کتابوں میں کوئی اور املا پڑھتے ہیں آپ انھیں کچھ اور سکھلاتے ہیں۔ کیا یہ بچّوں کے لیے پریشان کن نہیں ہے۔ میں اس جدید املا کا قطعی مخالف ہوں۔ لیکن اگر پوری اُردو دنیا اسے تسلیم کرے اور استعمال کرنے لگے۔ تو مخالفت کے باوجود میں بھی جدید املا استعمال کروں گا۔ دنیا کی ہر زبان اور اس کی املا کا صرف ایک اصول ہے اور وہ ہے چلن یا رواج۔ باقی سب غلط۔ مختصر یہ کہ ہمیں بے چارے بچّوں کے ذہنوں کو (CONFUSION) (اُلجھن) کا شکار نہیں کرنا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری اس گزارش پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

خلیق انجم

پرچہ ہمیشہ کی طرح وقت پر مل گیا۔ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ ان کی کتاب کب تک آجائے گی۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے ضرور بھیجیے گا۔ ان کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوا

ہم لوگوں نے خود ہی اُردو کو مشکل کر لیا ہے۔ ورنہ ہماری زبان کتنی آسان زبان ہے۔

ذاکر صاحب پر مضمون "ذاکر صاحب اور بچے" خوب ہے۔ البتہ شفیع الدین نیّر صاحب کی رباعیات اور محمد ایوب واقف صاحب کی نظم سمجھنے میں بچوں کو دشواری ہوگی۔ کہانیاں مزیدار ہیں۔

بچوں کی چونکہ ان مہینوں میں چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس عرصے میں اگر پیام تعلیم کا کوئی خاص نمبر نکلتا تو ان کی دلچسپی کا سامان ہو جاتا۔ ویسے پیام تعلیم کے عام پرچے بھی خاص نمبر سے کوئی کم ہوتے ہیں!

رؤف خیر حیدرآباد

کل ایک خریدار زعفران احمد خاں متعلم درجہ یازدہم آر، آر ہائی اسکول گوونڈی کا چندہ مکتبہ کے نام بھیج دیا۔ یہ بھی اتفاق ہی کی بات ہے کہ مولوی غلام محمد ہیڈ مولوی اسکول مذکورہ کی موجودگی میں مئی کا پرچہ آیا۔ اور انھوں نے "دعا" دیکھ کر خریداری قبول کرلی۔

مئی کے پرچے میں میری "دعا" کی اشاعت کا شکریہ۔ نیّر صاحب کا کیا کہنا وہ تو اُردو میں بچوں کے ادب میں امام کا مرتبہ رکھتے ہیں"۔ کیا کہنا "آیا چھٹی آئی" کا۔ پھر محترم ڈاکٹر مرحوم پر ان کی نظم کے علاوہ دوسری چیزیں بھی بچوں کے لیے درس آموز ہیں۔

"حرفوں کا جادو" بڑی مفید تحریر ہے۔ آج کے بچوں کو آنکھ کان ہو جائے تو کل کے بوڑھے بھی سنور رہے رہیں۔ موصوف کا یہ کارنامہ قابل مبارکباد ہے۔ ان ان لوگوں کی اصلاح کہاں تک ہوسکے گی۔ جن لوگوں نے مصرعوں کے حوالے بھی جناب رشید حسن خاں صاحب کے اصول کے خلاف صحیح سمجھ کر پڑھے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ عقل و دانش اور سمجھ سے کام لیا جائے گا۔ تو محترم خاں صاحب کی رائے ماننی ہی ہوگی۔ پیاسیوں کی اصلاح ہوگئی تو نیا سماج سدھر جائے گا۔

ناظم سیواتی۔ آر آر سکنڈری اسکول

اور آپ کا پیام تعلیم بھی۔ بہت ہی دلچسپ رسالہ ہے۔ اس سلسلے میں میں نے بچوں سے چھیاسٹھ روپے جمع کیے ہیں۔ یہ منی آرڈر سے بھیجے جا رہے ہیں۔

م۔ نور محمد۔ استاد بسکول اسکول بسری نگر۔

"پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بے حد پسند آیا۔ تازہ شمارہ کی سبھی کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ لیکن خاص طور پر جناب خواجہ محمد معین الدین کی تخلیق "میں بہت ذہین لڑکا تھا" جناب اکرام احمد کا معلوماتی مضمون "کوپرنکس" بہت پسند آیا۔ جناب حافظ باقوی کی نظم "بچے کا ارادہ" اور جناب رؤف خیر کی کی نظم "باہر دھوپ ہے" بھی بے حد پسند آئی۔ غرض شمارہ ہر طرح سے لاجواب ہے۔ اتنا بہترین مواد پیش کرنے کے لیے میں آپ کی ہمتوں کو سراہتا ہوں اور مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محمد فاضل کھتری۔ بمبئی ۳

"جون کا پیام تعلیم پڑھ لیا ہے۔ ٹائیٹل واقعی آپ کی تعریف سے بڑھ کر پایا۔ قیصر سرمست صاحب کو شکریہ اور مبارکباد پہنچا، امید ہے کہ آئندہ بھی وہ کرم فرمائی کرتے رہیں گے۔ کہانیاں، نظمیں اور مضامین سبھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ اس مرتبہ پیام تعلیم کا افادی پہلو بڑھا ہوا ہے۔ کہانیاں بھی معلوماتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

خلیق انجم اشرفی

اِدھر اُدھر سے

دھوکا دینے کا انوکھا طریقہ

اس آزاد بھارت میں لوگوں کو دھوکا دینے کے بے وقوف بنا کر ٹھگنے کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ پر ہم آپ کو یک انوکھی خبر سناتے ہیں۔ یہ خبر جیون نائر صاحب نے ہندوستان ٹائمز میں شایع کی ہے۔ ذہانت اور دلیری کا شاہ کار۔

ہوا یہ کہ دوپہر کو لنچ کے وقت لوگ اپنے دفتروں سے نکلے۔ تو وہ ایک ٹرک کو دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے۔ یہ ہارڈنگ سرائے (چمسفورڈ روڈ) کی بات ہے۔ یہ ٹرک دو کلو کے بناسپتی گھی کے سربند ڈبوں سے نیچے سے اوپر تک بالب بھرا ہوا تھا۔ ٹرک میں ڈرائیور کے پاس دو نوجوان سجن (آدمی) بیٹھے تھے۔ ٹرک کے رکتے ہی یہ چلک کر ٹرک کے اوپر گیے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر کہنا شروع کیا۔ بھائیو سرکار کو شکایتیں پہنچی ہیں کہ دکان داروں نے بناسپتی گھی بلیک میں منھ مانگے داموں بیچنے کے لیے غائب کر دیا ہے۔ اس لیے سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ بناسپتی گھی کنٹرول قیمت پر خود گاہکوں تک پہنچائے۔

اتنا سننا تھا کہ ٹرک کے چاروں طرف بھیڑ جمع ہو گئی اور کبھی زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں "سارا مال" بک گیا۔ اور ٹرک خالی ہوتے ہی چل پڑا اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اب ادھر کی سنیے۔ گاہک بغلیں بجاتے مونچھوں پر تاؤ دیتے سیدھے گھر پہنچے۔ گھر کے لوگ بھی اس آسانی سے اچانک دو کلو گھی مل جانے پر کیا کچھ خوش نہ تھے۔ جلدی جلدی سربمہر ڈبوں کو کھولا گیا مگر —— مگر ان میں تو خالص گھی کی جگہ خالص پانی تھا۔ خریدنے والے بھائیوں پر کیا گزری! کیا کیجیے گا پوچھ کر!!

ہاں ٹرک والوں کے گھنٹے آدھ گھنٹے میں وارے نیارے ہو گئے۔ (ہندوستان ٹائمس)

ازبکستان میں کشن عہد کی چیزیں کھود کر نکالی گئیں

وادی سرخانہ (ازبکستان) کے "دلورزن ٹےپے" علاقے میں آثار قدیمہ کے ماہروں نے کمہار کا بنایا ہوا ایک جگ کھود کر نکالا ہے۔ یہ جگ قیمتی سامان سے بھرا ہوا ہے۔ تقریباً سو چیزیں ہیں۔ مثلاً سونے کے سکّے۔ ربابیاں۔ کنگن، گلوبند وغیرہ وغیرہ

یہ سارا خزانہ ازبک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اِلیج میں لایا گیا ہے۔ اور اس کی قیمت لگ بھگ دس لاکھ روبل (روسی سکہ) لگائی گئی ہے۔ مگر اس کی تاریخی قیمت کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ یہ سب چیزیں کشن عہد کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ میں مدد دیں گی۔

آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے اسی علاقے میں اور بھی اہم اور دلچسپ چیزوں کا پتہ لگایا ہے۔ مثلاً غار نوں کے بلاک جو کمہاروں کے لیے تھے۔ کشن آرٹ کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں وغیرہ۔

عجیب درخت

کیوبا میں ایک درخت پایا جاتا ہے جسے زلزلہ کا درخت کہتے ہیں۔ کیونکہ زلزلہ آنے سے پہلے اس درخت کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔

امریکہ کے ایک ضلع میں ایک ایسا ہی درخت موجود ہے۔ جس کے پتّوں کا رُخ ہمیشہ شمال کی طرف رہتا ہے۔ مسافروں کو اس درخت کے ذریعے سمت معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ درخت قطب نما درخت کے نام سے مشہور ہے۔

افریقہ کے جنگلوں میں ایک قسم کا درخت پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ آدمی کا خون چوس لیتا ہے۔ اس درخت کو مردم خور درخت کہتے ہیں۔ یہ خوفناک درخت دور سے بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ اس کے تنے سے بہت سی موٹی موٹی۔ سانپ کی شکل کی ٹہنیاں پھوٹتی ہیں۔ ان میں پتے بالکل نہیں ہوتے۔ ان میں سے گھاس کھودنے کے کھرپے کی طرح ترچھی اور تیز دھاریاں نکلتی ہیں۔ اس درخت کی شاخیں دوسرے درختوں کی طرح ترچھی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے سرے نیچے زمین میں اُگتے ہیں۔ اس سے یہ قاتل درخت بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مسافر دور سے اس کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے۔ جوں ہی وہ اس درخت کے پاس جاتا ہے۔ اس کی ڈالیاں یکایک اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ اور اس کے جسم پر لپٹ جاتی ہیں موت کے منہ میں پڑا ہوا مسافر آہستہ آہستہ درخت کے درمیانی حصے کی طرف کھنچتا جاتا ہے۔ اور اس درخت کی ٹہنیاں اس کے جسم میں گھس جاتی ہیں وہ بڑی تیزی سے آدمی کا خون چوسنے لگتی ہیں تھوڑی دیر میں مسافر کا جسم نیچے گر جاتا ہے۔ اور یہ مردم خور درخت کسی دوسرے انسان کے انتظار میں چپ چاپ کھڑا راہ تکتا ہے۔

سُنا جاتا ہے کہ افریقہ کے کسی علاقے میں چوروں کو ان درختوں کے ذریعۂ موت کی سزا دی جاتی ہے۔

(محمد اعجاز الغفاری شبلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵)

البیرونی کی سوانح حیات کی اشاعت

تاشقند ۵۔ فروری۔ قرونِ وسطیٰ کے ممتاز ترین مورخ البیرونی کی مکمل سوانح حیات ان کے ایک ہزارویں جنم دن کے موقع پر شائع کی گئی ہے۔

ازبک فلم اسٹوڈیو البیرونی سے متعلق ایک فلم بھی تیار کرے گا۔ ممتاز ازبک فنکار شہرت عبّاسوف اس فلم کو ڈائریکٹ کریں گے۔ جس میں اہلِ علم، شہری توہمات اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرنے والے کی حیثیت سے البیرونی کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کیے جائیں گے۔ یہ فلم ازبکستان کے علاوہ افغانستان ہندوستان اور ایران میں بھی دکھائی جائے گی۔ البیرونی نے ہندوستان پر ایک بہت نادر کتاب لکھی ہے۔

★

Regd. No. D. 1457

JULY 1973

پیام تعلیم

(5) 10



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

ماہنامہ پیام تعلیم

نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۸

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

اگست ۱۹۷۳ء

قیمت : ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ : ۶ روپے



فہرست مضامین

★

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری ۱/۵۰
آن حضرت — الیاس احمد مجیبی (اُردو) ۰/۹۵
پاک کہانیاں (دو حصوں میں) مقبول احمد سیوہاروی ۲/۲۵
چار یار — الیاس احمد مجیبی ۱/۲۰
خلفائے اربعہؓ — خواجہ عبدالحی فاروقی ۲/۲۵
رسولِ پاکؐ — عبدالواحد سندھی ۱/۸۰
عقائدِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری ۰/۵۰
مسلمان بیبیاں — مولانا اعجاز الحق قدوسی ۰/۸۵
نبیوں کے قصّے — خواجہ عبدالحی فاروقی ۱/۲۵
ہمارے رسول — ” ” ” ۱/۲۵
ہمارے نبی — سیّد نواب علی رضوی اُردو ہندی ۰/۷۵ ۰/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد ۱/۷۵
انوکھا عجائب خانہ — محمد حسین حسّان (چار حصّے) ۱/۸۰
بجلی کی کہانی — علی احمد خاں ۰/۵۰
بڑ دادا کی کہانی — محمد عبدالغفور ۰/۵۶
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل — خجستہ سلطانہ ۰/۸۰
” ” ” دوم — ضیاء الرحمٰن ۱/۰
” ” ” سوم — مشتاق احمد اعظمی ۱/۸۰
” ” ” چہارم ” ” ۰/۹۵
چٹانوں کی کہانی — محمد امین ۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے — رضیہ منظور الامین ۰/۸۵
”دنیا کے بچّے“ — محمد حسین حسان ۱/۰
دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ۱/۸۰

رابندر ناتھ ٹیگور — صفدر حسین ۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل — احمد شکیل و غلام ابرار ۰/۵۶
” ” دوم ” ” ” ۰/۸۱
” ” سوم ” ” ” ۰/۸۱
سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی ۱/۳۰
سمندر کے نیچے ” ” ” ۲/۰
قدرت کے کرشمے — ادارہ ۰/۶۲
میر انیس — محمد حسین حسّان ۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر ۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے۔ ناول

جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے ۴/۰
اس نے کیا کرنا چاہا (کہانیاں) آصفہ مجیب ۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما) اسداللہ کاظمی ۰/۳۷
تابیل خاں (کہانی) محمد حسین حسان ۰/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (”) مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) م۔ ندیم ۱/۵۰
تین اناڑی (”) عصمت چغتائی ۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی) برکت علی فراق ۱/۴۰
چھپا دت کا آم
خورشیر (سچی کہانی) محمد معین ۰/۳۵
چنبیلی — محمد حسین حسان ۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول) کرشن چندر ۱/۷۵
کوے دادا (سچا ناول) مجیب احمد خاں ۱/۷۵
لال مرغی (کہانی) عبدالواحد سندھی ۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (”) مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۰/۳۵
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) محمود علی خاں ۰/۴۵
ننھا منّو (کہانی) خورشید سلطانہ ۰/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵

بچوں سے باتیں

یہ اگست کا پرچہ ہے اب سے دس برس پہلے (۱۹۶۴ء) پیام تعلیم نے اپنا نیا سفر شروع کیا تھا۔ یہ سفر اب بھی جاری ہے۔ دعا کیجیے کہ اس کے قدم آگے ہی کی طرف بڑھتے رہیں اور جس مقصد کے لیے یہ جاری کیا گیا تھا اس مقصد کو اپنے سامنے رکھے۔

اس تمام عرصے میں پیام تعلیم پر ہر طرح کے دن آئے۔ شروع شروع میں اسے ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں اور ہم نے اس کی ظاہری صورت کو بھی بہت بہتر بنانے کی کوشش کی اور شکر ہے کہ اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔

لیکن پھر مشکلوں نے، پریشانیوں نے چاروں طرف سے آگھیرا پر ہم بددل نہیں ہوئے، نا امید نہیں ہوئے اور پیام تعلیم نے اپنا سفر جیسے تیسے جاری رکھا۔ اس کی ظاہر شکل و صورت میں ضرور تھوڑا بہت فرق آگیا مگر معنوی اعتبار سے خدا کا شکر ہے کہ اس کا معیار اونچا ہی رہا۔ عام پرچوں کے علاوہ ہمارے خاص نمبروں نے دھوم مچادی۔ قہقہہ نمبر۔ ڈراما نمبر۔ کہانی نمبر اور ان سب سے پہلے غالب نمبر بے حد پسند کیے گئے۔ غالب نمبر کے خاص خاص مضمون ہمیں کتابی شکل میں چھاپنے پڑے

اور اب خدا کا شکر ہے کہ دھیرے دھیرے حالات بہتری کی طرف جا رہے ہیں۔ مکتبے کے کارکنوں خصوصاً محترم شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر مکتبہ جامعہ کی رات دن کی محنت کی بدولت مکتبہ پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ امید بلکہ یقین ہے کہ مکتبے کا ہر قدم اب آگے کی طرف ہوگا۔ ہمارے دیس کی حکومت بھی اُردو کی ترقی کی طرف پہلے سے زیادہ کہیں زیادہ توجہ کر رہی ہے۔ یہ بھی ہمارے لیے نیک فال ہے۔

مکتبے کی حالت سدھرنے کا خوش گوار اثر پیام تعلیم پر قدرتی طور پر پڑے گا۔ خصوصاً اس لیے کہ اپنی دوسری غیر معمولی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ محترم شاہد علی خاں صاحب کو پیام تعلیم کو بہتر بنانے کی برابر فکر رہتی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ تو ہم کر رہے ہیں۔ کچھ آپ بھی تو ہماری ہمت بڑھائیے۔ ہم ان صفحوں میں مسلسل آپ سے پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے کی درخواست کر رہے ہیں، اس امید پر کر رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی تو آپ ہماری مشکلوں کو، پریشانیوں کو محسوس کریں گے اور مدد کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ اور اُسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں گے۔ یاد رکھیے پرچے کے خریدار جتنے زیادہ بڑھیں گے اسی قدر ہم اس کی ظاہری صورت شکل کو پسندیدہ بنا سکیں گے۔

اس مرتبہ بہت دنوں کے بعد ہمارے دو کرم فرماؤں

نے نوازش فرمائی ہے۔ عبدالرحیم صاحب نشتر اور محترم کیف احمد صدیقی کو آپ بھولے نہ ہوں گے۔ ان دونوں حضرات کی نظمیں برسات پر ہیں اور اسی پرچے میں شائع ہو رہی ہیں۔ محترم کیفؔ صاحب کے خط سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ یوپی کی اُردو اکاڈمی نے آپ کو ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ یہ انعام ان کی دو کتابوں "گردِ کادرد" اور "بچوں کی نظمیں" پر ملا ہے۔ ہم اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے کیفؔ صاحب کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انعام میں بچوں کے لیے لکھی ہوئی کتاب بھی شامل ہے۔ اور یہ بچوں کے ادب کے لیے نیک شگون ہے۔

اور ہاں بارش ہی پر ایک اور انوکھی نظم ذوالنورین مسحور کی پڑھیے۔ یقین ہے کہ آپ اسے ضرور پڑھیں گے۔

میلے کی سیر کی دوسری قسط جولائی میں چھپنی چاہیے تھی مگر یہ مضمون دیر میں ملا۔ بہت دلچسپ ہے اس لیے اس پرچے میں شامل کر لیا گیا۔

اسی طرح ہمالیائی مہم بھی آپ کے لیے وقت کی چیز ہے یہ مضمون مختلف اخباروں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اسے بھی ضرور پڑھیے۔ ہم چاہتے ہیں دیس کے اور لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح آپ میں یعنی اُردو پڑھنے والوں میں بھی ہمت، جوش اور ولولہ پیدا ہو۔ گنجائش کی کمی کے سبب اس مضمون کو مختصر کرنا پڑا۔

ہم اس پرچے میں ایک بات بار بار لکھ چکے ہیں۔۔ کوئی پیامی یا مضمون نگار چھپی ہوئی کہانی یا مضمون چھپنے کے لیے نہ بھیجیں۔ ہم خود بھی بہت دیکھ بھال رکھتے ہیں۔ پھر بھی چوک جاتے ہیں۔ جون کے پرچے میں ایک صاحبزادے کی کہانی چھپی تھی۔ ایک صاحب نے ہمیں شکایتی خط لکھا کہ یہ تو پہلے بھی ایک پرچے میں چھپ چکی ہے۔ ہم نے ایک خط کے ذریعے انھیں توجہ دلائی جواب ملا کہ اس کہانی کا انھوں نے ایک انگریزی کہانی سے خود ترجمہ کیا ہے۔ پہلے انھوں نے اسے ایک ہندی رسالے میں چھپوایا پھر ایک اردو رسالہ میں چھپوایا۔ پھر پیامِ تعلیم میں چھپوایا۔ ہندستان کے ملاپ میں چھپوا رہے ہیں۔ یعنی ایک ہی کہانی جگہ جگہ چکر لگاتی اور چھپتی رہی

اپنی چیز کو چھپوانے کا شوق کوئی بری بات نہیں لیکن ایک ہی چیز کو بار بار چھپوانا بہت بری بات ہے، بری عادت۔ ہمیں بڑی خوشی ہوگی اگر یہ عزیز آئندہ اس معاملے میں احتیاط برتیں گے۔ انھوں نے جولائی کے پرچے میں چھپی ہوئی ایک کہانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ بھی دلی کے ایک رسالے میں چھپ چکی ہے۔ جن صاحب کی یہ کہانی ہے اُن کے لیے یہ اشارہ کافی ہے۔ ان سے بھی توقع ہے کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔

ہم نے کہانی نمبر اور ڈراما نمبر دونوں زیادہ چھپوا لیے تھے اور ان کی کچھ کاپیاں محفوظ کرا لی گئی تھیں۔ اب ہمارے منیجر صاحب نے طے کیا ہے کہ پیامِ تعلیم کے نئے خریداروں کی خدمت میں ان دونوں میں سے اور ان دونوں نمبروں میں سے کوئی ایک تحفے کے طور پر مفت پیش کیا جائے۔ نئے خریدار صاحب اپنے خط میں یہ درخواست کر دیں کہ انھیں کہانی نمبر چاہیے یا ڈراما نمبر۔ بڑا اچھا موقع ہے فائدہ اٹھائیے ورنہ پھر یہ یادگار نمبر کسی قیمت ملیں گے۔

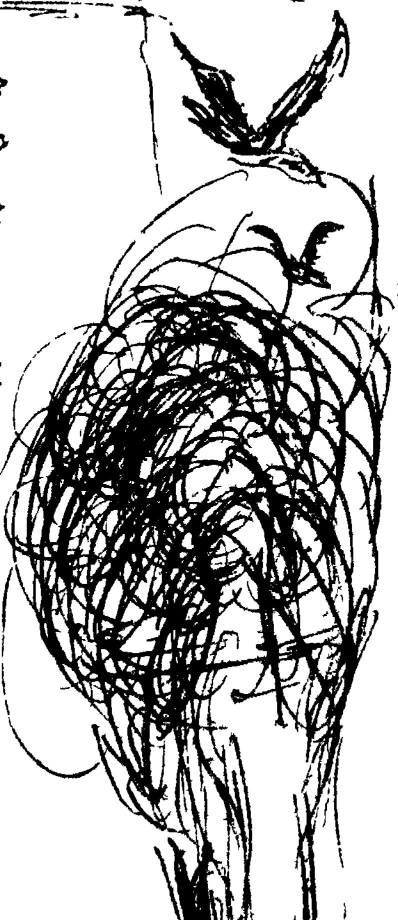
جناب ذوالنورین صدیقی مسحور

بارش کیسے ہوتی ہے

مولوی صاحب نے ایک دن یوں کہا — اپنے بچوں سے کہ بتلاؤ ذرا
کس طرح ہوتی ہے بارش یہ کہو — ہے مگر یہ شرط پہلے سوچ لو!
ایک نے فوراً کھڑے ہو کر کہا — مولوی صاحب مری سنیے ذرا
غسل فرماتے ہیں جب اللہ میاں — عرش سے گرتا ہے پانی تب یہاں
دوسرے نے جھٹ کھڑے ہو کر کہا — کیا کہا بدھو میاں نے واہ وا
غسل فرماتے نہیں اللہ میاں — ہے غلط میری نظر میں یہ بیاں
مولوی صاحب ہماری اب سنیں — گر اجازت دیں تو ہم بھی کچھ کہیں
جب فرشتوں پر بگڑتا ہے خدا — اور غصے میں گرجتا ہے خدا
ڈر سے روتے ہیں فرشتے عرش پر — ان کے آنسو ہیں ٹپکتے فرش پر
آنسوؤں سے ہوتی ہے بارش یہاں — ٹھیک ہے بالکل ہمارا یہ بیاں
تیسرے نے یوں کہا، ہے سب غلط — دوستو! ہے بات اتنی سی فقط
ہے فلک پر حوض کوثر بے مثال — جس کی کرتے ہیں فرشتے دیکھ بھال
جب فرشتے صاف کرتے ہیں اسے — سارا پانی حوض کا ہیں پھینکتے
بس وہی پانی جو گرتا ہے یہاں — کہتے ہیں بارش اسے اہل جہاں
ایک نے ٹوپی سنبھالی اور اٹھا — سن کے وہ یہ داستاں کہنے لگا
کہہ گئے کیا دوست تم بھی جوش میں — ہو نہیں شاید تم اپنے ہوش میں







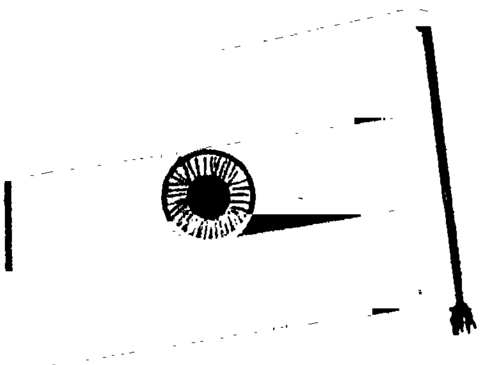
جھوٹی باتیں ایسی آخر کیوں کہو؟ — بات جو سچی ہے، کہتا ہوں سنو!
نہر ہے اک آسماں پر بیکراں — نام ہے تسنیم ہے رشکِ جناں
جب کبھی اس نہر میں آتی ہے باڑھ — تب یہاں ہوتا ہے ساون اور اساڑھ

مختصر، سب اپنی اپنی کہہ گئے
مولوی صاحب بے چارے چپ رہے

ایک لڑکا جو بہت ذی ہوش تھا — سُن رہا تھا سب مگر خاموش تھا
با ادب اس نے کھڑے ہو کر کہا — میں بھی ہوں کچھ عرض کرنا چاہتا
سال میں آتا ہے جب ماہِ جون — اس میں آجاتی ہے چل کر مانسون
بحر سے خشکی کی جانب یہ ہوا — بھاپ لے کر ساتھ چلتی ہے سدا
سرد حصّے میں پہنچتی ہے یہ جب — اس کی گرمی ختم ہو جاتی ہے تب
سرد ہو کر منجمد ہوتی ہے بھاپ — شکل پھر وہ ہے بدلتی اپنے آپ
بن کے پھر کالی گھٹا پھرتی ہے وہ — شکل میں پانی کی پھر گرتی ہے وہ
اس طرح ہوتی ہے بارش برملا — ہم سے کہتا ہے یہی جغرافیہ

مولوی صاحب نے سن کر یوں کہا
"سچ کہا ہے تم نے بالکل، مرحبا"





ناوک حمزہ پوری

ہمارا قومی جھنڈا

دُنیا کے سارے ملکوں کی تاریخ میں ان کے قومی جھنڈوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ قومی پرچم (جھنڈا) ملک کے لوگوں کی آزادی اور خودداری کی علامت ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ دل جوش اور امنگ سے بھر جاتا ہے۔ ہمّت اور شجاعت کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔

ہمارے قومی جھنڈے نے بھی آزادی کی لڑائی میں ہمارے جوش کو بڑھانے اور اسے برقرار رکھنے میں ہماری بہت مدد کی ہے۔ جنگِ آزادی کے مجاہدین اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ہمارے قومی جھنڈے کی تاریخ دراصل ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ ہے۔

موجودہ صدی کے پہلے دہے میں ہمارے مجاہدینِ ہندوستان کی آزادی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتے یورپ کے مختلف ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ ان بہادر اور جاں باز لوگوں میں انقلابی مجاہدہ مشر بھیکا جی "کاما" کا نام احترام کے لائق ہے۔ ۱۸۔ اگست ۱۹۰۷ء کو جرمنی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یکایک ایک جھنڈا نکالا اور اُسے لہرا دیا۔ پھر بڑے اطمینان کے ساتھ بولیں "لوگو! یہ ہندوستان کی آزادی کا پہلا عَلَم (جھنڈا) ہے اسے سلامی دو" شریمتی کاما انگریزی جھنڈے "یونین جیک" کو لہرانا اپنی اور ہندوستان کی توہین سمجھتی تھیں۔ اس لیے وہ پہلے ہی سے ایک جھنڈا تیار کرکے لائی تھیں۔ انھوں نے جو جھنڈا تیار کیا تھا وہ لال پیلی اور ہری ترچھی دھاریوں والا تھا۔ اوپر کی لال دھاری میں کنول کا ایک پھول اور سات ستارے بنے ہوئے تھے۔ بیچ کی پیلی دھاری میں گہرے نیلے رنگ سے "بندے ماترم" لکھا ہوا تھا۔ ہری دھاری میں تھا سورج چاند اور تارا۔

مشہور ہے کہ اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کے پارسی بگان کے ایک قومی جلسے میں بھی ٹھیک ایسا ہی ایک جھنڈا لہرایا جا چکا تھا۔ اس طرح ہمارے قومی جھنڈے کی تاریخ ۱۹۰۶ سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت سے ۱۹۱۶ء تک اسی جھنڈے کو ہمارے قومی جھنڈے کی حیثیت حاصل رہی۔

۱۹۱۷ء میں لوک مانیہ تلک اور اینی بسنٹ کی ہوم رول کی تحریک نے ایک دوسرے قومی جھنڈے کو جنم دیا۔ اس میں پانچ لال اور چار ہری ترچھی پٹیاں تھیں۔ بیچ میں سات تارے بنے ہوئے تھے۔ بائیں کونے

میں یونین جیک کی تصویر تھی اور دائیں کونے میں تارے کے ساتھ چاند کی تصویر تھی۔

اس جھنڈے میں یونین جیک کی تصویر ہونے پر کچھ قومی رہنماؤں کو اعتراض ہوا۔ اس لیے کانگریس کے وجے واڑا اجلاس میں گاندھی جی کی فرمائش پر وہ جھنڈا شری وینکیا نے تیار کیا تھا۔ اس جھنڈے میں لال اور ہرے رنگ کی دو پٹیاں تھیں۔ لالہ ہنس راج کے سجھاؤ پر اس جھنڈے میں ایک چرخے کی تصویر بھی بنائی گئی۔ اس وقت گاندھی جی نے یہ خیال کیا تھا کہ ہندوؤں کے لال رنگ اور مسلمانوں کے سبز رنگ کو جھنڈے میں شامل کرنا بہتر ہے گا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے اس اجلاس میں اس جھنڈے پر غور و خوض نہ ہو سکا۔

اس پر گاندھی جی نے خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ بعد میں گاندھی جی کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ ہندستان میں ہندو مسلمانوں کے علاوہ اور دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی بستے ہیں۔ جھنڈے میں ان کے لیے بھی رنگ ہونا چاہیے۔ اس لیے خوب سوچ وچار کے بعد جھنڈے میں سفید رنگ بھی شامل کرایا۔ اس طرح ایک نیا یعنی چوتھا قومی جھنڈا وجود میں آیا۔ بہر حال خیال یہی رہا کہ لال رنگ ہندوؤں، ہرا رنگ مسلمانوں اور سفید رنگ بقیہ مذاہب کے ماننے والوں کے جذبات سے وابستہ ہے۔

کچھ قومی رہنماؤں کو جھنڈے کے رنگوں کے ساتھ مختلف مذہبوں کا رشتہ جوڑنا اچھا نہ لگا۔ آخرکار اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے سات ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ قومی جھنڈا صرف ایک رنگ کا ہونا چاہیے اور وہ رنگ ہو کیسریا یا زعفرانی۔ جھنڈے کے نچلے بائیں کونے پر لال رنگ کا چرخہ بنا رہے۔ یہ پانچواں قومی جھنڈا تھا۔ لیکن کانگریس کی جنرل اسمبلی نے خوب سوچ سمجھ کر چوتھے جھنڈے کو ہی قومی جھنڈے کی حیثیت سے منظوری دی۔ اس نے صرف یہ ترمیم کی کہ رنگوں کا مفہوم بدل دیا۔ اب کیسریا رنگ ایثار و قربانی، سفید رنگ حق پرستی اور امن چین اور ہرا رنگ عقیدت و شجاعت کی علامت مانا گیا۔ درمیان کی سفید پٹی پر نیلے رنگ کا چرخہ رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک یہی جھنڈا ہمارا قومی جھنڈا رہا۔ ۱۹۴۲ء میں اسی جھنڈے کو نیتا جی سبھاش چندر بوس نے عارضی حکومت کا جھنڈا بنایا۔ اسی جھنڈے کو لال بہادر شاستری نے الٰہ آباد کے گھنٹہ گھر پر لہرایا اور اسی جھنڈے کی حفاظت کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے سات طالب علموں نے اپنی جانیں قربان کیں۔

۱۹۴۷ء میں ۲۲۔ جولائی کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے اسی ترنگے جھنڈے کو ہندوستان کا قومی جھنڈا تسلیم کر لیا۔ تبدیلی صرف یہ کی کہ چرخے کی جگہ اشوک کا دھرم چکر،، رکھنا منظور کیا۔ یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان کا قومی جھنڈا کیسریا سفید اور سبز رنگ کی تین آڑی پٹیوں کا ہوگا۔ تینوں پٹیوں کی لمبائی چوڑائی برابر ہوگی۔ جھنڈے کی لمبائی چوڑائی کا تناسب ۲:۳ کا ہوگا۔ یعنی اگر لمبائی تین فٹ ہوگی تو چوڑائی دو فٹ۔ سفید پٹی کے بیچ میں گہرے نیلے رنگ کا اشوک چکر ہوگا۔ چکر کا دائرہ سفید پٹی کی چوڑائی کے برابر ہوگا۔ چکر کا ڈیزائن سارناتھ کی اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے چکر کی طرح ہوگا۔

ملک کے مشہور عالم اور فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے مجلس دستور ساز کے سامنے جھنڈے کے رنگوں

...شریح کرتے ہوئے فرمایا "بھگوا یا کیسریا رنگ قربانی ...بے لوثی کی علامت ہے۔ ہمارے قومی رہنماؤں کو اس سے ...ت حاصل کر کے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کرنی چاہیے ...ذاتی عیش و آرام کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔ درمیان ...ید رنگ ہمارے ملک کی سرسبزی و شادابی کی علامت ...یچ کا اشوک چکر ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ حرکت میں ہی برکت ...ہے"

قومی جھنڈے سے چرخے کو ہٹائے جانے پر گاندھی جی ...نہیں ہوا۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی مشکل سے ...یا اور کہا کہ ایک طرح سے چرخے کی علامت ...ہے۔ اس طرح ہمارے قومی جھنڈے کی شکل متعین ...ی۔ یہ جھنڈا جسے قومی تہواروں پر ہم لہراتے ہیں وہی جھنڈا ...۱۹۴۷ء کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ...سی طرح کی معمولی سے معمولی تبدیلی کی روک تھام کے لیے ...مستند قومی جھنڈا مہر بند کر کے حفاظت کے ساتھ ...رکھا گیا ہے۔

ہندوستان کے قومی جھنڈے "آرڈیننس کلاتھ فیکٹری ...شاہجہاں پور" میں بنائے جاتے ہیں۔ صرف اسی فیکٹری ...کے جھنڈے مستند سمجھے جاتے ہیں۔ قومی جھنڈے میں ...استعمال کیا جانے والا کپڑا کھادی ہوتا ہے۔ ہاتھ کے کاتے ...ہوئے اون اور ریشم کا جھنڈا بھی بنایا جاسکتا ہے۔

بڑے بڑے سرکاری دفتروں پر لہرایا جانے ...والا قومی جھنڈا ۱۴ فٹ چوڑا اور ۲۱ فٹ لمبا ہوتا ...ہے اور اس کی قیمت اوسطاً لگ بھگ ڈھائی سو ...روپے ہوتی ہے۔

قومی جھنڈا ہماری آزادی کی علامت ہے۔ اس کی ...عزت کرنا اور اس کا وقار قائم رکھنا ہم پر فرض ہے۔

اسی لیے اس کے استعمال کے لیے کچھ ضروری قاعدوں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی اس کی زعفرانی پٹی سدا اوپر کی طرف رہنی چاہیے۔ صبح سے شام تک جھنڈا لہرانے کا وقت ہے۔ سورج نکلنے کے بعد کسی وقت اسے لہرایا جا سکتا ہے۔ اور سورج ڈوبنے سے پہلے اسے اتار لینا چاہیے۔ لہراتے وقت اسے تیزی کے ساتھ اوپر لے جانا چاہیے اور اتارتے وقت دھیرے دھیرے اتارنا چاہیے۔ اگر قومی جھنڈے کے نزدیک کوئی دوسرا جھنڈا بھی لہرانا ضروری ہو تو دائیں طرف اور زیادہ اونچائی پر قومی جھنڈا ہی ہونا چاہیے۔ جلوس میں چلتے وقت جھنڈا آگے آگے اور داہنے ہاتھ میں پکڑ کر چلنا چاہیے۔ گندا یا کٹا پھٹا جھنڈا نہیں لہرانا چاہیے۔ اسے سجاوٹ کے لیے کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ قومی جھنڈے کو زمین پر گرنے یا زمین سے چھونے نہ دینا چاہیے۔ جھنڈا ہمیشہ ڈنڈے کی چوٹی پر لہرانا چاہیے۔ ہاں صرف غم کے موقعہ پر (کسی بڑے قومی رہنما کی موت وغیرہ پر) اسے ڈنڈے کی آدھی اونچائی پر لہرایا جاتا ہے۔

اقوال

★ صبر ہے تو مشکل لیکن اس کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ (روسو)

★ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ توکل یہ ہے کہ حصولِ معاش کی کوشش اور تدبیر نہ کریں۔ یہ خیال جاہلوں کا ہے۔ (حضرت امام غزالی)

★ جو کچھ تمہارے باطن میں ہوگا وہی ظاہر ہوگا۔ (ایمرسن)



مرہٹی کہانی

وی۔ س۔ کھانڈیکر

مترجم۔ سلام بن رزاق

پتھر پھوڑ

(وی۔ س۔ کھانڈیکر پیدایش ۱۸۹۸ء مرہٹی کی مشہور کہانی کار ہیں۔ بھارت سرکار کی طرف سے پدم بھوشن کا خطاب بھی ملا ہے۔ بچّوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں — 'سنگ تراش'، میں اُنھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آدمی کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔ دوسروں پہ جلنے اور کڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ کسی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ پتھر توڑنے (یا پتھر پھوڑنے) کا کام کرتا تھا۔[1] پر یہ کام تھا بڑی محنت کا۔ خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ معمولی سی مزدوری پر وہ صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتا۔ مگر جب اس کڑی محنت کے بدلے چند تانبے کے سکّے اُس کی ہتھیلی پر رکھے جاتے تو وہ بہت کڑھتا۔ اور اپنی بدنصیبی اور مفلسی پر دُکھی ہو جاتا۔ ایک دن اُس کے دل میں اچانک ایک خواہش پیدا ہوئی "کاش میں اتنا امیر ہوتا کہ اس چلچلاتی دھوپ میں پسینہ بہانے کے بجائے کسی آرام دہ پلنگ پر لیٹا ہوتا۔ جس پر خوبصورت مچھر دانی ہوتی۔"

اُسی دم آسمان سے ایک فرشتہ زمین پر اُترا اور اس کے سامنے آکر بولا۔

"بدنصیب انسان! تیری خواہش پوری ہوگی۔"

آخر اُس کا خواب پورا ہوا۔ وہ ایک مال دار آدمی بن گیا اب وہ رات دن ایک آرام دہ پلنگ پر لوٹ لگانے لگا۔ اس پلنگ کے چاروں طرف ریشمی مچھر دانی تھی۔

ایک دن اُدھر سے ایک راجہ کا گزر ہوا۔ راجہ کے رتھ

---

[1] دلّی میں پتھر توڑنے والے کو عام طور پر "پتھر پھوڑ" کہتے ہیں

کے آگے پیچھے گھڑ سوار دوڑ رہے تھے۔ ایک خادم سنہری چھتری سے راجہ کے سر پر سایا کیے ہوئے تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی وہ امیر آدمی بے چین ہو گیا۔ اس نے سوچا "آہا! کیسی خوبصورت چھتری ہے۔ کتنا بدنصیب ہوں میں" کاش میں راجہ ہوتا!"

اُسی وقت وہ فرشتہ اس کے سامنے حاضر ہوا۔ اور بولا۔ "بدنصیب انسان جا! تیری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔"

وہ راجہ بن گیا۔ اُس کے آگے پیچھے گھڑ سوار دوڑتے لگے۔ اور اُس کے سر پر سنہری چھتری کا سایا بھی ہو گیا۔ گرمی کا موسم آیا۔ سورج آگ اُگلنے لگا۔ زمین تپ گئی۔ گھاس کا ایک ایک تنکا خشک ہو گیا۔ تب اُس نے سوچا۔

"سورج مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ تبھی تو اس کی گرمی سے میرا چہرہ جھلس گیا ہے۔ کتنا بدنصیب ہوں میں۔ کاش میں سورج ہوتا۔ کیسا لطف آتا۔"

اسی فرشتے کی مہربانی سے وہ فوراً سورج بن گیا۔ اُس نے زمین پر بسنے والے چھوٹے بڑے تمام جانداروں کو جھلسا کر رکھ دیا۔ لیکن ایک دن ایک بہت بڑا بادل کا ٹکڑا سورج پر چھا گیا۔ لوگوں کو اُس قیامت کی گرمی سے نجات ملی۔ اور زمین پر بسنے والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اپنی کرنوں کو یوں بے بس دیکھ کر وہ بولا۔ "واقعی بادل عظیم ہیں۔ کاش مجھے بادلوں کی شکتی (طاقت) مل جاتی"

فرشتے نے اُس کی وہ خواہش بھی چشم زدن (آنکھ جھپکتے) میں پوری کر دی۔ بادل بن کر وہ سورج اور زمین کے بیچ اِدھر اُدھر ڈولنے لگا۔ ایک دن اُس بادل کے ٹکڑے نے زمین پر موسلادھار مینھ برسایا۔ ندیوں میں سیلاب آ گیا۔ بہت سے مویشی اور انسان اُس سیلاب میں بہہ گئے۔ کھیت پانی میں ڈوب گئے۔ فصل تباہ ہو گئی۔ کسان آنسو بہانے لگے۔ یہ سب تو ہو گیا مگر بادل کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ مسلسل کئی روز سے پتھر کی ایک چٹان پر مینھ برسانے کے بعد بھی وہ اُس میں ایک سوراخ تک بنا نہ سکا۔ اس کی ساری کوششوں کے باوجود چٹان جوں کی توں تھی۔ چٹان بادل سے زیادہ طاقتور ہے یہ جان کر اُسے بے حد غصہ آیا۔ اپنے آپ پر جھنجھلاتا ہوا وہ بڑبڑانے لگا۔

"کتنا بدنصیب ہوں میں۔ کاش میں ایک چٹان ہوتا"

دوسرے ہی لمحے وہ چٹان بن گیا۔ برسات میں، گرمی میں ہر موسم میں وہ چٹان کسی سادھو کی طرح سمادھی لگائے چپ پڑی رہتی۔ ایک دن ایک پتھر پھوڑ، کدال، ہتوڑا وغیرہ لیے وہاں آ پہنچا۔

پتھر چونکا اس نے سوچا "اس آدمی کی قوت مجھ سے زیادہ ہے یہ تھوڑی ہی دیر میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ آہ کتنا بدنصیب ہوں میں اگر کوئی میری دُعا قبول کرے تو میں صرف اتنا مانگوں۔ پروردگار! مجھے پتھر پھوڑ بنا دے"

خدا کے حکم سے وہی فرشتہ زمین پر آیا اور بولا۔ "بدنصیب انسان! تیری خواہش پوری ہوئی" اور وہ ایک بار پھر وہی پتھر پھوڑ بن گیا۔

آپریشن، دُم نکال دی گئی!

جے۔ جے اسپتال کے سرجنوں نے ایک چھ ماہ کے بچے ہرش کی ۲ انچ لمبی دُم کو آپریشن کر کے نکال دیا۔ ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ آپریشن کامیاب رہا ہرش کی دم تھی اور وہ اس کو ہلایا بھی کرتا تھا۔ اس کا سیدھا پیر بھی مفلوج ہے۔

کیف احمد صدیقی ایم۔ اے

برسات کا موسم

کس درجہ حسین دیکھو
برسات کا موسم ہے
اس موسم دلکش کا
کچھ اور ہی عالم ہے
سردی بھی نہیں یارو
گرمی بھی بہت کم ہے
برسات کا موسم ہے

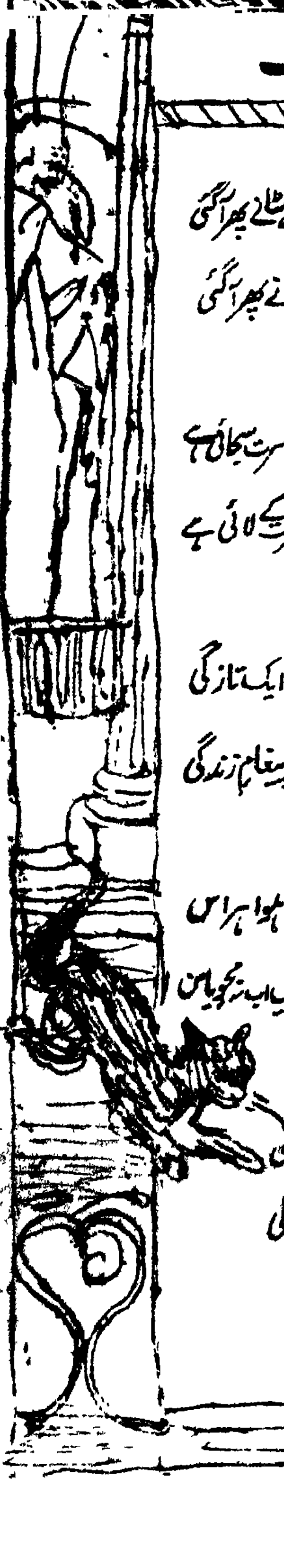
تپتی ہوئی دھرتی پر
بہتا ہوا پانی ہے
کس جوش کے عالم میں
ندیوں کی روانی ہے
طوفان کے ہاتھوں میں
سیلاب کا پرچم ہے
برسات کا موسم ہے

ہر شاخ گلستاں پر
کھلتی ہوئی کلیاں ہیں
پھولوں سے بھرے آنگن
مہکی ہوئی کلیاں ہیں
اب گل ہی نہیں خنداں
ہنستی ہوئی شبنم ہے
برسات کا موسم ہے

باغوں میں ہر اک جانب
خوش رنگ بہاریں ہیں
جھومی ہوئی ڈالوں پر
جھولوں کی قطاریں ہیں
آواز ہے رم جھم کی
یا پیار کا سرگم ہے
برسات کا موسم ہے

ہر شخص کے ہونٹوں پر
بارش کے فسانے ہیں
رنگین فضاؤں میں
ساون کے ترانے ہیں
اے کیفؔ تمھیں آخر
کس بات کا اب غم ہے
برسات کا موسم





جوہر جام نیری (پالگھر)

پندرہ اگست

(بڑے پیامیوں کے لیے)



عیش و طرب کے گیت سنانے پھر آ گئی　　دل سے نقوش غم کے مٹانے پھر آ گئی
لو نشۂ سرور بڑھانے پھر آ گئی　　پندرہ اگست عید منانے پھر آ گئی
اُمید کے چراغ جلانے پھر آ گئی

لے کر پیام حبِ وطن کا پھر آئی ہے　　ہر دل نے ایک بزمِ مسرت سجائی ہے
پھر تازگی بہار کی ہر سمت چھائی ہے　　سو سو پیام، عیش و مسرت کے لائی ہے
رونق میرے وطن کی بڑھانے پھر آ گئی

مغموم کو نصیب ہوئی ہے نئی خوشی　　افسردہ رُخ پہ دوڑ گئی ایک تازگی
تعبیر بن کے آئی ہے دیرینہ خواب کی　　مردہ دلوں کو دیتی ہے پیغامِ زندگی
احساسِ زندگی کو بڑھانے پھر آ گئی

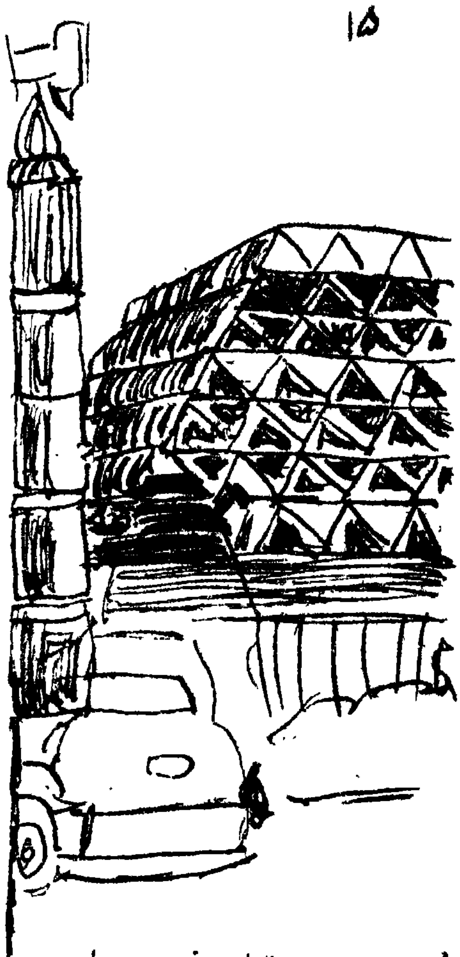
وہ دل رہے ہیں دورِ غلامی میں جو اداس　　محکوم زندگی پہ تھا چھایا ہوا ہراس
اک لمحہ بھی بہار کا آیا نہ جس کو راس　　اہلِ چمن سے کہہ دو رہیں اب نہ محوِ یاس
لو وہ گُلِ اُمید کھلانے پھر آ گئی

دیکھو متاعِ عیش سے محروم ہے کوئی　　کس کو نہیں نصیب گلستاں میں اب خوشی
فصلِ بہار لائی ہے پیغامِ میکشی　　جوہر بجھے گی آج ہر اک دل کی تشنگی
سب کو مئے نشاط پلانے پھر آ گئی



جناب خلیق انجم اشرفی

نمائشی میلے کی سیر (۲)



اتوار کو صبح ہی صبح بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا —
"بھائی صاحب۔ یاد ہے آپ کو۔ نمائش چلنا ہے"
"ارے بھئی نمائش کا وقت دو بجے دن سے نو بجے رات تک ہے تم لوگوں نے ابھی سے کیوں تیاری شروع کر دی" میں بولا۔
"تو اس کا مطلب ہے کہ دو بجے تک نمائش بند رہتی ہے ؟" رعنا نے سوال کیا۔
"نہیں نمائش تو سارا دن کھلی رہتی ہے لیکن صبح دس بجے سے دو بجے دن تک صرف تاجر یا تجارتی معلومات حاصل کرنے والے نمائش دیکھنے جاتے ہیں اور اس وقت کا ٹکٹ بھی دو روپے ہوتا ہے۔ ہم تم جیسے میلا دیکھنے والے تو دو بجے جاتے ہیں، اور اس وقت کا ٹکٹ ایک روپے کا ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔
"مگر بھائی صاحب۔ آپ کچھ بھول رہے ہیں۔ آج اتوار ہے اور اتوار کو میلا صبح دس بجے سے عام لوگوں کے لیے کھل جاتا ہے" عتیق نے کہا۔
"خوب یاد دلایا بھئی۔ اچھا اب تم لوگ جلدی جلدی ناشتہ کر لو۔ پھر چلتے ہیں"
ساڑھے نو بجے لال قلعے کے بس اسٹاپ پر پہنچے۔ وہاں رنگ برنگے کپڑے پہنے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو بس پر دیوانوں کی طرح دھاوا بول رہا تھا۔ ہر شخص جلد سے جلد میلے پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔
"بھئی اس دھکم پیل میں تو بس میں چڑھنا مشکل ہے" میں نے گھبرا کر کہا "ٹیکسی کرتے ہیں" اتنے میں ایک سردار جی

قریب آگئے" "آؤ بادشاہو۔ نمائش۔ صرف ایک روپیہ سواری"

"ایک روپیہ سواری" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر دہرایا۔ ارے سردار جی۔ میٹر کے حساب سے جو بنے وہ لے لینا"

"ہی ہی ہی ہی" سردار جی دانت نکال کر بولے "اس نمائش میں میٹر کہاں چلتا ہے"

کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ مجبوراً سب ٹیکسی میں بیٹھے۔ بھیروں روڈ کے قریب پہنچے تو دور ہی سے ڈی۔ سی۔ ایم اور ہال آف نیشنس کے اونچے اونچے پویلین نظر آنے لگے۔ گیٹ نمبر ایک پر سردار جی نے ہمیں اتار دیا۔

رنگ برنگے کپڑے پہنے میلے کے شوقین مردوں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی ایک بھیڑ ٹیکسیوں، کاروں، اسکوٹروں، سائیکلوں اور بسوں سے اتر اتر کر ٹکٹ کی قطاروں میں لگ رہی تھی۔

"گیٹ آف ہارمونی" رعنا نے زور سے پڑھا۔

"ہاں۔ یہ ہے باب یکجہتی یا تال میل کا دروازہ۔ آؤ۔ اب ٹکٹ خرید لیں"

بھیڑ کے باوجود ٹکٹ آسانی سے مل گئے۔ ٹکٹ کے بہت سارے بوتھ بنے ہوئے تھے۔

گول گھومنے والے دروازے پر کھڑے، گیٹ کیپر کو ٹکٹ دکھاتے ہوئے ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی راجستھان کا حسین و دلکش پویلین تھا۔

"آہا ہا۔ کتنا خوبصورت اسٹال ہے راجستھان کا" شائستہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں بھئی یہ شاید نمائش کا سب سے خوبصورت اسٹال ہے" میں نے کہا "اسے سرخ پتھر اور سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ اس کی ایک سمت جے پور کے مشہور ہوا محل کے طرز پر بنائی گئی ہے۔

سنگ مرمر کے ستونوں اور محرابوں سے بنے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ہر طرف راجستھان میں بننے والی مختلف صنعتی چیزیں لگی تھیں۔ بچوں کو راجستھانی گڑیاں بہت پسند آئیں۔ وہ سب وہیں کھڑے ہو گئے اور حیرت اور شوق بھری نظروں سے خوب صورت سجی بنی گڑیوں کو تکنے لگے۔

"ارے بھئی اگر تم لوگ ایک ہی جگہ اتنی اتنی دیر کھڑے رہو گے تو میلہ کا ایک چوتھائی حصہ بھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ بس ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جاؤ"

برابر ہی پنجاب کا عظیم الشان اسٹال تھا۔ ٹیوبوں اور سلنڈروں سے بنا ہوا یہ اسٹال پانی کے ایک مصنوعی تالاب میں کھڑا تھا، پنجاب کی عظیم زراعتی اور صنعتی ترقی کا مظہر! اندر داخل ہوتے ہی بچوں کی نظر سب سے پہلے کھلونوں اور کھیل کے دوسرے سامان پر پڑی۔ میں نے انھیں بتایا کہ کھیل کا یہ سامان جالندھر میں بنتا ہے اور اتنا اچھا ہوتا ہے کہ باہر کے ملکوں کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ پنجابی گڑیا اور گڈے بھی بے حد پیارے لگ رہے تھے۔ جلدی جلدی سب چیزوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر باہر نکلے اور اڑیسہ کے اسٹال میں داخل ہو گئے۔ یہاں داخل ہوتے ہی کونارک اور بھوبنیشور کے مندروں کے نمونے دیکھنے کو ملے۔ جگہ جگہ اڑیسہ میں دیکھنے لائق جگہیں بڑی بڑی تصویروں کے ذریعے دکھائی گئی تھیں۔ اڑیسہ میں بنے ہوئے روڑکیلا اسٹیل پلانٹ کی ترقی کا حال بھی تصویروں کی زبانی دکھایا گیا تھا اور اس کا ایک ماڈل بھی یہاں موجود تھا۔ جگہ جگہ موجود گرل گائڈس ہر سوال کا جواب بڑی ملائمت نرمی اور دل چسپی سے دے رہی تھیں۔

اڑیسہ کے اسٹال میں بچوں نے زیادہ دل چسپی نہیں ظاہر کی وہ جلدی سے باہر نکلے تو ایک مستطیل چبوترے پر سفید دھندلے شیشے کے خوبصورت ہشت پہلو ستونوں کا بنا ہوا اتر پردیش کا پویلین نظر آیا۔ یہ دو منزلہ تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے شیشم کے چوڑے دروازے میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی تاج محل کا ایک بہت بڑا اور دلکش فوٹو نظر آیا۔ اسٹال مختلف حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ لکھنؤ سیکشن۔ بنارس سیکشن۔ مرادآباد سیکشن اور آگرہ سیکشن۔ ان سیکشنوں میں اس شہر کی مصنوعات اور قدیم تہذیب کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ برتنوں پر مرادآبادی نقاشی کے حسین و دلکش نمونے۔ بنارسی پوت کی ساڑیاں۔ لکھنؤ کا مشہور پیچوان اور اسے پیتے ہوئے مجسمے۔ اور آگرہ کی مشہور تاریخی عمارتوں کے فوٹو۔ سب اس اسٹال کو عجیب دلکشی عطا کر رہے تھے۔ نیچے اترے تو کنیّ چلّا اٹھیں

"وہ دیکھیے اندرا گاندھی"

صرف ہم ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی چونک کر دیکھنے لگے۔ سامنے ہی اندرا گاندھی کا ایک مسکراتا ہوا فوٹو آویزاں تھا۔ آخر وہ بھی تو اتر پردیش ہی کی پیداوار ہیں۔ نیچے کے حصّے میں سونے کا کمرہ۔ کھانے کا کمرہ اور رہنے کا کمرہ قدیم انداز میں سجایا گیا تھا۔

آندھرا کے تین حصّوں میں بنے ہوئے خوب صورت اسٹال اور گجرات کے عجیب و غریب اسٹال کے پویلین کا ایک چکر لگا کر مغربی بنگال کے پویلین میں جا گھسے۔ گھستے ہی ایک سادہ سی جھونپڑی نظر آئی۔ اس میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ یہ بنگالی کسان کی جھونپڑی تھی اوپر کی منزل پر پہنچے تو مرشدآباد کی ریشمی ساڑیاں اور قیمتی کپڑے نظر آئے۔

ایک خاتون گائڈ نے بتایا کہ اب مرشدآباد میں یہ ساڑیاں بننے والے صرف سات کاریگر خاندان رہ گئے ہیں۔ ایک طرف کالی دیوی کی مختلف بھیانک مورتیاں اور تصویریں اور دوسری طرف ایک کونے میں جنگل کا ایک کونہ بنا کر اس میں بنگال کا مشہور شیر کھڑا دکھایا گیا تھا۔ کھال میں بڑی صفائی سے بھُس بھر گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی وہ اگلا قدم اٹھائے گا۔ یا چھلانگ مار کر جھاڑیوں میں غائب ہو جائے گا۔ پاس ہی ریت بکھری تھی اور اس میں ایک زبردست مگرمچھ لمبا لمبا پڑا تھا۔ بنگال کا پویلین بچّوں کو بہت پسند آیا۔ اس میں انھیں اپنی دل چسپی کی بہت ساری چیزیں نظر آئیں۔

مغربی بنگال کے اسٹال سے باہر نکلے تو رعنا بولی "ارے وہ کھٹیر کیسی لگی ہے؟"

"اوہ! وہاں تو ایک چھوٹا سا ہاتھی کھڑا ہے" شائستہ خوش ہو کر بولی۔

"ارے یہ تو بچّوں کو ہار پہنا رہا ہے" کنّی جو دوڑ کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہیں سے چیخ کر بولی۔

"کیرالا" حسنین نے اسٹال کا نام پڑھا۔

"ہاں بھئی یہ گوونداں ہے۔ اس میلے کا اکیلا جانور۔ لوگ اس کی حرکتیں دیکھ کر ایسا مست ہو جاتے ہیں کہ کیرالا کے اسٹال کے اندر جانا ہی بھول جاتے ہیں" میں نے بتایا۔

سڑک کے دوسری طرف "نہرو اور نیا ہندوستان" نامی اسٹال تھا۔ اندر گھسے تو ایک کمرے میں لوگ پلاسٹک کے رنگ برنگے چپٹے چپٹے ڈبے سے کانوں سے لگائے خاموش کھڑے تھے۔ ہم نے بھی سب کی دیکھا دیکھی ایک ایک رسیور اپنے کانوں سے لگا لیا۔

"ارے! اس میں تو نہرو جی کی آواز آ رہی ہے۔"

اردو میں بول رہے ہیں۔" رعنا حیرت سے چلا کر بولی۔

"میرے رسیور میں تو انگریزی میں بول رہے ہیں۔" حسنین بولے۔

"ہاں بھئی یہ نہرو جی کی ریکارڈ کی ہوئی تقریریں ہیں جو یہ رسیور کان سے لگاتے ہی سنائی دینے لگتی ہے۔ یہ چیز ہے انوکھی اور دلچسپ۔"

اسٹال کی اوپری منزل میں ڈھیر ساری تصویروں کے ذریعے نہرو جی کی زندگی اور ان کے کارنامے دکھائے گئے تھے۔ دو جگہ چھوٹے چھوٹے سے آڈی ٹوریم بھی بنے تھے جہاں ان کی زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔

مہاراشٹرا کے لیے چوڑے پویلین میں مشینیں ہی مشینیں تھیں اور مہاراشٹرا کی عظیم صنعتی ترقی کو ظاہر کر رہی تھیں۔ لیکن بچے اپنی دلچسپی کی کوئی چیز نہ پا کر جلد سے جلد اس سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ راستہ ایک ہی تھا اور داخلے کے دروازے سے باہر نکلنا منع تھا مجبوراً بھاری بھاری مشینوں کو اکتائی ہوئی نظروں سے تکتے، بھیڑ میں دھکے کھاتے باہر نکلنا پڑا۔

جموں اور کشمیر کا اسٹال غالباً نمائش کا سب سے نازک سا اسٹال تھا۔ ایک شکارے کی شکل کا بنا ہوا یہ حسین اسٹال ایک مصنوعی جھیل میں پڑا تھا۔ شکارے کے دروازے پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "آپ ایک شکارے میں ہیں" اندر قدم رکھتے ہی شکارہ ہلتا تھا بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی شکارے میں داخل ہو گئے ہیں۔ اندر جنت کشمیر کے حسین رنگین منظر، مختلف خشک میوے، لکڑیوں اور پھلوں کے نمونے اسٹال کی رونق اور حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔

گوا کا گرجا نما اسٹال تھا چھوٹا سا لیکن بڑا حسین تھا۔ سامنے ہی "ہندوستانی دیہات" کا حصہ تھا۔ بس اندر جاتے ہی یہ لگا کہ کسی گاؤں میں پہنچ گئے۔ ویسی ہی جھونپڑیاں۔ کچی زمین۔ کنواں۔ چھوٹی سی نہر حد یہ کہ دیہاتی بیل تک موجود تھے۔ ایک بڑی خوبی یہ کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے دیہاتوں کی جھونپڑیوں کا ایک ایک نمونہ مع دیہاتی ساز و سامان کے موجود تھا۔

بہار کے پویلین کا ایک چکر لگا کر میسور کے اسٹال میں گھسے تو ایسا لگا گویا خوشبوؤں کے دیس میں آ گئے ہوں۔ ہر طرف صندل کی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"آہا کیسی بھینی بھینی خوشبو ہے"، بچے خوش ہو کر چلائے۔

"ہاں بھئی یہ میسور کا پویلین ہے۔ صندل وہاں کی مشہور چیز ہے۔ باہر دروازہ پر جو درخت کھڑا تھا وہ بھی صندل کا تھا اور یہاں دیکھو ہر طرف صندل کی بنی ہوئی آرائشی چیزیں اور فرنیچر کے نمونے نظر آ رہے ہیں۔"

مدھیہ پردیش کا شیشے سے بنا اسٹال بڑا دلکش تھا۔ شیشوں پر کھجوراہو کی مورتیوں کی نقلیں بنی تھیں۔ اندر کھسے بھرے ہوئے مختلف جانور بہت اچھے لگے۔ ہریانہ کے پویلین میں سنجے (اندرا گاندھی کے ساجزادے) کی بنائی ہوئی چھوٹی کار "ماروتی" دیکھنے کے لیے زبردست بھیڑ لگی تھی۔

دہلی کا شیشوں کا بنا اسٹال اپنی خوبصورتی کی وجہ سے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لیکن اندر سے کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھا۔

ہماچل پردیش کا پگوڈا جیسا اسٹال کچھ زیادہ

نہیں، چچا! ہاں تامل ناڈو (مدراس) کے عظیم الشان پویلین میں موم سے بنے پھلوں کے خوبصورت نمونے۔ وہاں کے ساحلی مناظر کی رنگین تصویریں اور ایک مچھیرے کے مچھلیاں پکڑتے ہوئے اور دوسرے مچھیرے اور مچھیرن کا دن بھر کے کام کے بعد آگ تاپتے ہوئے مجسمے جو ارد گرد کے قدرتی جیسے ماحول کی وجہ سے سچ مچ کے لگ رہے تھے، بچوں کو بہت پسند آئے۔

"اب تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" تامل ناڈو کے اسٹال سے نکلتے ہوئے سب ایک زبان ہو کر بولے۔

"ہاں بھئی ایک بج رہا ہے نا! لگنی ہی چاہیے۔" میں نے کہا۔

ہم لوگ اپنے ساتھ ڈبل روٹیاں اور آملیٹ لے گئے تھے۔ سب نے سینڈوچ بنا کر کھائے اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگے لیکن پانی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اتنے بڑے میلے میں یہ عجیب بدانتظامی تھی۔ آخر پریشان ہو کر ایک کھانے پینے کے اسٹال پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حقے کے پانی جیسے رنگ والی "ریڈی میڈ" چائے کے ایک کپ کی قیمت تیس پیسے ہے۔ لوگ پھر بھی یوں ٹوٹے پڑ رہے تھے گویا مفت بٹ رہی ہو۔ آخر یہ طے کیا گیا کہ کوکا کولا پیا جائے جو نسبتاً کم مہنگا تھا یعنی صرف ساٹھ پیسے بوتل۔

گھاس پر تھوڑی دیر لیٹ کر تازہ دم ہو گئے تو پروگرام بنا کہ اب غیر ملکی پویلین دیکھے جائیں۔ شکنتلم تھیٹر سے آگے بڑھے تو ہال آف ٹیکسٹائلس (HALL OF TEXTILES) کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"اُفوہ! یہ اتنا بڑا سارا پویلین کس کا ہے؟" رعنا نے سوال کیا۔

"اس میں ہندوستان کی مختلف کپڑا بنانے والی ملوں کے تیار کیے ہوئے کپڑوں کی نمائش لگی ہے۔" میں نے بتایا۔

اندر گھسے تو سامنے کھڑے، ایک رنگ برنگے ہاتھی نے استقبال کیا۔ سچ مچ کا نہیں تھا کپڑے کا بنا ہوا۔ مگر تھا پورے ہاتھی کے قد کا۔ اس کے بدن پر رنگ برنگے موتی ٹکے تھے۔ اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ویسا ہی ایک ہاتھی چھت کے اندر کھڑا ہے۔ ہاں بھئی چھت شیشے کی تھی۔ سامنے کی دیوار پر کپڑے کے تھانوں پر رنگی رنگ برنگی چھینٹوں سے عجیب خوب صورت ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ اس کا عکس بھی شیشے کی چھت میں آ رہا تھا اور اصل سے زیادہ دل کش لگ رہا تھا۔

اندر کپڑا پہننے کی پوری تاریخ تصویروں کے ذریعہ دکھائی گئی تھی اور طرح طرح کے ماڈل طرح طرح کے لباس پہنے کھڑے تھے۔

وہاں سے نکلے تو ہال آف نیشنس (HALL OF NATIONS) پہنچے۔ اس کی عمارت سطح زمین سے پچیس فٹ اونچی معلق تھی اور فنِ تعمیر کا ایک ایسا عجیب و غریب نمونہ تھی کہ جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ نمائش میں حصہ لینے والے ۷۹ غیر ممالک میں سے ۲۱ کے اسٹال اسی ہال میں تھے۔ افغانستان کی خوب صورت کڑھی ہوئی پوستینیں اور بہترین خشک میوے، بلجیم کے حسین و دلکش کٹ گلاس کے برتن اور بھوٹان کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے اسٹال میں کھڑے بھوٹانی ہمیں بہت پسند آئے۔

مانسرور جھیل کے سامنے روس کا عظیم الشان پویلین تھا اور اس مصنوعی جھیل کے خوب صورت پس منظر نے اس کا حسن اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن اس

کے دروازے کے سامنے لگی کئی فرلانگ لمبی لائن دیکھ کر اُسے دیکھنے کی ہمت کم ہی پڑتی تھی۔ پھر بھی چاند کی مٹی اور مریخ پر چلنے والی روسی گاڑی لیونوخود، کا ماڈل دیکھنے کے شوق میں ہم بھی لائن میں لگ لیے۔ اتنی لمبی لائن کی ایک وجہ گھڑی کا لالچ بھی تھا۔ روسی اپنے پویلین میں داخل ہونے والے ہر لاکھویں آدمی کو ایک ہاتھ کی گھڑی انعام میں دے رہے تھے۔ روسی پویلین دیکھ کر نکلے تو بچوں نے جاپانی پویلین پر چلنے کی ضد کی۔

"سنا ہے کہ وہاں ایک ننھی منی ریل گاڑی بھی ہے اور اپنے آپ چلنے والی چھوٹی چھوٹی موٹریں بھی" کتنی بڑے اشتیاق سے بولی۔

"ہاں بھئی سنا تو ہم نے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

جاپانی پویلین پر بچوں اور ان کے ہمراہ بڑوں کا ایک جم غفیر تھا۔ بچوں کی ریل گاڑی تو خیر ایسی عجیب چیز نہ تھی، دہلی کے بال بھون میں بھی موجود ہے لیکن پاؤں کے دباؤ سے چلنے والی خودکار ننھی ننھی موٹریں واقعی دلچسپ اور قابل تعریف چیز تھیں۔ ان کے منہ بچوں کی دلچسپی کے لیے مختلف جانوروں کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ جاپان کے پویلین میں زیادہ تر تصویریں ہی تصویریں تھیں اور یہی حال زیادہ تر غیر ملکی اسٹالوں کا تھا۔ اس لیے ایک دو اسٹال دیکھ کر ہم ہندوستانی صنعتوں والے حصے کی طرف پہنچ گئے۔ دہلی کلاتھ مل پویلین میں زیادہ تر تصویریں ہی تصویریں تھیں اور یہی حال زیادہ تر غیر ملکی اسٹالوں کا تھا اس لیے ایک دو اسٹال دیکھ کر ہم ہندوستانی صنعتوں والے حصے کی طرف پہنچ گئے۔ دہلی کلاتھ مل کا پویلین سب سے اونچا اور بہت شاندار تھا۔ اندر ایک مشین پر پرنٹنگ کے تولیے ایک ساتھ بنتے ہوئے دکھائے جارہے تھے۔ مفت لال ملز کا اسٹال کنول کی شکل کا تھا اور مصنوعی تالاب میں بنا تھا اس کی ایک روش سے گزرتے ہوئے لوگوں پر خوشبو کی پھوار پڑتی تھی۔ ڈالمیا کا اسٹال مکمل سمنٹ سے بنا تھا اور دو حصوں میں تھا۔ ایک حصہ سنہرے رنگ کی دو بڑی بڑی اڑن تشتریوں پر مشتمل تھا اور دوسرا حصہ ایک مینار نما راکٹ یا راکٹ نما مینار تھا۔ اڑن تشتریوں سے گزر کر مینار پر چڑھے تو نیچے سے ریکارڈ کی ہوئی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین دو ایک۔ زیرو۔ بلاسٹ اور اس کے ساتھ ہی وہ شور ہوا کہ راکٹ ہلنے لگا۔ اور واقعی ایسا لگا کہ ابھی خلا کی طرف پرواز کر جائے گا۔ راکٹ کی کھڑکیوں سے پورے میلے اور شہر کا منظر بس دیکھنے لائق تھا۔

نیچے اترے تو سات بج چکے تھے۔ بچے اور خود میں بے حد تھک چکے تھے اور رنگ برنگی روشنیوں میں جگمگاتے حسین پویلین بھی ہماری توجہ اپنی طرف نہیں مبذول کر پا رہے تھے۔ اس لیے واپسی کا فیصلہ ہوا۔ باہر نکلے تو بس کے لیے ایک میل لمبی قطار دیکھ کر ہوش اڑ گئے ناچار پھر ایک سردار جی کی خدمات حاصل کیں اور خیر سے گھر کو آئے۔


بھارت ایک مُرقّع ہے
مذہبوں کا،
تہذیبوں کا،
زبانوں اور پہناووں کا،
رسموں اور رواجوں کا،
روایتوں اور جذبوں کا،
آدرشوں اور اُمنگوں کا،
کاوشوں اور کامیابیوں کا
بے مثال رنگا رنگی
لازوال یک جہتی
بھارت ایک گلدستہ ہے
جس میں آراستہ
بھانت بھانت کے پھول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دِلوں کو لبھاتے ہیں،
دماغوں کو معطر بناتے ہیں۔
davp 73/123



کہتے ہیں کبھی کبھی جانور بھی آدمی سے زیادہ ہوشیاری دکھاتے ہیں۔ اچھا تو آیئے آج آسٹریلیا کے سرکس کی ایک ہتھنی کی عجیب رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی سنیئے۔

۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ نیو ساؤتھ ویلس کے ہیٹرفیلڈ نامی گاؤں میں ایک سرکس ٹھہرا ہوا تھا۔ اس سرکس میں ایلیس نامی ہتھنی ریل کے بھاری (وزنی) ڈبوں (ڈوگیوں) کو آسانی سے اٹھا کر نیچے رکھنے میں منہمک تھی۔ یکایک اس کے کانوں میں شور کی آواز آئی۔ اس نے آواز کی طرف دیکھا تو اُسے ایک عجیب تماشا نظر آیا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بیل گاڑی ریل کی پٹریوں میں پھنسی ہوئی تھی اس نے آگے بڑھ کر پٹریوں میں پھنسی ہوئی بیل گاڑی کو پھرتی سے کھینچا اور اس کے مالک کو مصیبت سے بچا لیا وہ اپنے اس نیک کام پر بڑی خوش تھی۔

رنگ ماسٹر چارلی کو ایلس بہت عزیز تھی، چارلی کا کہنا تھا کہ میرے ہر جملے کو وہ بخوبی سمجھ لیتی ہے۔ وہ جب کوئی اور کام نہ ہوتا تو ایلیس کے لیے خاموشی بڑی تکلیف دہ ہوتی۔ اس لیے اس سے باتیں کرنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ اگر چارلی اس کی طرف سے بے خبر ہو کر دوسرے سے بات چیت کرنے لگتا تو وہ خود ہی اس کے قریب آ کر اس کی باتوں میں دخل دینے لگتی تھی مگر چارلی کے دھمکانے پر وہ ایک بچہ کی طرح چپ ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ ایلین بر تھر پر ایک مست ہاتھی نے حملہ کیا اور ابھی وہ اُسے روندنے ہی والا تھا کہ ایلیس نے اس ہاتھی کے پیٹ میں اس زور سے دھکا دیا کہ وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ صرف ایلیس کی ہوشیاری کی وجہ سے

ایلین برتھ کی جان بچ گئی۔

۱۹۱۴ء کا ذکر ہے کہ سڈنی میں سرکس میں ہاتھیوں کے کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہاتھی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور قریب تھا کہ ہاتھی کے پیروں تلے روندا جاتا کہ عورتوں کے شور اور مردوں کی چیخوں نے ایلیس کو چونکا دیا وہ آگے بڑھی اور اپنی سونڈ میں بچے کو اٹھا کر اس کی ماں کی گود میں دے دیا۔

۱۹۵۳ء میں نیوزی لینڈ میں سرکس کے پروگرام ہو رہے تھے اس وقت ایلیس کی عمر ۱۰۷ سال کی تھی۔ بڑھاپے میں اسے آرام پہنچانے کے لیے سرکس کے مالک نے اسے میلبورن کے عجائب گھر میں رکھ دیا تھا۔ جہاں اس کی صحت خراب ہوگئی سرکس کے ساتھیوں کی جدائی کا اسے بے حد غم تھا۔ اس لیے اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ چڑیا گھر کے دوسرے ہاتھیوں سے الگ تھلگ گم سم سی رہنے لگی۔ غمگین اور پریشان سی وہ دن دن بھر ایک جگہ کھڑی رہ کر دن بتانے لگی سرکس جب نیوزی لینڈ کے دورے سے واپس آیا تو ایلیس کی حالت بہت خراب اور قابلِ رحم تھی۔

جب سرکس کا کوئی جانور بیمار ہو کر دواخانے چلا جاتا اور تندرست ہو کر واپس آتا تو اس کی واپسی پر تمام جانور اس کا استقبال کرتے تھے۔ ایلیس دوسرے ہاتھیوں کی بڑی چہیتی تھی۔ اسے دواخانے سے واپس لانے والے ٹرک کو دیکھ کر اس کی بو سونگھ کر دوسرے ہاتھیوں نے جان لیا کہ ان کی پرانی دوست آرہی ہے۔ اس کی بو آتے ہی دوسرے ہاتھیوں نے زور زور سے چنگھاڑ کر اس کا استقبال کیا اور ایلیس نے ایک ایک کو اپنی سونڈ سے چھو کر اور سونڈ ان کے سروں پر پھیر کر آشیرباد دیا۔ اسے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی تھی سرکس میں پہنچ کر اس کا دکھ کوسوں دور چلا گیا اور اس کے چہرے پر خوشی چھا گئی۔

ایلیس بڑھاپے میں بھی سرکس میں کام کرنا چاہتی تھی مگر کمزوری کی وجہ سے وہ مجبور ہو جاتی تھی ۱۹۵۹ء تک وہ سرکس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے رہتی تھی۔ اس کے بعد اس کی تندرستی نے جواب دے دیا۔ اس کا وزن ۵۰۰ پونڈ کم ہو گیا تھا اب اس کے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

۱۹۵۶ء میں سڈنی میں سرکس کے آخری شو کے بعد "برتھ سرکس دوسرے شہر کو روانہ ہو رہی تھی ایلیس کو ٹرک پر چڑھایا جا رہا تھا مگر اس کے پیروں کی طاقت نے جواب دے دیا اور وہ ڈگمگانے لگی" ڈیلیلا نامی اس کی سہیلی نے اس کی مدد کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا ایلیس دھڑام سے زمین پر آرہی اب ڈاکٹروں نے بھی بتایا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس کا جینا محال ہے۔

ایلیس کا تڑپ تڑپ کر مرجانا کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ اس لیے سب کی رائے سے اسے گولی سے ماردینا طے پایا۔ نہایت ہمدرد، بڑی چونچال ہوشیار اور ذہین ہتھنی کی موت سے ساری آسٹریلین جنتا غم کے سمندر میں ڈوب گئی۔ (مراٹھی سے)

تیرہویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ

"پیٹرکن نے جوتے بنائے"



ہیروں کے غار کی سیر کے بعد تازہ ہوا اور چمک دار تیز دھوپ، بڑی فرحت بخش معلوم ہوئی ہم اس غار میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں رکے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ہمیں یہ وقفہ بہت طویل معلوم ہو رہا تھا۔

کپڑے بدلتے وقت اور گھر کی طرف چلتے ہوئے راستہ میں ہم نے غار کے تذکروں سے غریب پیٹرکن کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن غار کے عجائبات کا دلچسپ اور انوکھا حال سُن کر اسے سخت افسوس ہو رہا تھا آخر اُسے غوطہ لگانا کیوں نہیں آیا لیکن اس معاملے میں ہم اس کی کوئی مدد بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔

جب ہم پیٹرکن کو ہیروں کے غار کے بارے میں وہ سب کچھ بتا چکے جو بتا سکتے تھے اور خاموش ہو کر تیزی سے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے تو اچانک ہمیں ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"یہ رہا ٹکٹ!" پیٹرکن نے ایک عجیب سی آواز میں چیخ کر کہا اور اپنا بھالا سنبھال لیا۔

"ارے سنو تو!" جیک چلایا "یہ تو تمھارے دوست ہیں پیٹرکن، اور صرف تم سے ملاقات کرنے اس طرف آئے ہیں۔"

اس سے پہلے تو جزیرے کی اس سمت میں میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں۔

"جلدی آؤ!" پیٹرکن نے جیک کی بات پر کان دھرتے ہوئے چلا کر کہا اور تیزی سے درختوں کی طرف بڑھا۔ میں اور جیک مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے۔

اور اب پہلے سے بھی تیز آوازیں وادی میں سنائی دیں۔ اس وقت ہم اس چھوٹی سی وادی کے سامنے تھے جو وادیٔ جہاز اور ہیروں کے غار کے بیچ میں تھی۔

"میں کہتا ہوں، پیٹرکن" جیک سرگوشی کے انداز میں چلایا۔

"کیا ہے بھئی؟"

"ارے بندۂ خدا۔ ایک منٹ ٹھہرو تو۔ سوّر ادھر پہاڑی پر ہیں۔ اگر تم رالف کے ساتھ جاکر اس چٹان کے نیچے کھڑے ہو جاؤ تو میں چکر کاٹ کر پیچھے سے انھیں دوڑاؤں گا۔ تاکہ تم لوگوں کو شکار کا بہتر موقع مل سکے۔ ہاں یہ خیال رہے پیٹرکن کہ وہ موٹا اور نوجوان ہو۔" جیک نے جھاڑیوں میں گھستے ہوئے کہا۔

"بس ابھی لو!" پیٹرکن نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

ہم نے چٹان کے پیچھے پوزیشن لے لی تھی۔ "میرے دل میں ان نوجوان سوّروں کے لیے بڑی جگہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی جگہ میرے ......"

"وہ آرہے ہیں دیکھنا!" میں چلایا اور پیٹرکن کی بات نامکمل رہ گئی۔ جیک کی ایک زوردار چیخ نے پورے گلے کو پہاڑی سے نیچے بھیج دیا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر پیٹرکن کے لیے ساکت (خاموش) رہنا مشکل تھا۔ اس سے پہلے کہ سوّر زیادہ قریب آجاتے اس نے انھیں دیکھنے کے لیے اپنا سر چٹان کے پیچھے سے نکالا۔

اسی لمحے دو ننھے سوّر جو اپنے گلے سے آگے نکل آئے تھے، اچانک تیزی سے دوڑتے ہوئے چٹان کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک تو پیٹرکن کے کان سے رگڑ کھاتا ہوا گزر گیا اور دوسرا کوئی راستہ نہ پاکر سیدھا پیٹرکن کے بازوؤں میں آگرا اور پھر وہ اور پیٹرکن دونوں ڈھلان پر دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ لیکن وہ ننھا سوّر زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی سنبھل گیا اور ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اس نے پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کا نشانہ لیا۔ خوش قسمتی سے نشانہ اچھا تھا اور وہ پتھر اس کے سر پر اس زور سے لگا کہ دوسرے ہی لمحے وہ مردہ ہو کر زمین پر گر پڑا۔

"بہت اچھے رالف۔ بس تم ہی کر سکتے تھے۔" پیٹرکن چلایا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گرد میں اٹا ہوا تھا لیکن اس کے کہیں چوٹ نہیں آئی تھی۔

وہ تیزی سے وادی کی سمت دوڑا جہاں سے آتی ہوئی سوّروں کی تیز چیخیں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ وہ نزدیک آچکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اب میں دوسرا سوّر نہیں ماروں گا۔ کیونکہ اگر پیٹرکن ان

میں سے ایک بھی مارنے میں کامیاب ہو گیا تو دو ہو جائیں گے اور ہماری موجودہ ضرورتوں کے لیے یہ دو سور بھی کافی سے زیادہ ہوں گے۔

اچانک وہ پگڈنڈی تیزی سے وادی میں گھس آیا۔ آگے آگے دو تین ننھے ننھے سور تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ایک بہت موٹی اور بوڑھی سورنی ننھے ننھے بچوں کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔

"اے پیٹرکن،" میں نے کہا۔" وہ رہا ایک بہت عمدہ اور موٹا تازہ سور۔ بس اسے چھید ڈالو۔"

لیکن پیٹرکن اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ اس نے ان ننھے سوروں کو گزر جانے دیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے اور بھنویں سکڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت خوف ناک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر رہا ہے۔

"یہ کیا؟" میں نے ذرا خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

اچانک اس نے اپنا بھالا اٹھایا اور ایک ایسی بھیانک چیخ ماری جس نے میرا خون تک رگوں میں منجمد کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا بھالا بوڑھی سورنی کے دل کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

"او پیٹرکن!" میں اس کے قریب جا کر بولا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

"کیا کیا؟" میں نے ان کی ماں کو مار ڈالا۔ بس" وہ کچھ خوف زدہ سی نظروں سے مردہ جانور کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہیلو۔ یہ کیا ہے بھئی" جیک اوپر آتا ہوا بولا۔

"کیوں پیٹرکن۔ ایسا لگتا ہے کہ نہیں۔ بوڑھے جانور کا سخت گوشت اچھا لگتا ہے۔ لیکن اتنا میں بتائے دیتا ہوں کہ اگر تم نے اس بڑھیا سورنی کا گوشت کھانے کی کوشش کی تو دانتوں پسینے آ جائیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا تم نے اس کا شکار کیوں کیا آخر؟"

"مجھے ایک جوڑ جوتوں کی ضرورت ہے۔"

"لیکن جوتوں کا بھلا اس بڑھیا سورنی سے کیا تعلق" میں اس کے اس لا پروا ہی کے جواب پر مسکراتا ہوا بولا۔

"میرے موجودہ جوتوں کا بے شک اس سے کوئی تعلق نہیں،" پیٹرکن نے جواب دیا۔ "لیکن میرے آئندہ جوتوں کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے رالف کہ جب میں نے دیکھا کہ تم نے اس ننھے سور کو اتنی آسانی سے گرا لیا ہے تو میں نے سوچا کہ اب دوسرے کو مارنے کی ضرورت نہیں لیکن پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ عرصے سے مجھے اپنے جوتوں کے لیے چمڑے کی ضرورت ہے اور یہ بڑھیا سورنی مجھے اتنی سخت نظر آئی کہ میں نے فوراً اسے اپنے بھالے سے چھید ڈالنے کا ارادہ کر لیا اور یہ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ جو میں نے سوچا وہ کر دکھایا۔"

"یقیناً۔ تم نے کمال کر دیا پیٹرکن۔" جیک نے جانور کا معائنہ کرتے ہوئے پیٹرکن کی تائید کی۔

اب ہمارے سامنے ان جانوروں کو گھر تک لے جانے کا مسئلہ تھا۔ فاصلہ تو تھوڑا ہی تھا۔ لیکن سورنی بہت بھاری تھی۔ آخر ہمارے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ ہم نے سورنی کے چاروں پیر باندھ دیے اور ان کے بیچ سے بھالے

کا بڑا سا دستہ گزار دیا۔ ایک سرا جیک نے اپنے کندھے پر رکھا۔ اور دوسرا میں نے اپنے کندھے پر۔ اور اس طرح "ڈنڈا ڈولی" کرتے ہم گھر کی طرف چلے۔ رہا وہ ننھا سور تو اسے پیٹرکن نے لاد لیا۔ اور اس طرح پیٹرکن کے الفاظ میں بامقصد شکار کے پھل لیے ہم گھر لوٹے۔

اس رات کا کھانا اتنا مزے دار تھا کہ پیٹرکن بعد میں بھی اس کا تذکرہ کرتے کرتے رال ٹپکانے لگتا تھا۔ اور اس لیے مجھے یہ کہنے میں ذرا جھجک نہیں کہ اس رات جب ہم کھانا کھا کر اپنے گھاس اور پتوں کے بستر پر لیٹے تو بہت مطمئن تھے۔

(پھر کیا ہوا؟ کیا وہ کشتی جسے پیٹرکن نے حضرت نوح کی کشتی بتایا تھا، بن سکی؟ کیا تینوں ساتھی جزیرۂ پنگوئن جا سکے؟ یہ اور اسی طرح کے دوسرے سوالوں کا جواب معلوم کرنے کے لیے ستمبر کے پیامِ تعلیم میں اس دلچسپ اور انوکھے ناول کی چودھویں قسط پڑھیے گا۔

★ اچھے کاموں کا معیار صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس سے نوعِ انسانی کو مسرت حاصل ہو۔ (مل)

★ اس خوشی سے دور رہو جو کل غم بن کر کانٹے کی طرح دکھ دے۔

(ہاربرٹ)

ادارہ



۱۹۷۳ء کی چند ہمالیائی مہمیں

ہمالیہ کی چوٹیوں خصوصاً ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنے کی کوششوں کا سلسلہ تو بہت دنوں سے جاری ہے۔ لیکن دیس کی آزادی کے بعد تو ان کوششوں میں خاصی تیزی آگئی ہے اور اب تو یہ مہم جوئی یا کوہ پیمائی جیسے سالانہ کا معمول بن گئی ہے۔ پیامیوں کو یاد ہوگا غالباً پچھلے سے پچھلے سال ہم نے ان مہموں کا کافی تفصیل سے ذکر کیا تھا اور پیامیوں نے یہ مضمون بہت دلچسپی سے پڑھا تھا۔

۱۹۷۳ء میں بھی اس سلسلے میں کافی جوش و خروش رہا اور اٹلی کی ایک مہم نے ایورسٹ کی چوٹی پر سر کرنے میں جو کامیابی حاصل کی تو جوش و خروش اور بڑھ گیا۔ یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنے کی کوشش برسہا برس سے ہو رہی تھی اور ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ آخر کامیابی کا سہرا تین سنگھ اور ایڈمنڈ ہلاری (آسٹریلیا) کے سر بندھا۔ پھر تو ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی بہت سی مہموں نے ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیابی حاصل کی اور دنیا کی اس سب سے اونچی چوٹی کو سر کرنے کا جذبہ اب بھی لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔ اور اب بھی یہ بہت جوکھم کا کام ہے۔ اسی لیے اس سال اٹلی کے مہم بازوں کی یہ کامیابی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم اس کا حال "سب ساتھ" ہفتہ وار دہلی کے شکریے کے ساتھ ذرا تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔

اٹلی کے کوہ پیماؤں کی یہ مہم ۵-۱ور ے مئی کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی۔ اس مہم میں ۶۴ آدمی شریک تھے۔ مہم کے سربراہ یا سردار مسٹر گڈو مانزینو تھے۔ یہ بہت ہی تجربے کار اور مشہور کوہ پیما (پہاڑ پر چڑھنے والے) ہیں۔ یہ ان کی اٹھارویں اور آخری مہم تھی۔ ان کی مہم کوہ پیما اٹلی واپس جاتے ہوئے دہلی سے گذرے تھے یہاں انھوں نے بتایا کہ ہماری کامیابی کا راز بہت کچھ وہ کتاب ہے جو ایورسٹ کی ہندوستانی مہم کے بارے میں لکھی گئی ہے اور جسے ہم نے بائبل کی طرح اپنی تیاری کی زمانے میں استعمال کیا۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ "میں ان ہندوستانی رہنماؤں اور ہندوستانی عوام کا ممنون ہوں جنھوں نے ہمیں خیر سگالی اور مبارک باد کے پیغام بھیجے ہیں"

ان کوہ پیماؤں کا انتخاب کوہ پیمائی کی تربیت دینے والے پانچ اسکولوں سے کیا گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر نوجوان تھے ان کی عمریں ۲۱ سے ۳۵ برس تک ہیں۔

مانسز ہونے کہا کہ تیاری اتنی مکمل اور انتظام اتنا اچھا تھا کہ مہم کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ دو ایک جگہ تیز ہواؤں کی وجہ سے کچھ پریشانی ہوئی اور بس"۔ مانسز نیو خود بنیادی کیمپ میں رہے اور رسد کے انتظام کی نگرانی کرتے رہے۔

یہ مہم ۲-اپریل کو شروع ہوگئی تھی۔ مگر پوری جماعت آگے کے کیمپ یعنی کیمپ نمبر ۲ پر رکی رہی۔ اس لیے رکی رہی کہ کوہ پیما اونچائی کے اور موسمی حالات کے عادی ہو جائیں۔ اس درمیان میں کوہ پیما کیمپ چار تک گیے۔ مگر پھر کیمپ نمبر ۲ پر واپس آگئے تاکہ آخری یورش کے لیے پوری تیاری کر سکیں۔

ان کوہ پیماؤں میں کاریل کی عمر کل ۲۱ سال ہے۔ اپنی جماعت میں یہ سب سے کم عمر ہیں وہ کہنے لگے "مگر ایک شرپا مجھ سے بھی کم سن تھا۔ اس کی عمر ۱۹ ہی برس تھی۔"

اٹلی کے جو کوہ پیما چوٹی پر پہنچے: منیتزرو، اننا ہوراؤ، بنڈیٹی، ایلس، کاریل ہیں۔ یہ سبھی نوجوان تھے۔ یہ سب پیشہ ور کوہ پیما ہیں۔ ایلبر ہیں، استاد ہیں اور فوجی افسر ہیں۔ ان کے چہروں پر کامیابی کی شرح روئی جھلک رہی تھی۔

ایک اخباری نامہ نگار نے کاریل سے پوچھا: "جب آپ چوٹی پر کھڑے تھے تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟"

کاریل نے جواب دیا "مجھے بہت خوشی تھی کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ مگر دو فٹ مربع رقبے کی چوٹی پر تنہائی کا احساس ہو رہا تھا"

اور پھر انھوں نے کہا: "ہم لوگوں نے چوٹی پر چڑھائی ٹولیوں میں کی۔ پہلی ٹولی ۵-مئی کو چوٹی پر پہنچی۔ دوسری ۷-مئی کو۔ میں چوٹی پر تقریباً ۴۰ منٹ رہا۔ اس قدر سبھو کا تھا کہ بسکٹ کا پورا ڈبا کھا گیا۔ میں نے وہاں دو جھنڈے لہرائے: اٹلی کا اور نیپال کا۔ اٹلی والوں نے ایک تختی بھی چھوڑی یہ ہمیں پوپ نے دی تھی۔ شرپاؤں نے نیپال کے بادشاہ اور ملکہ کی تصویریں چھوڑیں۔

۵-مئی کو اٹلی کے دو کوہ پیما اور دو شرپا چوٹی پر گئے اور ۷-مئی کو اٹلی کے تین کوہ پیما اور ایک شرپا چڑھے۔ کاریل نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: "ہمالیہ پہاڑ اٹلی کے پہاڑوں سے کہیں زیادہ دشوار گزار ہے۔ یہاں کا موسم بہت پُرفریب ہے۔ ناقابلِ یقین ہے۔ جب ہم ایک کنارے پر چڑھ رہے تھے تو برف کے طوفان نے آلیا۔ مگر بھلا ہو ہمارے رہبر کی انتظامی صلاحیت کا ہم لوگ اس طوفان سے صحیح سلامت نکل آئے۔"

دِلّی کے طالب علموں کا کارنامہ:

اس سے پہلے کے مضمون میں ہم بتا چکے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی خصوصاً تین سنگھ اور ایڈمنڈ ہلاری کے ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کے بعد پورے ملک میں کوہ پیمائی یا پہاڑوں پر چڑھنے کا ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ دارجلنگ کے علاوہ جگہ جگہ کوہ پیمائی کی تربیت دینے کے اسکول کھل گئے جگہ جگہ کوہ پیمائی کے کلب اور ایسوسی ایشن قائم ہو گئیں۔

بھلا ہماری دِلّی جو پورے دیس کا دل ہے۔ کیوں محروم رہتی۔ یہاں بھی ایسوسی ایشن اور کلب قائم ہو گئے ہیں۔ اور تقریباً ہر سال پہاڑوں پر چلنے کی اور چوٹیوں پر چڑھنے کی مشق کے سلسلے میں طالب علموں کی ٹولیاں پہاڑوں پر جاتی رہتی ہیں۔

اس سال بھی دِلّی کے ۱۹ طالب علموں نے کل ہند اسکولوں

کی گڑھوالی مہم کے سلسلے میں، ۲۰۹۵۹ اونچی بلیک پیک۔ (کالی چوٹی) کو سر کرنے میں حصہ لیا اور یہ ان کے لیے بہت جوش دلانے والا بہت ہی ہیجان انگیز امنگ اور ولولہ پیدا کرنے والا تجربہ تھا۔ اور بار بار اسے دہرانے کی خواہش دلوں میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان طالب علموں میں کافی تعداد دِلّی کے مدرسوں کی ہے ان کے علاوہ دون اسکول (دہرہ دون) اور میو کالج (اجمیر) کے کچھ پرانے طالب علم بھی ہیں۔ دِلّی کے طالب علموں میں چار تو یہاں کے سرکاری اسکولوں کے تھے۔ دو دِلّی کے ایڈمنسٹریشن اسکولوں کے تھے۔ دو نئی دہلی میونسپل اسکولوں کے تھے۔ مہم کا اہتمام دہلی ماونٹیئرنگ ایسوسی ایشن کی طرف سے کیا گیا تھا۔

یہ چوٹی بارہ جون سہ پہر کو سر کی گئی۔ چوٹی پر چڑھنے والے تین پرانے طالب علم تھے۔ تاہم سبھی طالب علموں کے لیے یہ ایک یادگار دن تھا۔

پہلے لڑکے ہری کی دون (HARI-KIDOON) کے کیمپ میں لے جائے گیے۔ یہاں انھوں نے برف پر چڑھنے کی اور برف پر چلنے کی مشق کی۔ انھیں تربیت دینے والوں میں میو کالج (اجمیر) کے سابق پرنسپل مسٹر جے گبسن اور پہاڑوں کی چڑھائی کے بہت ہی تجربے کار اور پرانے ماہر مسٹر سومی داس (موجودہ پرنسپل میو کالج) اور دارجلنگ کے شرپا شامل تھے۔

اپنے اس کیمپ سے یہ لڑکے، ۱۵ میل دور "رُل شار تال" (RULSHAR-TAL) بھیجے گئے یہاں انھوں تقریباً دو ہزار دو سو فٹ کی اونچائی پر بنیادی کیمپ قائم کیا اس بنیادی کیمپ سے ایک ہزار فٹ کی اونچائی پر الرالو نے مل کر پہلا کیمپ قائم کیا پھر مختلف اونچائیوں پر دوسرا اور تیسرا کیمپ لگایا گیا۔

چوٹی کو سر کرنے کی پہلی کوشش دس جون ۷۳ء کو کی گئی لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ لڑکے اپنی اس ناکامی سے ذرا بد دل نہیں ہوئے۔ اب کے انھوں نے تیسرے کیمپ سے بھی اوپر چوتھا کیمپ لگایا اور بارہ جون دو بارہ کوشش کی گئی اور کامیابی نصیب ہوئی۔

بہت پرانے طالب علم جو چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے ان کے نام ہیں (۱) سدھیر ساہلی (۲) گرپریت سنگھ اور (۳) درشن سنگھ، ماؤنٹینیرنگ ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر اے۔ پی۔ ایس اہلو والیا ڈپٹی۔ ایم۔ اے کا کہنا ہے کہ ایسوسی ایشن لڑکوں میں کوہ پیمائی اور مہم جوئی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور بہت سے لڑکوں میں کوہ پیمائی اور مہم جوئی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور بہت سے لڑکوں کی تو یہ دلی خواہش ہے کہ انھیں کوہ پیمائی کے موقع بار بار ملیں لیکن ایک تو پیسے کی کمی یا مالی دشواری کے سبب دوسرے صحیح وقت پر چھٹی نہ ملنے کے سبب انھیں موقع نہیں ملتا۔ اور دل کی دل ہی میں سب رہ جاتی ہے۔

حادثے اور قربانیاں: ان کامیابیوں کے علاوہ کوہ پیماؤں کے مختلف گروپوں اور جماعتوں کو بھی چھوٹی موٹی کامیابیاں ہوئیں۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ نئی دہلی کی ایک خبر کے مطابق ہندوستان اور تبتی سرحد کی پولس کی ملی جلی ٹیم نے کمایوں کے ہمالیائی علاقے میں پنچولی کی چوٹی کو سر کیا۔

ان کامیابیوں کے ساتھ ساتھ کچھ حادثے بھی ہوئے آپ جانیں پہاڑوں پر چڑھنا ان پر راستہ بنانا۔ موسم کا مقابلہ کرنا۔ خصوصاً ہمالیہ کا موسم تو بہت ہی ناقابلِ اعتبار ابھی موسم صاف تھا اور دیکھتے دیکھتے برفانی طوفان آگیا۔ کوہ پیما کو ان سب کڑی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی منزل تک پہنچتے پہنچتے جانیں بھی دینی پڑتی ہیں۔

کہتے ہیں اس سال ایک نہ دو سات کوہ پیما ہمالیہ کی نذر ہو گئے۔ بے چاروں نے ہمالہ کی چوٹیوں پر پہنچنے کی کوشش میں جان دے دی۔ ان میں چار جاپانی کوہ پیما اور ایک شرپا برفانی تودے میں پھنس گئے۔ اس مہم کا اہتمام جاپان کے شمانوسی۔ بی۔ ام۔ الپائن کلب نے لیا تھا۔ یہ مہم۔ سنٹرل ہمالیہ میں اناپورنا (۱) کی ۸۰۸۹ میٹر اونچی چوٹی پر چڑھائی کی کوشش کر رہی تھی اور یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب یہ پانچوں آدمی چوٹی پر چڑھائی میں ناکام ہو کر واپس آ رہے تھے۔ اچانک بے چارے برف کے پھسلے ہوئے تودوں میں پھنس گئے ساتھ ہی برف باری نے طوفانی شکل میں انھیں آلیا۔ اور پانچوں کے پانچوں ہزاروں ٹن برف کے نیچے دب گئے۔ چوٹی تک پہنچنے میں کل ۴۴ میٹر رہ گئے تھے۔ کہ اچانک برفانی طوفان نے انھیں آگے جانے سے روک دیا اور ان کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی میں یہ حادثہ پیش آیا۔ اس سال کا یہ سب سے بڑا حادثہ تھا۔

دو اور کوہ پیما اٹلی کی سی گی لوٹریکنگ گروپ کے تھے۔ گروپ کے سردار مسٹر کن سی۔ گی لیو تھے یہ بہت ہی تجربہ کار کوہ پیما تھے۔ ابھی چار ہی سال انھوں نے نہال چوری کی چوٹی سر کی تھی ان دونوں کوہ پیماؤں کی موت سب سے نیچے کے بنیادی کیمپ میں ہوئی۔ پہاڑوں کی اونچائی والی بیماری موت کا سبب ہوتی۔

(ہندوستان ٹائمس کے دو مضمونوں سے اقتباس)

عبدالرحیم نشتر



کب ورشا رانی آئے گی

جانے کب ورشا آئے گی
جانے کب پانی برسے گا
سوکھی دھرتی کب بھیگے گی
آکاش کا دل کب پگھلے گا

مینڈک کب ٹرٹر بولیں گے
کوئل کب نغمہ گائے گی
کب بادل گھر گھر گرجیں گے
کب ورشا رانی آئے گی

کب تک سجو کی پیاسی خلقت
سوکھے کھیتوں کو دیکھے گی
کب بارش کا دھن برسے گا
کب دھرتی سونا اگلے گی

جناب اسرار ندوی (ہسپورہ)



انوکھی عدالت

اس قصّے کے اصل مصنف مصر کے توفیق الحکیم ہیں۔ اس کا ترجمہ "ایک اخبار" میں ڈرامے کی شکل میں چھپا تھا۔ میں اُسے کہانی کی شکل میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ (اسرار ندوی)

ایک نان بائی تھا۔ وہ روزانہ صبح سویرے اپنا چولھا سلگا کر گاہکوں کا انتظار کرتا۔ کوئی آٹا دے جاتا، کوئی گوشت، کوئی مرغ، کوئی بٹیر۔ نان بائی سب کی فرمائش کے مطابق چیزیں پکا کر رکھتا۔ لوگ آتے اور اُجرت دے کر اپنی چیزیں لے جاتے۔

ایک دن ایک آدمی نان بائی کو ذبح کیا ہوا مرغ دے گیا، کہ مرغ مسلم پکا دینا۔ نان بائی مرغ مسلم تیار کرنے میں لگا تھا۔ اور اس کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ اتنے میں شہر کے قاضی کی سواری ادھر سے گذری۔

قاضی صاحب نے گھر پہنچتے ہی ملازم کو نان بائی کی دکان سے مرغ مسلم لانے کی فرمائش کی۔ بے چارہ نان بائی عجیب چکّر میں پڑا۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے ملازم سے کہا "چلو، میں خود لے کر آ رہا ہوں" نان بائی قاضی صاحب کے پاس مرغ مسلم لئے ہوئے آیا اور دبی زبان سے بولا۔ "یہ مرغ ہمیں ایک صاحب نے پکانے کو دیا تھا۔"

قاضی نے کہا۔ "اس سے کہہ دینا مرغ اڑ گیا۔"

اس جواب سے نان بائی کی تسلّی نہ ہوئی۔ اس نے کہا "حضور وہ شخص مرغ ذبح کر کے دے گیا تھا۔"

قاضی نے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور وہ نہ مانا تو؟" باورچی نے پوچھا۔

"تو اُسے میرے پاس لے آنا"، قاضی نے اطمینان دلایا۔

اس جواب سے باورچی بے فکر ہو گیا اور چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد مرغ کا مالک دکان پر آیا اور مرغ مسلّم طلب کیا۔

باورچی کے پاس قاضی جی کا جواب تیار تھا۔

"صاحب وہ مرغ تو آنچ پر رکھتے ہی اڑ گیا۔"

"کیا مرغ اڑ گیا؟"

مرغ کے مالک نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں، کہہ تو رہا ہوں کہ چولھے پر رکھتے ہی مرغ اڑ گیا۔ اب کس زبان میں کہوں۔"

یہ روکھا جواب سنتے ہی مرغ کا مالک لال پیلا ہوگیا۔ چور، بے ایمان، حرام خور، جھوٹا، ایک سانس میں وہ سب کچھ بک گیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ دکان کے سامنے بھیڑ جمع ہوگئی۔ باورچی کھایا پیا، ہٹا کٹا آدمی تھا۔ کسی کے گھونسہ جمایا، کسی پر لات جھاڑی، مرغ والے کو پٹخنی دی اور ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ بھیڑ نے پیچھا کیا۔

باورچی بھاگم بھاگ، بھاگم بھاگ سیدھا قاضی صاحب کی عدالت میں پہنچا۔ مرغ والا بھی پہنچا۔

قاضی صاحب نے دونوں کے بیان سنے۔ پھر مرغ والے سے پوچھا۔

"کیا تمھیں مرغ کے اڑ جانے کا یقین نہیں آتا؟"

"جناب وہ مرغ ذبح کیا ہوا تھا۔"

قاضی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مرغ والے نے جلدی سے کہا۔ "جناب یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"تم مسلمان ہو؟" قاضی نے پوچھا۔

"بیشک" مرغ والے نے جواب دیا

"خدا ہر چیز پر قادر ہے، تمھیں اس کا یقین ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر جس خدا نے اسے پہلی بار بنایا اس میں روح ڈالی وہ دوسری بار ایسا نہیں کر سکتا؟" قاضی صاحب نے ذرا گرم لہجے میں کہا۔

یہ سن کر مرغ والے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اپنی بازی جیتی ہوئی دیکھ کر باورچی نے ایک ردّا اور جمایا "حضور کا اقبال بلند رہے۔ انھوں نے حرام خور، بے ایمان، چور اور جھوٹا کہہ کر ہزاروں کے بیچ میں مجھے ذلیل کیا۔ حالاں کہ یہ مرغ میرا ہی تھا۔"

قاضی نے حیرت سے پوچھا "ہائیں، وہ کیسے؟"

باورچی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "حضور کا اقبال بلند رہے۔ یہ مرغ جس انڈے سے نکل کر جوان ہوا تھا وہ انڈا میری مرغی کا تھا۔"

مرغ کا مالک گھبرا گیا۔ "وہ کہنے لگا "میں مرغ سے باز آیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

قاضی نے پیشانی پر بل دیتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

"مرغ کے مالک کی باتوں سے عدالت کی توہین کی بو آتی ہے۔ وہ باورچی کے سوالوں کا جواب نہ دے سکا نہ اپنا دعوا ثابت کر سکا۔ ایک بے گناہ کو چور، بے ایمان اور حرام خور کہہ کر اس کی توہین کی۔ اس لیے عدالت باورچی کو بری کرتی ہے اور مرغ کے مالک پر سو روپے جرمانہ کرتی ہے۔"

باورچی جانے ہی والا تھا کہ ایک شخص اپنی ایک آنکھ پہ ہاتھ رکھے ہوئے عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔ "حضور! اس باورچی کو روکا جائے۔ اس نے میری آنکھ بیکار کر دی ہے۔"

"باورچی ٹھہرو! ہاں تم اپنا بیان جاری رکھو۔"
قاضی نے آنکھ کے فریادی سے کہا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ "حضور، میں اسی باورچی کی دوکان والی سڑک سے چلا جا رہا تھا۔ کہ اس کی دکان پر بھیڑ دیکھی۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا کہ باورچی اور مرغ والے صاحب لڑتے ہوئے ہیں۔ میں ان لوگوں کو چھڑانے لگا۔ اس پر باورچی نے مجھے اسی زور کا چانٹا کھینچ مارا کہ میری اس آنکھ کی روشنی جاتی رہی۔ میں عدالت سے انصاف کی درخواست کرتا ہوں۔" قاضی نے اس کو نزدیک بلا کر اس کی آنکھ دیکھی اور کہا "تمھاری اس آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا؟"

"جناب، بالکل نہیں۔"

"تو گویا اب تمھاری ایک ہی آنکھ ہے۔"

"جی ہاں۔"

"جیسے دوسری آنکھ تھی ہی نہیں۔"

"جی۔"

"عدالت تمھارے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔"

"حضور کی عمر دراز ہو۔" آنکھ والے نے خوش ہو کر کہا۔

پھر قاضی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ عدالت تمھارے ساتھ پورا پورا انصاف کرے گی۔ "دیکھو انصاف کہتا ہے۔ آنکھ پھوڑنے والے کی آنکھ پھوڑ دی جائے۔ عدالت تمھیں حکم دیتی ہے کہ تم باورچی کی ایک آنکھ پھوڑ دو۔ اور وہ تمھاری ایک آنکھ پھوڑ دے۔

"اب تو بے چارا آنکھ والا بڑا گھبرایا۔ اس نے جلدی سے پوچھا کون سی آنکھ؟"

قاضی صاحب نے کہا "وہ آنکھ جس سے تم دیکھ رہے ہو۔"

آنکھ والا سوچنے لگا کانا بن کر آیا تھا اور اب اندھا بن کر جانا ہوگا۔ اس سے تو ایک ہی آنکھ بھلی۔ کہنے لگا "جناب والا، میں باورچی کے قصور کو معاف کرتا ہوں۔"

قاضی صاحب نے غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں کسی کو معاف کرنے کا حق نہیں۔ تم عدالت کا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ تمھیں ایک سو روپے جرمانے کی سزا دی جاتی ہے۔"

بے چارے آنکھ والے نے جرمانہ دینے میں عافیت دیکھی اس نے جلدی سے جرمانہ ادا کیا اور چلتا بنا۔

اس کے بعد ایک بوڑھا روتا ہوا عدالت کے کمرے میں داخل ہوا۔

قاضی صاحب نے پوچھا "کیا تم کبھی باورچی کی دکان کے سامنے گزر رہے تھے؟"

بوڑھے نے انکار میں سر ہلایا۔ اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ جناب والا میں اور میرا بھائی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک شور و غل کی آواز کان میں پڑی میں نے نماز ختم کی اور دیکھا کہ ایک بھیڑ مسجد کی طرف آ رہی ہے۔ آگے آگے یہی باورچی تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک بھیڑ تھی میں نے جلدی سے مسجد کے کواڑ بند کر لیے۔ باورچی وضوگاہ کی چھت پر چڑھ گیا اور مسجد میں چھلانگ لگا دی۔ میرا بھائی نماز پڑھ رہا تھا۔ یہ کم بخت اسی پر کود گیا اور اسے روندتا ہوا۔ ایک طرف کو نکل گیا۔ میرا بھائی وہیں دب کر مر گیا۔"

قاضی صاحب نے بوڑھے کی فریاد سننے کے بعد کہا۔ "خدا آپ کے بھائی کو جنت میں جگہ دے۔ کیا مبارک موت پائی ہے۔ لیکن کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہر شخص

کی موت کا وقت اور موت کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے۔ اور اس کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

بوڑھا بولا "جناب والا میں خدا کی مشیت کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ لیکن خدا کی مشیت کا علم اس باورچی کو کیسے ہوا، جسے پورا کرنے کی اسے جلدی تھی؟"

قاضی صاحب زچ ہوتے ہوئے بولے "بھئی، تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

"جناب والا، انصاف چاہتا ہوں۔"

قاضی نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تمھارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔"

بوڑھا خوش ہوا اور قاضی کو دعائیں دینے لگا۔

قاضی صاحب نے فیصلہ سُنایا "دیکھو، انصاف کہتا ہے کہ خون کا بدلہ خون ہے۔ اس لیے میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم بھی وضو گاہ کی چھت پر چڑھ کر باورچی پر چھلانگ لگاؤ تاکہ اسے اپنے کیے کا بدلہ مل جائے۔"

یہ فیصلہ سن کر بوڑھا بوکھلا گیا۔ اس نے کہا "یہ کیوں کر ممکن ہے۔ جناب والا؟"

اس جواب پر عادت کے مطابق قاضی صاحب کو غصہ آگیا۔ انھوں نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ممکن نا ممکن دیکھنا عدالت کا کام نہیں۔ —— تمھاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم عدالت کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے تم پر ایک سو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔"

یہ سن کر بڑے میاں کی سٹّی گم ہو گئی۔ بے چارے ایک لفظ نہ بولے۔ سیدھے گھر کی راہ لی۔

باورچی بے حد خوش تھا۔ نالش کرنے والے منہ کی کھا رہے تھے۔ اُس نے سوچا ایک اور رہ گیا ہے۔ اُسے بھی عدالت میں پیش کر دوں تو اطمینان ہو جائے۔

چنانچہ کمرے کے باہر سے وہ ایک شخص کو دھکیلتا ہوا اندر لایا اور کہنے لگا۔ "حضور کا اقبال بلند رہے یہ گدھے والا ہے۔"

"اچھا اُسے کیا کہنا ہے؟" قاضی نے پوچھا۔

گدھے والے نے گڑگڑا کے کہا۔ "کچھ بھی نہیں حضور مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔"

باورچی جھٹ بول اٹھا "حضور، میں جس وقت ہٹ رہا تھا یہ گدھے والا اپنا گدھا بھگائے لے جا رہا تھا میں نے گدھے کو پکڑنا چاہا تو اُس کی دم ہاتھ میں آگئی میں نے جو کھینچا تو وہ جڑ سے اکھڑ گئی اس پر گدھے نے ایسی دولتی چلائی کہ میرے دو دانت جھڑ گئے (دانت دکھاتے ہوئے) یہ دیکھیے حضور۔ اور یہ گدھے والا کھڑا تماشا دیکھا کیا۔"

قاضی نے گدھے والے سے اور نزدیک آنے کو کہا اور پوچھا "کیا یہ صحیح ہے؟"

گدھے والے نے کہا "جی نہیں حضور۔ ان کے دانت پہلے کے ٹوٹے ہوئے ہیں اور میرا گدھا پیدائشی بے دُما ہے۔"

قاضی نے کہا "میں نے تو بے دُما گدھا آج تک نہیں دیکھا۔"

گدھے والے نے بڑے اطمینان سے کہا "حضور، یہ خدا کی قدرت ہے۔"

قاضی صاحب بڑے چکرائے۔ گدھے والا گرفت میں نہیں آتا ہے۔

پھر کہنے لگے "یہ بالکل جھوٹ ہے۔ بے دم کا گدھا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں حضور، جب بھنا ہوا مرغ اڑ سکتا ہے تو بے دم کا گدھا نہیں ہو سکتا؟" گدھے والے نے کہا۔

اب قاضی صاحب بُرے پھنسے۔ بات کا پہلو بدل کر کہنے لگے تو تمھیں اس باورچی سے کوئی شکایت نہیں؟"

گدھے والے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نہیں حضور میں اور ان حضرت کے خلاف شکایت کروں؟" گدھے والے نے یہ وار بھی خالی دیا۔

لیکن قاضی صاحب بھی کچے کھلاڑی نہ تھے۔ انہوں نے ایک اور پینترا بدلا کہنے لگے "تو پھر تم عدالت میں کیوں کھڑے تھے؟"

گدھے والا اس پینترے کو نہ سمجھ سکا اور بولا۔ "بھیڑ دیکھ کر چلا آیا۔"

اب گدھے والا۔ قاضی صاحب کی گرفت میں آگیا۔ انھوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ چوں کہ گدھے والے نے عدالت کو تماشا گاہ سمجھا جو عدالت کی توہین ہے۔ اس لیے اس پر ایک سو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔

اس فیصلے کے بعد عدالت برخاست ہو گئی۔ جب سب لوگ چلے گئے تو قاضی صاحب نے باورچی سے کہا۔ دیکھا تمھیں بچانے کے لیے ہمیں کتنی تگڑم لڑانی پڑی۔"

باورچی نے کہا۔ "خدا آپ کی عدالت کو قائم رکھے۔ لیکن۔ جرمانے کی رقم میں ....."

"ہاں ہاں تم اطمینان رکھو۔ پورے انصاف کے ساتھ تمھارا حق تمہیں دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر قاضی صاحب اُٹھ گئے۔ باورچی سوچنے لگا۔ کیا قاضی صاحب میرے ساتھ بھی "انصاف" کریں گے۔

★★

ادبی اور تاریخی لطیفے

مولانا حالی ایک مرتبہ سہارن پور تشریف لے گئے اور ایک زمیندار کے ہاں ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے مولانا ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ زمیندار نے ایک کسان کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو پنکھا جھل۔ کچھ دیر بعد کسان نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ زمیندار نے کہا۔ کم بخت تو انھیں نہیں جانتا۔ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ یہ مولوی حالی ہیں۔

اس پر کسان نے حیرت سے کہا۔

"ہالی بھی مولوی ہو سکے ہے" (وہ حالی کو ہالی یعنی ہل چلانے والا سمجھا) مولانا حالی سوئے نہ تھے کسان کا جملہ سن کر پھڑک اٹھے۔ اور فرمایا۔ "حضرت اس تخلص کی داد آج ملی۔"

(۲)

سرسید احمد خان، سید ممتاز علی اور مولانا شبلی بیٹھے ہوئے تھے۔ سرسید کا کوئی ضروری کاغذ گم ہو گیا۔ وہ اُسے تلاش کر رہے تھے مگر مل نہ رہا تھا۔

اتفاقاً مولانا شبلی کی نظر اس کاغذ پر پڑی۔ مولانا نے سرسید کو پریشان کرنے کے لیے اپنا ہاتھ کاغذ پر رکھ دیا۔ سرسید بھانپ گئے کہ وہ کاغذ شبلی دبائے بیٹھے ہیں۔

مسکرا کر بولے "بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے۔ شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت مولانا ذرا دیکھیے کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں ہے۔"

محمد عبید اللہ شریف حیدرآباد

آدھی ملاقات

جولائی کا پیام تعلیم پڑھ لیا ہے۔ سرورق اس بار بھی خاصا دلکش ہے۔ آپ کی کہانی پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ یہ تبرک کبھی کبھی نظر نواز ہوتا ہے۔ دوسری کہانیاں اچھی ہیں۔ لیکن بچوں نے شکایت کی ہے کہ آپ کی کہانی کے علاوہ دوسری سبھی کہانیاں ان کی پڑھی ہوئی ہیں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا ہے اس لیے میں نے ان کی اس شکایت کو چیلنج نہیں کیا۔ حصۂ نظم خوب نہیں بہت خوب ہے۔ لیکن محترم وقار خلیل کی نظم "سمے کی آنکھیں" پتہ نہیں دانستہ یا نادانستگی میں کاتب صاحب کی ستم ظریفی کا شکار ہوگئی ہے۔ اسے جس طرح ایک کونے میں جگہ دی گئی ہے اور جس بے تکے طریقے سے اس کی کتابت ہوئی ہے وہ وقار خلیل صاحب کے شایانِ شان نہیں۔

اپنے ہم نام ڈاکٹر خلیق انجم کا خط نظر نواز ہوا۔ محترم نے فرمایا ہے کہ دنیا کی ہر زبان اور اس کا املا کا صرف ایک اصول ہے اور وہ ہے چلن یا رواج باقی سب غلط۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر غلط الفاظ اور غلط املا رواج پا جائے تو وہ درست ہو جائے گا۔ اگر اکثریت "توتا" کو "طوطا" لکھتی ہے تو طوطا صحیح ہوا اور "توتا" غلط۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبان کی درستگی اور اصلاح کی کوششیں بیکار ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر صاحب کے محض الجھن کا باعث۔ محترم رشید حسن خاں کے مضامین کے چند پہلوؤں اور چند اصلاحوں سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی افادیت سے انکار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر نظر ثانی فرمائیں۔

خلیق انجم اشرفی

مجھے پندرہ تاریخ کو میرا پیام تعلیم ملا۔ سرورق اس قدر خوبصورت تھا کہ دیکھتے ہی چوم لینے کو جی کر گیا اور میں انجانے میں ایسا ہی کر گیا۔ مگر جلد ہی طبیعت اداس ہوگئی کیونکہ من میں اس شبہ نے گھر کر گیا تھا کہ ممکن ہے اس کے پڑھنے میں وہ مزا نہ آئے جو عام پیام تعلیم میں ملتا تھا، کیونکہ حسن کسی سجاوٹ کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر جلد ہی میرا وہم دور ہوگیا۔ موسمی کا جزیرہ بہت ہی شاندار سلسلہ چل رہا ہے۔ مگر بہت مختصر ہوتا ہے۔ معلوماتی مضمون برگیتی سیلان کا میلا اور ہتھیاروں کی کہانی اچھا رہا۔ گرمی کی گرما گرمی بھی اچھی رہی۔ مگر بھئی اب برسات شروع ہو چکی ہے۔ اس لیے پیام تعلیم میں بارش کی سہانی رم جھم کا منتظر ہوں۔ جلد ہی کوشش کیجیے۔

ہم آپ کو ایک صلاح دینا چاہتے ہیں۔ امید ہے آپ میرے اس خیال پر غور کریں گے مشورہ یہ ہے۔ کہ آپ جلد ہی ایک مختصر سا سلسلہ شروع کریں۔ جس میں پیغمبروں کی زندگیوں کے متعلق باتیں بتائی جائیں کیونکہ

پیام تعلیم سے آپ کا مقصد صرف تفریح ہی تو نہیں ہے بلکہ نصیحت آمیز باتیں بھی بتانا ہے۔

مجھے امید ہے آپ میرے اس خیال پر ضرور دھیان دیں گے۔ میں نے اب تک پیام تعلیم کا کوئی خریدار نہیں دیا جس کا مجھے سخت افسوس رہا۔ طبیعت بھی ملامت کرتی رہی مگر میں انشاءاللہ ماہ جولائی سے ایک خریدار ضرور دے دوں گا۔

محمد انوار علی

اِدھر اُدھر سے

دہلی کی راجدھانی حکومت کا ایک غیر معمولی کارنامہ

مشہور پہاڑی مقام مسوری میں دہلی کے مزدوروں کے لیے ہالی ڈے ہوم!

اس سال ہماری دِلّی کی حکومت نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو پورے دیس میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور یہ ہے غریب مزدوروں کے لیے مسوری پہاڑ پر چھٹیاں گزارنے کا انتظام۔

ہمارے دیس میں دولت مندوں سرمایہ داروں کو یہ سہولتیں نہ جانے کب سے حاصل ہیں۔ بے چارہ مزدور ان باتوں کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر آپ جانیں ہماری حکومت تو سماج واد حکومت یا عوامی راج ہے۔ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ سماج یا عوام کے ہر طبقے کا خیال رکھے۔ اس کے نزدیک تو غریب مزدور بھی سیر و تفریح کے اور زندگی کے چند دن ہنسی خوشی گزارنے کے اسی طرح مستحق ہیں جس طرح اونچے طبقے کے لوگ۔

مسوری کے اس ہالی ڈے ہوم یا چھٹیاں گزارنے کے گھر میں آٹھ فلیٹ ہیں۔ ہر فلیٹ میں دو کمرے ہیں اور ہر فلیٹ کے ساتھ باورچی خانہ ہے غسل خانہ ہے بیت الخلا (پاخانہ) ہے۔ کمرے فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ مزدوروں کے لیے کھیل کود کا سامان بھی ہے۔ ریڈیو بھی ہے۔ کھانا پکانے کے برتن بھی ہیں پانچ آدمیوں کا ایک خاندان اس فلیٹ میں بڑے آرام سے رہ سکتا ہے۔ ان سب سہولتوں کے ساتھ کرایہ کُل ایک روپیہ روزانہ۔ ہر مزدور کو دس دن ہالی ڈے ہوم میں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ اس ہوم میں پہلا کنبہ ۱۳- مئی (۱۹۷۳ء) کو آیا اور اور اب تک پندرہ خاندان آ چکے ہیں۔ اور کتنے ہی کنبوں نے پیشگی بکنگ کرائی ہے۔

اس ہالی ڈے ہوم کا افتتاح بہت شان بہت اہتمام کے ساتھ دِلّی حکومت کے چیف ایگزیکیوٹو کونسلر محترم رادھا رمن کے ہاتھوں عمل میں آیا مسوری کارپوریشن کے چیرمین اور دِلّی حکومت کے اکزیکیٹو کونسلر شری بھل بھی تشریف رکھتے تھے۔ ہالی ڈے ہوم قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے انھی کے دماغ میں آیا تھا۔ اور انھی کی رات دن کی کوششوں کی بدولت اس خیال اس منصوبے نے عمل کی شکل اختیار کی۔ ایسی کامیاب شکل!

بھل صاحب کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ انھوں نے دوسرے پہاڑی مقامات پر بھی اسی طرح کے ہالی ڈے ہوم بنانے کے منصوبہ بنایا ہے۔ یقین ہے کہ بھل صاحب کا یہ منصوبہ بھی ضرور کامیاب ہوگا۔ بھل صاحب کی یہ بھی خواہش ہے کہ مرکزی حکومت مدد کرے تو مزدور کنبوں کے لیے ایک طرف کا ریل کا کرایہ معاف کر دیا جائے۔

دِلّی کی حکومت نے خود راج دھانی کے مختلف علاقوں میں بہت دنوں پہلے سے مزدوروں کی فلاح و بہبود اور تفریح کے لیے دس مرکز کھولے ہیں۔ ان مرکزوں میں کھیل کود کا سامان ہے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے لیے لائبریریاں ہیں۔

اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء سے ایک اور منصوبے پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کا نام ہے "مطالعاتی سفر کا انتظام"۔ اس کا

ایک خاص مقصد ہے۔ دِلّی کے مزدور دِلی سے باہر جاکر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ سکیں کہ ہم جتنے مزدوروں کو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے میں کس کس طرح کی سہولتیں اور سہولتیں حاصل ہیں۔ اب تک اس طرح کے دس مطالعاتی دوروں کا انتظام کیا گیا ہے اور اس میں ۲۷۶ مزدوروں نے حصّہ لیا ہے۔

زمین میں انجکشن دیجیے!

جی ہاں زمین میں، کتنی عجیب بات انجکشن جانداروں کے جسم میں دیا جاتا ہے۔ سنتے ہیں پیڑ پودوں میں دیا جاتا ہے۔ پھر یہ زمین کے انجکشن والی خبر تو بالکل نرالی خبر ہے۔ بھلا کیا خبر ہے!

امریکہ میں علم طبقات الارض یا زمین کے اندرونی حصّے کے علم کے ماہر ہیں۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر زمین میں پانی کا انجکشن دے دیا جائے تو زمین میں بڑے بڑے زلزلے آنا بند ہو جائیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کو اس موذی اور خطرناک مرض سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔

امریکہ میں کولوروڈو کے مقام رینگ لے میں علم طبقات الارض کے ماہروں نے یہ تجربہ کیا۔ پانی کی کچھ مقدار انجکشن کے طریقوں سے زمین کے اندر پہنچائی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جو چھوٹے موٹے زلزلے آتے تھے وہ بند ہو گئے۔

بھلا پانی کے انجکشن کا زمین کے اندر کیا عمل ہوتا ہے؟ ماہرینِ طبقات الارض کہتے ہیں کہ پانی زمین کے اندر ان چٹانوں میں جو زلزلے کے مرض میں مبتلا ہیں اندرونی چٹانوں میں پھسلن پیدا کر دیتا ہے اور چٹانیں ایک دوسرے پر آسانی سے پھسل جاتی ہیں۔ ان چٹانوں کو پانی نہ ملے گا۔ تو ان کو پھسلنے میں دشواری ہوگی اور زلزلہ آجائے گا۔

یہ چٹانیں پانی کی مدد سے پھسلتی ہیں تو ان کی حرکت بہت معمولی ہوتی ہے اور زمین میں جھٹکے نہیں آتے۔ اگر چٹانوں کو زیادہ دنوں تک حرکت کا موقع نہ ملے اور وہ بے جگہ رکی پڑی رہیں تو وہ جب حرکت کریں گی زمین میں زلزلہ آجائے گا۔ رینگ لے کا تجربہ بتاتا ہے کہ زلزلہ کا علاج اس انداز پر ممکن ہے۔

(سب ساتھ دہلی)

PAYAM-I-TALEEM

کتابیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

10(9)

تعلیم



ماہنامہ
پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۹

اِڈیٹر

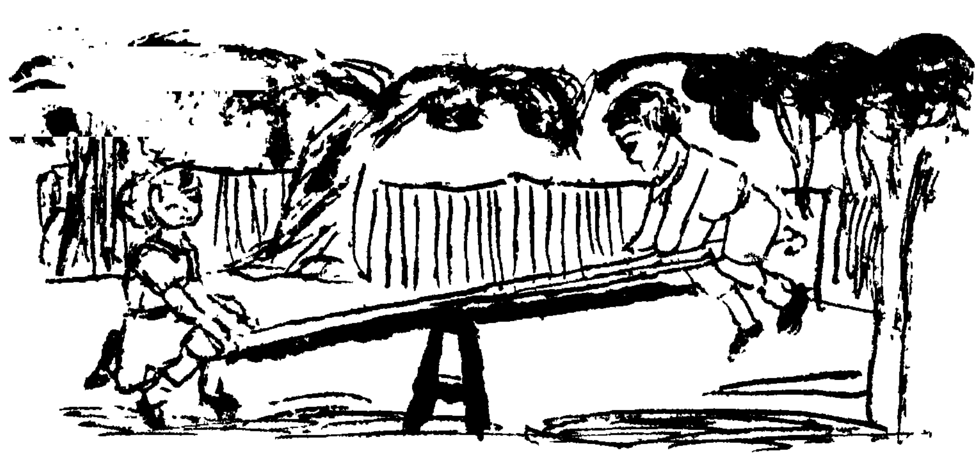
محمد حسین حسان ندوی

ستمبر ۱۹۷۳ء

قیمت ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

فہرست مضامین



بچّوں سے باتیں

۱۵۔ اگست کی تاریخ ہمارے دیس کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آج سے ۲۶ سال پہلے اسی تاریخ کو ہم آزاد ہوئے تھے۔ اسی لیے ۱۵۔ اگست نے ہمارے دیس میں قومی تیوہار کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اور ہر سال یہ قومی تیوہار بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اس سال بھی منایا گیا۔ آج کل ہمارا دیس بہت سی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔ مہنگائی ہے۔ قحط ہے اور اس وقت جگہ جگہ سیلاب کی ہولناکی ہے۔ پھر بھی یہ پچھلے مہینے (۱۵۔ اگست کو) خلوص اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔

پچھلے مہینے (اگست میں) جوہر حامد نیری صاحب کی ایک نظم (پندرہ اگست) اور جناب ناوک حمزہ پوری کا مضمون (ہمارا قومی جھنڈا) اسی مناسبت سے شایع کیے گئے ہیں۔ اس پرچے میں بھی جاوید احمد خاں صاحب کی ایک نظم (جشنِ سیمیں) پڑھیے گا۔

ناوک حمزہ پوری صاحب نے ازراہ نوازش مضمونوں کا ایک سلسلہ ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ ایک مضمون (ہمارا قومی ترانہ) اس پرچے میں چھپنے والا تھا مگر کاتب صاحب اس کی وقت پر کتابت نہ کرسکے۔ اب یہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔ مضمون بہت معلوماتی بہت دلچسپ ہے۔

پچھلے مہینے میں ہمارے کاتب صاحب کی بھول چوک سے دو اہم اور وقتی مضمون شائع نہ ہوسکے۔ ان میں سے ایک مضمون (دُنیا کا طویل ترین سورج گرہن) ہم نے اپنے پرانے کرم فرما محمد امین صاحب ایم۔ اے سے وقت کے وقت لکھوایا تھا۔ اب یہ اس پرچے میں شایع کیا جارہا ہے۔ اسے پڑھ کر پچھلے سورج گرہن (۳۰۔ جون) کے بارے میں آپ کو قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ دوسرا مضمون "ہنڈ کلھیا" پر تھا یہ بھی اسی پرچے میں شایع ہو رہا ہے۔ باوجود گنجایش کی کمی کے ہم بچیوں کے فائدے کچھ اور چیزیں بھی پرچے میں دینا چاہتے ہیں۔

پچھلے پرچے کے مضامین میں قومی جھنڈا، میلے کی سیر، رلیں ستھنی، ہمالیائی مہمیں۔ کہانیوں میں مونگے کا جزیرہ، انوکھی عدالت، پتھر پھوڑ، اور نظموں میں برسات کا موسم (کیف صاحب) "کب ورشا آئے گی" (نشتر صاحب) اور ایک انوکھی نظم کب بارش ہوتی ہے (مسعود صاحب) بہت پسند کی گئی۔

اس پرچے میں سورج گہن کے علاوہ، ٹیڑھا مینار اور ڈولفن کا سرکس بہت پسند آئیں گے۔ کہانیوں میں مونگے کے جزیرے کے علاوہ محترم سہیل عظیم آبادی کی کہانی عقلمند لوگ، نوری تسکارے والی خاص طور سے پسند آئیں گی۔
محترم سہیل عظیم آبادی صاحب اکثر پیام تعلیم کی سرپرستی فرماتے رہتے ہیں۔ ہم ان کے اور ان کے ساتھ ان کے ہونہار بچے

شان الحق کے بھی ممنون ہیں جو اُن سے فرمائش کر کے پیام تعلیم کے لیے کہانیاں بھجواتے رہتے ہیں۔

اس مرتبہ محترم شفیع الدین نیّر صاحب نے پھر نوازش فرمائی ہے ان کی ایک نظم اچھے شہری اس پرچے میں پڑھیے ایک اور دلچسپ نظم اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔ ان کے علاوہ "آزادی کا جشن ہے" "اقوالِ زریں" "اپنا گیت" گڈو بڑا شیطان، دھرتی کے تارے، چل بنجارا بہت دلچسپ اور پیاری نظمیں ہیں۔

اور ہاں بھئی پیام تعلیم کے پرچے کے ٹائٹل کی سبھی نے تعریف کی خصوصاً اس کی بولڈنس کی اور رنگوں کے تناسب اور رنگوں کے ملان کی۔ اس پرچے کا ٹائٹل بھی ان شاء اللہ آپ کو بہت اچھا لگے گا۔

شکر ہے کہ پیامیوں پر اور بزرگوں پر ہماری مسلسل اور پے بہ پے درخواستوں کا اثر ہو رہا ہے اور ایک ایک دو دو نئے خریداروں کے منی آرڈر یا وی پی کے آرڈر روزانہ وصول ہو رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم اپنے عزیز بھائی اسرار ندوی کا کہاں تک شکریہ ادا کریں۔ اسرار صاحب ۷۴ء سے پہلے ایک عرصے تک مکتبے میں کام کر چکے ہیں۔ اس زمانے میں پیام تعلیم میں ان کی کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ اسی لیے انھیں مکتبے سے اور پیام تعلیم سے غیر معمولی لگاؤ ہے اور پیام تعلیم کے لیے برابر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

اور پھر محترمہ انوار جہاں صدیقی بھی پیام تعلیم کی پرانی قدر داں ہیں۔ تقریباً ہر سال پیام تعلیم کے کافی خریدار فراہم کرتی ہیں اور اس طرح ہماری ہمت بڑھاتی ہیں۔ اس سال بھی محترمہ نے بہت سے نئے خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کی یہ نوازش شکریے سے بالاتر ہے۔

پچھلے پرچے میں ہم نے نئے خریداروں کے لیے عام نمبر کے ساتھ تحفے کے طور پر کہانی نمبر یا قہقہہ نمبر بھی بھیجنے کا اعلان کیا تھا۔ اور اس اعلان کے مطابق ہم ہر نئے خریدار کو ان میں ایک خاص نمبر بھیج رہے ہیں اور جب تک یہ نمبر موجود ہیں۔ برابر بھیجتے رہیں گے۔ پیامی اس رعایت سے جلد فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ نئے خریداروں سے ہمارا مقصد ان لوگوں سے ہے جو ستمبر میں خریدار بنیں۔

آپ کا کام

یہ ہے کہ اپنے پیام تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں موجود نہیں ہے تو ہمیں لکھیے۔ ہم آپ کا مشوروں پر غور کریں گے۔ ان مشوروں کی روشنی میں پیام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

اپنے دوست احباب میں پیام تعلیم کا چرچا کیجیے ایسے دوستوں کے پتے بھیجئے جنھیں پیام تعلیم سے دلچسپی ہو۔ پیام تعلیم کے خریدار بنا کر ہماری مدد کیجیے اور اس طرح پرچے کو زیادہ شان دار زیادہ خوب صورت اور زیادہ کار آمد بنانے میں ہماری مدد کیجیے۔

(منیجر)

اچھے شہری

از محمد شفیع الدین نیر

جو لوگ بھی مل کر رہتے ہیں، وہ سب شہری کہلاتے ہیں
یہ شہری آپس میں مل جل کر، اپنے کام چلاتے ہیں

الفت ہے شیوہ ان سب کا، پیار سے مل کر رہتے ہیں
دکھ بھی اگر آجائے کوئی، تو بھی خوش ہو کر سہتے ہیں

یہ شہر کے سب رہنے والے، آزاد بھی ہیں پابند بھی ہیں
خوشحال بھی ہیں، بدحال بھی ہیں غمگین بھی ہیں خورسند بھی ہیں



قانون کی پابندی کرنا، یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں
یہ امن وامان کی دولت کو جنتا کا قرض سمجھتے ہیں
دکھ درد کے ساتھی بنتے ہیں، اور سب کی مدد سب کرتے ہیں
سب ڈاکو، چور، اُچکے، رہزن، سا یے سے ان کے ڈرتے ہیں
ان ہی لوگوں کی کوشش سے جنتا کی بھلائی ہوتی ہے
ان کی محنت کی برکت سے، مسرور خدائی ہوتی ہے
ہے اچھا شہری صرف وہی، جو اچھا پیشہ کرتا ہے !
ہے خوفِ خدا دل میں جس کے، اللہ سے اپنے ڈرتا ہے
ہر پیشہ ور کے دل میں ہو، احساس اپنی خودداری کا
ورنہ ہر پیشہ ماتھے پر ٹیکا ہے ذلت وخواری کا
نیّرؔ یہ تمنا ہو اپنی، ہم اچھے شہری بن جائیں !!
ہم بھی کچھ خدمت کر جائیں، اس خدمت میں راحت پائیں

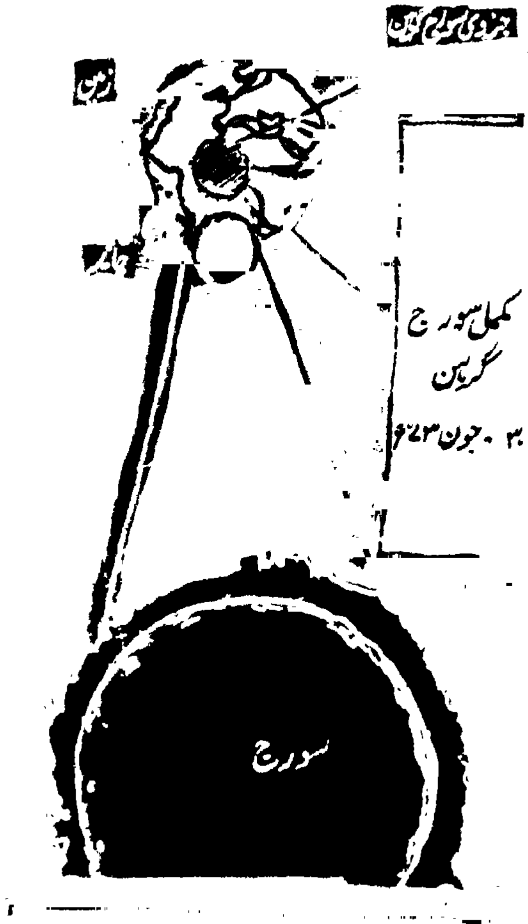
یہ نظم نیرؔ صاحب کی نئی کتاب "ہماری زندگی" میں شائع ہوگی جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

جناب محمد امین۔ ایم اے

دُنیا کا طویل ترین سورج گرہن

بر اعظم افریقہ میں دوپہر کے وقت اندھیرا

۳۰۔ جون ۱۹۷۳ء کو چار سو سے زیادہ سائنس دانوں نے اور افریقہ کے مختلف قبیلوں کے بہت سے لوگوں نے حیرانی کے عالم میں سورج گرہن اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جنوبی افریقہ کے جنوبی مختصر سے علاقے چھوڑ کر یہ گرہن ہر جگہ دکھائی دیا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ۳۰ کروڑ افریقی باشندوں کو مکمل یا نامکمل گرہن دیکھنے کا یہ موقع (وہ بھی دن دہاڑے) بہت زمانے کے بعد ہاتھ آیا تھا۔



جی ہاں، یہ کوئی ایسا ویسا معمولی گرہن نہیں تھا مکمل گرہن تھا اور سورج چاند کے سایے کے پیچھے بالکل چھپ گیا تھا۔ اس طرح دن دہاڑے افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ کینیا مشرقی افریقہ کا ایک اہم ملک ہے۔ یہاں مکمل سورج گرہن دکھائی دیا تھا۔ کینیا کی حکومت اپنے دارالسلطنت نیروبی سے اپنے دور دراز کے علاقوں میں خبریں نشر کر کے مختلف قبیلوں کو بار بار آگاہ کرتی رہی کہ ۳۰۔ جون کو جب دن میں اندھیرا ہوگا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قیامت آجائے گی یا ہماری زمین کے — اور خدانخواستہ ہم سب کے آخری دن آجائیں گے۔ ایسا نہیں ہے یہ محض وہم ہے۔ ہمیں اس سے ڈرنے کی

کوئی ضرورت نہیں۔ یہ محض سورج گرہن ہے اور اس سے نہ تو ہمیں نہ ہماری زمین کو کسی قسم کا نقصان پہنچے گا۔

ساری احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کے باوجود کینیا کے دور دراز کے گانوؤں اور جھونپڑوں میں رہنے .... والے قبیلے کے قبیلے مکمل سورج گرہن دیکھ کر حیرت زدہ ہوتے رہے اور بہت دیر تک ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔ جادو ٹونے والے ڈاکٹر بھی اپنی بات پر اڑے رہے۔

ایک ڈاکٹر بظاہر کچھ روشن خیال نظر آتا تھا اس نے کہا کہ "یہ سورج گرہن کوئی قدرتی چیز نہیں ہے بلکہ یہ سفید چمڑی والے یعنی یورپین اور امریکی وغیرہ جو لوگ ہیں وہ اپنے آلوں سے کچھ ایسا کرتب دکھاتے ہیں کہ یہ گرہن عمل میں آجاتا ہے اور ہم ڈر کر اور دہشت زدہ ہو کر پریشان ہوتے ہیں۔"

لیکن مسائی قبیلے کے ایک آدمی نے جو بات کہی وہ پچھڑے ہوئے قبیلوں کی زیادہ ترجمانی کرتی ہے۔ سورج گرہن دیکھ کر اس نے کہا کہ "سورج مر گیا ہے" یہ سن کر اس کی بیوی بہت پریشان ہوئی اور ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا۔ "یہ دوبارہ زندہ ہوگا یا نہیں؟"

کینیا اور افریقہ کے کئی ملکوں میں بہت سے قبیلے اب بھی نئی تہذیب کو نہیں مانتے نہ کسی مذہب میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کا دراصل اپنا ایک الگ مذہب ہے۔ اس کو پیگنزم (PAGANISM) کہتے ہیں اور وہ خود پیگنز (PAGANS) کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ قدرتی مظاہر پر اعتقاد رکھتے ہیں اور جو چیز بہت اہم یا طاقتور یا روشن ہوتی ہے اسی کو وہ اپنا ان داتا مان لیتے ہیں۔ بہت سے قبیلے سورج کو بھی اپنا دیوتا مانتے ہیں اور گرہن کے وقت وہ بھی مکمل گرہن کے وقت جب سورج نظروں سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتا ہے تو یہ لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں۔

مسائی قبیلے کے علاوہ دوسرے قبیلے (جو جادو ٹونے اور ٹوٹکوں پر یقین رکھتے ہیں) کہتے ہیں کہ سورج گرہن لگنا اس بات کی علامت ہے کہ زمین پر کوئی بہت ہی خطرناک قسم کی مصیبت پیش آئے گی بلکہ ایک سردار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سورج گرہن لگنا منحوس بات ہے اور گرہن بالکل نہ لگے تو اچھا ہے

بہر حال ۳۰ جون کو صبح سویرے سے قبیلے کے قبیلے یہ تماشا دیکھ کر حیران ہوتے رہے کہ سیکڑوں سیاح اور گورنمنٹ کے افسر بھاگ کر خشکی سے اور ہوائی جہاز سے سفر کر کے لوئینگیلانی (LOIBIENGALANI) کیوں جا رہے ہیں۔

لوئینگیلانی، جھیل روڈالف کے اندر ایک نخلستان ہے۔ یہاں لوگ اس لیے جمع ہو رہے تھے کہ مکمل گرہن دیکھ سکیں۔ یہاں ۵ منٹ مکمل گرہن رہا۔

ستاروں کے علم کے چار سو ماہر اور سائنس داں (جو بلجیم، مغربی جرمنی اور کناڈا سے آئے تھے) پہلے ہی سے وہاں جمع تھے۔ ۸۰ ام سائنس داں بھی تھے۔

لوئینگیلانی تاڑوں کا نخلستان ہے اور نیروبی سے شمال میں ۸۰۰ کلو میٹر دور ہے۔ یہاں ہتھیار بند پولیس کا پہرا بھی تھا تاکہ کسی قسم گڑبڑ ہو تو اسے فوری طور سے روکا جاسکے

اور سائنس دانوں کو سورج گرہن کے مشاہدے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔

گھانا کی راجدھانی عکرا میں ہزاروں لوگ اپنی دھوپ والی عینکیں لگا کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ کچھ لوگ شیشے کے ٹکڑوں پر دھوئیں کی تہہ جمائے ہوئے تیار کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے نامکمل گرہن دیکھا اگرچہ مکمل گرہن دیکھنے کے لیے وہ بے چین تھے اور بار بار پہلو بدلتے تھے لیکن انھیں ایسا موقع نہ ملا اور اس طرح وہ کچھ مایوس سے نظر آئے۔

نائیجیریا کے کئی حصّوں میں بھی نامکمل گرہن دیکھا گیا۔ یہاں بھی قبیلے گرہن سے ڈرتے ہیں اور ان کے آبا و اجداد (یا پُرکھے) زمانۂ قدیم سے دہشت کھاتے رہے ہیں۔ اُن کے خوف و ہراس کو دور کرنے کے لیے اور بہت سے ٹونے ٹوٹکوں کی تردید کے لیے نائیجیریا کے اخباروں نے مضامین شایع کرکے لوگوں کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی تاکہ گرہن سے لوگ ڈرنے نہ پائیں۔ باوجود اس کے دور دراز اور کور دہ مقامات کے لوگ اور قبیلے بہت دہشت زدہ اور سورج گرہن سے بہت خائف تھے۔

کینیا کے علاوہ افریقہ کے آٹھ اور ملکوں میں مکمل سورج گرہن دکھائی دیا تھا۔ ان آٹھ ملکوں کے سائنس داں، جاپان کے غباروں کے ماہرین اور دوسرے ممالک کے ستاروں کے علم کے ماہرین، بہت سے سیّاح اور ہالی ووڈ سے آئے ہوئے فوٹوگرافروں کی ٹیم افریقہ کے ریگستان صحرائے اعظم کے شمالی حصّے میں اپنے خیمے وغیرہ نصب کرکے پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی کہ یہ زرّیں موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ وہ اپنے آلے وغیرہ سیٹ کرکے تیار بیٹھے تھے تاکہ نہ صرف جی کھول کر گرہن کا مشاہدہ کر سکیں بلکہ مکمل سورج گرہن کا جائزہ لے سکیں۔

شمالی مغربی افریقہ میں گرہن کی مدت سات منٹ چار سیکنڈ تک رہی۔ اس طرح سائنس دانوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چاند کے سایے میں آئے ہوئے سورج کا خوب خوب مشاہدہ کیا اور اس کے فوٹو اتارے۔ عجیب اتفاق کہ اس بار موسم بھی سازگار تھا اور بادل کے کسی ٹکڑے نے سورج گرہن کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔

پچھلا طویل سورج گرہن ۲۰ جون ۱۹۵۵ء کو لگا تھا۔ اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے دنیا بھر کے سائنس داں سیلون (شری لنکا) میں جمع ہوئے تھے اس لیے کہ اُس وقت مکمل گرہن یہیں سے دیکھنے کا بہترین موقع تھا لیکن ہوا یہ کہ عین وقت پر موسم خراب ہو گیا اور بادل کے ایک ٹکڑے نے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

تم میں سے جو بچے ہوائی جہازوں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ یہ جانتے ہوں گے کہ برطانیہ اور فرانس نے مل کر ایک جمبو جیٹ جہاز بنایا ہے جو آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز اڑان کرتا ہے۔ اس جہاز کا نام کونکارڈ (CONCORDE) ہے۔ اس جہاز میں فرانسیسی اور امریکی سائنس داں بیٹھ کر اپنے سارے آلوں اور کیمروں سمیت گرہن کا پیچھا کرتے رہے۔ ۸۰ منٹ تک پیچھا کرنے کے بعد کونکارڈ کینیا میں جھیل رو ڈولف کے ساحل پر پہنچا جہاں نخلستان لوئنگیلانی میں ۲۰۰ سے زیادہ غیر ممالک کے سائنس داں اپنے

الوسیت، میبعے تھے۔
مقامی وقت کے مطابق اس وقت دوپہر کے بعد ۲ بج کر ۴۴ منٹ کا وقت تھا ہمارے حساب سے شام کے پانچ بج کر پانچ منٹ ۱۱ اس طرح ڈھائی گھنٹے سے زیادہ دیر تک دنیا کے استوائی علاقے میں کنکارڈ کے سائنس دانوں کو سب سے لمبا سورج گرہن دیکھنے کا جو موقع ملا اس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پہلے بھی چاند کے سائے میں زیادہ سے زیادہ دیر تک اڑتے رہنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن اب کی بار کنکارڈ میں بیٹھ کر جو اڑان کی گئی وہ پہلے کی اس قسم کی اڑانوں سے آٹھ گنا زیادہ لمبی تھی۔ یعنی سائنس داں ۷۴ منٹ سے زیادہ دیر تک مکمل سورج گرہن کا مشاہدہ کرتے رہے اور فوٹو بھی اتارتے رہے۔

امریکہ نے الگ سے اپنا ایک جٹ جہاز اڑایا تھا جو لاس اے ماس (LOSALAMAS) سے اڑا تھا۔ اس کے اندر بین الاقوامی سائنس دانوں کی اہم ممبروں کی ایک ٹیم بیٹھی تھی۔ یہ ٹیم لاس اے ماس سے اڑ کر شمالی مغربی افریقہ میں واقع مالی (MALI) کے ملک میں گئی تھی اور وہاں سے گرہن کا مشاہدہ کرتی رہی۔

ستاروں کے ماہر کیتھ پیرس (KEITHPIERS) نے اخباری نمائندوں کو بتایا "ہماری زمین کا سورج کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ گرہن کے دوران مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اگر ہم یہ راز معلوم کر سکیں کہ سورج کس طرح انرجی یا طاقت پیدا کرتا ہے تو شاید ہمیں بڑی زبردست کامیابی ہوگی۔ اور پھر ہم کو اپنے اس طرح کے تجربے کو زمین پر جو قدرتی مسائل درپیش ہیں ان کو حل کرنے کے لیے اور جنرل انجینئرنگ کے کاموں کو آسان بنانے میں بڑی زبردست مدد ملے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ سورج گرہن کیوں لگتا ہے؟ بیشتر بیالی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زمین اپنے مدار پر سورج کے اردگرد گردش کرتی ہے اسی طرح چاند اپنے مدار پر زمین کے اردگرد گردش کرتا رہتا ہے کبھی کبھار اپنی گردش کے دوران چاند سورج اور زمین کے درمیان آجاتا ہے اور سورج کو اپنے عکس میں یا سائے میں چھپا لیتا ہے۔ اس طرح سورج زمین دکھائی نہیں دیتا اور اسی کو ہم سورج گرہن کہتے ہیں۔

۳۰۔ جون ۱۹۷۳ء کو یہی ہوا تھا کہ چاند سورج اور زمین کے درمیان آگیا تھا۔ اس نے اپنے سائے میں سورج کو چھپا لیا تھا اور عجیب اتفاق کہ اب کی بار سات منٹ سے زیادہ دیر تک سورج چاند کے عکس سے باہر نہ نکل سکا۔ اس طرح ایک ہزار سال میں ہم نے سب سے لمبا سورج گرہن دیکھا۔

شمالی مغربی افریقہ میں گرہن کی مدت سات منٹ سے زیادہ رہی۔ کینیا میں ۵ منٹ رہی۔ گرہن کے دوران سورج کے اندر سے یا اس کے کناروں سے لپٹیں نکلتی ہیں جن کا مشاہدہ کرنا اور ان کا فوٹو اتارنا سائنس دانوں کے لیے بہت دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسے موقعوں پر ستاروں کے ماہرین پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سورج کی سطح پر جو گرمی ہے اس کا درجہ حرارت دس ہزار ڈگری فارن ہائیٹ ہے۔ لیکن گرہن کے دوران جو لپٹیں نکلتی ہیں ان میں درجہ حرارت ۲۰ لاکھ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ سائنس داں کچھ نئے راز معلوم کرنے کی فکر میں ہیں۔ سورج گرہن کے

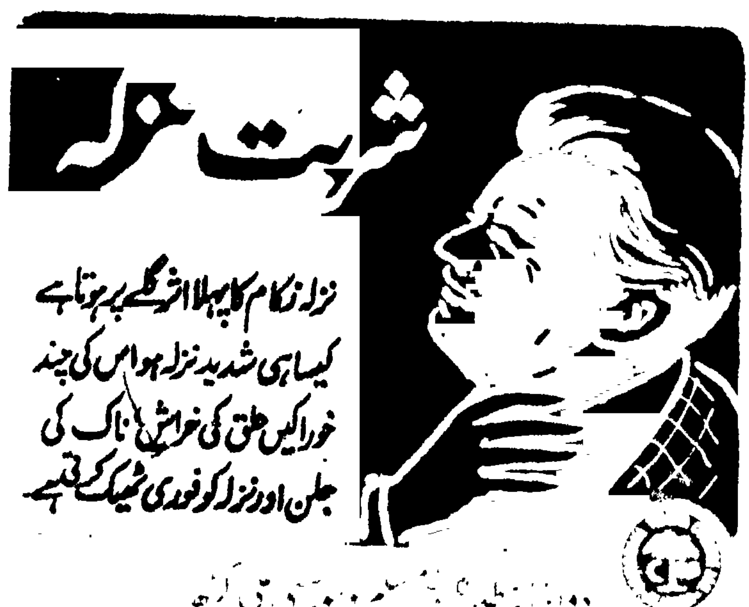
وقت جو مقناطیسی اور کشش کی طاقت کام کرتی ہے اس کا راز بھی سائنس داں ڈھونڈنے کی فکر میں ہیں۔

مکمل گرہن کا مرکز ۸ ۲۵ کلومیٹر کی چوڑائی کے اندر تھا اور دراصل یہ چاند کا سایہ یا عکس تھا جو فی گھنٹہ ۲۲۰۰۴ کلومیٹر کی رفتار سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس دائرے کی لمبائی ۱۴۵۶۰ کلومیٹر تھی جو برازیل (جنوبی امریکہ کا سب سے بڑا ملک) سے شروع ہو کر بحر اطلانتک کو پار کرتی ہوئی افریقہ کے دس ملکوں سے گزرتی بحر ہند کے ساحل تک چلی گئی تھی۔

پیرس کی خبر کے مطابق کنکارڈ جہاز میں بیٹھ کر جڑوں کو نظر کرنے والے سائنس دانوں نے بتایا کہ پروگرام کے مطابق ان کے سارے تجربے کامیاب رہے اور اس طرح سارے سائنس داں بہت ہی خوش تھے اور جذبات سے لبریز۔

نئی دہلی کی خبر کے مطابق ساری دنیا کے سائنس داں سورج کی طاقت کو استعمال کرنے کے لیے جو تجربے کر رہے ہیں اس کے متعلق یونسکو کی طرف سے اسی مہینے کے اندر یعنی جولائی ۱۹۷۳ء میں پیرس میں ایک زبردست کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جس میں سارے مسائل پر غور کیا جائے گا۔ اور سورج کی انرجی کو صنعتی کاموں میں استعمال کرنے کے لیے منصوبہ پیش کیا جائے گا۔

دنیا کے ۲۹ ملک اور سیکڑوں سائنس داں گرہن کے متعلق سو سے زیادہ منصوبوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور ان کو کامیاب بنانے کے لیے ایک دوسرے کی ہمت بڑھا رہے ہیں۔



آزادی کا جشن سبھی

جاوید احمد خاں

چمن میں اب ہوائیں اس ادا سے سرسراتی ہیں کبھی تو مسکراتی ہیں کبھی دل کو لبھاتی ہیں
عجب اندازِ الفت سے قریب آ کے کانوں میں لہک کے ساتھ پیغامِ مسرت یہ سناتی ہیں

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

وطن کے بسنے والے دل ہی دل میں مسکراتے ہیں اچھلتے ہیں چہکتے ہیں خوشی کے گیت گاتے ہیں
گلے ملتے ہیں آپس میں محبت آزماتے ہیں چمن کی جان ہیں بلبل چمن پر رنگ لاتے ہیں

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

اس آزادی کی نعمت پاکے کھیتی لہلہاتی ہے ترقی بڑھتی جاتی ہے زمیں سونا اگاتی ہے
خوشی سے جھومتی ہے یہ زمیں اور گیت گاتی ہے وطن کے گوشے گوشے سے یہی آواز آتی ہے

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

بڑے ہی شوق سے گنگ و جمن دھارا بہاتی ہیں زمیں سیراب کرتی اور وہ مستی میں گاتی ہیں
ہمارے دیش کی سب وادیاں خوشبو لٹاتی ہیں بہار کی چہکتی چوٹیاں مژدہ سناتی ہیں

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

یہ آزادی ہے جس نے من کے دیپک کو جلایا ہے یہ آزادی مقدر جس نے اپنا جگمگایا ہے
وطن کے پیار میں اہلِ وطن نے خون بہایا ہے جبھی دلکش یہ نقشہ سامنے آنکھوں کے آیا ہے

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

مبارک ہو کہ نہرو جی کی وہ تدبیر[1] جاگ اٹھی　　مبارک ہو کہ گاندھی جی کی وہ تعبیر جاگ اٹھی
مبارک ہو کلام آزاد کی تحریر[3] جاگ اٹھی　　مبارک ہو کہ اپنے دیش کی تقدیر جاگ اٹھی

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

یہ آزادی نہیں آپس کی سنگت کا نتیجہ ہے　　وطن کے واسطے دن رات محنت کا نتیجہ ہے
یہ ہمّت کا نتیجہ ہے صداقت کا نتیجہ ہے　　فدا کاروں کی قربانی و خدمت کا نتیجہ ہے

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

شہیدانِ وطن کے پاس کہتی ہے صبا جاکر　　یہی مژدہ سناتی ہے مچلتی ہے یہ کہہ کہہ کر
وطن آزاد ہے چاہے تو کوئی دیکھ لے اُٹھ کر　　شہیدانِ وطن کی روح کہتی ہے یہ ہنس ہنس کر

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

مسرّت کے گھنے بادل فلک پر چھائے جاتے ہیں　　خوشی کے اشک برسا کر ترانے گائے جاتے ہیں
نشانِ رفعتِ ہندوستان لہرائے جاتے ہیں　　شہیدوں کے نشاں پر پھول بھی برسائے جاتے ہیں

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

خوشی کا نام ہے رنج و محن سب کا مٹا دینا　　دلوں میں آدمیّت کے لئے جگہیں بنا لینا
وطن والوں کی الفت کو نگاہوں میں بسا لینا　　ہماری کامرانی ہے اسی حکمت کو پا لینا

بہارو مسکراؤ ، رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

بڑھو جاوید تم پتوار کو ہاتھوں میں لینا ہے　　ہواؤ موج کی زد پر ابھی اپنا سفینا ہے
غریبوں مفلسوں کا آج بھی مشکل میں جینا ہے　　ابھی سیکھا نہیں ہم نے بھی جینے کا قرینا ہے

بہارو مسکراؤ رنگ لاؤ جشن کا دن ہے
مسرّت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

---

[1] منصوبہ بندی (برائے ترقی)، [2] سوراج [3] مولانا آزاد کی الہلال و البلاغ کی شعلہ بار تحریریں۔

چودھویں قسط

مونگے کا جزیرہ

آر۔ ایم بیلین ٹائن
تلخیص و ترجمہ۔ خلیق انجم اشرفی

ہم نے کشتی بنائی



اس دلچسپ شکار کے بعد کئی روز تک جیک کشتی بنانے میں جٹا رہا۔ آخرش چیز کچھ کچھ کشتی جیسی معلوم ہونے لگی۔ اس کام کی مشکلوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ کام کرنے کی کوشش کی ہو اور ہمارے پاس تو بس ایک کلہاڑی تھی۔ لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا، ایک ملاحوں والی سوئی تھی۔ اور ایک ٹوٹا ہوا چاقو تھا۔ ان کے علاوہ کوئی اوزار نہ تھا لیکن اس بے سروسامانی، بے دست و پائی کے باوجود جیک نے یہ کام کر ہی لیا۔

اس کشتی کا تذکرہ کئی بار آچکا ہے۔ اس لئے اگر یہاں اس کی تیاری کے متعلق ذکر کر دیا جائے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

میں اس حیرت انگیز درخت کا تذکرہ پہلے بھی کر چکا ہوں جس کے تنے میں قدرتی تختے لگے ہوئے تھے۔ کشتی بنانے کا سب سے اہم مسالہ ہمیں اسی درخت سے حاصل ہوا۔

تختے مل جانے کے بعد جیک کو ایک ایسی مناسب جسامت اور تراش کے تختے کی تلاش ہوئی جس سے کشتی کا پیندا بنایا جا سکے۔ اور جو دونوں طرف سے اس طرح مڑا ہوا ہو کہ اس سے کشتی کے اگلی اور پچھلی طرف کے ستون بھی بن جائیں۔ ایسا تختا پا جانا ملنا آسان نہ تھا۔ لیکن جیک نے ڈھونڈھ ہی نکالا۔ اس نے ایک چھوٹا سا درخت جڑ سمیت اکھاڑا جس کے تنے کی دس

…ے اونچائی پر ایک شاخ پھوٹی ہوئی تھی اور نیچے …جڑیں ایسی تھیں کہ ان جڑوں کو پیندے میں جڑنے سے جیک اپنے مطلب کا پیندا بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس نے تین مضبوط …یں لیں اور انھیں برابر برابر فاصلے سے پیندے پر …کا دیا۔ اس طرح پیندے پر تین مضبوط پشتے بن گئے

اب جڑوں پر رندا کرنے اور انھیں صاف کرنے …مسئلہ تھا اس کے علاوہ انھیں پیندے لگانے کے لیے جگہ …اے کا بھی سوال تھا یہ سارا کام جیک نے کلہاڑی سے لیا ہے۔ …ستعمال میں وہ اب حیرت انگیز طور پر ماہر ہو گیا تھا۔ لیکن …ب جڑوں کو پیندے میں جڑنے کا مسئلہ آیا تو سب سوچ میں پڑ گئے۔

ہمارے پاس نہ تو سوراخ کرنے کے لئے کوئی …زار تھا نہ کیلیں، جن سے ان سوراخوں میں یہ جڑیں …نٹ کر کے ہم جڑ دیتے۔ یہاں آ کر ہمارا کام بالکل ٹھپ ہو گیا۔

لیکن آخر کار جیک نے ایک ایسا اوزار بنا ہی لیا۔ …ں سے کشتی کے پیندے میں سوراخ کئے جا سکیں۔ ہر پشتے میں ڈیڑھ ڈیڑھ انچ گہرے دو دو سوراخ بنا لئے گئے۔ اور ایسے ہی کشتی کے پیندے میں بھی۔ لیکن کشتی کے پیندے والے سوراخ آر پار نہیں تھے۔ ان سوراخوں میں کیلوں کی جگہ ایک ایسے درخت کی لکڑی کے پتلے پتلے ٹکڑے تراش کر لگائے گئے جس کا نام آئرن ووڈ[1] یا فولادی درخت تھا۔ اور واقعی جب ان ٹکڑوں کو پشتوں کے سوراخوں سے گزار کر کشتی کے پیندے میں بنے سوراخوں میں ڈالا گیا تو وہ اتنی مضبوطی سے فٹ ہو گئے گویا واقعی کیلوں سے جڑے گئے ہوں۔ لیکن ہم نے اسی پر بس نہیں کی۔ فولادی لکڑی کی کیلوں کے علاوہ ہم نے کشتی کے کناروں کو ایک رسی کے ذریعہ پشتوں سے جکڑ دیا۔

یہ رسی ہم نے ناریل کے ریشوں سے بٹی تھی۔ ناریل کے بہت سے ریشوں کو ملا کر بٹی ہوئی یہ رسی بہت مضبوط ہوتی تھی۔ شروع میں تو ہم نے رسی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بٹ کر انھیں آپس میں گرہ لگا لگا کر ایک لمبی رسی بنائی۔ لیکن بعد میں ہم مطلوبہ لمبائی کی ایک ہی رسی بٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس رسی کے بنانے میں ہمیں بہت محنت کرنی پڑی۔ لیکن جب کبھی ہم تھک کر نڈھال ہو جاتے یا اکتا جاتے۔ جیک فوراً ہماری ہمت بڑھاتا اور ہم پھر اسی جوش سے کام میں لگ جاتے۔ آخر ہم نے یہ رسی تیار کر ہی لی۔

اب درخت سے ایک انچ موٹے تختے کاٹے گئے کلہاڑی سے انھیں چکنا کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس کام کے لئے رندا استعمال کیا جاتا ہے۔ بھلا کلہاڑی کیا کام دیتی بہر حال انھی کھردرے تختوں سے کام چلایا گیا۔ اور دونوں طرف پانچ پانچ تختے لگائے گئے اور ایک گول شکل کی کشتی بن گئی۔

ان تختوں کو آپس میں اور کشتی کے پیندے سے جوڑنے کے لئے کیلیں تو تھیں نہیں۔ اس لئے کشتی بنانے کے پرانے طریقے کو چھوڑ کر ہم نے ان تختوں کو ایک دوسرے کے کناروں پر رکھ کر رسی سے آپس میں جکڑ دیا تاکہ انھیں آگے پیچھے اور تلے سے بھی جکڑ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہم نے تختوں کے کناروں پر اندر کی طرف ناریل کا کیرا بھی لگا دیا۔

ہمیں امید تھی کہ گیلا ہو کر وہ پھول جائے گا اور ان

---

[1] IRON-WOOD

طرح ہماری کشتی واٹر پروف بن جائے گی۔ اور کشتی کا اندرونی حصہ خشک رہ سکے گا۔ باہر حصہ ہم نے کھلا ہی رکھا تھا۔ یہاں میں اتنا اور بتادوں کہ ہماری یہ امید غلط ثابت نہیں ہوئی۔

جب تک جیک کشتی بنانے میں لگا ہوا تھا تو میں اور پیٹرکن کبھی کبھی اس کی مدد کرتے۔ لیکن اسے ہماری مدد کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے ہم دونوں اکثر شکار کو نکل جاتے۔ ہماری شکارگاہ ہمارے گھر کے قریب واقع وادی کا کچھ حصہ تھا۔

یہاں ہمیں قسم قسم کے آبی پرندے غول کے غول نظر آتے۔ ان میں سے کچھ بطخیں تو ہمارے ملک میں پائی جانے والی بطخوں سے اس قدر مشابہ تھیں کہ کبھی کبھی میں یہ سوچتا کہ کہیں یہ وہی تو نہیں۔

ان موقعوں پر ہم تیر کمان اور غلیل سے لیس ہوکر جاتے اور زیادہ تر کامیاب لوٹتے۔ اس طرح ہمارا رات کا کھانا روزانہ الگ طرح کا ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو ہمارے دسترخوان پر اتنی نعمتیں اکٹھا ہو جاتیں کہ ہماری سمجھ میں نہ آتا کہ کیا پہلے کھائیں کیا بعد میں۔

مونگے کی وہ مسطح اور چوڑی چٹان جو ہمارے گھر کے عین سامنے تھی۔ ہمارے لئے میز کا کام دیتی تھی۔ اسی چٹان پر ہم نے پہلے پہل اس دن اپنا بچا کھچا سامان پھیلایا تھا جس دن ہمارا جہاز طوفان کی نذر ہو گیا تھا۔ اور اب اسی پر ہم روزانہ اپنا کھانے کا سامان پھیلاتے تھے۔

بعض بعض دن ہمارے اس دسترخوان پر ساٹ سعل [illegible] روٹی والے درخت کے آگ پر سینکے ہوئے پھل کا پیٹرکن نے یہ نیا نام رکھا تھا۔ بھنا ہوا سور، بھنی ہوئی بطخ، ابلے اور بھنے ہوئے یام، ناریل، تارو اور شکرقند جیسی نعمتیں ہوتیں اور اس کے بعد تازہ پھل کھاکر میٹھی ڈش کی کمی بھی پوری کر لیتے۔

اکثر پیٹرکن نے چند نئے کھانے پکانے کی بھی کوشش کی لیکن یہ اتنے بدمزہ ثابت ہوئے کہ آخر میں اس نے یہ کوشش ہی چھوڑ دی۔ لیکن اس وقت بھی وہ جیک سے یہ کہے بغیر نہ رہا کہ اس کی ان کوششوں نے آخر جیک کی ایک بات تو غلط ثابت کر ہی دی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "جہاں چاہ وہاں راہ" لیکن پیٹرکن نے کہا کہ اسے ایک اچھا باورچی بننے کی زبردست خواہش ہے۔ اور وہ اس کے لئے مسلسل کوشش بھی کرتا رہا لیکن آخر نہیں بن سکا۔

ایک دن میں اور پیٹرکن اسی میز پر دوپہر کا کھانا سجائے جیک کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ اچانک وہ ساحل کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا۔ اور کلہاڑی ایک طرف پھینکتا ہوا چلایا: "لڑکو، آخرکار کشتی تیار ہو گئی اور اب ہمیں چپوؤں کا ایک جوڑا بنانے کے علاوہ کچھ نہیں کرنا ہے پھر ہم جب جی چاہے اسے سمندر میں اتار سکتے ہیں۔"

اس خبر نے ہمیں حیرت و مسرت کے جذبات سے بھر دیا۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ کشتی آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے لیکن اس کام نے اتنا وقت لے لیا تھا کہ اب ہمیں اس کے دو تین ہفتے سے پہلے مکمل ہونے کی قطعی امید نہ تھی لیکن جیک مسلسل کام میں لگا رہا اور ہمیں اچانک حیران کرنے کے خیال سے ہمیں پہلے سے کچھ نہیں بتایا۔

"میرے پیارے دوست" پیٹرکن خوشی سے چلایا۔ "تم واقعی فرشتہ ہو۔ لیکن تم نے ہمیں پہلے سے بتایا کیوں

نہیں کہ کشتی تیاری کے اتنے قریب ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا کل ہی ہم اپنے سفر پر روانہ ہو سکیں گے؟"

"اس قدر باتیں نہ کرو پیڑکن" جیک بولا "اور ہاں مجھے ذرا اس سور کا گوشت تو دینا۔"

"یقیناً میرے عزیز" پیڑکن کلہاڑی اٹھاتا ہوا چلایا "تمہیں کون سا حصہ زیادہ پسند ہے؟ ٹانگ، بازو یا جسم کا کہیں سے ایک ٹکڑا؟ لو لو"۔

"پچھلی ٹانگ" جیک بولا "اور ہاں اگر زحمت نہ ہو تو اس میں دم بھی شامل کر دینا۔"

"بڑی خوشی سے" پیڑکن نے مطلوبہ حصہ کاٹتے ہوئے کہا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مگر جیک میں کشتی پر سفر کی بات کر رہا تھا۔ کیا ہم کل نہیں چل سکتے؟"

"نہیں" جیک نے جواب دیا "ہم کل سفر پر تو روانہ نہیں ہو سکیں گے۔ ہاں شاید آس پاس کی سیر کر سکیں، کیونکہ میرا ارادہ ہے کہ آج سہ پہر ہی سے چپو بنانے میں جٹ جاؤں گا۔ اور اگر ہم اسے سورج ڈوبنے تک نہ بنا سکے تو پھر وہی پھل جلا کر اس کی روشنی میں سونے سے پہلے پہلے مکمل کر لیں۔"

"نیک خیال ہے" پیڑکن بولا "اور اگر ہو سکا تو میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔"

"اور ہاں" جیک نے اپنی بات جاری رکھی "اس کے بعد ہم ناریل کے کپڑے سے ایک بادبان بنائیں گے۔ اور کشتی میں ایک مستول بھی بنائیں گے۔ تب کہیں جا کر اس قابل ہوں گے کہ اپنے سفر پر روانہ ہوں اور دوسرے جزیروں کی سیر کریں۔ اور اپنے پرانے دوستوں پنگوئنوں سے بھی ملاقات کر آئیں۔"

اتنی جلد خوب صورت سمندر کے وسیع سینے پر سیر کرنے اور دوسرے جزیروں تک جانے کا تصور اتنا دل خوش کن تھا کہ کھانا کھاتے ہی ہم پوری تن دہی سے چپو بنانے میں جٹ گئے۔ ہم نے اس قدر محنت اور اتنی تیزی سے کام کیا کہ جب سورج ڈوبا تو میں اور جیک چار عمدہ چپو لئے مکان کی طرف واپس آ رہے تھے۔ یہ چپو بالکل مکمل تھے بس انھیں چاقو سے ذرا چھیل کر چکنا کرنا تھا۔

رات کا کھانا کر ہم جلدی سے بستر پر لیٹ گئے تاکہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ کر اپنی ننھی کشتی پر کئے جانے والے سفر کو دیکھ سکیں۔

پھر کیا ہوا؟ اپنی ننھی سی کشتی پر سوار ہو کر تینوں ساتھیوں نے کہاں کہاں کی سیر کی؟ کیا ان کی کشتی سمندر کا مقابلہ کر سکی؟ وہ پنگوئنوں سے ملنے اور دوسرے جزیروں کی سیر کرنے جا سکے؟ یہ اور دوسرے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے اکتوبر کا پیامِ تعلیم ضرور پڑھیے گا۔

ازبک جفت ساز کو نادر ہندوستانی مخطوطہ دستیاب

ماسکو ۵ فروری علامہ مسلم صنعانی کا ایک نادر مخطوطہ (قلمی کتاب) اندیجان (ازبکستان) کے ایک جفت ساز (جوتا بنانے والے) کو دستیاب ہوا ہے۔ علامہ صنعانی چار سو سال پہلے آگرہ میں رہتے تھے۔ ایم۔ حسنوف کو جو جوتا بنانے کا کام کرتے ہیں، اپنے دادا کی چھوڑی ہوئی پرانی کتابوں میں یہ نایاب کتاب ملی ہے۔ جس کا نام "اشیائے ضروری" ہے۔ حسنوف نے یہ کتاب مقامی بابر کتب خانہ کے حوالے کر دی۔ یہ کتاب زبردست علمی اور تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہے (سوویت خبرنامہ)

مہرؔ وردلوی

اقوالِ زریں

(منظوم)

ہاں خدا سے بہت قریب ہے وہ — اس زمانے میں خوش نصیب ہے وہ
حسنِ اخلاق سے جو پیش آئے — خدمتِ خلق سے نہ کترائے
دوسروں کا جو بوجھ اُٹھاتا ہے — سب کے دل میں جگہ وہ پاتا ہے

(حضرت بایزید بسطامیؒ)

دیکھیے اہلِ علم و دانش کو — اپنے عیبوں پہ ہے نظر اُن کی
ساتھیوں کے عیوب سے لیکن — مہرؔ کرتے ہیں چشم پوشی ہی

(حضرت امام شافعیؒ)

جس کو کہتے ہیں لوگ خاموشی
ایک دانائی کی علامت ہے
ہو نہ کہنے کی جب حاجت ہی
خوب تر مہرؔ یہ بھی عادت ہے

(حضرت شیخ ابوبکر ورّاقؒ)

حضرت نامیؔ کوہ سوار شاہ پوری

اپنا گیت

علم ہمارا راہ نما ہو
عقل ہماری، جیسے دیا ہو
آج ہیں ہم گو بھولے بھالے
کل کو بڑھیں گے ہوش سنبھالے
لکھنا، پڑھنا، ذوق ہمارا
حسنِ عمل ہے شوق ہمارا
کھیل بھی علمی تاش سے کھیلیں
ہم نہ کسی اوباش سے کھیلیں
سارے ساتھی اپنے بھائی
کیسے کریں آپس میں لڑائی
جھوٹ سے ہم کو نفرت ہوگی
سچ ہی اپنی عادت ہوگی
خدمت ہو ماں، باپ کی لازم
دل سے ہوں، استاد کے خادم
نامیؔ اپنا کام کریں ہم
جگ میں پیدا نام کریں ہم

جناب سہیل عظیم آبادی

عقلمند لوگ

کسی ملک میں ایک راجہ تھا۔ بڑا بہادر اور جنگجو۔ سدا لڑائی کے میدان میں سپاہیوں کے ساتھ لڑتا تھا۔ لڑائی جب تک ختم نہ ہو جاتی اور میدان جیت نہ لیتا۔ گھر لوٹ کر نہ آتا تھا۔

مگر اس میں ایک بڑی بُرائی تھی وہ بڑا بے وقوف اور ظالم تھا۔ کسی ملک کو فتح کرتا تو وہاں کے لوگوں پر بڑا ظلم کرتا ان کے گھروں کو ڈھا دیتا تھا۔ جوانوں کو مروا ڈالتا تھا کہ وہاں کے لوگ سر نہ اٹھا سکیں۔

لوگوں نے اُسے سمجھایا۔ لڑائی لڑنا اور جیتنا تو بہادروں کا کام ہے۔ پر ہارے ہوئے لوگوں پر ظلم کرنا اچھی بات نہیں۔ پر وہ تو بہت ہی بیوقوف تھا یہ بات اس کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی۔

راجہ کے ملک سے ملا ہوا ایک دوسرا علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگ بہت عقلمند تھے وہ اپنا سارا کام پنچایت کے ذریعے چلاتے تھے۔ ان کا کوئی راجہ نہ تھا۔ اس لئے بہت دنوں تک راجہ نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا جب کبھی راجہ اس شہر پر چڑھائی کرنے کی دھمکی دیتا۔ تو وہاں کے لوگ آتے اور ہاتھ جوڑ کر کہتے۔

مہاراج! ہمارا تو کوئی راجہ نہیں۔ راجہ، راجہ سے لڑتا ہے۔ معمولی آدمیوں سے نہیں۔ ہم لوگوں پر چڑھائی کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ بھلا ہم لوگ آپ سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔ آدمی لڑتا تو برابر کے آدمی سے ہے۔

اور راجہ ان کی بات سن کر خوش ہو جاتا اور انھیں چھوڑ دیتا۔

بہت دنوں تک یہی حال رہا۔ راجہ نے آس پاس کے دوسرے راجاؤں کو ہرا کر سب کے راج پر قبضہ کر لیا۔ بیچ میں یہی تھوڑا سا علاقہ رہ گیا جو اُس کے قبضے میں نہیں تھا۔

راجہ کے ایک خوشامدی منتری نے سمجھایا ——
"مہاراج! اس شہر کے لوگ بہت چالاک ہیں۔ آپ کو چَل دے جاتے ہیں۔ آپ ان پر چڑھائی کر کے اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیں۔ بس یہی ایک علاقہ آپ کے راج میں نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پہلوان کے بدن پر کوڑھ ہو۔ آپ اس علاقے پر قبضہ کیجیے۔ اور وہاں کے لوگوں کو سزا دیجئے۔ وہ لوگ ایسا تک باتیں بنا کر دھوکہ دیتے رہے ہیں۔

راجہ کے دماغ میں یہ بات آگئی اور اُس نے سیناپتی (سپہ سالار) کو بلا کر چڑھائی کی تیاریوں کا حکم دے دیا۔ یہ بات اس علاقہ کے لوگوں تک پہنچ گئی۔ لوگ بہت گھبرائے۔ راجہ بہت طاقتور تھا۔ اس سے لڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ذرا سا علاقہ اور اس کے پاس نہ فوج نہ لڑائی کا سامان آخر سب نے پنچایت بلائی۔ اور ترکیبیں سوچنے لگے کہ اس اچانک مصیبت سے کیسے بچا جائے۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کوئی تدبیر لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی تو ایک بوڑھے نے کہا:۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ راجہ بیوقوف ہے اس کی بیوقوفی سے ہم اب تک فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ اس بار بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لوگوں نے کہا۔ اب تو وہ فوج لے کر خود ہی چڑھائی کرنے آرہا ہے۔ اور بڑا ظالم ہے۔ جب بات کرے گا ہی نہیں تو پھر فائدہ کیسے اُٹھایا جائے۔

بوڑھے نے کہا۔ میں بتاتا ہوں۔ سب سے پہلے تو شہر کا پھاٹک بند کرادو۔ ہزار کچھ ہو۔ پھاٹک نہ کھولا جائے۔ اس کے بعد میں جیسے جیسے بتاؤں کرتے جاؤ۔ بیوقوف راجہ آپ ہی لوٹ جائے گا۔ شہر کے لوگ بوڑھے کی عقل مندی کے قائل تھے۔ چپ ہورہے۔ اور شہر کا پھاٹک بند کرکے بیٹھ رہے۔

راجہ اپنی فوج لے کر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑنے کو ایک بھی سپاہی سامنے نہیں۔ اور شہر کا پھاٹک بند ہے۔ فوج چپ کھڑی رہی۔ لڑائی کس سے۔ راجہ نے سپہ سالار کو حکم دیا کہ پھاٹک توڑ دیا جائے۔

سپاہیوں نے پھاٹک توڑنا شروع کیا۔ اور ذرا سی دیر میں توڑ کر رکھ دیا۔ اور سپاہی شہر میں گھس پڑے۔ راجہ نے حکم دیا کہ یہ لوگ لڑے تو نہیں۔ پھر بھی پھاٹک بند کرنے کی سزا انھیں ملنی چاہیے اس لئے جو آدمی سامنے آئے اسے جان سے مارا نہ جائے۔ بلکہ اس کی ناک اور کان کاٹ لئے جائیں۔

راجہ سب سے آگے آگے تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک آدمی کو دیکھا۔ یہ کنوئیں سے پانی نکال کر باہر پھینک رہا تھا۔ سپاہیوں نے اُسے پکڑا اور راجہ کے پاس لائے۔ راجہ نے حکم دیا کہ اس کی ناک اور کان کاٹ لو۔ سپاہیوں نے چھری نکالی۔ تو اس نے راجہ سے کہا۔ مہاراج! میں تو پرجا ہوں میری ناک اور کان آپ ہی کے لیے ہیں۔ پر میں ایک بڑا کام کر رہا ہوں۔ ذرا یہ ختم کرلوں۔ پھر ناک کان کیا، چاہیں تو میری گردن بھی کٹوادیں۔

راجہ نے پوچھا۔ کیا کام کر رہے ہو۔ اس آدمی نے جواب دیا۔

"مہاراج! رات چاند یکایک اس کنوئیں میں گر گیا اور دنیا اندھیری ہوگئی۔ اگر یہ اس میں رہ گیا تو دنیا اندھیری رہے گی۔ میں چاند کو نکال رہا ہوں۔ چاند کو آسمان پر بھیج دوں گا۔ تو پھر روشنی ہونے لگے گی۔ میں یہ کام کر دوں تو پھر آپ مالک ہیں۔ ناک کان کٹوادیں یا گردن۔"

راجہ نے سوچا۔ یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا اُسے چھوڑو اور آگے بڑھو۔"

سپاہی اور راجہ آگے بڑھے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ شہر کے پھاٹک کی طرف جارہا تھا سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے چلا کر کہا۔ "تم لوگ بڑے بےوقوف ہو۔ تم نے ہمارے شہر کا پھاٹک کھول دیا۔ اب شہر کی ساری ہوا نکل جائے گی اور ہم سب مرجائیں گے۔ ہم نے بہت مشکلوں سے ہوا اکٹھا کی تھی۔"

راجہ یہ سن کر بڑا گھبرایا۔ اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو"

اس آدمی نے کہا۔" میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں ر شہر والوں کے لیے ہوا اکٹھا کرنا میرا کام ہے۔ ہوا نکل گئی تو لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ یہ کہہ کر وہ ونے لگا۔

راجہ نے کہا: " یہ بھی پاگل معلوم ہوتا ہے جو یسی باتیں کرتا ہے۔ اسے چھوڑ دو اور آگے بڑھو" اجہ سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا تو دیکھا کچھ وگ دیوار اٹھا رہے ہیں۔ راجہ سپاہیوں کو لے کر ہاں پہنچا اور بولا۔" تم لوگ یہ دیوار کیوں اُٹھا رہے ہو۔"

ایک آدمی راجہ کے پاس آیا اور اس کے کان یں چپکے سے کہنے لگا۔" مہاراج زور سے نہ بولئے۔ وہ دیکھیے سامنے چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں یہ ہمارے کھیت برباد کر دیتی ہیں۔ ہم دیوار بنا رہے ہیں۔ تاکہ چڑیاں آ ہی نہ سکیں۔ اور کھیت ان سے بچ جائیں۔ بس ذرا ہٹ جائیے اِدھر سے "۔

راجہ بڑا گھبرایا۔ یہ لوگ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ سب کے سب پاگلوں جیسی۔ کوئی عقلمندی کی باتیں نہیں کرتا۔

وہ ان سب کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی چبوترے پر بیٹھا ہے۔ ایک انگلی سے ایک نتھنا دبائے منہ بند کئے، دوسرے نتھنے سے سانس لے رہا ہے۔ راجہ سپاہیوں کو لے کر اس کے پاس پہنچا اور ڈانٹ کر بولا۔" تم یہ کیا کر رہے ہو"

اس آدمی نے پلٹ کر دیکھا۔ اور بولا۔

" مہاراج! پہاڑی پر میں نے ایک چکی لگائی ہے یہ ہوا سے چلتی ہے۔ مگر اس وقت وہاں ہوا نہیں ہے۔ اور چکی رُکی ہوئی ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر پھونکیں مار رہا ہوں کہ ہوا پہاڑی پر پہنچے اور میری چکی چلنے لگے "۔

راجہ بڑے زور سے ہنسا۔ اور بولا۔" اس شہر میں پاگل بستے ہیں۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ لوٹ چلو یہاں سے۔ نہیں تو ہم سب بھی پاگل ہو جائیں گے "

سب لوٹ چلے تو پھاٹک کے پاس ایک بھیڑ دیکھی۔ بہت سے آدمی راستہ روکے کھڑے تھے۔ راجہ نے سمجھا کہ لوگ اس کا راستہ روک رہے ہیں۔ اُسے بڑا غصّہ آیا اور ان کے پاس پہنچا۔ گرج کر بولا۔" تم سب راستہ کیوں روک رہے ہو؟ ان لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج! ہم لوگ آپ کا راستہ نہیں روک رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے شہر کا پھاٹک توڑوا دیا ہے۔ شہر کی ساری ہوا نکلی جا رہی ہے۔ ہم لوگ اسے روک رہے ہیں۔ اگر ہوا کو نہ روکیں گے۔ تو ہم سب مر جائیں گے اور مہاراج بھی مر جائیں گے "۔

راجہ نے جب یہ سُنا تو سپاہیوں سے کہا " بھاگ چلو یہاں سے ہمیں شہر چاہیے پاگل خانہ نہیں چاہیئے۔ سارے سپاہی راجہ کے ساتھ لوٹ گئے۔ شہر کے لوگوں نے خوشی منائی۔ ان کی عقلمندی سے بڑی بلا ٹل گئی۔ ●●

- اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔
(قرآن پاک)
- ظلم سے بچو، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ظلم برباد کر دیتا ہے۔
(حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم)

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

گڈو بڑا شیطان ہے

امی نے پاپا سے کہا   گڈو کو کچھ دیجے سزا
ہر سو شکایت کی صدا   آفت میں میری جان ہے
گڈو بڑا شیطان ہے

کل رات ہمسایہ کے گھر   سب کو کیا زیر و زبر
پل میں اِدھر پل میں اُدھر   بھاری وہیں نقصان ہے
گڈو بڑا شیطان ہے

باہر نکلتا ہے اگر   لڑتا ہے بےخوف و خطر
پھاڑا کسی بچے کا سر   زخمی کسی کا کان ہے
گڈو بڑا شیطان ہے

ہر وقت ہیں ماتھے پہ بل   رہتا ہے ہر ضد پہ اٹل
دیگر مٹھائی اور پھل   بہلانا کب آسان ہے
گڈو بڑا شیطان ہے

جاتا نہیں اسکول کو   میں منع کروں "جاؤ گے تو!"
فوراً ہی کہہ دیتا ہے "نو"   تعلیم کی یہ شان ہے!
گڈو بڑا شیطان ہے

ذوالنورین صدیقی مسحور

دھرتی کے تارے

ننھے منے بالک یہ، ہیں دھرتی ماں کی شان
یہ ہیں دھرتی ماں کی شان!!
ان کی سندر، کومل بانہیں جیسے چاند کا ہالا
ہر دم ان سے خوش رہتا ہے دنیا کا رکھوالا
ان کے بھولے پن پر ساری دنیا ہے قربان
یہ ہیں دھرتی ماں کی شان!!
ان ہی سے تو ہر سو جگ میں ہوتا ہے اجیارا
ان ہی پھولوں سے بہتی ہے امرت جل کی دھارا
پیپت کی مدھ میں ڈوبی ان کی ہوتی ہے مسکان
یہ ہیں دھرتی ماں کی شان!!
مل کر رہنا ریت ہے اچھی، کہتے ہیں یہ پیارے
آئینہ سا دل رکھتے ہیں دھرتی کے یہ تارے
ان کی قیمت کیا سمجھیں گے دنیا کے نادان
یہ ہیں دھرتی ماں کی شان!!
دیش کی شوبھا، دیش کی آشا ہیں یہ بھولے بھالے
راہ دکھائیں مکتی کی، یہ الفت کے متوالے
ان کے دم سے وابستہ ہے نہرو کا ارمان
یہ ہیں دھرتی ماں کی شان!!

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔ اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

(۱) بالو حصہ اول مصنف: ایف سی ڈی تاس مترجم: صالحہ جیما
(۲) بالو " دوم " : " " " "
(۳) کشمیر " : مالا سنگھ " : خدیجہ بیگم تصاویر: بیجا نند
(۴) پرندوں کی دنیا " : جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیر
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ مترجم: محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : عزیز سجی ذہیر
(۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا بھاگوت " : " " "
(۸) سیلی کہانیاں " : منوج داس " : " : جعفر اسعدی
(۹) آزادی کی کہانی حصہ اول " : وشنو پربھاکر " : انور کمال حسینی
(۱۰) ہماری ریلیں " : جگجیت سنگھ " : عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیاح " : کے سی کھنہ تصاویر: کرشن کھنہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں " : اوما ناند مترجم: نعیمہ منظور الامین
(۱۳) خان بلی کا خاندان " : منوہر داس چترویدی " : محمد شفیع الدین نیر
(۱۴) بہت دن ہوئے حصہ اول " : ایم جی کیسی دیم جوشی " : رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) بہادروں کی کہانیاں " : راجندر لال سنگھی " : انور کمال حسینی
(۱۶) روہنت و نندیہ مصنف: کرشن چیتنیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگاچاری " : " "
(۱۸) ایجادیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی " : میر نجابت علی " : سید احسان
(۱۹) " " " دوم " : " " : " "
(۲۰) بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
(۲۱) مورا " : ملک راج آنند " : انور کمال حسینی
(۲۲) پانی کا کھیل " : سرویندر سانیال " : پریتم لال

ذاکر حسین سیریز

(۲۳) ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۳/-
(۲۴) انوکھی دکان " : قدسیہ زیدی " ۲/۵۰
(۲۵) گلالیو چوہیا اور پریزاد " : " " : ۲/-
(۲۶) نیلے جانور " : " " : ۲/۵۰
(۲۷) راجہ رام موہن رائے } عرش ملسیانی (زیر طبع)

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ - اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ - پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

نوری شکارے والی

محمد فاضل کھتری



نوری رحیم خان شکارے والے کی بیٹی تھی. عمر تقریباً بارہ سال تھی. بہت خوبصورت بہت پیاری بچی تھی کہتے ہیں اس جیسی خوبصورت بچی سارے کشمیر میں نہیں تھی۔ جبھی تو کشمیر میں بہار کا موسم آتا تو باہر سے آنے والے سیاح نوری کے شکارے میں رہنے کی کوشش کرتے اس کی بھولی ادائیں اور بات چیت کا معصومانہ انداز سب کا دل موہ لیتا. اور پھر اس کا شکارہ بھی ہر طرح سے آرام دہ تھا. شکارے میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں. آرام دہ پلنگ اور اس پر مخملی تکیے اس شکارے کا نام بھی "کشمیر کی رانی" تھا.

نوری صبح ہوتے ہی اپنے مہمان کو پھولوں کا گلدستہ پیش کرتی. یہ گلدستہ وہ شالیمار باغ سے چن کر لاتی. شکارے میں رہنے والے مہمانوں کا دل ان گلدستوں کو پا کر باغ باغ ہو جاتا. وہ کشمیری پکوان بھی بہت ہی مزے دار پکاتی تھی کوئی ایک بار اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا لیتا تو انگلیاں چاٹتا رہ جاتا.

نوری اپنے مہمان کو کشمیر کے تمام باغوں، مندروں، مسجدوں اور دوسرے مقامات کی سیر کراتی. ساتھ ہی ساتھ اپنے مہمانوں کو بڑے ہی دلچسپ لطیفے اور کہانیاں بھی سناتی جاتی. غرض سارے کشمیر میں نوری اور اس کے

شکارے کی دھوم مچی ہوئی تھی بڑی بات یہ کہ اس کے شکارے کا کرایہ بھی واجبی ہوتا۔ رحیم خاں لوزی سے بے حد خوش تھا۔ اسی کی وجہ سے تو اس کا شکارہ گاہکوں سے بھرا رہتا اور وہ اچھا خاصا کما لیتا۔ رحیم خاں لوزی کا بہت خیال رکھتا۔ اس کی ہر خواہش پر اپنا سر جھکا دیتا تھا۔

لیکن اچانک وقت بدل گیا۔ لوزی جیسی پیاری بچی ایک بہت ہی بری بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ اسے برص ہو گیا تھا۔ لوزی کے حسین چہرے پر بے شمار داغ پڑ گئے۔

لوزی کو اس بیماری سے سخت صدمہ پہنچا۔ اب اس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ خود رحیم خاں بھی بے رخی سی برتنے لگا۔

ایک بار تو غضب یہ ہوا کہ لوزی نے ایک بہت ہی مہنگا گلدستہ توڑ دیا۔ اتفاق کی بات، اسی دن اس نے کھانا بھی بہت خراب پکایا۔ شکارے میں رہنے والا مہمان خفا ہو کر چل دیا۔ رحیم خاں اس بات کو برداشت نہ کر سکا اس نے سارا قصور لوزی کے سر منڈھا مگر لوزی کیا کرتی۔ وہ خود اپنی بیماری سے پریشان تھی۔ اب لوزی کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ وہ ہر وقت اداس رہتی۔ شکارہ بھی خالی ہو گیا تھا۔ رحیم خاں سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ وہ لوزی پر برسنے لگا۔ اسے ہر وقت ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔ رحیم خاں کو لوزی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ہوتے ہوتے رحیم خاں نے لوزی کو شکارے سے نکال دیا۔

برص جیسی بیماری میں مبتلا لوزی یہ صدمہ بھی برداشت کر گئی۔ اس نے اپنے والد اور شکارے کو چھوڑ دیا۔

اچانک اسے راستے میں ایک مولوی صاحب مل گئے ان سے لوزی کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ لوزی کو انھوں نے اپنے گھر میں پناہ دی۔ لوزی اب مولوی صاحب کے یہاں رہنے لگی۔ اور دھیرے دھیرے تھوڑا بہت کام بھی کرنے لگی۔ اسے کشمیری شال بنانا اچھی طرح آتا تھا۔ مولوی صاحب سے کچھ رقم لے کر اس نے شال بنانا شروع کیا۔ ہر مہینے کے آخر میں شہر کے بڑے میدان میں بازار لگتا تو لوزی ان شالوں کو بیچ دیتی۔ شہر والے تو اسے جانتے ہی تھے اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو ترس آ جاتا۔ اور وہ اس سے شال خرید لیتے۔ دھیرے دھیرے لوزی کے پاس کافی پیسے ہو گئے۔ کچھ روپیہ مولوی صاحب نے بھی دیا۔ اس رقم سے خود لوزی نے خود اپنا شکارہ بنوا لیا۔

ادھر رحیم خاں اپنی بیٹی کو گھر سے نکال کر پچھتا رہا تھا۔ اب اس کے شکارے میں سیاح بہت کم آتے تھے۔ دھیرے دھیرے رحیم کی آمدنی گھٹتی چلی گئی۔ اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ رحیم خاں کو احساس ہوا کہ اسے اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ادھر سری نگر میں ایک بہت بڑے حکیم آئے ہوئے تھے۔ جو ہر بیماری کا علاج مفت کرتے تھے۔ مولوی صاحب لوزی کو لے کر حکیم صاحب کے پاس گئے۔ حکیم صاحب نے پانی بھری ہوئی ایک شیشی دی۔ خدا کا کرنا تین دن تک پانی پیتے ہی لوزی کی بیماری دور ہو گئی؛ اس کے جسم کے تمام سفید داغ مٹ گئے۔

اب لوزی پہلے کی طرح خوبصورت بچی تھی۔ اس کا شکارہ بن کر تیار ہو چکا تھا۔

لوزی نے اس کا نام "گلستان" رکھا۔ گرمی شروع ہوتے ہی لوزی کے شکارے "گلستان" کی دھوم مچ گئی کشمیر میں آئے ہوئے سیاح لوگ لوزی کے شکارے میں رہنے کے خواہش مند رہتے تھے۔

ادھر رحیم خاں کے شکارے کو کوئی بھی نہ پوچھتا۔ رحیم خاں کو ڈر تھا اگر اس سال بھی اس کے شکارے میں کوئی نہ آیا تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہے اب زیادہ فاقہ کرنے کی اس میں سکت نہ تھی۔

رحیم خاں کو اپنی غلطی کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کر لے۔ اور پھر سے اُسے اپنے شکارے میں لے آئے۔

یہ سوچ کر رحیم خاں نوری سے ملنے اس کے شکارے "گلستان" میں گیا۔ اور اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالیں باپ کے منہ سے یہ سب سن کر نوری کو افسوس ہوا۔ رحیم خاں اچانک نوری کے پاؤں پر گر گیا۔ اور اپنی غلطی کی معافی مانگنے لگا۔

نوری نے فوراً رحیم خاں کو اپنے بازوؤں سے سنبھالیا اور گلے لگا لیا۔ نوری کا دل اب باپ کی طرف سے صاف ہو چکا تھا۔ نوری اب دونوں شکاروں پر رہتی اور مہمانوں کو خوش کرتی۔ نوری کی آمدنی دگنی ہو گئی۔ نوری بڑی نیک لڑکی تھی۔ وہ ہر مہینے اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ مولوی کو دے دیتی۔ مولوی صاحب اُسے مسجد کے چندے میں جمع کر دیتے۔ دھیرے دھیرے کافی چندہ جمع ہو گیا اور اس چندے سے کشمیر میں ایک بڑی مسجد تیار ہو گئی اس کا نام بھی نوری مسجد پڑ گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب لوگ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ تو نوری کی درازیٔ عمر کے لئے ضرور دعا کرتے ہیں۔ تاکہ اسے آئندہ بھی ایسے نیک اور اچھے کام کرنے کی توفیق ہو۔

جناب عبدالحق خاں پرنسپل مدرسہ ثانوی



پیسا کا ٹیڑھا مینار

دنیا کے سات عجائبات بہت مشہور ہیں۔ انھیں دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسی عجیب وغریب چیزیں دیکھنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ کاش! ہم تم بھی دنیا کے ان عجائبات کو دیکھ کر لطف اندوز ہو سکتے۔ لیکن اس کے لیے بہت وقت اور بہت روپے کی ضرورت ہے۔ دنیا کے یہ عجائبات کسی ایک جگہ یا ایک ملک یا ایک براعظم میں نہیں ہیں جبھی تو ان سب کا اپنی آنکھوں سے دیکھنا آسان نہیں ہے۔ پر اس سے کیا؟

ہم جگہ جگہ جا کر ان عجیب وغریب چیزوں کو نہ دیکھ سکیں لیکن ہم ان کے حالات پڑھ کر یا دوسروں کی زبانی ان کا حال معلوم کر کے بھی کافی لطف اٹھا سکتے ہیں اپنی معلومات بڑھا سکتے ہیں اور سچ جانیے یہ سب آنکھوں دیکھے حال سے زیادہ پر لطف اور مزے دار ہوتی ہے۔ کیونکہ آنکھوں سے تو ہم ان کو بس دیکھ ہی سکتے ہیں پتھر ہوتے تو ہیں نہیں وہ اپنی کہانی نہیں کہہ سکتے۔ ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہمارے ذہن میں طرح طرح کے جو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انھیں کس نے بنایا۔ کب بنایا۔ کیوں بنایا ان سب سوالوں کا جواب یہ کہاں دے سکتے ہیں اور کبھی یہ کمی تو ان کا حال پڑھنے یا سننے ہی سے پوری ہو سکتی ہے ہم چاہے کسی عمارت کو نہ دیکھ رہے ہوں اور وہ ہم سے سینکڑوں ہزاروں میل دور ہو۔ لیکن سنانے والا اس کا حال کچھ اس انداز سے سناتا ہے کہ یہ دوری بے معنی ہو جاتی ہے اور ہم کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ چیز ہمارے سامنے ہو اور ہم اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

آئیے آج ہم آپ کو ایک ایسے شہر سے چلیں جو آپ کے ہاں سے ہزاروں میل دور ہے اور صدیوں پرانا ہے۔ اس شہر کا نام پیسا ہے یہ یورپ کے ملک اٹلی میں واقع ہے۔ یہ شہر ایک ندی کے کنارے آباد ہے جس کا نام آرنو (ARNO) ہے۔ یہ شہر خوبصورت گرجا گھروں آرٹ کے بہت ہی بیش بہا اور قیمتی نمونوں کے لیے مشہور ہے لیکن اس کا سب بڑا عجوبہ اس کا ٹیڑھا مینار ہے۔

------------ جو دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔

دنیا کے کونے کونے سے ہزاروں ہزار سیاح اسے دیکھنے ہر سال اس شہر میں آتے ہیں اور اس کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ مینار بہت جھکا ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ ابھی گر جائے گا لیکن آٹھ سو سال پرانا یہ مینار اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا ہے۔ اور جب سے بنا ہے تب ہی سے ٹیڑھا ہے۔ خبر نہیں جان بوجھ کر ٹیڑھا بنایا گیا تھا یا غلطی سے بن گیا تھا۔ گیونانی ڈی سیمن (GIONAMI DESIMON) نام کے ایک ماہر تعمیرات نے ۱۱۷۴ء میں اسے بنانا شروع کیا ۱۱۸۵ء تک ساڑھے تین منزلیں ہی بنی تھیں کہ اسے محسوس ہوا کہ ارے یہ تو ٹیڑھا بن رہا ہے۔ اسے میں سیدھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ یہ گر جائے گا۔ یہ سوچ کر ڈر کے مارے وہ کہیں بھاگ گیا پھر نہیں لوٹا۔

پیسا کے لوگوں میں ایک اور دلچسپ روایت مشہور ہے جس معمار نے یہ مینار بنایا تھا وہ کبڑا تھا۔ یہ مینار بھی اس کی مناسبت سے کبڑا بن گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مینار ریتیلی زمین پر بنا ہوا ہے اور تیسری منزل بننے پر اس کا وزن اس کی بنیاد پر پڑا زمین پکی (یا پختہ) تو تھی نہیں نرم تھی، اس لیے دھنسنے لگی اور مینار ایک طرف کو جھک گیا اور مینار جھکتا چلا جا رہا ہے۔

ماہر تعمیرات بیونانی کے بھاگ جانے کے بعد اس مینار کے بننے کا کام تقریباً نوے سال بعد شروع ہوا۔ اور پیسا کے معماروں نے اس مینار کی چار منزلیں اور مکمل کر دیں اس مینار کی آٹھویں منزل اس کے اسی سال بعد بنائی گئی۔ جس میں گھنٹیاں رکھی گئیں جو عبادت کے وقت یا خاص خاص موقعوں پر بجائی جاتی تھیں ان گھنٹوں میں سے ایک تو تقریباً ستو من کی ہے جب بجتی تھی تو پورا مینار دہل جاتا تھا۔

اب مینار کی بنیاد بہت کمزور ہو گئی ہے۔ خطرہ ہے کہ یہ مینار اب گرا کہ اب گرا۔ اسی لیے نہ صرف گھنٹیاں بجانا بند کر دیا گیا ہے بلکہ آس پاس سے بھاری موٹریں تک نہیں گزرنے دیتے۔ آج کل انجینیر فکرمند ہیں کہ کس طرح اس کی بنیاد کو مضبوط بنایا جائے۔ اور اسے گرنے سے بچایا جائے۔ طرح طرح کی تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ جس طرح موٹر ٹھیک کرتے وقت جیک لگا کر اوپر اٹھائی جاتی ہے اس طرح بہت سے جیک لگا کر اس بھاری بھرکم مینار کو بھی اٹھا دیا جائے جس کے وزن کا اندازہ لگ بھگ چار لاکھ ٹن کے لگایا جاتا ہے اور پھر اس کی بنیاد کو خوب پکا کر کے اسے واپس اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔[۱]

پیسا کا ٹیڑھا مینار سفید سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس میں کہیں کہیں رنگین سنگِ مرمر کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے ہیں۔

اس مینار کو بنانے کا کام ۱۱۷۴ء میں شروع ہوا اور ۱۳۵۰ء میں مکمل ہوا۔ اور اس طرح اس کام کے

---

[۱] - روس کی راجدھانی ماسکو میں بہت دنوں سے بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں ادھر سے ادھر کھسکائی جا رہی ہیں۔ پیام تعلیم کے بہت سے آپ نے پڑھا ہوگا ادھر اُدھر سے

مکمل ہونے میں تقریباً دوسو سال لگے۔

اس مینار کا قطر بنیاد پر تقریباً ۵۲ فٹ ہے اور دیواروں کی موٹائی ۱۳ فٹ ہے جیسے جیسے اوپر جاتے ہیں دیواروں کی موٹائی کم ہوتی جاتی ہے اور آخری منزل پر دیواریں صرف سات فٹ موٹی رہ جاتی ہیں۔

مینار کی کل اونچائی ۱۷۹ فٹ ہے آخری منزل تک جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کی کل تعداد دوسو چھیانوے (۲۹۶) ہے۔

قطب مینار پر چڑھنے کے لیے بھی سیڑھیاں ہیں۔ جو بھی اسے دیکھنے آتا ہے اوپر ضرور چڑھتا ہے۔ لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ قطب مینار ۲۵۔۱ انچ ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ تو بہت کم لوگ اوپر چڑھنے کی ہمّت کریں گے۔ مگر آپ یہ سوچیے کہ اگر یہ مینار سترہ فٹ جھکا ہوتا تو آپ کے خوف کی کیا حالت ہوتی۔ آپ اس پر چڑھنے کی ہمّت تو کیا کرتے اس کے پاس سے گزرنے کی ہمّت بھی مشکل سے ہوتی۔

پیسا کا مینار ۱۷ فٹ جھکا ہوا ہے۔ اور برابر جھکتا ہی جا رہا ہے۔ ۱۸۲۹ میں اس مینار کا جھکاؤ ½۱۵ فٹ تھا۔ اور آجکل یہ ۱۷ فٹ سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا آپ پیسا کے مینار پر چڑھنا پسند کریں گے۔

ابھی ہم نے بتایا ہے کہ پیسا کے مینار کی نیچے سے اوپر تک آٹھ منزلیں ہیں۔ ہر منزل ستونوں کے اوپر بنائی گئی ہے۔ نیچے کی منزل سب سے بڑی ہے اور یہ ۱۵ ستونوں پر بنائی گئی ہے۔ آخری منزل ۱۲ ستونوں پر بنائی گئی ہے۔ جوں جوں اونچائی بڑھتی جاتی ہے۔ اوپر کی منزلیں لمبائی اور چوڑائی میں کم ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ آٹھویں منزل بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔

مینار کو بنانے کے لیے جو سفید سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ وہ شیشے کی طرح شفاف ہے۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ سینکڑوں سورج مینار طلوع ہو رہے ہیں۔

لطیفہ

اسلم : ڈاکٹر صاحب مریض کو دکھانا ہے۔

ڈاکٹر : مریض گھر دیکھنے کی فیس سولہ روپے ہوتی ہے۔

اسلم : جلدی کیجیے۔

ڈاکٹر : گیرج سے کار نکالی اور اسلم کو اشارہ سے کار میں بٹھا کر اس کے بتائے راستہ اس کے گھر پہنچے۔ اسلم نے سولہ روپے فیس ڈاکٹر صاحب کو دیتے ہوئے۔

ڈاکٹر : ۔ مریض کہاں ہے

اسلم : بارش بہت زور سے ہو رہی تھی اور کوئی سواری مل نہیں رہی تھی۔ اس لیے گھر پہنچنے کے لیے۔

بشیرالدین شیرکوٹی

لالچ کا نتیجہ

جناب عزیز فاطمہ فریدی
ایم اے فائینل

کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ وہ بڑا نیک تھا بہت صابر تھا ایماندار تھا۔ پورا گاؤں اس غریب آدمی کی دیانتداری کی تعریف کرتا تھا۔

غریب آدمی کے مکان کے پاس ہی ایک بدمزاج اور لالچی آدمی رہتا تھا۔ ہر ایک سے بے رحمی اور بدتمیزی سے پیش آتا تھا پورا گاؤں اس سے نالاں تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ ایک فقیر عورت خیرات مانگنے غریب آدمی کے گھر آئی۔ بچارے غریب آدمی کے پاس دینے کو تھا ہی کیا۔ جو کھانا اس وقت وہ خود کھا رہا تھا وہی فقیر عورت کو دے دیا۔ کھانا لے کر فقیر عورت نے غریب آدمی سے کہا۔ جاؤ یا کوئی برتن لے آؤ۔ غریب آدمی ایک دیگچی لے کر باہر آیا اور کہا۔ "لو یہ برتن ہے"

مگر وہ فقیر عورت وہاں موجود نہیں تھی بلکہ ایک خوبصورت پری گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ غریب آدمی سے اس پری نے کہا "آنکھیں بند کر لو اور دیگچی پر ہاتھ رکھ لو جب بھر جائے تو مجھے بتا دینا۔ جب دیگچی بھر گئی تو غریب آدمی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سبحان اللہ دیگچی تو اشرفیوں سے لبالب بھری تھی بوڑھا آدمی بڑا خوش ہوا اور اس کی زندگی آرام سے گذرنے لگی۔

دوسرے دن وہ پری فقیر کے بھیس میں بدمزاج و لالچی آدمی کے گھر آئی اور خیرات مانگی۔ پری نے کھانا لینے کے بعد وہی عمل کیا اور اس آدمی سے کہا کہ:
"دیکھو دیگچی بھر جائے تو فوراً بتانا ایسا نہ ہو کہ کوئی اشرفی دیگچی سے باہر گر پڑے۔

لالچی آدمی نے دیگچی بھرنے کے بعد بھی فقیر عورت کو نہیں بتایا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اشرفیاں ملیں۔ مگر آپ جانیں! لالچ اور حرص بڑی بری بیماری ہے۔ ہوا یہ کہ دیگچی سے جوں ہی اشرفی باہر گری۔ لالچی آدمی نے آنکھیں کھولیں کیا دیکھتا ہے کہ دیگچی میں کوئلے اور مٹی کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور پری بھی وہاں سے غائب ہے۔

روتا پیٹتا لالچی آدمی گھر کو واپس چلا تو کانوں میں یہ آواز آئی۔ "اے نادان! حرص اور لالچ کا یہی انجام ہوتا ہے۔

نوٹ: یہ کہانی انگلش ریڈروں کی کہانیوں میں سے ایک روایتی (TRADITIONAL) کہانی کا آزاد اردو ترجمہ ہے۔

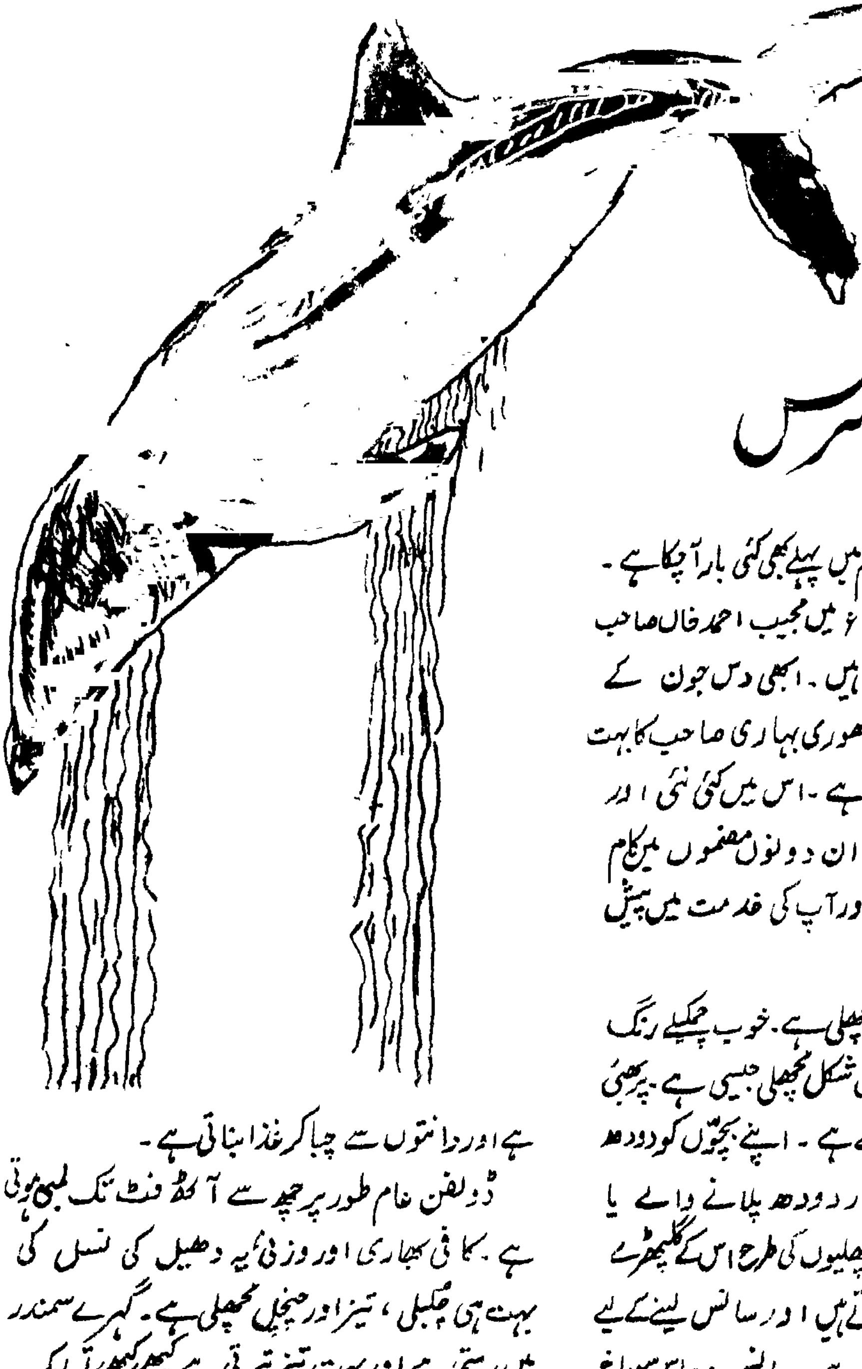
*

جناب شفیع تمنا کلکتہ

چل بنجارا ہنستا گاتا



چل بنجارا ہنستا گاتا
سب سے اپنی پریت بڑھاتا
بھول کے ساری ریت پرانی   دہرادے اک نئی کہانی
نئے جگت سے جوڑے ناتا
چل بنجارا ہنستا گاتا
کر لے سب سے بھائی چارہ   یہی ایک ہو تیرا نعرہ
سب کو چل یہ گیت سناتا
چل بنجارا ہنستا گاتا
مل جائے گی تجھ کو منزل   ٹل جائے گی ساری مشکل
چلتا جا تو قدم بڑھاتا
چل بنجارا ہنستا گاتا
نفرت کا ہو جہاں اندھیرا   وہاں یہی بس کام ہو تیرا
بڑھ الفت کے دیپ جلاتا
چل بنجارا ہنستا گاتا



محمد حسین حسّان

ڈولفن کا سرکس

ڈولفن کا ذکر پیام تعلیم میں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ اس سمندری مچھلی پر جولائی ۶۶ء میں مجیب احمد خاں صاحب بہت دلچسپ مضمون لکھ چکے ہیں۔ ابھی دس جون کے ہندوستان ٹائمس میں مادھوری بھاری صاحب کا بہت مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں کئی نئی اور بہت ہی دلچسپ باتیں ہیں۔ ان دونوں مضمونوں میں کام کی اور دلچسپ باتیں ہیں اور آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

ڈولفن مشہور سمندری مچھلی ہے۔ خوب چمکیلے رنگ والی۔ یوں دیکھنے کو اس کی شکل مچھلی جیسی ہے۔ پر بھی وہ تو وھیل مچھلی کی نسل سے ہے۔ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ یعنی اس کا شمار دودھ پلانے والے یا دودھیلیا جانداروں میں ہے مچھلیوں کی طرح اس کے گلپھڑے بھی نہیں ہوتے ہیں ہاں پھیپھڑے ہوتے ہیں اور سانس لینے کے لیے اسے پانی کے اوپر آنا پڑتا ہے۔ سانس وہ اس سوراخ سے لیتی ہے جو اس کے سر کے اوپر ہوتا ہے۔ اس کا منھ یا تھوتھنی بھی چونچ جیسی ہوتی ہے۔ منھ میں بہت سے دانت ہوتے ہیں اسی کی مدد سے اپنا شکار پکڑتی ہے اور دانتوں سے چبا کر غذا بناتی ہے۔

ڈولفن عام طور پر چھ سے آٹھ فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ کافی بھاری اور وزنی، یہ دھیل کی نسل کی بہت ہی چلبل، تیز اور چنچل مچھلی ہے۔ گہرے سمندر میں رہتی ہے اور بہت تیز تیرتی ہے کبھی کبھی تو ایک گھنٹے میں ساٹھ کلو میٹر تک پہنچ کر دم لیتی ہے۔

آپ جانوروں میں بندر، کتّے، ہاتھی اور گھوڑے کو سب سے زیادہ سمجھ دار مانتے ہیں۔ پر جناب بی پر ڈولفن

صاحبہ ان سب سے زیادہ سمجھ دار ہیں کہیں زیادہ ذہین ہیں۔ انسانوں سے تو، نہ جانے کیوں انھیں قدرتی اُنس محبت یا لگاؤ ہے۔

ایک دفعہ ایک آدمی نہ جانے کیسے شارک مچھلیوں کے نرغے میں آگیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں پر اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سی ڈولفن مچھلیاں وہاں پہنچ گئیں۔ آدمی کو اپنے حلقے (گھیرے) میں لے لیا۔ ایک ڈولفن مچھلی نے آدمی کو اپنی پیٹھ پر لٹا دیا۔ اور اس کے ساتھ کی دوسری مچھلیاں شارک مچھلیوں سے لڑتی بھڑتی آدمی کو ان دشمنوں کے نرغے سے نکال لائیں۔ اور اُسے ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دیا۔

بیالوجی (علم حیوانات) اور سائنس کے ماہر بھی اس بات پر متفق ہیں کہ دودھ پلانے والی مخلوق میں انسان کے بعد ڈولفن مچھلی ہی - ذہنی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جاندار ہے۔ اسے سدھانا بہت صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ مگر سدھ جاتی ہے تو ایسی ایسی حرکتیں کرتی ہے۔ ایسے ایسے کرتب دکھاتی ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور کیا بچے کیا بڑے دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں۔

ڈولفن کے گلے میں آواز پیدا کرنے والے عضلات نہیں ہوتے پر وہ اپنے منھ سے ہوا نکال کر مختلف آوازیں پیدا کرتی ہے۔ یہ آواز سیٹی جیسی ہوتی ہے۔ اپنی ساتھی ڈولفنوں سے باتیں بھی کرتی ہے۔ باتیں کرنے کا طریقہ بھی عجیب وغریب ہے وہ اسی طرح پوری آواز سے سیٹی بجاتی ہے۔ سیٹی کی آواز پانی کے اوپر بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ سیٹی جیسی آوازیں اس کے مختلف جذبات کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہی نہیں آپنے جسم کی مختلف حرکتوں سے وہ خوشی، رنج، غصّے اور نفرت کا بھی صاف اظہار کرسکتی ہے۔

سمت اور رُخ کا اندازہ لگانے میں بھی ماہر ہوتی ہے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر سمندر میں دُور لے جائیے۔ پھر کنارے پر کھڑے ہو کر آواز دیجیے۔ آواز سنتے ہی سیدھی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ اور سننے کی طاقت تو اتنی حیرت انگیز ہے کہ سائنس داں بھی اچنبھے میں ہیں۔

غرض عقل اور سوجھ بوجھ میں یہ جان دار انسان کے علاوہ سب جان داروں سے بازی لے گیا ہے۔ اسی لیے سائنس داں اس کی عقل اور سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے سائنس دانوں نے سمندر کے اندر کیے جانے والے تحقیقاتی کاموں میں مدد کے لیے ایک ڈولفن کو سدھایا ہے۔ اس ڈولفن کے نام انھوں نے ٹفی رکھا ہے۔

ٹفی سمندر کے اندر تحقیقات کرنے والے جہاز میں کام کرتی ہے۔ اور سمندر کی تہہ میں کام کرنے والے سائنس دانوں اور سمندر کی سطح پر کھڑے ہوئے جہاز کے درمیان پوسٹ مین کی خدمت انجام دیتی ہے۔ پیغامات لاتی لے جاتی ہے اور چھوٹا موٹا سامان بھی پہنچا دیتی ہے۔ وہ اپنے مالک کے ہر اشارے کو اور آواز کے اتار چڑھاؤ کو خوب سمجھتی ہے۔ ہمیشہ وہی کرتی ہے جو اس کا مالک کرانا چاہتا ہے۔

ایک بار ٹفی کے جہاز پر کام کرنے والا ایک آدمی سمندر میں گر گیا لہریں کچھ اس طرح چل رہی تھیں کہ باوجود کوشش کے وہ دور ہوتا چلا گیا۔ ٹفی کے مالک نے ٹفی کو آواز دی۔ ٹفی فوراً سطح پر یعنی پانی کے اوپر آگئی مالک نے ایک لمبی رسّی کا سرا ٹفی کے منہ میں دے کر

اُس آدمی کی طرف اشارہ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اُس آدمی کے پاس تھی۔ اس نے رسی کا سرا اس آدمی کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس طرح اس کی جان بچالی۔

ہم ابھی آپ کو بتا لئے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے سائنس داں اس عجوبہ مچھلی کی طرف غیر معمولی توجہ کر رہے ہیں۔ ہالینڈ والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس کے کرتب دکھلانے کے لیے بڑا سا اسٹیڈیم بنا ڈالا۔

ہالینڈ میں ایک جگہ ہے ہارڈر وچ (HARDERWIJK) یہیں یہ بڑا ڈولفن اسٹیڈیم بنایا گیا ہے۔ یہ اوپر سے پٹا ہوا ہے۔ یعنی اس کے اوپر چھت ہے۔ یہ عمارت ۱۹۶۵ء میں بننا شروع ہوئی اور ۱۹۶۸ء میں اس کا افتتاح ہوا۔

اس اسٹیڈیم میں ڈولفن کے عجیب و غریب کرتب دکھائے جاتے ہیں آپ اسے ہی ڈولفن کا سرکس کہہ سکتے ہیں۔

انوکھا سرکس بہت ہی انوکھا!

اسٹیڈیم میں چودہ فٹ گہرے حوض کے گرداگرد یا چاروں طرف بیٹھنے کی ڈھائی ہزار سیٹیں یا جگہیں ہیں۔ حوض میں چار لاکھ گیلن بالکل صاف شفاف پانی ہے۔ اس کا درجہ حرارت مستقلاً ۲۰ سینٹی گریڈ رکھا جاتا ہے۔

اس سرکس کا ٹکٹ چار ڈچ گلڈر (تقریباً دس روپے) ہے۔ یہ چار گلڈر خرچ کر شوقین لوگ اس چونچال چلبلی اور چنچل مچھلی کے اچنبھے میں ڈالنے والے اور ناقابلِ یقین کرتب دیکھ سکتے ہیں۔ مادھوری بہاری صاحب نے یہ سرکس خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور یہ اُن کے لیے زندگی کی جیسے ایک یادگار چیز ہو گئی ہے۔

ایک عجیب و غریب کرتب تو سائنسی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کئی چیزیں پانی میں ڈال دی جاتی ہیں اور ڈولفن اپنی ہی آوازوں کی لہروں کی مدد سے ان چیزوں کا پتہ لگا لیتی ہے اور انھیں نکال لاتی ہے۔

اس کرتب کو دکھاتے وقت ڈولفن کی آنکھوں پر ربر کی پٹیاں چڑھا دی جاتی ہیں۔ پھر چھلّے پانی میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ڈولفن انھیں نکال لاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ڈولفن ہلکی ہلکی آوازیں نکالتی ہے۔ یہ پانی میں ان آوازوں کی لہریں یکے بعد دیگرے چھلّے سے ٹکراتی ہیں اور ٹکرا کر واپس آتی ہیں۔ بس انھی کی مدد سے وہ چھلّے تک پہنچ جاتی ہے۔ اور چھلّا نکال لاتی ہے۔ ہے تو عجیب و غریب بات! آپ ذرا اندازہ تو کیجئے اس کے سننے کی طاقت کتنی تیز ہے۔

یہ تماشا یا سرکس میں (مادھوری بہاری صاحب) نے بھی دیکھا۔ یہ ایک گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ تین ڈولفنیں اس میں حصّہ لے رہی تھیں۔ ہر ایک کا وزن لگ بھگ ڈیڑھ سو کلوگرام تھا۔

رنگین بلب، چھلّے وغیرہ پانی میں ڈال دیے گئے اور یہ ڈولفنیں انھیں باہر نکال لائیں۔

پھر پانی میں ایک اچھی خاصی بڑی کشتی اتاری گئی اس کشتی میں دو برس کا بچہ بٹھا دیا گیا ایک ڈولفن کشتی کو ادھر سے ادھر کھینچ کرتی رہی۔

اب ایک اور سب سے دلچسپ کرتب کا حال سنیے۔ ایک ڈولفن صاحبہ پانی سے باہر آگئیں۔ بستر پہ دراز ہو گئیں۔ یہ بستر اُن کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا بستر پر لیٹتے ہی سو گئیں۔ یہاں تک کہ الارم بجا۔ یہ جیسے اس بات کا اعلان تھا کہ جاگو سونے والو، سونے کا وقت ختم ہو گیا۔

اور پھر جیسے کسی خاتون کلرک کو دفتر جانے کی جلدی ہو وہ غسل خانے میں گھس گئیں۔ وہاں بڑے سے

باقی صفحہ ۴۹ پر

پیامی بچوں کے لیے

ہنڈ کلھیا

شاہدہ پروین

بہت دنوں سے پیام تعلیم پڑھنے والی بچیّوں کا تقاضا تھا کہ رسالے میں خاص ہمارے مطلب کی چیزیں بھی ہونی چاہئیں۔ ہمیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ مگر چند مجبوریوں کی وجہ سے کوئی انتظام نہ کر سکے تھے۔ پچھلے سال ہمارے ساتھی محترم سیّد احمد ولی صاحب کے ایک بھانجے تشریف لائے تھے۔ گورنمنٹ انٹر کالج میں استاد ہیں۔ اُن کے سامنے بات چیت چلی تو انھوں نے فرمایا میرے پاس اس سلسلے میں کچھ مواد ہے وہ میں بھیج دوں گا۔ یہ آپ چھاپنا شروع کر دیجیے۔ ایک دفعہ یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا تو انشاءاللہ بند نہ ہوگا۔ خود پیامی بچیاں اور بزرگ خواتین آپ کی مدد کریں گی شکر ہے کہ دیر سے سہی۔ یہ وعدہ انھوں نے پورا فرمایا۔ اور اپنے بچّوں اور بچیوں سے 'ہنڈ کلھیا' پر مضمون اور کشیدہ کاری کے نمونے بھجوائے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی توقع کے مطابق یہ مفید اور کارآمد سلسلہ اب چلتا ہی رہے گا۔ انشاءاللہ۔

(اڈیٹر)

آم کا اچار

اچار کا مسالہ: (۱) پسی ہلدی (۲) پسی مرچ (۳) سونف

ڈیڑھ چمچہ　جتنی آپ پسند کریں　۲۰ گرام

(۴) کلونجی (۵) ادرک (۶) لہسن (۷) تیل سرسوں

۱۰ گرام　۵۰ گرام　۲۰ گرام　۱۰۰ گرام

(۸) پودینہ خشک (۹) نمک

۵ گرام　ذائقہ کے مطابق

ترکیب: ایک کلو آم چھیل کر کدوکش میں کس لیجیے۔ اس میں اپنے ذائقے کے مطابق نمک ملا لیجیے۔ اسے ایک یا دو گھنٹے کے لیے رکھ دیجیے تاکہ اس میں سے زیادہ سے زیادہ پانی نکل جائے۔ سونف سل پر موٹی موٹی کوٹ لیجیے۔ لہسن چھیل کر موٹا موٹا کاٹ لیجیے۔ ادرک باریک کتر لیجیے۔

ترکیب: اب نمک لگے آموں کو (ایک یا دو گھنٹے بعد) نچوڑ لیجیے اور آموں میں مسالہ اور تیل ملا کر شیشے کے یا گوالیار کے بنے ہوئے مرتبان میں بھر دیجیے۔ دو تین دن دھوپ میں رکھیے اور پھر مزے سے کھائیے۔ زیادہ دنوں رکھنا ہو تو تیل دوگنا کر دیجیے۔ یہ اچار پسند آئے تو لکھیے تاکہ اچار تیار کرنے کی اور ترکیبیں بتائی جائیں۔

بوٹی کباب

مصالحہ: (۱) دہی (۲) پیاز (۳) ادرک

۱۰۰ گرام　دو چھوٹی گانٹھیں　ایک درمیانی ٹکڑا

(۴) دھنیا پسا ہوا (۵) ہلدی پسی ہوئی (۶) لال مرچ

چائے کے دو چمچے　چار کا ایک چمچہ　حسب منشا

(۷) نمک (۸) خشخاش (۹) تیل یا ڈالڈا

حسب منشا　چائے کا ایک چمچہ　دو بڑے چمچے

ترکیب: بوٹیاں ایک ایک انچ کی خود کر لیجیے یا کرا لیجیے نمبر ۲ سے ۹ تک سب چیزیں اچھی طرح پیس لیجیے اور

باقی صـ۴۹ پر



کتابوں کی باتیں

ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی

پہلا حصّہ دوسرا حصّہ

مصنف : جناب میر نجابت علی

مترجم : ،، سیّد احسان حسین

لکھائی چھپائی آفسیٹ کی بہت خوب صورت تصویریں یک رنگی دو رنگی قریب قریب ہر صفحے پر ٹائٹل ہر کتاب کا تین رنگوں کا بچوں کے لیے بہت دل کش ضخامت ہر حصّے ۴۴ صفحے اور قیمت ہر ایک کی ۱/۵۰

ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ملے۲۵

ان دونوں کتابوں میں محترم میر نجابت علی صاحب نے ان ایجادوں کا حال بیان کیا ہے۔ جن کی بدولت ہماری یہ دنیا سچ مچ کیا سے کیا ہو گئی۔ ہمارے رہن سہن پر ہماری تہذیب پر ہمارے تمدن پر کتنا کچھ گہرا اثر پڑا ہے۔ کہ بیان میں نہیں آسکتا۔

کتاب کے پہلے حصّے میں پہیے کا ذکر ہے (۲) خورد بین کا ذکر ہے (۳) چھاپہ خانے (پرنٹنگ پریس) کا ذکر ہے میر صاحب نے ان سب چیزوں کا شروع بالکل شروع سے بہت اختصار کے ساتھ حال لکھا ہے اور پھر آخر میں بعد کے آنے والوں نے ان میں جو نت نئی اصلاحیں کیں ان کا ذکر کیا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود مختصر ہونے کے ان کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔

دوسرے حصّے میں ڈائنمو (۲) ٹیلی گراف (۳) جوہری توانائی (۴) الیکٹرانکس (علم البرق یا بجلی کا علم) کا ذکر ہے قریب قریب سبھی چیزیں ایسی ہیں کہ بچے انھیں آسانی سے نہیں سمجھ سکتے خصوصاً جوہری توانائی تو بہت ہی مشکل مضمون ہے۔ یہ میر صاحب کا کمال ہے کہ ان مشکل مضمونوں کو انھوں نے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس کوشش میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ انھوں نے ان ایجادوں کا ذکر کیا ہے جو ان دریافتوں یا انکشافات کی بدولت وجود میں آئیں۔ مثلاً خلا کا سفر چاند کی مہم کی کامیابی وغیرہ۔

ان کتابوں کی زبان ہی سادہ نہیں ہے۔ لکھنے کا انداز یا انداز بیان بھی دلچسپ ہے۔ بچہ انھیں پڑھنا شروع کرے تو بس پڑھتا چلا جائے۔ ذرا بھی اکتاہٹ یا دماغ پر ذرا سا بھی بوجھ محسوس نہ کرے۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے اس کتاب کے لیے مترجم بھی اچھا تلاش کیا ہے۔ پوری کتاب پڑھ جائیے ذرا بھی آپ کو ترجمہ پن محسوس نہ ہوگا۔ پھر ترجمہ کی زبان بھی آسان اور دلچسپ ہے۔ کتاب کا کاغذ لکھائی چھپائی گیٹ اپ سبھی چیزیں اعلیٰ درجے کی ہیں۔ عموماً ہر صفحے پر تشریحی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں سے مضمون کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود قیمت یوں سمجھیے کہ برائے نام ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر سے منگوائیے۔

★★

آدھی ملاقات

پیام تعلیم کے مئی اور جون کے پرچے ملے۔ بہت پسند آئے۔ جناب رشید حسن خاں صاحب کا مضمون —— "حرفوں کا جادو" بہت مفید ہے۔ مئی سے پہلے جن شماروں میں اس مضمون کی سابق قسطیں چھپی ہیں وہ اگر آپ ارسال فرما سکیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

(محمد انس (پروفیسر جغرافیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

پیام تعلیم پڑھا سرورق بہت پسند آیا چچا شفیع الدین نیر کی خدمت میں آداب۔ یہاں بھی برکھا رت آئی ہے اور بڑی چھٹیوں کے بعد مدرسے کھل گئے ہیں۔

بچوں کی دعا اثر کر گئی۔ بے شک خود اعتمادی سے طفن کے عزیز منزل مقصود پاتے ہیں

رضوان احمد۔ باگل کوٹ

مدتوں سے میری تمنا تھی کہ پیام تعلیم کا سرورق کشش والا ہو۔ پچھلے چند ماہ سے میری یہ تمنا بر آئی ہے۔ دوسری تمناؤں میں حسب ذیل شامل ہیں۔

سوال و جواب کا کالم   انعامی مقابلے
لطیفوں کا کالم   بچوں کی تصاویر

عبدالمجید آنیکل۔ تاگار۔ بنگلور

پیام تعلیم کھولا۔ سرورق دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ذہن میں ایک بے تکا سا خیال آیا کہ آیا یا پیام تعلیم ہی ہے یا کوئی دوسرا اسی نام کا پرچہ۔ سرورق درحقیقت اتنا ہی خوبصورت اور دل کش ہے کئی لمحوں تک پرچہ کھول کر دیکھے کو جی نہ چاہا اور مسلسل سرورق پر نظریں جمی رہیں۔ رنگوں کا انتخاب بھی بیک ارٹسٹ کے سلیقہ کا ترجمان ہے۔ آپ کو محترم شاہد صاحب اور محترمہ آرٹسٹ صاحبہ کو دلی مبارک باد۔ خدا کرے کہ پیام تعلیم کے ہر شمارہ کا سرورق اتنا ہی دیدہ زیب و دل کش ہو آمین۔ گھر میں بھی کیا بچے کیا بڑے سب ہی کو سرورق بہت پسند آیا! ان سب کی طرف سے بھی مبارکباد قبول فرمایئے۔

پیام تعلیم نے اپنی نئی زندگی کے بھی دس سال پورا کر لیے۔ مبارک ہو۔ مجھے واقعتاً دلی مسرت ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ میرے اور پیام تعلیم کے جدید تعلقات کو دس سال کی مدت ہوگئی جدید تعلقات یوں کہ ایک پیامی کی حیثیت سے دلی وابستگی تھی اور اب دس سال سے دہری وابستگی ہے ایک بحیثیت پیامی کے جو کسی بچے ہی کی طرح پیام تعلیم کا انتظار کرتا ہے

مضامین۔ کہانیاں۔ نظمیں سب ہی پسند آئیں خصوصاً انوکھی عدالت بہت دلچسپ کہانی ہے۔ محترم اسرار ندوی صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے توفیق الحکیم کی یہ انوکھی اور قہقہہ زار کہانی ہم تک پہنچائی۔ مسحور صاحب کی نظم بھی اپنے انداز کی انوکھی نظم ہے۔ میرے مضمون اور خط کی اشاعت کا شکریہ۔

طباعت — اس بار کچھ جچی نہیں۔ جمال پریس لیتھو کا بہترین پریس کہلاتا ہے۔ اور خاصی عمدہ طباعت ہوتی ہے۔ اس بار جانے کیوں ایسا ہوا۔

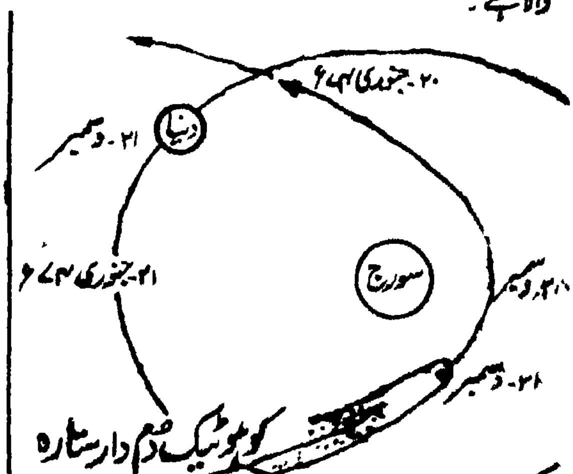
انوار علی صاحب کا خط آدھی ملاقات کے کالم میں نظر نواز ہوا۔ الیس، مونگے کا جزیرہ، کا سلسلہ شاندار لگا۔ شکریہ۔ آئندہ قسطیں زیادہ طویل ہیں۔ اس لیے اب انھیں اس کے "بہت مختصر" ہونے کی شکایت نہ ہوگی۔

خلیق انجم شمری

اِدھر اُدھر سے

ایک دُم دار ستارے کی آمد

آسمان کی وسعتوں میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ تمام عالم میں رصدگاہیں ہیں جہاں دن رات ہیئت داں آسمان کے چپے چپے کے مشاہدے میں مشغول ہیں اور اس کے لیے جدید ترین آلات اور ترقی یافتہ دوربینیں استعمال کی جاتی ہیں اور اجرام فلکی کے بہت سے حادثات روزانہ ان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ مگر دمدار ستارہ ایسا تماشا ہوتا ہے جو اپنی آمد سے انسانوں میں ایک ہلچل مچا دیتا ہے۔ ایسا ہی حادثہ عنقریب ہونے والا ہے۔



رصدگاہوں نے ایک دمدار ستارے کی آمد کی خبر دی ہے۔ اس کا نام بھی رکھ دیا گیا ہے "کوہوٹیک دمدار ستارہ"! ہیمبرگ کی رصدگاہ کے ہیئت داں ڈاکٹر لوباس کوہوٹیک نے سب سے پہلے اسے مارچ میں لی گئی تصویروں سے شناخت کیا تھا اس لئے انہی کے نام پر اس کا نام رکھ دیا گیا۔

کمپیوٹروں سے اس کی جسامت اور اس کے مدار کا جو تجزیہ کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معمولی ہر سال نظر آنے والے درجن یا اس سے زیادہ دُم دار ستاروں کی طرح نہیں ہے بلکہ خاصا شاندار ہے اور شاید برسوں ایسا تماشا دیکھنے کو نہ ملے۔

جتنے دُمدار ستارے ہیں یہ سب سورج کے گرد مداروں میں گھومتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جیسے ہیلی کا دم دار ستارہ بہت باقاعدگی سے سورج کے قریب آتے ہیں ان کا مدار پچکے ہوئے دائرہ کی طرح ہوتا ہے جس کا سرا سورج کے قریب ہوتا ہے اور باقی وقت نظام شمسی کی دور دراز وسعتوں میں گزرتا ہے چونکہ واپسی پابندی سے مقررہ اوقات میں ہوتی ہے لہذا کبھی کبھی اس کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

بہت نادر موقعوں پر سورج کے خاندان کے یہ جلا وطن بھرے افراد اپنے تاریک گوشوں سے نکل کر ذرا سا درشن دیتے ہیں اور پھر ایک طویل عرصہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں کوہیک انہی میں سے ایک ہے۔ نہیں معلوم اس سے قبل یہ سورج کے نزدیک کب آیا تھا۔

کوہوٹیک کے بارے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بے مثال نظارہ ساری دنیا میں دکھائی دے گا۔ یہ اتنا روشن ہے کہ دسمبر ۷۳ء کے دن میں بھی بغیر دوربین کی مدد کے دیکھا جا سکے گا۔ یہ ایک روشن ستارے کی طرح دکھائی دے گا۔ جس کے گرد ایک تابناک ہالہ ہوگا اور ایک بہت لمبی پھیلی پھیلی ہوئی سی دم ہوگی دمدار ستاروں کی آمد اور روانگی سے ان کی تیز رفتاری کا گمان ہوتا ہے مگر آپ گھنٹوں دیکھیں گے تب آپ کو ان کی حرکت نظر آئے گی۔ وہ دوسرے ستاروں کے مقابلے میں متحرک نظر آئے گا۔ دراصل

رفتار ڈیڑھ لاکھ میل فی گھنٹہ ہو گی۔
و ہوٹیک کی سورج سے ملاقات ۲۸۔ دسمبر ۷۳ء کو
اس دن وہ سورج سے ایک کروڑ تیس لاکھ میل کی دوری
رہے گا۔ ستاروں کی دنیا میں یہ فاصلہ بہت قریب سمجھ
ہی سورج کی تابناک کرنیں اس میں داخل ہوں گی اس
وہ پھیل جائے گی اور ہوا میں لہرائے گی۔ یہ ہوا میں لہراتا
علوم ہوگا۔ مگر یہ بالکل واقعہ ہے کیوں کہ سورج کی سطح
برابر ذرات کا بہاؤ جاری ہے جسے سورج کی آندھی
میں۔

آئندہ سال جنوری کی ابتدا میں نظارہ دلچسپ ہونا
روع ہوگا۔ اگر دمدار ستارے کی دم زیادہ لمبی ہوئی جیسا
زہ ہے تو شام کو دم دکھائی دے گی حالانکہ خود ستارہ
رج کے بہت قریب ہونے کے باعث نظر نہ آئے گا۔
طلوع پر اس طرح ابھرے گی جیسے ایک تیر سورج پر نشانہ
رہا ہو اور کچھ دنوں میں ستارے کا سر بھی سورج کی آڑ
سے نکل آئے گا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنے تاریک گوشہ میں
چلا جائے گا۔

دم دار ستارے میں سوائے گرد کے اور چمکتی ہوئی گیس کے
مادہ بہت کم ہوتا ہے اور سوائے اس وقت کے جب وہ
ٹکرا ہی جائیں دنیا کو ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور
کوہوٹیک کا تو سب سے قریب فاصلہ دنیا سے سات کروڑ
پچاس لاکھ میل ہوگا۔ (سب ساتھ)

برفانی انسان

کھٹمنڈو ۵۔ اگست۔ برطانیہ کے تین ماہرین حیوانات
نے جو ہمالیہ سے حقیقی برفانی انسان کی تلاش کر رہے ہیں
آج بتایا ہے کہ ہمالیہ میں برفانی انسان موجود ہے یہ شکل
رکھتا ہے۔ لیکن ایسا انسان نہیں ہے، جیسا کہ کوہ پیما ہلن
اور شیر پاؤں نے بیان کیا ہے۔ ان ماہرین کی رائے
ہے کہ یہ برفانی انسان ان عظیم بن مانسوں کی اولاد
معلوم ہوتا ہے جو لاکھوں برس پہلے ہمالیہ کے علاقے
میں رہتے تھے۔ (الجمعیۃ)

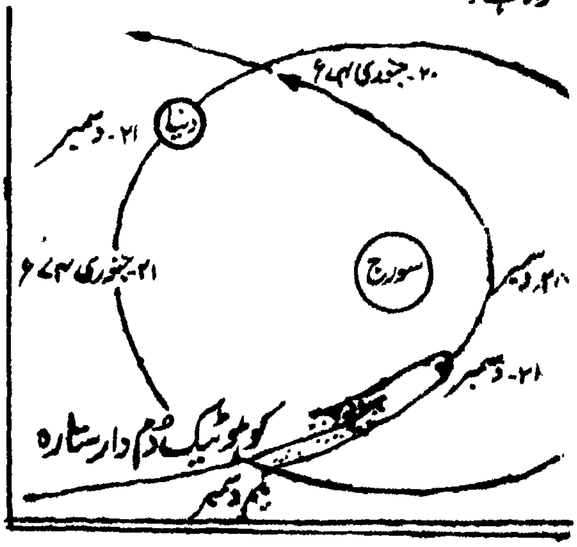
ڈولفن کا سرکس بقیہ صفحہ ۳۴ سے
تو تھوتھنی سے دانت مانجھے اور پھر پردہ تان دیا جیسے
نہانے کی تیاری کر رہی ہوں اور نہاتے وقت لوگوں کی
نظروں سے چھپنا چاہتی ہوں۔
اور جب وہ غسل خانے سے باہر نکلیں تو تولیہ ان
کی کمر سے لپٹی ہوئی! یہ منظر دیکھ کر کیا بچے کیا بڑے سبھی
کی ہنسی چھوٹ گئی سب دیر تک بے اختیار ہنستے رہے۔
ویسے ڈولفن کو سدھانا اور اسے انسانی تہذیب
سے مانوس کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔ ہمارے ہندوستان
میں سائنس دانوں نے ڈولفن سے دلچسپی کم لی ہے۔ اور
ہمارے خیال میں یہ بڑی کمی ہے۔

بقیہ ہند کا معیا صفحہ ۳۵ سے
اور سب کو دہی ملا دیجیے پھر بوٹیوں کو ان ملے ہوئے
مسالوں میں تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیجیے۔ تھوڑی
دیر گذرنے کے بعد بوٹیاں ایک سخت تار میں پرو دیجیے۔
اس طرح پرو دیئے کر دہی اور سب چیزیں بوٹیوں پر لگی رہیں۔
اب انھیں انگیٹھی میں انگاروں پر سینک لیجیے یا انگارے زمین پر پھیلا کر
اینٹوں پر تار رکھ کر سینک لیجیے سلاخوں یا تار کو تھوڑی
تھوڑی دیر بعد گھماتے رہیے۔ بوٹیاں سک جانے کے بعد
ان پر گھی لگا لیجیے اور مزے سے کھائیے۔

اِدھر اُدھر سے

ایک دُم دار ستارے کی آمد

آسمان کی وسعتوں میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ تمام عالم میں رصدگاہیں ہیں جہاں دن رات ہیئت داں آسمان کے چپے چپے کے مشاہدے میں مشغول ہیں اور اُس کے لیے جدید ترین آلات اور ترقی یافتہ دوربینیں استعمال کی جاتی ہیں اور اجرامِ فلکی کے بہت سے حادثات روزانہ ان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ مگر دُمدار ستارہ ایسا تماشا ہوتا ہے جو اپنی آمد سے انسانوں میں ایک ہلچل مچا دیتا ہے۔ ایسا ہی حادثہ عنقریب ہونے والا ہے۔



رصدگاہوں نے ایک دُمدار ستارے کی آمد کی خبر دی ہے۔ اس کا نام بھی رکھ دیا گیا ہے "کوہوٹیک دُمدار ستارہ"! ہیمبرگ کی رصدگاہ کے ہیئت داں ڈاکٹر لوباس کوہوٹیک نے سب سے پہلے اسے مارچ میں لی گئی تصویروں سے شناخت کیا تھا اس لئے انہی کے نام پر اس کا نام رکھ دیا گیا۔

کمپیوٹروں سے اس کی جسامت اور اُس کے مدار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معمولی ہر سال نظر آنے والے ایک درجن یا اس سے زیادہ دُم دار ستاروں کی طرح نہیں ہے بلکہ خاصا شاندار ہے اور شاید برسوں ایسا تماشا دیکھنے کو نہ ملے۔

جتنے دُمدار ستارے ہیں یہ سب سورج کے گرد مداروں میں گھومتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جیسے ہیلی کا دم دار ستارہ بہت پابندی سے سورج کے قریب آتے ہیں ان کا مدار پچکے ہوئے دائرہ کی طرح ہوتا ہے۔ جس کا سر سورج کے قریب ہوتا ہے اور باقی وقت نظامِ شمسی کی دور ٹھنڈی وسعتوں میں گزرتا ہے چونکہ واپسی پابندی سے مقررہ اوقات میں ہوتی ہے لہذا کبھی کبھی اس کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

بہت نادر موقعوں پر سورج کے خاندان کے یہ جادو بھرے افراد اپنے تاریک گوشوں سے نکل کر ڈرامائی درشن دیتے ہیں اور پھر ایک طویل عرصہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں کوہیک انہی میں سے ایک ہے۔ نہیں معلوم اس سے قبل یہ سورج کے نزدیک کب آیا تھا۔

کوہوٹیک کے بارے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بے مثال نظارہ ساری دنیا میں دکھائی دے گا۔ یہ اتنا روشن ہے کہ دسمبر ۷۳ء کو دن میں بھی بغیر دوربین کی مدد کے دیکھا جا سکے گا۔ یہ ایک روشن ستارے کی طرح دکھائی دے گا۔ جس کے گرد ایک تابناک ہالہ ہوگا اور ایک بہت لمبی پھیلی ہوئی سی دم ہوگی دمدار ستاروں کی آمد اور روانگی سے ان کی تیز رفتاری کا گمان ہوتا ہے مگر آپ گھنٹوں دیکھیں گے تب آپ کو ان کی حرکت نظر آئے گی۔ وہ دوسرے ستاروں کے مقابلے میں متحرک نظر آئے گا۔ دراصل

اس کی رفتار ڈیڑھ لاکھ میل فی گھنٹہ ہوگی۔

کوہوٹیک کی سورج سے ملاقات ۲۸ دسمبر ۷۳ء کو ہوگی، اس دن وہ سورج سے ایک کروڑ تیس لاکھ میل کی دوری سے گزرے گا۔ ستاروں کی دنیا میں یہ فاصلہ بہت قریب کا ہے جیسے ہی سورج کی تابناک کرنیں اس میں داخل ہوں گی اس کی دم اور پھیل جائے گی اور ہوا میں لہرائے گی۔ یہ ہوا میں لہرانا عجیب معلوم ہوگا۔ مگر یہ بالکل واقعہ ہے کیوں کہ سورج کی سطح سے برابر ذرات کا بہاؤ جاری ہے جسے سورج کی آندھی کہتے ہیں۔

آئندہ سال جنوری کی ابتدا میں نظارہ دلچسپ ہونا شروع ہوگا۔ اگر دمدار ستارے کی دم زیادہ لمبی ہوئی جیسا اندازہ ہے تو شام کو دم دکھائی دے گی حالانکہ خود ستارہ سورج کے بہت قریب ہونے کے باعث نظر نہ آئے گا۔ دم مطلع پر اس طرح ابھرے گی جیسے ایک تیر سورج پر نشانہ لگا رہا ہو اور کچھ دنوں میں ستارے کا سر بھی سورج کی آڑ سے نکل آئے گا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنے تاریک گوشہ میں چلا جائے گا۔

دم دار ستارے میں سوائے گرد کے اور چمکتی ہوئی گیس کے مادہ بہت کم ہوتا ہے اور سوائے اس وقت کے جب وہ ٹکرا ہی جائیں دنیا کو ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور کوہوٹیک کا تو سب سے قریب فاصلہ دنیا سے سات کروڑ پچاس لاکھ میل ہوگا۔ (سب ساتھ)

برفانی انسان

کھٹمنڈو ۵ اگست۔ برطانیہ کے تین ماہرین حیوانات نے جو ہمالیہ سے یتی (برفانی انسان) کی تلاش کر رہے ہیں آج بتایا ہے کہ ہمالیہ میں برفانی انسان موجود ہے یہ عقل رکھتا ہے۔ لیکن ایسا انسان نہیں ہے، جیسا کہ کوہ پیماؤں اور شیرپاؤں نے بیان کیا ہے۔ ان ماہرین کی رائے ہے کہ یہ برفانی انسان ان عظیم بن مانسوں کی اولاد معلوم ہوتا ہے جو لاکھوں برس پہلے ہمالیہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ (الجمعیۃ)

ڈولفن کا سرکس بقیہ ص۳۴ سے

ٹوتھ برش سے دانت مانجھے اور پھر پردہ تان دیا جیسے نہانے کی تیاری کر رہی ہوں اور نہاتے وقت لوگوں کی نظروں سے چھپنا چاہتی ہوں۔

اور جب وہ غسل خانے سے باہر نکلیں تو تولیہ ان کی کمر سے لپٹی ہوئی! یہ منظر دیکھ کر کیا بچے کیا بڑے سبھی کی ہنسی چھوٹ گئی سب دیر تک بے اختیار ہنستے رہے۔

ویسے ڈولفن کو سدھانا اور اسے انسانی تہذیب سے مانوس کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔ ہمارے ہندوستان میں سائنس دانوں نے ڈولفن سے دلچسپی کم لی ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہ بڑی بھول ہے۔

بقیہ ہند کا کھیا ص۳۵ سے

اور سب کو دہی ملا دیجیے پھر بوٹیوں کو ان ملے ہوئے مسالوں میں تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیجیے۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد بوٹیاں ایک سخت تار میں پرو دیجیے۔ اس طرح پروئے کر دہی اور سب چیزیں بوٹیوں پر لگی رہیں۔ اب انھیں انگیٹھی میں انگاروں پر سینک لیجیے یا انگارے زمین پر پھیلا کر اینٹوں پر تار رکھ کر سینک لیجیے سلاخوں یا تار کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھماتے رہیے۔ بوٹیاں سک جانے کے بعد ان پر گھی لگا لیجیے اور مزے سے کھائیے۔

Regd. No D. 1457

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم



ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۱۰

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

اکتوبر ۱۹۷۳ء

قیمت :- ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ :- چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	1/50
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی (اُردو)	-/65
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	2/45
چار یار	الیاس احمد مجیبی	1/30
خلفائے اربعہ رض	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	2/25
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	1/80
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/50
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/75
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	2/25
ہمارے رسول	〃 〃	1/65
ہمارے نبی	سیّد نواب علی رضوی اُردو -/75 ہندی -/40	
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسّان ندوی	2/75

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	1/75
او کھا عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصّے)	1/80
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/50
بڑے دادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/56
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل)	نجستہ سلطان	-/80
〃 〃 〃 (دوم)	ضیاء الرحمٰن	1/-
〃 〃 〃 (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	1/80
〃 〃 〃 (چہارم)	〃 〃	-/95
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	1/75
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	-/85
دنیا کے بچے	محمد حسین حسّان	1/-
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	1/80

رابندر ناتھ ٹیگو	صفدر حسین	1/25
سماجی زندگی (اوّل)	احمد پٹیل و غلام ابرار	-/56
〃 (دوم)	〃 〃 〃	-/84
〃 (سوم)	〃 〃 〃	-/81
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	1/30
〃 〃 نیچے	〃 〃	2/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	-/62
میر انیس	محمد حسین حسّان	1/25
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	1/25

کہانیاں، ڈرامے، ناول

جن حسن عبدالرحمٰن (ناول)	دو حصّے	4/-
اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں)	آصفیہ مجیب	-/30
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	-/37
تا نبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسّان	-/50
ترکوں کی کہانیاں (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/55
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	1/50
تین اناڑی (〃)	عظمت چغتائی	1/40
چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	-/40
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/35
چنبیلی	محمد حسین حسان	-/50
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	1/75
کورے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	-/75
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/50
مزہ چکھائیں گے (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/25
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/65
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	-/30

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

بچوں سے باتیں

ہماری جامعہ آزادی کی لڑائی کی بہت اہم یادگار ہے۔ اب سے لگ بھگ ۵۴ سال پہلے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح نے اس کا افتتاح فرمایا تھا۔ کئی سال یہ علی گڑھ میں رہی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ یہ سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی۔ وہ تو کہو اس کے مخلص کارکنوں کی اور اس وقت کے طالب علموں کی مستقل مزاجی تھی جس نے اس قومی درسگاہ کو قائم رکھا۔ اس زمانے کے سمجھدار ہندو مسلمان لیڈر بھی اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اسے دہلی لے آئے اور جامعہ کا یہ قافلہ قرول باغ میں آکر ٹکا اور باوجود مالی پریشانیوں کے اس نے تعلیم کا کام جاری رکھا۔

پھر تھوڑے ہی دنوں بعد قبلہ ذاکر صاحب جامعہ میں تشریف لائے نیا جوش، نئی امنگ اور عزم استقلال بھی اپنے ساتھ لائے۔ ان کے آنے سے جامعہ والوں کو کیا کچھ سہارا ملا کہ پوری فضا میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ شروع شروع میں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جامعہ والوں کی مستقل مزاجی اور نئے حوصلوں اور امنگوں کی بدولت کام برابر آگے بڑھتا گیا۔ مشکلیں حل ہوتی گئیں۔ پریشانیاں دور ہوتی گئیں۔

اور پھر جامعہ دہلی شہر کے شور و شغب سے دور اوکھلے میں آگئی اور اس کا قدم آگے ہی بڑھتے گئے اور اب اس نے ماشاء اللہ یونی ورسٹی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

۱۹۴۸ء میں دیس کے بزرگوں نے۔ دیس کے دوسرے اور اہم کام، ہمارے محبوب شیخ الجامعہ ذاکر صاحب کے سپرد کیے

تو ان کا کام ہمارے محترم پروفیسر مجیب سپرد ہوا۔ وہ تک علمی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ دن رات لگے رہتے تھے۔ اب تمام انتظامی کاموں کی ذمے داری بھی انھیں اپنے سر لینا پڑی باوجود اس کے اپنے علمی مشغلوں اور تعلیمی کاموں میں بھی اسی طرح لگے رہے جامعہ کو یونیورسٹی کی حیثیت انھی کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ جامعہ کی بہت سی شاندار عمارتیں، جامعہ کالج، کالج کے ہوسٹل، لڑکیوں کا ہوسٹل، مرحوم تعلیم و ترقی کی عمارت (جہاں اب وائس چانسلر، رجسٹرار اور محاسبی کا دفتر ہیں) جامعہ سنٹرل لائبریری، آرٹ اسکول کی عمارتیں اسٹاف کوارٹرس اور بہت سی چھوٹی موٹی عمارتیں انھی کے عہد میں بن کر تیار ہوئیں اور بہت سی عمارتیں ابھی بن رہی تھیں غرض انھوں نے رات دن کی محنت سے جامعہ کو اس جامعہ کو جو آج سے تیس چالیس سال پہلے سخت پریشانی کی حالت میں زندگی کے دن گزار رہی

کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔

اور اب ـــ اسی اکتوبر میں لگ بھگ سینتالیس سال دن رات کام کرنے کے بعد وہ اس اہم ذمّے داری کو دوسروں کے سپرد کر رہے ہیں۔ جامعہ والے اپنے شفیق استاد محترم بزرگ کی جدائی کا جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ لیکن خود قبلہ مجیب صاحب کے لیے یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے وہ ایسے ناسازگار زمانے میں مسلمانوں کے قومی ادارے کو کامیابی سے چلانے میں، اتنا اونچا اٹھانے میں اس قدر کامیاب ہوئے۔ ایک مرجھائے ہوئے پودے کو انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے خونِ دل سے سینچا اور درخت بنا دیا۔ اب بھی جب کہ وہ جامعہ کی دفتری چپقلش سے الگ رہے ہیں۔ ان کی علمی اور تعلیمی رہنمائی سے جامعہ والے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

یہاں یہ بتانا بے موقع نہ ہوگا کہ پیام تعلیم سے قبلہ مجیب صاحب کا تعلق شروع سے رہا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ مضمون کی درخواست کی گئی ہو اور موصوف نے اس درخواست کو رد کر دیا ہو۔ یہ تعلق ان شاء اللہ زندگی بھر باقی رہے گا۔

اس پرچے میں بہت دنوں کے بعد آپ محترمہ آصفہ مجیب کا بہت ہی دلچسپ مضمون پڑھیں گے۔ اصل میں پچھلے دنوں محترمہ بہت سخت بیمار ہو گئی تھیں لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ علاج معالجے کے بعد خدا خدا کر کے کچھ ٹھیک ہوئی تھیں کہ محترم مجیب صاحب اچانک بیمار پڑ گئے ایسے بیمار کہ جان کے لالے پڑ گئے (تفصیل انھیں کے مضمون میں پڑھیے)، شکر ہے کہ اب وہ اچھے ہیں۔ لیکن پوری طرح تن درست ہونے میں ابھی کچھ دن لگیں گے۔

ابھی جون ۷۳ء میں محترمہ، مجیب صاحب کے ساتھ کشمیر تشریف لے گئی تھیں۔ ہمارے آپ کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ آپ کے پیام تعلیم کو نہ بھولیں۔ روزانہ اپنی ڈائری لکھتی رہیں۔ کشمیر سے واپسی پر آپ نے یہ روزنامچہ یا ڈائری مرتب فرمائی اور یہ بہترین تحفہ پیام تعلیم کی نذر کر دیا۔ یہ دلچسپ مضمون کئی قسطوں میں شایع ہوگا۔ ہم محترمہ کی اس سرپرستی کا پیام تعلیم سے اتنی محبت اور لگاؤ کا کس منھ سے شکریہ ادا کریں۔

پچھلے پرچے میں سورج گہن والا مضمون دیر سے شایع ہوا پھر بھی بہت پسند کیا گیا۔ امین صاحب نے سورج گہن کے بارے میں بہت قیمتی معلومات بڑے سلیقے سے جمع کر دی ہیں۔ حضرت سہیل عظیم آبادی کی کہانی بھی پیامیوں کو بہت اچھی لگی۔ ڈولفن کا سرکس بھی پسند کیا گیا۔ حضرت شفیع الدین نیّر کی نظم (اچھا شہری) آزادی کا جشن سیمیں دھرتی کے تارے خاص طور پر پسند کی گئیں۔ ہنڈ کلھیا والا مضمون تو بچیوں کی چیز ہے۔ یہ سلسل شایع ہوگا۔ اس پرچے میں بھی شایع ہو رہا ہے۔

اس پرچے میں "کشمیر میں چند دن" کے علاوہ اور بھی دلچسپ مضمون، کہانیاں اور نظمیں پڑھیے۔ اس مرتبہ ایک نئے صاحب ہماری بزم میں آئے ہیں۔ جناب اظہار الحسن صاحب ہیں۔ ان کی نظم چالاک شکاری پڑھیے۔ امید ہے کہ اظہار صاحب آئندہ بھی نوازش فرماتے رہیں گے۔

باقی صـ۳۲ پر

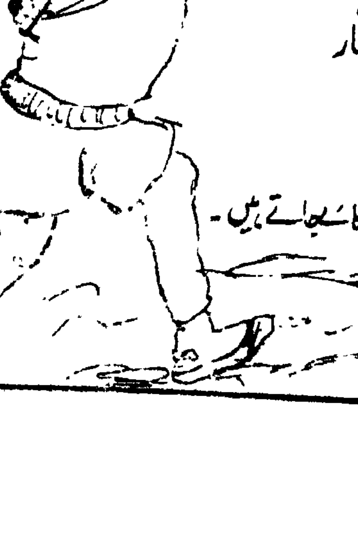
جناب محمد شفیع الدین نیرؔ

کمھار

کس قدر خوش ہے کس قدر ہے مگن — کام سے اپنے کس قدر ہے لگن
ظرف مٹّی کے یہ بناتا ہے — اس میں اپنا ہُنر دکھاتا ہے
چاک ہے اک سامنے رکھّا — شکل میں گول گول، پہیا سا
چاک رکھّا ہوا ہے کیلی پر — خوب کھاتا ہے اس پہ یہ چکّر
پاس رکھی ہے ایک لکڑی بھی — چکنی مٹّی بھی ہے گندھی رکھّی
لوندا مٹّی کا وہ اُٹھاتا ہے — چاک کے بیچ میں جماتا ہے
پھر یہ لکڑی وہ چاک پر رکھ کر — دیتا رہتا ہے چاک کو چکّر
ہاتھ لوندے میں پھر لگاتا ہے — برتن اس طرح ڈھلتا جاتا ہے
لوٹا، لٹیا، پیالیاں، ہنڈیاں — بادیہ، پیالہ اور گھڑا، مٹکا
آبخورے، رکابیاں، مٹھلیاں — مٹکیاں، کونڈے اور دیے جی ہاں
یہ اور ایسے ہی اور بھی برتن — ہے بناتا لگا کے، اپنا من
ایک دھاگے سے ہے الگ کرتا — ریت پھیلا کے اُس پہ ہے دھرتا
جب یہ برتن میں سارے بن چکتے — خشک کرتا ہے دھوپ میں رکھ کے
سوکھ جاتے ہیں جب یہ سب برتن — پھر کچھ اس طور کا ہے اُس کا چلن
رکھ کے آوے[1] میں یہ پکاتا ہے — یوں انھیں کام کا بناتا ہے
یہی کرتا ہے کام یہ ہر بار — نام اسی کا تو پڑ گیا ہے کمھار

کام اِس کا بھی خوب ہے نیرؔ
کام آتا ہے سب کے اس کا ہنر





[1] آوہ وہ جگہ جہاں برتن پکائے جاتے ہیں۔

جناب محترمہ آصفہ مجیب

چند دن کشمیر میں

اب کی گرمیوں میں کشمیر جانا ہوا تو جی چاہا کہ وہاں کا کچھ حال پیامِ تعلیم میں لکھوں بہت دنوں بعد قلم اٹھایا ہے۔ پچھلے دنوں سخت بیمار رہی اور پھر اس سال دسمبر میں مجیب صاحب ایسے بیمار پڑے کہ ایک ناگہانی مصیبت سر پر آئی میرے آئے گئے ہوش جاتے رہے۔

مجیب صاحب ۱۹۲۶ء میں یورپ سے تعلیم حاصل کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آئے اور اب تک اس کی ان تھک خدمت کی ملک اور قوم کے بہت سے بھلائی کے کاموں میں بغیر کسی مذہبی تفریق کے دن رات ایسے لگے رہے کہ کبھی سکون اور چین سے نہ بیٹھے۔ دن کو وقت نہ ملتا تو لکھنے پڑھنے کا کام عموماً رات کو گیارہ بارہ بجے تک کرتے رہتے۔

۱۱ دسمبر کی صبح کو وہ سو کر اٹھے تو ان کی یادداشت ختم ہو گئی نظر پر بھی اثر تھا۔ علاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہولی فیملی ہسپتال میں داخل ہوئے ایکسرے وغیرہ ہوئے تیسرے دن حالت زیادہ خطرناک ہو گئی۔ مشہور ڈاکٹروں کے مشورے سے ۱۴ دسمبر کو دماغ کے بائیں حصّے کی طرف آپریشن ہوا۔ ہال کلاٹ۔ رِسے ہوئے خون کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا۔ خون کی روانی بند ہو گئی تھی۔ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ اس نے جان بچائی۔ بغیر آپریشن کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

ہسپتال سے آٹھ دن بعد گھر آئے تو ابھی طبیعت پوری سنبھلی بھی نہیں تھی اور بولنے میں بھی مشکل پڑتی مگر وہ کام کرنے کی اور لکھنے پڑھنے کی باتیں کرتے۔ کتاب جو بیماری سے پہلے لکھنا شروع کی تھی اس پر بحث کرتے کہتے "ایسی زندگی جس میں کام نہ ہو زندگی نہیں" آنسو بھر بھر آتے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ پوری صحت میں عرصے لگے گا۔ ان کے دوست جگت سنگھ بڑی مہربانی سے روزانہ آ کر کچھ الفاظ یاد کراتے جس سے کچھ تسکین ہوتی۔

بیماری کے زمانہ میں دور و نزدیک کے جن عزیزوں دوستوں اور جامعہ برادری نے جتنا خلوص جتنی ہمدردی برتی ہر دم شریک رہے ان سب کا شکریہ کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ میری عمر جامعہ میں گزری ہے مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جامعہ ایک بڑے خاندان کی طرح ہے اور یہ سب دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ ہر طرف سے تار، خط خیریت دریافت کرنے کے لیے آتے رہے۔ ہماری وزیر اعظم اندرا جی خیریت پچھواتی رہیں۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری ہکسر صاحب بار بار ٹیلی فون پر پوچھتے۔ انھوں نے کہا "ہم سب مجیب صاحب کی صحت کے لیے دعا کر رہے ہیں وہ ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ وزیرِ تعلیم ڈاکٹر نور الحسن صاحب نے ہر قسم کی مدد کرنے کو کہا اور باہر سے ڈاکٹر

بلانے کی تجویز کی بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین باوجود طبیعت کی خرابی کے کئی بار دیکھنے آئیں اور بہت فکر مند رہیں۔

گرمی شروع ہوئی تو صاحب کی صحت اور آرام کے خیال سے کشمیر جانے کا پروگرام بنا۔ ان کے دوست اور جامعہ کے پرانے ساتھی آغا اشرف صاحب کی پہلے ہی یہ تجویز تھی کہ گرمیاں کشمیر میں گذاریں کشمیر صاحب کو بہت پسند ہے۔ وہ جگہ ہی ایسی ہے۔ جنت ارضی کہیے اسے۔ کشمیر کی حکومت نے خاص طور سے ان کے ٹھہرنے کا سرکاری گسٹ ہاؤس میں انتظام کیا۔

۲۱۔ مئی کے لیے انڈین ایرلائن کی تین سیٹیں رزرو ہوئیں۔ انس صاحب ساتھ جا رہے تھے۔ وہ صاحب کے دفتر میں ٹائپ وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ لیکن محبت وعقیدت کا رشتہ اس سے بڑا ہے۔ شروع بیماری کے زمانے سے ان کی دیکھ بھال ہر قسم کی مدد اور خدمت کرتے رہے ہیں کہ مثال نہیں۔ خدا انھیں اس کا اجر دے۔

ڈھائی بجے دوپہر کو جہاز کی روانگی کا وقت تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آدھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ انس صاحب اور لطیف صاحب سامان تلواتے ہیں اور دوسرے انتظام میں لگ گئے۔ بشیر فاطمہ وہاں بھی رخصت کرنے آئی تھیں انھوں نے مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا آرنج اسکوائش لا کر دیا۔ بہت مزے کا لگا صاحب نے کافی پی۔ جہاز آیا تو چلنے سے پہلے کسٹم پر کچھ برائے نام تلاشی ہوئی۔ میرا پرس کھلوا کر دیکھا۔ یہ مشکل پڑی کہ میری ٹوکری جس میں پان تھے۔ نازک سی چھوٹی سی پنڈنیا اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں انس صاحب کے ہاتھ میں اور کنجی میرے پاس۔ ان سے کہا گیا کھولو تو انھوں نے مجھے بلایا اور کنجی مانگی۔

میں ادھر گئی تو کسی نے بتایا کہ ابھی عورتوں کی طرف تلاشی ہوگی۔ اتنے میں سپاہیوں کے ایک افسر نے جو بڑی میز کے پاس تھے مجھے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ وہ ہم لوگوں کو جانتے تھے اور جامعہ آ چکے تھے۔ اس طرح مزید تلاشی کے جھنجھٹ سے چھٹی ملی۔ صاحب ہم سے پہلے ہی باہر آ گئے ان کو کسی نے نہ روکا۔ نہ تلاشی ہوئی۔

تین بجے جہاز اڑا۔ آسمان سے باتیں کرتا۔ پہاڑوں کی سر بہ فلک چوٹیوں کو سر کرتا چلا جا رہا تھا۔ کہیں برف نظر آتی کہیں ایسا لگتا جیسے خوبصورتی سے پتھر جڑے ہیں۔ چٹانیں اور لائنیں بنی ہیں۔

چار بج کر بیس منٹ پر جہاز سری نگر کے اڈے پر اترا۔ کیا خدا کی شان تھی اب ہم کشمیر کی وادی میں کھڑے قدرت کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ڈاکٹر آغا اشرف مع اپنے خاندان کے لینے آئے۔ حکومت کی طرف سے مظفر صاحب (ڈپٹی کنٹرولر تواضع) سرکاری موٹریں کر آئے۔ آغا صاحب نے کہا "آپ لوگ چلیے ہم سامان لے کر آئیں گے۔ ہم دونوں مظفر صاحب کے ساتھ گسٹ ہاؤس پہنچے"۔

یہ دو مہمان خانے مہاراجہ ہری سنگھ صاحب کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ دو منزلہ شاندار عمارتیں ہیں ہم ان میں آئے۔ بہت اونچی کرسی ہے۔ سیڑھیاں طے کر کے بڑے سے برآمدے میں آئے۔ سامنے کشادہ گیلری ہے۔ پورے میں قالین بچھا ہے۔ میز صوفے اور کرسیاں لگی ہیں۔ میز پر شیشے کے گلدان

پھولوں سے سجا رکھا ہے۔ لکڑی کا زینہ نظر آتا ہے اس پر بھی قالین بچھا ہے۔ دونوں طرف کمرے ہیں۔ ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا (باغ کی طرف) نمبر کمرہ ہے۔ بہت بڑا پورے کمرے میں پھولدار قیمتی قالین بچھا ہوا۔ کھڑکیوں پر جالی کے اور ریشمی دہرے پردے لگے ہیں۔ ان میں ریشم کی ڈوریاں۔ سنگار میز۔ لکھنے کی میز۔ الماریاں جن میں ایک قدآدم آئینہ ہے۔ صوفہ کرسیاں غرض آرام و آسائش کا ہر سامان۔ اور ہر چیز صاف ستھری جھلاجھل۔ سامنے باغ کا نظارہ۔ رنگ رنگ کے گلاب کے پھولوں کی بیضاوی کیاری بیچ میں ہے پھولوں سے بھری۔ دونوں طرف راستہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے پھولوں کے تختے کھلے ہوئے۔ درخت۔ کہیں بیل چڑھی ہوئی۔ سامنے بلند پہاڑ۔ شنکر اچاریہ صاف نظر آتا ہے، تھوڑے کچھ فاصلے پر ٹیلی وژن کی عمارت اسی پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ شمشاد اور چنار کے پیڑوں کی قطاریں۔ غرض جدھر نظر دوڑاؤ بہار ہی بہار ہے۔

آغا صاحب بھی سامان لے کر آگئے۔ ان سے، صوفیہ اشرف سے، دونوں لڑکوں۔ بھیا اور للا سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مظفر صاحب نے بہت اخلاق سے صاحب کے کھانے وغیرہ کے بارے میں سب باتیں معلوم کیں اور ملازموں کو ہدایتیں دیں۔ صاحب سے کہا "جس چیز کی ضرورت ہو بتائیے گا"۔

چائے ہمارے کمرے میں آگئی۔ صبح شام کی چائے کمرے میں ہوتی ہے۔ صبح کا ناشتہ اور کھانا ڈائننگ حال میں۔ کھانے کا کمرہ ہمارے کمرے کی طرف برآمدے اور گیلری سے ہو کر پہلے ڈائننگ روم میں اس کے بعد ڈائننگ روم میں آتے ہیں۔ انس صاحب کا کمرہ گیلری کے دوسری طرف ہے پیچھے بھی برآمدہ ہے اس کے آگے پکا صحن، جس میں ایک دروازہ بندھ پر جانے کے لیے ہے۔

بندھ کے ساتھ ساتھ جہلم میلوں تک لہریں مارتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ جگہ ٹہلنے کے لیے مجھے بہت پسند آئی۔ صبح شام تھوڑی دور بندھ پر ٹہلتی ہوں۔ بہت سے اور لوگ بھی ٹہلتے ہیں۔ کوئی کوئی دوڑ بھی لگاتا ہے۔ کچھ بوڑھے لاٹھی ٹیکے جھکے جھکے چلتے ہیں۔ جہلم کے کنارے کنارے ہاؤس بوٹ لگے ہیں ان میں ہانجی وغیرہ جو رہتے ہیں ان کے بچے اوپر آکر کھیلا کرتے ہیں۔ چنار کے اونچے گھنے پیڑوں کا سایہ اتنا ہے کہ کہیں کہیں تو پانی کی بوندیں زمین پر نہیں گرتیں۔ انس صاحب صبح تڑکے دور تک ٹہل آتے ہیں۔ جہلم پر کئی پل بنے ہیں۔ پھر اکدل۔ حبہ کدل۔ زینا کدل۔

بقیہ مونگے کا جزیرہ ص۵ سے

مچھلیوں ہی کی دریافت کیوں! ہم نے اس جزیرہ پر کوئی ہفتہ ایسا نہ گزارا تھا۔ جب زمین پر یا پانی میں کوئی نئی دریافت نہ کی ہو۔

(پھر کیا ہوا؟ تینوں دوست سیر ہی کرتے رہے یا کشتی لے کر لمبے سفر پر بھی نکلے؟ کیا وہ جزیرہ بیکو بن گئے؟ بہت دلچسپ داستان ہے۔ نومبر کے پیام تعلیم میں پڑھیے گا)

• انصاف کرنے والے قیامت کے دن نورانی منبروں پر بیٹھیں گے۔ (حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

(۱) باپو حصّہ اوّل مصنّف: سی فری ٹاس : مترجم: صالحہ عابد حسین
(۲) باپو " دوم " : " " " : " "
(۳) کشمیر مصنف: ملا سنگھ مترجم: خدیجہ بیگم تصویر: پرمانند
(۴) پرندوں کی دنیا " : جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیّر
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : برگیڈیر گیان سنگھ مترجم: محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
(۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا بھاگوت " : " "
(۸) رسیلی کہانیاں " : منوج داس " : صغرا مہدی
(۹) آزادی کی کہانی (حصّہ اول) : وشنو پربھاکر " : انور کمال حسینی
(۱۰) ہماری ریلیں مصنف: جگ جیت سنگھ " : عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیاح " : کے سی کھنہ تصاویر: کرشن کھنہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں " : اوما نند مترجم: رفیعہ منظور الامین
(۱۳) خار پلی کا خاندان " : منوہر داس چترویدی " : محمد شفیع الدین نیّر
(۱۴) بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) " : چوسی بی ام جوشی " : رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) بہادروں کی کہانیاں " : راجندر اوستھی " : انور کمال حسینی
(۱۶) رو ہنت و نندیہ مصنف: کرشن چیتنیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگا چاری " : " "
(۱۸) ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی " : میر نجابت علی " : سیّد احسان
(۱۹) " " (دوم) " : " " " " " "
(۲۰) بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
(۲۱) مورا " : ملک راج آنند : انور کمال حسینی
(۲۲) ہاکی کا کھیل " : سرویندر رسانیال : پریتم لال

ذاکر حسین سیریز

(۲۳) ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۳/-
(۲۴) انوکھی دکان " : قدسیہ زیدی " ۲/۵۰
(۲۵) گلابو چوہیا اور پیر زاد " : " " : ۲/-
(۲۶) دنیا کے جانور " : " " : ۲/۵۰
(۲۷) راجہ رام موہن رائے " : عرش ملسیانی (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵۔ اردو بازار جامع مسجد دلی ۶ ۔(۳) پرنس بلڈنگ بمبئی ۳



جناب اظہار الحسن۔ ایم۔ اے۔ علیگ

چالاک شکاری

ایک جنگل میں شیر رہتا تھا
اپنا سب پر وہ رعب رکھتا تھا
روز تازہ شکار کرتا تھا
اس طرح اپنا پیٹ بھرتا تھا
جب کہ وہ ہو گیا بہت بڈھا
اور قابل شکار کے نہ رہا
اب ہوئی اس کو فکر یہ لاحق
کس طرح وہ جتائے اپنا حق
اس نے ترکیب اک نئی سوچی
ایک اندھے کو دور کی سوجھی
جانور سارے اس نے بلوا کے
سامنے سب کو اپنے بٹھلا کے
شیر نے پوچھا پہلے بتلاؤ
میرا گھر کیسا ہے یہ فرماؤ
ہر طرف میرے گھر میں ہے بدبو
نام کو بھی یہاں نہیں خوشبو
جو بھی اس کا جواب پہلے دے
پہلا انعام آج مجھ سے لے
پہلے اک بھیڑیا ہوا گویا
[illegible] بدبو کا ہے یہاں بیا

بدبو آتی ہے اور جاتی ہے
شیر ناراض ہو کے یہ بولا
میں تو کچّا تجھے چباؤں گا
کہہ کے یہ شیر کھا گیا اس کو
بعد اس کے ہرن سے یوں پوچھا
سوچ کر یوں ہرن لگا کہنے
یاں تو بدبو کا کوئی نام نہیں
سن کے یہ شیر یوں لگا کہنے
تم کو بھی اب نہ چھوڑا جائے گا
اس طرح وہ ہرن کو کھا ہی گیا
یہ سوال اس نے سب سے دہرایا
جب کہ بی لومڑی کا نام آیا
دست بستہ یہ اس نے عرض کیا
میرا گم شُم دماغ ہے شاہا
ہو گئی چپ یہ لومڑی کہہ کر

سونگھ کے مجھ کو متلی آتی ہے
تو نے یہ جھوٹ کس طرح بولا
تیرا گردہ، کلیجہ کھاؤں گا
یعنی کچّا چبا گیا اس کو
"تم نے کیوں اپنا منہ نہیں کھولا؟"
"یاں تو خوشبو کو پا لیا میں نے
"آپ کے گھر میں اس کا کام نہیں"
"کس طرح سچ چھپا دیا تم نے
تم کو بھی اب کچّا کھایا جائے گا
یعنی کچا اسے چبا ہی گیا
اور خطاوار سب کو ٹھیرایا
یعنی قصہ تمام پر آیا
"مجھ کو بے حد زکام ہے شاہا
مجھ کو محسوس کچھ نہیں ہوتا
شیر کو آ گئی ہنسی سُن کر





جو بھی ہشیار لوگ ہوتے ہیں
ہر جگہ کامیاب ہوتے ہیں



پندرھویں قسط

آر۔ ایم بیلن۔ ٹائن

تلخیص و ترجمہ:۔ خلیق انجم اشرفی

مونگے کا جزیرہ

کشتی کی سیر

وہ بڑی خوب صورت روشن اور شفاف صبح تھی جب ہم نے اپنی ننھی سی کشتی لگون کے پانی میں اتاری اور اسے کھینا شروع کیا۔ نیلے آسمان پر دور دور تک بادل کا ٹکڑا بھی نہ تھا۔ ہوا پُر سکون تھی اور سمندر کی سطح بھی پر سکون۔

دور تک پھیلا سمندر شیشے کی طرح شفاف تھا اور اس کی بیکراں سطح ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ ہلکورے جو ساری دنیا میں سمندر کی زندگی کی نشانی سمجھے جاتے ہیں۔ شفاف پانی کی تہہ میں موجود مونگے اور سمندری پودے قیمتی اور نایاب جواہرات کی طرح چمک رہے تھے۔

چند لمحے تک جوش کی زیادتی میں ہم بغیر کسی مقصد کے کشتی کھیتے رہے۔ لیکن جب خوشی کا یہ جوش کچھ کم ہوا تو ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم چٹان تک چلیں" پیٹرکن چلایا۔

"اور میری رائے ہے کہ ہم لیگون کے اندر واقع جزیروں پر چلیں" میں بولا۔

"اور میں کہتا ہوں کہ ہم یہ دونوں کام کیوں نہ کریں۔"
بیک چلایا۔

"کشتی آگے بڑھاؤ لڑکو!"

میں پہلے بتا چکا ہوں ہم نے کل چار چپو بنائے تھے لیکن ہماری کشتی اتنی چھوٹی تھی کہ اسے کھینے کے لیے دو چپو کافی تھے۔ چپوؤں کا دوسرا جوڑا ہم نے احتیاطاً رکھ لیا تھا اسی لئے کشتی کو بیک وقت ہم میں سے صرف دو کھے رہے تھے تیسرا ایک چپو کی مدد سے سمتیں بناتا جاتا اور کبھی دونوں میں سے جو تھک جاتا اس کی جگہ آ بیٹھتا۔

سب سے پہلے ہم ایک ننھے سے جزیرے پر اترے اور مارے خوشی کے اس پر دوڑتے پھرے۔ لیکن وہاں ہمیں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد ہم ایک ذرا بڑے جزیرے پر پہنچے۔ اس پر چند ناریل کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ صبح سے ہم نے کچھ کھایا نہ تھا اس لئے چند ناریل توڑے اور ناشتہ کیا۔ اس کے بعد ہم پھر کشتی میں سوار ہو گئے اور سیدھے مونگے کی چٹان پر جا اترے۔

یہ واقعی ہمارے لیے ایک نیا اور دلچسپ نظارہ تھا۔ ہم اب ساحل پر اتنے روز رہ لیے تھے کہ موجوں کے اٹھنے اور گرنے کا تماشہ تقریباً بھول گئے تھے لیگون کا پانی تو سدا پرسکون رہتا تھا اس لیے اس میں موجوں کے اٹھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اب ہمارے اندر وہی پرانے ملاح بیدار ہو گئے تھے۔ اور جب ہم نے ایک بڑی موج کو شور کرتے مونگے کی چٹان پر اپنے قدموں میں گرتے دیکھا تو ہم نے مونگے کے جزیرے کو بھلا دیا

اپنا گھر بھول گئے۔ خاموش جنگل کی پرسکون زندگی کو فراموش کر دیا۔ وہ سارے واقعات و حادثات ہمیں یاد نہ رہے۔ جو پچھلے چند مہینے کے عرصہ میں ہمارے ساتھ پیش آئے تھے۔ ہمیں کچھ یاد نہ رہا سوائے طوفان کے۔ تازہ ہواؤں کے اور کھلے سمندر کی سدا بے چین رہنے والی موجوں کے۔

وہ بڑی موج جس کا تذکرہ میں کئی بار کر چکا ہوں ہمارے اندازہ سے زیادہ بڑی اور عجیب و غریب تھی۔ وہ سطح سمندر سے گزوں اوپر اٹھی اور مونگے کی چٹان کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ آہستہ آہستہ وہ اور آگے بڑھی۔ چٹان کے قریب آتے آتے اس کی جسامت اور رفتار بڑھ گئی یہاں تک کہ اس نے ایک محراب کی شکل اختیار کر لی جو سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی وہ اور قریب آئی اور اُس کے اوپری کنارے نے چٹان کو چھوا اور پھر ایک تیز دھماکے کے ساتھ وہ چٹان سے ٹکرا گئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا سمندر کا دل پھٹ گیا ہو اور مونگے کی چٹان اس دھماکے کے اثر سے لرز رہی ہو۔

ہم یہ سارا تماشا حیرت اور محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے اور جب لہر چٹان سے ٹکرائی تو ہم بڑی مشکل سے اس کی زد میں آنے سے بچے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ موج چٹان کے کئی حصوں سے ٹکراتی تھی اور اس کا کچھ پانی بکھر کر لیگون میں چلا جاتا تھا لیکن زیادہ تر جگہوں پر چٹان کی چوڑائی اور اونچائی اتنی زیادہ تھی کہ وہ موج کی تیزی اور زور کو ختم کر دیتی تھی۔ بہت سی جگہوں پر مونگے کی چٹانیں درختوں سے ڈھکی تھیں۔ یہ غالباً نئے جزیروں کی ابتدا تھی۔

اس طرح اس مونگے کی چٹان پر آکر ہمیں علم ہوا کر ان سمندروں میں پائے جانے والے ننھے ننھے جزیرے کیسے وجود میں آتے ہیں۔ اس کے ایک حصّے میں ہم نے دیکھا کر موج کا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر بہہ رہا ہے اور لاکھوں ننھے کیڑے یہ زندہ دیوار بنانے کے لیے مسلسل کام میں جٹے ہوئے تھے۔ ایک اور جگہ جہاں چٹان اتنی اونچی تھی کر موج کا وہاں پہنچنا دشوار تھا ہم نے دیکھا کر سارے مونگے مردہ پڑے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کر وہ پانی کی سطح سے اوپر رہ کر نہ تو کام کر سکتے ہیں اور نہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ بہت سے دوسرے مقامات پر سمندر کی بے چین موجوں نے مردہ مونگوں کے ننھے ننھے ٹکڑے کرکے انھیں ریت میں بدل دیا تھا۔

چند دوسری جگہوں پر یہ ننھے جزیرے خاصے بڑے ہو گئے تھے اور ان پر ناریل کے اکّا دکّا درخت بھی نظر آرہے تھے۔ یہ درخت ریت میں اُگے ہوئے تھے اور سمندر کا پانی ان کے تنوں سے ٹکرا رہا تھا۔

سارا دن اپنی ننھی سی کشتی پر سیر کا لطف اٹھا کر ہم کچھ تھک گئے تھے اور بھوک بھی چمک اٹھی تھی اس لیے ہم نے کشتی واپس گھر کی طرف کھینی شروع کی۔

"اب" جیک نے کہا "ہماری کشتی خوب کام دے رہی ہے اس لیے ہم جلد ہی اس کے لیے ایک مستول اور بادبان بنائیں گے۔"

"بالکل" پیٹرکن چلایا۔ ہم تینوں کشتی کو باہر کھینچ رہے تھے۔

"ہم وہ پھل جلا کر اس کی روشنی میں آج رات کو ہی یہ کام شروع کر دیں گے۔ ہرّا لڑکو کھینچو!"

کشتی کھینچ کر باہر نکال لی گئی تو ہم نے دیکھا کر اس کا پیندا کچھ گھس سا گیا ہے۔ اس جگہ چونکہ ریت میں مونگے کی چٹان کے ٹکڑے بھی ملے ہوئے تھے اس لیے کہیں کہیں لکڑی کی چٹیں تک اکھڑ گئی تھیں۔

"اوہ!" یہ دیکھ کر جیک چلّایا "ایسے تو کام نہیں چلے گا بھائی۔ اس طرح تو یہ پیندا چند ہی بار میں گھس کر ختم ہو جائے گا۔"

"وہ تو ہوگا ہی!" میں نے کہا اور سوچنے لگا کر پیندے کو اس طرح گھسنے سے کیوں کر بچایا جا سکتا ہے لیکن باوجود بہت غور کرنے کے میں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ سوچ سکا کہ پیندے میں لوہے کا ایک پتّر جڑ دیا جائے مگر لوہا ہمارے پاس کہاں۔ اس لیے میری سمجھ میں نہ آیا کر کیا کیا جائے۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیک" اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے بولا۔

"کر پیندے کو گھسنے سے بچانا ناممکن ہے۔"

"ناممکن!" پیٹرکن چلّایا۔ "میرے پیارے رالف تم غلط کہہ رہے ہو۔ ارے اس سے آسان تو کوئی کام ہی نہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ایسے کر ہم کشتی کو استعمال ہی نہ کریں۔" پیٹرکن نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"خاموش رہو پیٹرکن!" جیک جیپرؤں کر کاندھے پر لا دتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں کام بتاؤں۔ سب سے پہلے تو تم جا کر ناریل کے ریشے اکٹھا کرو انھیں بٹ کر بادبان بننے کے لیے دھاگا۔

"ارے کپتان صاحب" پیٹر کن بیچ ہی میں بول پڑا۔ "دھاگا تو میں نے پہلے ہی بہت سا تیار کر رکھا ہے۔ ضرورت سے زیادہ جیسا کہ میرا ایک ننھا سا دوست روزانہ کھانے کے بعد کہا کرتا تھا۔

"بہت اچھے"، جیک بولا "تب تم ناریل کا کپڑا اکٹھا کرنے اور اسے کاٹنے میں رالف کی مدد کرو اس کے بعد ہم اس سے بادبان بنائیں گے میں ذرا مستول اور رسیاں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس اب کام شروع ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم کام میں پوری تندہی سے جٹ گئے اور تین دن کے اندر اندر ہم نے اپنی کشتی میں ایک مستول اور بادبان مع رسیوں کے فٹ کر دیا۔ ہمارا بادبان دیکھنے میں تو کچھ ایسا بھلا نہیں لگتا تھا۔ کیوں کہ کپڑے کے بے شمار ٹکڑوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا تھا۔ لیکن تھا مضبوط۔ ہم نے اسے ملاحوں والی بڑی سوئی سے بڑی مضبوطی سے سیا تھا اور اس کی مضبوطی ہی خاص چیز تھی۔

جیک نے پیندے کے گھسنے والی مشکل پر بھی قابو پا لیا تھا۔ اس نے کشتی کے پیندے میں ایک نقلی پیندا لگا دیا تھا۔ یہ لکڑی کا اتنا ہی لمبا اور چوڑا ٹکڑا تھا جتنا اصل پیندا۔ اس کی موٹائی کوئی پانچ انچ رہی ہوگی۔ اس نے اتنا موٹا تختہ اس خیال سے لگایا کہ اس طرح نہ صرف کشتی زیادہ مضبوط ہو جائے گی بلکہ تیز ہوا میں بھی اپنا راستہ بنا سکے گی۔ سمندر میں جہاں تیز ہوائیں چلتی ہی رہتی ہیں یہ بہت اہم بات تھی۔ لکڑی کا یہ ٹکڑا بڑی مضبوطی سے پیندے میں جڑ دیا گیا تھا اور اب ہمیں اطمینان تھا کہ نقلی پیندا گھس بھی گیا تو ہم دوسرا لگا لیں گے ہاں اگر اصل پیندا گھس گیا تو کشتی کو ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر سے بدلنا ناممکن تھا۔

مستول اور بادبان نے خوب کام دیا اور اب ہم لیگون میں بڑے مزے سے کشتی رانی کرتے اور دور سے اپنے جزیرے کے خوش نما نظاروں کا لطف اٹھاتے ہم نے گھنٹوں پانی پر نظریں جما کر چمکیلے رنگوں والی مچھلیوں کو رنگ برنگے مونگوں کو اور خوش نما سمندری گھاس کے درمیان کھیلتے ہوئے بھی دیکھا پیٹر کن نے مچھلی کے شکار کے لیے ایک بنسی بھی بنائی اور جیک نے کانٹے کچھ کانٹے تو بہت عمدہ بنے تھے اور کچھ بے حد خراب۔ یہ سارے کے سارے فولادی لکڑی سے بنائے گئے تھے اور چونکہ لکڑی بہت سخت تھی اس لیے جیک نے یہ کانٹے خاصے بڑے اور موٹے بنا دیئے تھے۔ مچھلی کی کھوپڑی کی چند ہڈیوں نے بھی کانٹے کا کام دیا لیکن ہمارا بہترین اور سب سے کارآمد کانٹا وہ تھا جو جیک کے پیتل کے چھلے سے بنایا گیا تھا۔

ان مچھلیوں کی شکل وصورت اور شکار کی داستان جو ہم نے پیتل کے اس کانٹے کی مدد سے پکڑیں بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لیے اسے چھوڑ ہی دیجیے۔ ہاں یہ بتاتا چلوں کہ یہ ساری کی ساری مچھلیاں پیٹر کن نے شکار کیں ہم نے دیکھا تھا کہ پیٹر کن کو شکار کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اس لیے یہ کام اسی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ میں اور جیک تو محض تماشائی تھے اور ہمیں اس تماشے ہی میں خاصا لطف آتا تھا۔

کشتی کی پرلطف سیر کے دوران ہم نے جن مچھلیوں کا شکار کیا ان میں سے بعض بے حد لذیذ تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے گھونگھا مچھلیوں کی بھی کئی قسمیں دریافت کیں اور اس طرح ہمارے دستر خوان پر روز نت نئے ذائقے اور مزے کی چیزیں سجنے لگیں۔ اور

باقی ص۹ پر

جناب ناوک حمزہ پوری

ہمارا قومی ترانہ

قومی جھنڈے کی طرح ہر آزاد ملک کا اپنا ایک قومی ترانہ بھی ہوتا ہے یہ ترانہ آزادی کے دن اور قومی اہمیت کے خاص خاص موقعوں پہ گایا جاتا ہے یا اس کی دھن بجائی جاتی ہے۔

ہمارے قومی جھنڈے کی طرح ہمارے قومی ترانے کی تاریخ بھی ہماری آزادی کی لڑائی سے جڑی ہوئی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دنوں میں قومی ترانے کی حیثیت سے بنکم چندر کے "بندے ماترم" رویندر ناتھ ٹھاکر کے "جن گن من" اور علامہ اقبال کے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" نے بھارت کی کروڑوں کی آبادی کا دل گرمایا، آزادی کے جذبے کو ہوا دی اور آزادی کے لیے مر مٹنے کو تیار کیا۔ یہ تینوں ترانے جنتا میں بہت مقبول ہوئے۔

ان میں سب سے پرانا گیت بنکم چندر کا "بندے ماترم" ہے۔ اسے انھوں نے ۱۸۷۵ء میں لکھا تھا۔ یہ گیت ان کے ناول "آنند مٹھ" میں پہلی بار ۱۸۸۲ء میں شایع ہوا۔ اسے سب سے پہلے ۱۸۹۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں گایا گیا۔ اس گیت کا پہلا ٹکڑا "بندے ماترم" عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ یہ آزادی کے متوالے دیش بھگتوں کے لیے "نعرے" کا کام دینے لگا۔ ۱۹۰۶ء میں بنگال کے صوبائی اجلاس میں بھی اسے گایا گیا۔ اور پھر خود رویندر ناتھ ٹھاکر نے اسے کانگریس کے اجلاس میں گایا۔ بعد میں کچھ اختلاف رائے کی وجہ سے کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ غور کرنے کے لیے ۱۹۳۷ء میں ایک کمیٹی بنائی کہ یہ گیت قومی ترانہ بن سکتا ہے یا نہیں۔ اس کمیٹی میں رویندر ناتھ ٹھاکر، مولانا ابوالکلام آزاد، اچاریہ نریندر دیو اور جواہر لال شامل تھے۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ آیندہ قومی جلسوں میں اس گیت کا صرف پہلا ایک بند ہی گایا جائے ساتھ ہی جلسے کے منتظمین کو یہ اختیار بھی دیا جائے کہ وہ اس کے ساتھ یا اس کے بدلے قومی جذبات سے لبریز کوئی دوسرا گیت بھی گا سکیں۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۹ء میں کہا تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں اس گیت نے شیر کی دہاڑ کا کام کیا ہے۔ اسے سن کر کروڑوں ہندوستانیوں کے دلوں میں دیش پریم اور دیش بھگتی کے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ یہ گیت پوری ہندوستانی قوم کے لیے بنگال کی ایک عظیم دین ہے۔ اس طویل گیت کا پہلا بند یوں ہے:۔

بندے ماترم

سجلام سپھلام ملیج شیتلام
شسیہ شیامل ماترم

سُکھدم ورَدام ماترم!
بہو بل دھاری نیم
رپو دل وارِنیم ماترم!
سُکھد ورد اُم ماترم!
ہاسنیم سُمدھرِ بھاشِنیم
ہاسنیم سمدھر بھاشنیم
سُکھدام ورَدام ماترم
بندے ماترم!

شُبھر جیوتسنا پُلکِت یا منیم
پھُلّ کُسُمت درُم دل شوبھنیم
سُہاسنیم سُمدھر بھاشنیم
سُکھدام وردام ماترم
بندے ماترم!

دوسرا گیت رویندر ناتھ ٹھاکر کا "جن گن من" ہے۔ یہ سب سے پہلے کانگریس کے اجلاس میں ۱۹۱۱ء میں اجلاس شروع ہونے کے دوسرے دن پڑھا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ ایک رسالہ "تتو بودھنی" میں شائع ہوا۔ اس رسالے کے مدیر خود رویندر ناتھ ٹھاکر ہی تھے۔ خود انھوں نے ہی "دی مارننگ سانگ آف انڈیا" کے عنوان سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سبھاش چندر بوس پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اعلان کیا تھا کہ "ٹھاکر کے "جن گن من" گیت کو ہم نے اپنا قومی ترانہ بنالیا ہے۔ اسے قومی ترانہ کی حیثیت سے قبول کرنے سے پہلے انھوں نے ہندوستانی میں اس گیت کا ترجمہ کرلیا تھا۔

کچھ لوگوں کو اس گیت پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں "بھارت بھاگیہ ودھاتا" وغیرہ کئی فقرے رویندر ناتھ نے شہنشاہ جارج پنجم کے لیے لکھے ہیں۔ یہ بات کچھ اس زور شور سے پھیلی کہ خود رویندر ناتھ کو پُرزور الفاظ میں اس کی تردید کرنا پڑی۔

آزادی حاصل ہو جانے کے بعد تک ہم اس دوبدھے میں پڑے ہوئے تھے کہ کس گیت کو قومی ترانے کے روپ میں اختیار کیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہندوستانی نمائندوں سے اپنا قومی ترانہ پیش کرنے کو کہا گیا۔ نمائندوں کے پاس اس وقت اتفاق سے "جن گن من" کا ایک ریکارڈ تھا جسے ان لوگوں نے پیش کر دیا۔ اس کی دھن سارے لوگوں نے بہت پسند کی تب سے عارضی طور پر بھی دھن قومی ترانے کی حیثیت سے بجائی جانے لگی۔

قومی ترانے کے بارے میں آخری اور حتمی فیصلہ مجلس دستور ساز کو کرنا تھا اس لیے درمیانی مدت میں استعمال کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے سبھی ریاستوں کے گورنروں سے دریافت کیا کہ کون سے گیت کو قومی ترانہ بنایا جائے۔ مدھیہ پردیش کے گورنر کے سوا بقیہ سبھی ریاستوں کے گورنروں نے "جن گن من" کے حق میں رائے دی۔ صرف مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ نے "بندے ماترم" کی سفارش کی۔ یہ اختلاف بھی بہت بڑھ چلا تھا۔ لیکن اسی درمیان میں ۲۴۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو مجلس دستور ساز نے "جن گن من" ہی کو قومی ترانے کا درجہ عطا کر کے سارے جھگڑے کا راستہ بند کر دیا۔ یہ گیت بھی لمبا ہے لیکن مجلس دستور ساز نے صرف درج ذیل حصے کو قومی ترانہ کی حیثیت سے اختیار کیا۔

جن گن من ادھی نایک جیے ہے بھارت بھاگیہ ودھاتا
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا دراوڑ اتکل بنگ
وندھیہ ہماچل یمنا گنگا۔ اُچھل جلدھی ترنگ
تو شبھ نامے جاگے تو شبھ آشش مانگے
گاہے تو جے گاتھا
جن گن منگل دایک جیے ہے بھارت بھاگیہ
ودھاتا۔

قومی ترانہ یوم آزادی، یوم جمہوریہ اور قومی اہمیت کے دوسرے موقعوں پر گایا جاتا ہے یا

اس کی دھن بجائی جاتی ہے۔ ہر حالت میں اسے ایک منٹ کے اندر اندر گا، یا، بجا لینا چاہیے۔ اس کی تعظیم کے لیے اسے گانے یا بجانے کے موقعے پر سننے والوں کو کھڑا ہو جانا چاہیے۔

علامہ اقبال کا قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا" بھی اپنی مقبولیت کے لحاظ سے بہت مشہور ہے آج بھی موقع بموقع جب اسے گا یا جاتا ہے تو سننے والوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ آپ بھی سنیے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

سمندر کا پانی نمکین کیوں؟

ترجمہ: جناب حیدر رحیکد نیوی

(جاپانی لوک کہانی)



اب سے بہت دنوں پہلے جاپان میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ذرا بھی محبت ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ وہ چھوٹے بھائی کو الگ کرنا چاہتا تھا۔ بڑا بھائی اس کوشش میں لگا رہتا کہ اس کی شادی ہو جائے اور وہ اپنا الگ گھر بسالے۔

چھوٹا بھائی اس بات کو سمجھ گیا اس نے شادی کرلی اور چھوٹا سا ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگا۔

کسی دن اسے کام مل جاتا تو تھوڑے پیسے مل جاتے۔ کسی دن نہ ملتا تو اس رات بے چارے میاں بیوی بنا کھائے ہی سو جاتے تھے۔

سردیاں آگئیں۔ پھر نئے سال کا تیوہار آیا۔ اس کے گھر میں چاول ختم ہو گئے تھے۔ وہ بڑے بھائی کے گھر گیا اور اس سے ایک سیر چاول مانگے بھائی نے صاف انکار کر دیا اور کہا "محنت کرو اور کھاؤ۔ دوسروں سے

مانگ مانگ کر گھر نہیں چلتا۔"

آخر بہت ملول اور رنجیدہ ہو کر۔ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے یہاں سے واپس چل پڑا پاس ہی ایک پہاڑ تھا۔ نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس پر چڑھنے لگا۔ وہاں اسے ایک سفید داڑھی والے بزرگ نظر آئے۔ سوکھی لکڑیاں جمع کر رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو بھائی؟"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا "ایسے ہی بھٹک رہا ہوں دادا۔ گھر پر چاول نہیں بچے ہیں اور کل نئے سال کا تیوہار ہے۔"

سفید داڑھی والے بزرگ نے کہا۔ "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ چاول تو میرے پاس بھی نہیں ہے ہاں ایک لڈو ہے۔ اسے لے لو اور پہاڑ کی چوٹی پر جنگلوں کے دیوتا کا مندر ہے۔ وہاں جاؤ۔ مندر کے پیچھے ایک غار ہے۔ اس غار میں سات بونے رہتے ہیں۔ ٹھیک انگلیوں کے برابر۔ انھیں لڈو بہت اچھے لگتے ہیں۔ تم سے وہ لڈو مانگیں گے اور بدلے میں وہ تمھیں پیسے دیں گے لیکن تم پیسے مت لینا اور کہنا "مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔ اگر پتھر کا کھرل دوگے تو میں تمہیں لڈو دوں گا" اتنا کہہ کر وہ بزرگ روپوش ہو گئے۔

اب چھوٹا بھائی بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ آخر ہمت کر کے وہ ہاتھ میں لڈو لیے آگے بڑھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر وہ مندر کے پیچھے پہنچا۔

غار کے دروازے پر سات بونے کھڑے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خوش ہوئے۔

ایک بونے نے چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں ایک لڈو دیکھا، وہ اس سے کہنے لگا "ہمیں یہ لڈو دے دو۔ ہم تمھیں ہیرے جواہرات سے مالا مال کر دیں گے۔"

چھوٹے بھائی نے کہا "نہیں مجھے ہیرے جواہرات اور سونا چاندی نہیں چاہیے۔ تم مجھے پتھر کا کھرل دے دو تو میں یہ لڈو دے سکتا ہوں۔"

بونے نے کہا "یہ کھرل تو ہمارے بہت کام کی چیز ہے لیکن خیر تم کہہ رہے ہو تو ہم دیئے دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں لڈو دے دو۔"

چھوٹے بھائی نے لڈو دے دیا۔ اور کھرل کو پیٹھ پر لاد کر پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ اسے راستے میں پھر وہی بزرگ ملے۔

انھوں نے کہا "تم کھرل تو لے آئے۔ آؤ اب ہم تمھیں اس کھرل سے کام لینا سکھا دیں۔ اسے دائیں طرف گھماؤ گے تو جو چیز مانگو گے اس کھرل سے نکلتی چلی جائے گی۔ لیکن صرف لڈو کو چھوڑ کر۔ اور اور ہاں جب اسے روکنا چاہو تو کھرل کو بائیں جانب گھما دو۔"

چھوٹا بھائی بہت خوش ہوا۔ اور خوشی خوشی گھر واپس لوٹا۔ بیوی نے پوچھا "اتنی دیر تک کہاں رہے کیا بڑے بھائی نے چاول نہیں دیے!"

چھوٹے بھائی نے کہا "پہلے ایک چٹائی تو بچھاؤ۔"

بیوی نے چٹائی بچھا دی۔

[illegible]

[illegible] کھرل گھما دی

کھرل میں سے چاول نکل کر چٹائی پر گرنے لگے، چاول کافی اکٹھا ہو گئے تو اس نے کہا۔ اب چینی دو۔ کھرل میں سے چینی نکلنے لگی۔ اس طرح اس نے کھرل سے بہت سی چیزیں نکلوائیں، اور اگلے دن نئے سال کا تہوار خوب دھوم دھام سے منایا۔

چھوٹے بھائی نے کھرل گھما کر ایک مکان منوایا۔ دکان منوائی۔ سات گھوڑوں اور گھوڑا گاڑی کا انتظام کیا کھرل کو گھما کر مٹھائی اور عمدہ عمدہ کھانے نکلوائے اور پھر گاؤں کے سبھی لوگوں کو اپنے گھر میں ایک شاندار دعوت دی۔

گاؤں کے سبھی لوگ آئے۔ بڑا بھائی بھی آیا۔ سبھوں کو بڑا تعجب ہوا کہ چھوٹا بھائی اتنا امیر کیسے ہو گیا۔ بڑے بھائی کو یہ بات بالکل اچھی نہ لگی۔ اس نے سوچا۔ ساری بات کا پتہ لگانا چاہیے۔ چھوٹے بھائی کو کیا پتہ تھا وہ چپ چاپ اٹھ کر پاس کے کمرے میں گیا۔ وہاں اس نے کھرل گھما کر کہا "اب مٹھائی دو" کھرل میں سے مٹھائی نکلنے لگی۔ بڑا بھائی چھپ کر دیکھ رہا تھا لیکن چھوٹے بھائی کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔

رات کو سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی دونوں سو گئے۔ تب بڑا بھائی چپ چاپ اندر آیا۔ کھرل اٹھا کر پیٹھ پر رکھ لیا اور سمندر کی طرف چل پڑا۔ سمندر کے کنارے پہنچا۔ تو وہاں ایک کشتی بندھی تھی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گیا اور اسے چلانے لگا۔ اس نے سوچا کہ بہت دور کسی ملک میں پہنچ کر وہاں کھرل کو گھما کر خوب مالدار ہو جائے گا۔ راستے میں اسے بھوک لگی۔ اس نے کھرل کو مٹھائی کی فرمائش کی پھر تو تھوڑے ہی دیر میں مٹھائیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ مٹھائیاں کھانے لگا۔ بہت ساری مٹھائیاں کھا گیا۔ پھر اسے نمکین چیز کی خواہش ہوئی۔ اس نے کھرل پھر داہنی طرف گھمایا اور کہا نمک دو کھرل سے نمک نکل کر گرنے لگا۔ کھرل گھومتا رہا نمک نکلتا رہا۔ نکلتا رہا۔

بڑے بھائی کو یہ تو پتہ تھا نہیں کہ بائیں طرف کھرل گھمانے سے نمک نکلنا بند ہو جائے گا۔ کشتی میں نمک کا ڈھیر لگ گیا۔ آخر نمک کے بوجھ سے کشتی ڈوب گئی۔ اور بڑا بھائی بھی سمندر میں غرق ہو گیا۔ کھرل بھی سمندر میں ڈوب گیا۔

کھرل کو روکا نہیں گیا تھا۔ اس لیے وہ اب بھی سمندر کے اندر چل رہا ہے۔ اور اب بھی اس میں سے نمک نکل رہا ہے۔ جبھی تو سمندر نمکین ہے اور اس میں سے جتنا نمک بھی نکال لیں۔ وہ کم نہیں ہوتا۔

بقیہ ببر شیر صـ۲۶ـ سے

ببر شیرنی انھیں تین ماہ تک دودھ پلاتی ہے اس کے بعد وہ گوشت کھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ برس بھر کے ہو جاتے ہیں تو شکار کھیلنا سیکھنے لگتے ہیں۔ ببر شیرنی ہی انھیں شکار کھیلنا سکھاتی ہے۔

ببر شیر کا بڑھاپا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ طاقتور نوجوان ببر شیر اسے اپنے جھنڈ سے نکال الگ کرتا ہے وہ ایسے ہی میں آدم خور بنتا ہے۔ اور ایسے ہی میں چالاک خرگوش کی باتوں میں آ کر کنوئیں میں کودتا اور موت کے گھاٹ اترتا ہے۔

بچّوں کی غزل

جناب عزیزؔ مراد آبادی

زندگی میں انھیں مزا کیا ہے
جو نہیں جانتے خدا کیا ہے؟

ساری دنیا کو دعوتِ حق دو
اور قرآن کی صدا کیا ہے

خود غرض ہو گیا مسلماں بھی
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

جس نے بخشے ہیں دین اور دنیا
ہم نے اس کو بھلا دیا کیا ہے

سچ کو سچ مانتا ہے ہر مذہب
جھوٹ بولو تو فائدہ کیا ہے

راہ سیدھی ہی راہِ جنت ہے
ہم سے قرآن نے کہا کیا ہے

حشر کے روز جان جاؤ گے
نیکیوں کا وہاں صلہ کیا ہے

دشمنوں سے نہ دشمنی رکھّو
دوستی ہی میں اب رکھا کیا ہے

فرض ہے یہ عزیزؔ بچّوں کو
تم بتا دو بُرا بھلا کیا ہے

جناب راج نرائن راز

شیر ببر



ببر شیر یا شیر ببر کے بارے میں تم نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ مثلاً چالاک خرگوش اور بوڑھے ببر شیر کی کہانی ...... یہ کہانیاں بڑی عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ دیکھو نا! خرگوش نے کیسی عقلمندی کی۔ وہ ببر شیر کی خوراک بننے جا رہا تھا کہ راستے میں سو گیا۔ خرگوش کو راستے میں سونے کی بڑی خراب عادت ہے جبھی تو دھیرے دھیرے چلنے والا کچھوا بھی دوڑ میں اس سے بازی لے جاتا ہے۔

خیر، خرگوش نے ایسی چال چلی کہ ببر شیر کنوئیں میں اپنا ہی عکس دیکھ کر دھوکا کھا گیا۔ پہلے تو بڑے زور سے دہاڑا اور پھر اُس پر جھپٹا۔ گویا کنوئیں میں کود کر ختم ہو گیا۔

لیکن سچ پوچھو تو ببر شیر ایسا بیوقوف نہیں ہوتا۔ وہ حبشی غلام اور ببر شیر والی کہانی، اور وہ چوہے اور رحم دل ببر شیر والی کہانی بھی تمھیں یاد ہو گی۔ یاد ہے نا!

ببر شیر حبشی غلام کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اُسے کھانے کی بجائے اس کے پیر چاٹنے لگا تھا کیونکہ! اس نے اُس کے پنجے سے کانٹا نکال کر اُسے مصیبت سے چھٹکارا دلایا تھا۔ اور اس رحم دل ببر شیر کی کہانی، جس نے چوہے کی درخواست پر، اس کی جان بخش دی تھی۔ اور اُسے کھایا نہیں تھا۔ بعد کو، اُسی چوہے نے شکاری کا جال کُتر کر اس ببر شیر کی جان بچائی تھی۔

خیر، یہ تو کہانیاں ہیں۔ اہا۔ میں سمجھا تم سوچ رہے ہو! ببر شیر جیسا بڑا جانور بھلا چوہے کو کیوں کھانے لگا۔ تو بھئی، شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ببر شیر چھوٹا چوہا، بچھو، کیڑے مکوڑے، مینڈک، گرے ہوئے پھل، سڑی ہوئی بیلیں وغیرہ تک کھا لیتا ہے۔

ہاں ببر شیر گوشت خور ہوتا ہے۔ زیبرا اور ہرن اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ لیکن وہ مارے ہوئے جانوروں کی ہڈیوں سے گوشت نہیں نوچتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیر کے مارے ہوئے شکار پر، گیدڑ، لکڑبگھے اور گدھ وغیرہ پلتے ہیں۔ یہ عام طور پر ببر شیر کے پیچھے پیچھے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی عجیب ہے کہ ببر شیر خونخوار درندہ نہیں۔ ایک بار پیٹ بھر کر کھانے اور کھا کر سیر ہو جانے کے بعد وہ شکار نہیں کرتا۔ گویا شکار صرف بھوک مٹانے کے لیے کرتا ہے۔ اُسے اکثر زیبروں اور ہرنوں کے جھنڈ کے قریب آرام کرتے یا ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

تم کہو گے، میں نے یہ تو بتا دیا کہ ببر شیر کھاتا کیا ہے۔ لیکن یہ تو بتایا نہیں کہ ببر شیر ہوتا کیسا ہے اور دنیا میں کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ تم نے چڑیا گھر میں، یا سرکس میں ببر شیر کو ضرور دیکھا ہوگا۔

یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ ببر شیر کی رنگت زردی مائل ہلکی بھوری اور ہلکی سرخ ہوتی ہے۔ اس کی گردن پر اور شانوں پر ایال ہوتی ہے۔ جنگلی ببر شیر کی ایال کم کم اور کھردری ہوتی ہے لیکن شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ ببر شیر کی دُم میں بھی ایک پنجہ سا ہوتا ہے۔ دُم کے سرے پر بالوں کا ایک گچھا ہوتا ہے اس گچھے میں اس کے پنجے جیسے ناخن سے بنے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ببر شیر اس سے کوئی کام بھی لیتا ہے یا نہیں۔ ہاں۔ ببر شیر، ناک سے دُم تک دس فٹ لمبا اور تین فٹ اونچا ہوتا ہے۔

ببر شیرنی کا قد البتہ کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ اور اس کی گردن پر بال نہیں ہوتے۔ تاہم ایسے ببر شیر بھی ہوتے ہیں، جو بے ایال ہوتے ہیں۔ شروع میں یہ ایال ہلکے زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ بعد کو اس کی رنگت کالی پڑ جاتی ہے۔

اور عمر—؟ جنگلی ببر شیر کی عمر، عام طور پر ۱۵ سال ہوتی ہے چڑیا گھر یا پناہ گاہ جیسی جگہوں میں، جہاں وہ زیادہ محفوظ ہوتے ہیں۔ اُن کی عمر بیس سے تیس برس تک ہو سکتی ہے۔

پانچ سال کے ببر شیر کا وزن پانچ سو پونڈ تک ہوتا ہے۔

ببر شیر طاقت اور وقار کا مجسمہ ہوتا ہے۔ جنگل کا راجہ کہلاتا ہے۔ لیکن اس کی بعض باتیں بہت خراب تصویر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ببر شیر پر اکثر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ اس کی بو بڑی خراب ہوتی

پھر وہ مشکل کام یعنی شکار سے بھی کتراتا ہے۔ شکار ببر شیرنی کرتی ہے۔ وہ تو صرف ضرورت کے وقت شیرنی کی مدد کرتا ہے۔

جب شیرنی شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار ہوتی ہے تو اس وقت اس کی رفتار اور لپک دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ وہ سو گز کا فاصلہ پلک جھپکنے میں طے کر لیتی ہے۔ ایسے میں اس کی رفتار ۶۰ میل فی گھنٹہ تک ہو سکتی ہے۔ وہ بڑی لمبی چھلانگ بھر سکتی ہے۔ شکار ہوشیار بھی نہیں ہو پاتا کہ ببر شیرنی کا پنجہ اس کے سر پر اور دانت گردن میں گڑ جاتے ہیں۔

تمھیں ایک عجیب بات بتائیں! ببر شیر اپنے سے دگنے جانور پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتا اور یہ کہ اپنے سے دگنے وزن والے جانور کی گردن کو دانتوں میں دبوچ کر اپنی پیٹھ پر ڈال لیتا ہے اور اچھا خاصا اونچا باڑا پھلانگ جاتا ہے۔ بارہ فٹ تک اونچی چھلانگ لگانا تو ببر شیر کے لیے بڑی معمولی بات ہے۔ معمولی جانوروں کی بات چھوڑیے۔ ببر شیر تو دریائی گھوڑے، مگرمچھ اور خونخوار اژدھا جیسے طاقتور اور خطرناک جانوروں کے مقابلے سے بھی نہیں گھبراتا، انہیں چیر پھاڑ کر ہی دم لیتا ہے۔

میں نے ابھی بتایا تھا کہ ببر شیر مینڈک تک کھا لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ببر شیر پانی میں اترنے سے گھبراتا نہیں۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات تو یہ کہ وہ بڑا اچھا تیراک ہوتا ہے۔ وہ خود کو مگرمچھ [illegible] وغیرہ پار کر لیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ببر شیر ایسے علاقوں میں رہتا ہے جہاں ندی نالے اور دریا ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ وہ علاقے ہرے بھرے اور میدانی ہوتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ ببر شیر جنگل میں رہتا ہے۔ اور یہ خیال تو اور بھی غلط ہے کہ ایک جنگل میں صرف ایک ببر شیر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ببر شیر اکیلا نہیں رہتا۔ بارہ چودہ سے بیس ببر شیروں اور ببر شیرنیوں کے جھنڈ کے ساتھ رہتا ہے۔ شکار بھی سبھی مل کر کرتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ چند زیبروں یا بھینسوں کو یانی جھنڈ سے الگ کر کے ان کے گرد گھیرا سا ڈال لیتے ہیں۔ پھر ببر شیر دہاڑ دہاڑ کر اپنے شکار کو اس مقام کی طرف لے آتے ہیں۔ جہاں ببر شیرنی شکار کرنے کو تیار، گھات میں چھپی بیٹھی ہوتی ہے۔ ایسے میں شکار کا بچنا ناممکن ہوتا ہے۔

ببر شیر یا ببر شیرنی کے جھپٹنے کی بات بھی عجیب سی لگتی ہے۔ مگر ہے صحیح اتنا بڑا جانور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح چھپ کر اور دبک کر بیٹھ جاتا ہے کہ دکھائی نہیں دیتا۔

اچھا ایک بات اور بھی ہے۔ جن علاقوں میں ببر شیر زیادہ ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی وہ دن میں مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ اوّل تو ان کی رنگت آس پاس کے منظر میں مل جاتی ہے۔ دوسرے وہ دن میں سوتے اور رات میں شکار کے لیے نکلتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ببر شیر کھوہ یا غار میں رہتا ہے۔

جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ببر شیر یورپ، افریقہ، ہندوستان، یونان، ایران، شام، فلسطین،

آرمینیہ، اور بلقان وغیرہ میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔

ببر شیر کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے مصری شاہی، ایرانی اور مغل بادشاہ۔ ببر شیروں کے جانی دشمن رہے ہیں۔ کہتے ہیں چالیس برس کے مختصر عرصے میں رومی پچاس ہزار ببر شیر مار کر روم لائے تھے پچھلی صدی کے آخر آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان اور افریقہ کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر ببر شیر باقی تمام ملکوں میں ختم ہو گئے۔

لیکن اب صورت مختلف ہے۔ اب زیادہ تر ملکوں میں ببر شیر کے شکار پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ہندوستان میں۔ ریاست گجرات میں۔ گیر کے جنگل میں ببر شیر خاصی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ ببر شیروں کی پناہ گاہ ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں ان کی تعداد برابر گھٹ رہی ہے۔ اسی لیے اب ببر شیر کی بجائے شیر کو جنگل کا راجہ قرار دیا گیا ہے۔

عجیب بات ہے: ببر شیر انسان کا ایسا بڑا دشمن نہیں۔ وہ عام طور پر انسان سے ڈرتا ہے۔ وہ آدم خور بعض خاص وجوہ سے بنتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ببر شیر جب کسی طاقتور زیبرے یا غزال پر حملہ کرتا ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے پوری طاقت کے ساتھ اس کے منہ پر اپنے کھر مارتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں پھر وہ زیبرے یا زرافے جیسے جانور کے شکار کے قابل نہیں رہتا۔

دوسرا یہ کہ زیبرا اور ہرن وغیرہ ببر شیر سے تیز بھاگتے ہیں۔ ببر شیر کی بو پاتے ہی وہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور ببر شیر اور خاص کر بوڑھا ببر شیر ان کا پیچھا نہیں کر پاتا۔ ایسے میں وہ کمزور جانوروں، انسانوں، عورتوں، بچوں وغیرہ کو آسانی سے اپنا شکار بنا لیتا ہے۔ کہتے ہیں۔ انسان کا خون ببر شیر کے منہ کو لگ جائے تو اس کی جان کے ساتھ ہی چھوٹتا ہے پہلے نہیں۔

ببر شیر کے بارے میں تمھیں ایک عجیب بات اور بتاؤں! یہ کہ ببر شیر آپس میں بات چیت کے لیے کئی طرح کی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کھانسنا، غرانا، دہاڑنا وغیرہ۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ بڑے چھوٹے بچوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے وہ پکار کر انھیں واپس آنے کو کہتے ہیں۔ ببر شیرنی ایسا ہی کرتی ہے۔ ببر شیرنی کے بچے جیسے ہی اچھلتے کودتے، اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کو ہوتے ہیں۔ تو وہ ایک عجیب آواز نکالتی ہے۔

یہ آواز، سارنگی جیسے ساز سے بڑے اناڑی پن کے ساتھ پیدا کی گئی آواز جیسی ہوتی ہے۔ اور اس آواز کو سنتے ہی ببر شیرنی کے بچے، الٹے پاؤں اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ببر شیرنی زیادہ خونخوار ہوتی ہے۔ وہ اچھی ماں اور اچھی استانی بھی ہوتی ہے۔

ببر شیرنی ایک وقت میں ۲ - ۳ بچے جنتی ہے ان کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن چھ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ بچے پیدائش کے وقت عام بلی جتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور چھ سات دن میں کھلتی ہیں۔

باقی ص۳۱ پر



جناب محمد امین۔ ایم۔ اے

ایک لکڑہارا

اتھوپیا کی سرزمین سے
کہانی

شُوا کے علاقے میں ایک گانوں تھا۔ اس کا نام گوُرا تھا۔ ایک دن اس گانوں سے ایک آدمی جلانے کے لیے لکڑی کاٹنے نکلا اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔ قریب کے سارے جنگل ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے لکڑی کی تلاش میں اسے دور جانا پڑا۔ چلتے چلتے "غدی گُن گل" دریا کی وادی میں پہنچ گیا۔ اب بھی اسے کوئی درخت نہ ملا۔ تھک کر وہ مایوس ہو رہا تھا کہ اتنے میں بہتے ہوئے پانی کے کنارے اسے سوکھا ہوا ایک بھاری سا زیتون کا درخت دکھائی دیا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے سوچا اس تنے میں لکڑی کافی ہے۔ اس کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔

وہ درخت پر چڑھ گیا اور سب سے موٹی شاخ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد درخت کاٹنے لگا۔ پاس سے ایک پادری گزرا۔ اس نے جو نظر اوپر کی تو دیکھا کہ گوُرا گانوں کا ایک لکڑہارا درخت کاٹ رہا ہے۔

"اچھے پڑوسی" پادری نے کہا "وہاں بیٹھے تم کیا کیا کر رہے ہو؟" آدمی نے جواب دیا۔ "ایندھن کے لیے لکڑی کاٹ رہا ہوں"

"ٹھیک ہے لکڑی کاٹنا بُرا نہیں لیکن تم بیٹھے کہاں ہو" پادری نے اسے خبردار کیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو لکڑی کی ضرورت ہے تو آپ بھی کوشش کر دیکھیے" آدمی نے اسے طعنہ دیا۔

"لکڑی کاٹنی ہے تو نیچے اتر کر جڑ سے کاٹو" پادری نے شرافت سے کہا "جس شاخ پر تم بیٹھے ہو اسی کو کاٹ رہے ہو۔ اس طرح گر جاؤ گے اور خطرہ ہے کہ کہیں مرنہ

جاؤ۔"

"حماقت کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟" آدمی بڑے طنزیہ انداز میں بولا:۔ "بہتر یہ ہے کہ تم اپنا راستہ ناپو۔"

پادری افسوس کرتا ہوا اپنے راستے پر چلا گیا۔ لکڑہارا اپنے کام میں لگا۔ پادری کی حماقت آمیز باتیں سوچ کر وہ لکڑی کاٹنے میں جٹ گیا۔ یک بیک شاخ ٹوٹی اور وہ ارارا! دھم! نیچے زمین پر آرہا۔ شاخ اس کے سینے پر اور وہ اس کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا۔ ایسی مصیبت میں اسے پادری کی بات یاد آئی۔

"اس نے سوچا کہ پادری نے ٹھیک کہا تھا کہ شاخ ٹوٹ جائے گی، میں گروں گا اور ختم ہو جاؤں گا۔ وہی ہوا۔ پادری کی بات حرف بہ حرف سچ نکلی۔ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی وہ جانتا تھا کہ میرا یہ انجام ہوگا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ گرنے کے بعد میں مر چکا ہوں۔ ہاں! سچ مچ یہی ہوا ہے۔ جان میری نکل چکی۔

اپنے کو مردہ سمجھ کر لکڑہارا وہیں پڑا رہا۔ بالکل خاموش اور بے حس۔ کافی دیر ہو گئی تو اس کی تلاش میں گورا گانوں کے کچھ لوگ آئے۔ دیکھا کہ وہ زمین پر دراز ہے اور اس کے اوپر ٹوٹی ہوئی بھاری شاخ پڑی ہے۔ انھوں نے اسے ہلایا، سر میں مالش کی زبان دیکھی۔ لیکن سب بے سود۔ اس نے اپنے کو مردہ بنا رکھا تھا۔ پھر کچھ دیر تک وہ روتے پیٹتے رہے۔

آخر طے کیا کہ اسے گھر لے چلو۔ کوشش کی کہ اسے کھڑا کرکے دیکھیں لیکن وہ دھڑام سے گر گیا۔ بھلا مردہ بھی کہیں کھڑا ہو سکتا ہے؟

جب کوئی چارہ نہ رہا تو مجبوراً اس کے دوست اسے اٹھا کر گورا کی طرف چل پڑے۔

"نیچے کلہاڑی پڑی ہے اسے نہ بھولنا" روانگی سے پہلے لکڑہارے نے کہا۔ یہ سن کر ایک آدمی گیا اور کلہاڑی اٹھا لایا۔ راستے میں سب اسی بات پر افسوس اور ماتم کرتے رہے کہ بے چارا کتنا بدقسمت تھا کہ لکڑی کاٹنے میں جان گنوا بیٹھا۔ انھیں ایک جگہ دوراہا ملا۔ سب پریشان کہ کدھر کو چلیں۔ کوئی کہتا نیچے اتر کر وادی سے چلو، دوسرا کہتا پہاڑی سے چڑھ چلو۔ لکڑہارے کا بوجھ الگ ان کے کندھوں پر گویا وہ ایک لاش اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ بحث تھی کہ ختم ہی ہونے کو نہ آتی تھی۔ لکڑہارے کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ لیٹا لیٹا وہ اٹھ بیٹھا اور پہاڑی کی طرف اشارہ کرکے بولا "ادھر سے چلو۔ یہ چھوٹا راستہ ہے اور میں اسی طرف سے آیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے دوست اس بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔ وہ برابر افسوس کرتے رہے کہ کتنا لیے تکا حادثہ تھا۔ بے چارے کی جان چلی گئی۔ خدا خدا کرکے کٹھن منزل آسان ہوئی اور وہ لوگ گانوں میں لاش لے کر پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے کہا:۔

"بات اس نے سچ کہی تھی۔ راستہ چھوٹا تھا اور ہم جلدی پہنچ آئے۔ واقعی وہ کتنا سچا اور ایماندار آدمی تھا۔"

اسے لے کر جا گھر پہنچے۔ دیکھتے ہی پادری نے پوچھا کیا بات ہے۔

"زیتون کے درخت کے نیچے یہ مرا پڑا تھا"، ایک نے کہا۔ "شاید ایک شاخ ٹوٹ کر گر پڑی تھی اور اسی

کے نیچے دب گیا تھا۔"

"نہیں۔ یہ غلط ہے" لکڑہارے نے آنکھ کھول کر کہا۔ "ہوا یہ تھا کہ میں جس شاخ پر بیٹھا تھا اسی کو کاٹ رہا تھا۔ پھر یہ گری اور میں دب گیا" یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

پادری کفِ افسوس مل کر رہ گیا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ دوست اُسے اٹھا کر گھر لے گئے وہاں دیکھا تو بالکل سناٹا۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ اب یہ بحث کہ آخر کیا کیا جائے۔ مردے کو کہاں چھوڑا جائے معاملہ بڑا گمبھیر۔ بات تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ اتنے میں ایک کتّا وہاں آنکلا۔ لکڑہارے کو زمین پر پڑا اور مرا سمجھ کر اس کے منہ کو وہ چاٹنے لگا۔

"اسے بھگاؤ" لکڑہارے نے چیختے ہوئے کہا۔ "کیا مرے ہوئے آدمی کی یہی قدر ہے؟"

کتے کو سب نے دھتکار دیا۔ لیکن بحث پھر چھڑ گئی کہ لاش کو کیا کیا جائے۔ پانی سر سے اونچا ہوگیا تو لکڑہارا پھر اٹھ بیٹھا اور غصّے سے اس نے کہا:

"میری بیوی کو ڈھونڈھو۔ وہ چشمے کے پاس بیٹھی خوش گپیاں کر رہی ہوگی" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر مردہ بن گیا۔ یاروں نے بیوی کو ڈھونڈھ نکالا۔ خبر سنتے ہی، چیختی چلاتی، آسماں کو سر پہ اٹھاتی، واویلا مچاتی آئی۔ ساتھ میں گاؤں کی ساری عورتیں بھی۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی جمع ہوگئے۔ پھر آدمیوں نے بتایا کہ قصّہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا "زیتون کی ایک شاخ ٹوٹ کر گر پڑی تھی اور یہ اسی کے نیچے دب کر مرگیا۔"

یہ سُن کر لکڑہارے کو غصّہ آیا۔ اس نے کہا "میں تمھیں کتنی بار ٹوکوں۔ بات یہ تھی کہ میں جس شاخ پر بیٹھا تھا اسی کو کاٹ رہا تھا۔ پھر وہ ٹوٹ کر گری اور اسی کے ساتھ میں بھی گر گیا۔"

آدمیوں نے اس کی بات دہراتے ہوئے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ شاخ پر بیٹھا تھا اسی کو کاٹ رہا تھا۔ پھر وہ ٹوٹ کر گری اور اس کے ساتھ یہ نیچے گرا۔ اور گر کر مرگیا۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ بولتا ہے تو مرا کیسے ہے؟" اس کی بیوی نے کہا۔

"دیکھتی نہیں ہو؟ یہ مردے کی طرح پڑا ہے۔" دوسروں نے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں۔ یہ بھلا مرا کیسے ہے؟" اس کی بیوی نے شک کرتے ہوئے کہا۔

لکڑہارے سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ چڑھ اٹھا اور بولا۔

"میں جب لکڑی کاٹ رہا تھا تو "مائی بڑا" گاؤں کا پادری وہاں سے گزرا۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ گر دگے اور مرجاؤ گے۔ اس کے بعد واقعی میں گر پڑا۔ پادری نے سچ کہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ پادری کی جب ایک بات سچ ہے تو دوسری بھی ضرور سچ ہوگی۔ اسی لیے گرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو مرا ہوا سمجھ لیا۔"

"نہیں۔ پادری بالکل سچّا نہیں تھا۔ گرنے سے پہلے اس نے دیکھا تھا۔ گرنے کے بعد تو نہیں دیکھا۔"

"بکے جاؤ بکے" کوفت محسوس کرتے ہوئے لکڑہارے نے زمین سے اٹھتے اٹھتے کہا۔

"کیا تم لوگوں کی بکواس ختم نہیں ہوگی؟ جھلّا کر

باقی صفحہ ۳۲ پر

جاپان کے تیوہار اور کھیل

عبدالرب مُلا



جاپان ایک خوبصورت ملک ہے یہ چین کے شمال مشرق میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کے روپ میں تقریباً ۱۹۰۰ کلومیٹر پھیلا ہوا ہے۔ سورج کے مشرق میں طلوع ہوتے وقت یہاں منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ شاید اسی خیال سے یہاں کے باشندوں نے اس دیس کا نام جاپان رکھا ہوگا۔ جاپان کا

نی ہیں سورج نکلنے والا دیس۔

ہندوستان کی طرح جاپان بھی تہواروں کا دیس ہے۔ وہاں بھی ہر مہینے کوئی نہ کوئی تہوار ہوا کرتا ہے۔ دو تیوہار تو بہت ہی مشہور ہیں جو نوا روح۔ اور اوبن کے تیوہار۔

نوا روح کا تیوہار سردیوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جاپان کے لوگ اسے بڑا قومی تیوہار مانتے ہیں۔ اس کی تیاریاں ہفتوں پہلے ہونے لگتی ہیں۔ چھوٹے بچوں سے لے کر اسّی سال کے بوڑھے تک اس کی تیاری میں برابر حصہ لیتے ہیں۔

تمام گھروں کو گلیوں اور بازاروں کو ہرے بھرے پتوں اور خوبصورت پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ ہر جاپانی اچھے اچھے کپڑے پہن کر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو مبارک باد دینے نکل پڑتا ہے۔ لڑکے پتنگ اڑاتے ہیں۔ لڑکیاں گیند بلا کھیلتی ہیں۔ اور گڑیوں کے بیاہ رچاتی ہیں۔ شہروں اور گاؤں کی بڑی سڑکوں پر جلوس نکالے جاتے ہیں۔

نوروج کا یہ تیوہار پانچ روز تک چلتا رہتا ہے۔ ہر جاپانی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پچھلے سال کا قرض اس آخری دن تک چکا دے۔ جو لوگ کسی وجہ سے اپنا قرض نہیں چکا سکتے وہ اپنے گھر کی کچھ چیزیں لے کر میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ اس میدان میں ایک میلا سا لگتا ہے۔ لوگ اپنی لائی ہوئی چیزیں اس میلے میں بیچ کر اپنا قرض ادا کرتے ہیں۔ قومی خدمت کرنے والے لوگ ان چیزوں کو زیادہ قیمت میں خریدتے ہیں۔ نوروج کا دن جاپانیوں کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا دن ہوتا ہے۔

دوسرا تیوہار اوبن کا ہوتا ہے۔ جو ہر سال جولائی کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ ان دنوں ان کے بزرگوں کی روحیں دنیا میں سیر کرنے آتی ہیں۔ ان روحوں کو خوش کرنے کے لئے جگہ جگہ پرانے زمانے کے ناچ گانے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر لوگ بازاروں میں رقص کرتے ہیں۔

جاپانیوں کو کھیل بہت پسند ہیں۔ گھر کے کھیلوں میں لڑکوں کو لٹو۔ لڑانا زیادہ پسند ہے۔ ایک لڑکا ڈوری کی مدد سے لٹو کو زمین پر پھینک کر گھماتا ہے۔ دوسرا لڑکا اپنا لٹو اس طرح گھما کر پھینکتا ہے کہ اس کا لٹو پہلے لٹو سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس ٹکر میں جس کا لٹو گر جاتا ہے اس کی ہار مانی جاتی ہے

اسی طرح ایک کھیل اور جاپانیوں میں زیادہ مشہور ہے۔ اس کھیل میں حصہ لینے والے ہر کھلاڑی کے پاس پانچ تھیلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سفید، کالے، لال، پیلے، اور نیلے رنگ کی ریت بھری ہوتی ہے کھلاڑی پہلے سفید رنگ کی ریت کو زمین پر بچھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد مٹھی میں تھوڑی سی کالی ریت لے کر اس ریت پر اس طرح انگلیوں کی مدد سے زمین پر گراتے ہیں کہ سفید ریت پر آدمی جانور یا پھول کی تصویریں بن جاتی ہیں۔ تصویر پوری ہونے پر دوسرے رنگ کے ریتوں سے ان تصویروں میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ یہ کام اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا ہے تمام کھلاڑی اسی طرح تصویریں بناتے ہیں۔ جو کھلاڑی سب سے پہلے تصویر پوری کر لیتا ہے وہ میدان مار لیتا ہے

جاپانیوں کو میدان کے کھیل بھی زیادہ پسند ہیں۔ ان کھیلوں میں پتنگ اڑانا سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل ہے

کچھ پتنگیں تو بڑے بڑے اژدہوں کی اور دوسرے جانوروں کی شکلوں کی بنا کر اڑائی جاتی ہیں۔ ہمارے دیش کی طرح جاپان میں بھی پتنگوں کو لڑایا جاتا ہے ایک ٹیم کی پتنگوں سے ایک ساتھ پیچ لڑایا جاتا ہے

غرض جاپان میں ہر تہوار میں کوئی نہ کوئی کھیل ضرور ہوتا ہے اور یہی لوگوں میں بھائی چارہ پیدا کرنے کے لئے ایسے کھیل بہت ضروری ہیں۔

بقیہ لکڑہارا ص۲۹ سے

اس نے اپنی کلہاڑی سنبھال لی اور پلک جھپکتے ہی گھر سے باہر نکل گیا۔

"کہاں چلے؟" اس کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

"آگ جلانے کے لیے لکڑی لینے جارہا ہوں" یہ کہتا ہوا وہ پہاڑ کی طرف نکل گیا۔

گاؤں والوں نے ایک زبان ہوکر کہا "کیا من موجی آدمی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اسے اپنی بیوی کا کتنا خیال ہے اور اسے سکھ دینے کی کتنی آرزو ہے"

بقیہ بچوں کی عدالت ص۳۴ سے

شاباش میرے بچو۔ شاباش۔ جو کام میں نہ کرسکا وہ تم نے کردکھایا۔ آفریں ہے تم پر۔ مگر یہ جادوئی گولیاں میری سمجھ میں نہ آئیں"

"پاپا یہ جادوئی گولیاں نہیں۔ سردرد کی گولیاں ہیں"

پاپا کے منہ سے ایک قہقہہ ابل پڑا۔ ★★

بقیہ بچوں سے باتیں ص۴ سے

دوسری نظمیں بھی دلچسپ ہیں۔ ناوک حمزہ پوری صاحب کا مضمون قومی ترانہ بھی ضرور پڑھیے گا۔ بہت کام کی چیز ہے۔

محترمہ انور جہاں صدیقی (رشیدہ) کی نوازشوں کا سلسلہ برابر جاری ہے اس دفعہ بھی انھوں نے دو خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کی ہدایت کے مطابق ان دو خریداروں کے علاوہ پچھلے نئے خریداروں کو بھی کہانی نمبر بھیج دیا گیا ہے۔ ایک خریدار ہمارے محترم ساتھی جناب جمیل قریشی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے اور آئندہ کے لیے امید دلائی ہے۔ ابھی چند دن ہوئے برادرم مرزا عزیز اللہ صاحب بی۔ اے جامعہ۔ جامعہ نگر تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بھی کئی خریدار دینے کا حتمی وعدہ فرمایا ہے۔ دو خریدار عزیزی انوار علی سلمہٗ نانپارہ نے دئے ہیں۔

کاپیاں پریس جارہی تھیں کہ اچانک محترم بزرگ، اردو کے مشہور ادیب۔ جناب سجاد ظہیر کی خبر آئی۔ مرحوم افرو ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے روس (قزاقستان) تشریف لے گئے تھے۔ وہیں دل کا دورہ پڑا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انتقال ہوگیا

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجِعُون ○

مرحوم کی میت دہلی لائی گئی اور جامعہ میں دفن ہوئے۔

ہمیں پیام تعلیم کی مستقل سرپرست محترمہ رضیہ سجاد ظہیر اور مرحوم کے دوسرے عزیزوں سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان کو اور مرحوم کے دوسرے عقیدت مندوں کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔

ڈی ۔ کے کینول

بچوّں کی عدالت

کہانی



جس دن پاپا کا بٹوا چوری ہوا گھر میں طوفان آگیا
ممی اور پاپا نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر بٹوہ نہ ملا ۔
ہم دونوں بھائیوں سے پوچھ تاچھ ہوئی ۔ ہم نے بٹوے
کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی —— چوکیدار نے بھی
ایسی ہی لاعلمی ظاہر کی۔

ہمارے گھر میں ایک نوکر بھی تھا اس کا نام تھا جمّن۔
جمن میاں ہڈیوں کا ڈھانچا تھے ۔ بال صفا
چٹ۔ کچھ عمر نے اور کچھ حالات نے اُنھیں سر کے بالوں
سے فارغ کر دیا تھا۔ لباس بھی وہ عجیب قسم کا پہنتا تھا ۔
نیچے تو پتلون اور اوپر سے ڈھیلا ڈھالا کرتا ۔ اس
لباس میں وہ سرکس کا جوکر سا لگتا تھا ۔

جمّن کو پاپا لے آئے تھے اسی لیے وہ اس کی
ہر غلطی کو نظر انداز کر دیتے تھے کبھی کبھار پاپا کے
سامنے ممی جمن میاں کی کوئی غلطی پکڑ لیتیں تو وہ
اس غلطی کو خوب اچھالتیں اور پاپا کو بہت ستاتیں۔

اور اب بٹوا چوری ہوا تو ممی نے جمن ہی پر شبہ
کیا۔ پاپا جمن میاں کو چور ماننے کے لیے تیار نہ تھے
نتیجہ یہ نکلا کر دونوں میں تکرار ہونے لگی ۔ جھگڑا کافی
سنگین صورت اختیار کر لیتا اگر میں مداخلت نہ کرتا
مجھے ایک بات سوجھی میں نے ممی سے کہا۔

" ممی تمھیں بٹوا چاہیے نا ۔ ؟"

" ہاں مجھے بٹوا چاہیے !!"

" تو پھر وہی کیجیے جو میں کہوں آپ بس ۔ چپ
چاپ یہاں بیٹھی رہیں اور اس وقت تک بات نہ
نہ کریں جب تک میں نہ بولوں ۔"

ممی نے یہ بات مان لی ۔ میں نے جمن میاں کو

اپنے کمرے میں بلایا۔ جمن میاں دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے مُنا۔ بھلا مجھے کیوں بلایا؟"

"جمن میاں تم اس جگہ جاکر کھڑے ہوجاؤ۔ ہم جو جو سوال تم سے پوچھیں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

اور جمن میاں تھے کہ ہمارا مذاق اڑانے لگے۔

"دودھ کے دانت ٹوٹے نہیں ابھی اور لگے پوچھ تاچھ کرنے۔"

"ہونہہ کیا زمانہ آگیا ہے۔" لیکن جب پاپا نے اسے ڈانٹا تو چپ چاپ کمرے کے کونے میں جاکر کھڑا ہوگیا۔

میں نے جمن میاں سے پہلا ہی سوال کیا اور وہ اس سوال سے قدرے بوکھلا گیا لیکن ایک دم بول اٹھا۔

"میں بٹوے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"دیکھو جھوٹ مت بولو۔ میرے پاس بہت سے ثبوت ہیں اور میں تمھیں چور ثابت کرسکتا ہوں۔"

"ثبوت! کیسے ثبوت —" جمن میاں تھوک نگل کر بولے۔

"تو تم ایسے نہیں مانوگے۔ اچھی بات ہے۔ تو اب مجھے اپنا نسخہ آزمانے دو!"

"دیکھو مُنا میں تم سے بڑا ہوں۔ بڑوں سے اس طرح کا مذاق نہیں کیا کرتے۔"

"یہ مذاق نہیں بچوں کی عدالت ہے اور اسی عدالت میں تمھیں اپنا گناہ قبول کرنا پڑے گا۔"

جمن میاں بہت بدکا۔ بہت اکڑا۔ اس نے پاپا سے احتجاج کیا لیکن پاپا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ چپ چاپ ہم بچوں کا تماشا دیکھتے رہے۔

جمن میاں کو اپنی غلطی کا اعتراف کرانا کوئی آسان کام نہ تھا ہم نے بھی ہمت نہ ہاری۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے قریب بلایا اور اسے ایک تھیلا لانے کے لیے کہا۔

وہ جب تھیلا لے آیا تو میں نے اس میں سے ایک ڈبیا نکالی اور ڈبیا جمن میاں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رہے ہو۔ جمن میاں یہ کیا ہے۔! اس ڈبیا میں جادو کی گولیاں ہیں اس عدالت میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کو ایک ایک گولی کھانی پڑے گی اس گولی کی یہ خاصیت ہے کہ جس نے چوری کی ہوگی۔ وہ اسے کھاتے ہی بے ہوش ہوکر گر پڑے گا۔ ممکن ہے اس کی جان بھی چلی جائے۔" یہ کہہ کر میں نے جمن میاں کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ میں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا۔ میں نے وہ گولی جمن کی طرف بڑھائی اور اس سے کھانے کے لیے کہا۔ جمن کی جان پر بن آئی۔ وہ ایک دم حواس باختہ ہوگیا اس نے طرح طرح کے بہتان تراشنے شروع کیے۔ کبھی کہا وہ جادو اور دواروں سے بہت ڈرتا ہے کبھی کچھ اور کہتا۔ میں بھی کہاں پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ میں اسے مجبور کرنے لگا۔ اس پہ دباؤ ڈالنے لگا۔

جمن کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنا گناہ قبول کرے۔ اس نے وہی کیا۔ ممی اور پاپا کے سامنے چرایا ہوا بٹوا واپس کردیا۔ اس میں نقدی جوں کی توں موجود تھی۔

پاپا ہماری ذہانت سے بے حد خوش ہوئے انھوں نے ہمیں سینے سے لگالیا اور ہمارا ماتھا چوم کر بولے۔

باقی صفحہ ۴۲ پر۔

زہرہ مشیر صاحبہ

ڈھیٹ سہیلیاں



رات کا وقت تھا شاہینہ تنویر ۔ زہرہ ۔ طلعت ۔ عرشی ۔ بنّی باجی اور یہاں تک کہ عنبر بھائی بھی نانی اماں کے بستر میں گھس کر کہانی کی فرمایش کر رہے تھے ۔ نانی اماں نے ایک پان اپنے کلّے میں دبا کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا ۔ "ارے بیٹا اپنے بستروں میں جاؤ مجھے کہانی وہانی کہاں آتی ہے ۔ عرشی جو ان سب میں سب سے چھوٹی تھی بول پڑی "بھئی نانی اماں سنا بھی دیجیے نا ! کیوں خوشامد کروا رہی ہیں " ساتھ ہی ساتھ شریر زہرہ بھی بولی "ارے نانی اماں بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ کی کہانیوں کا اسٹاک ختم ہو گیا ۔

غرض سب ہی بچے پیچھے پڑ گئے ۔ آخر نانی اماں نے ہار مان کر کہا ۔ "اچھا بھائی میرے بستر میں آکر بیٹھ جاؤ " سب جلدی سے بستر میں پہنچ گئے ۔

نانی اماں نے مسکرا کر کہا ۔ " آپ بیتی سنو گے یا جگ بیتی ؟ " تنویر جو ان سب میں شرمیلا اور خاموش تھا بولا : " نانی اماں کوئی سی سنا دیجیے "

نانی اماں نے اسے پیار سے لپٹا لیا اور کہنا شروع کیا ۔

بہت دنوں پہلے ایک شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا اس کی ایک لڑکی تبسّم تھی ۔ تبسّم کا چچا غریب تھا اس کی بھی ایک لڑکی قمر تھی ۔ قمر اور تبسّم ایک ہی جماعت میں پڑھتی تھیں لیکن تبسّم بدتمیز لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھی اپنی پڑھائی پر ذرا توجہ نہ دیتی تھی اس کے ہمیشہ نمبر خراب آتے تھے ۔ اس کے برعکس قمر خوب محنت کرتی اور اچھے نمبر لاتی ۔ وہ کلاس کی سب سے اچھی لڑکی تھی استانیاں اس سے خوش تھیں ۔

امتحان قریب آرہے تھے ۔ لیکن تبسّم اور اس کی سہیلیاں ہر وقت شرارت کرتی پھرتی تھیں ۔ انھی دنوں ایک نئی لڑکی انجم ، تبسّم اور قمر کی کلاس میں داخل ہوئی ۔ سب کو تعجب تھا کہ امتحان تو اتنے قریب آگئے اور

اس کا اضطراب ہوا ہے تبسم نے کلاس میں اس کے بیٹھنے کی جگہ ایک ٹوٹی کرسی لاکر رکھ دی انجم کرسی پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ قمر نے اس کو منع کر دیا اس طرح تبسم کی اسکیم کامیاب نہ ہو پائی۔ تبسم اس واقعہ کے بعد قمر سے نفرت کرنے لگی لیکن قمر نے اس پر دھیان نہیں دیا۔

امتحان آئے اور ختم ہوگئے نتیجہ نکلا قمر فرسٹ پوزیشن اور انجم سیکنڈ پوزیشن پاس ہوئیں۔ تبسم فیل ہوگئی۔ تبسم نتیجہ سننے کے بعد قمر سے اور نفرت کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک اسکیم بنائی کہ قمر کے ساتھ ندی کی طرف جائے اور وہاں کسی طرح سے قمر کو دھکا دے دے۔

اور ایک دن تبسم قمر کو دریا کی طرف لے گئی اور دونوں ہاتھ پکڑ کر ندی کے کنارے ٹہلنے لگیں۔ ٹہلتے ٹہلتے تبسم نے کہا دیکھو وہ پھول کتنا خوبصورت ہے۔ قمر جھک کر دیکھنے لگی۔ اتفاق سے تبسم کا پیر پھسل گیا اور وہ ندی میں گر پڑی قمر نے چیخ کر کچھ لوگوں کو بلایا۔ تبسم کو ہسپتال لے جایا گیا لیکن اس کی موت آگئی تھی۔

تبسم نے آخری وقت میں بتایا کہ میں قمر کو ندی میں دھکا دینے کے لیے لائی تھی لیکن اپنے بنائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گئی اور اس نے قمر سے معافی مانگی۔

زہرہ نے پوچھا نانی اماں کیا قمر نے معاف کر دیا نانی اماں نے کہا "ہاں بیٹی قمر نے معاف کر دیا" نانی اماں یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے کہا "کیا تم قمر کو دیکھنا پسند کروگے۔" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"جی نانی اماں"

نانی اماں نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"تو دیکھ لو قمر کو یہی تو تمھاری نانی اماں ہیں"

عرشی۔ طلعت اور تنویر نے کہا "واہ آپ تو ہماری نانی اماں ہیں۔ نانی اماں نے دونوں کو لپٹاتے ہوئے کہا، "ہاں بیٹیا میں ہی تمھاری نانی اماں اور تبسم کی قمر ہوں"

کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی سب بچے آج کی اس کہانی سے متاثر نظر آرہے تھے۔ اسی وقت امی جان شال لپیٹتی ہوئی آئیں اور کہا "بچو جاؤ سو جاؤ کافی رات ہوگئی" سب خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

....

مہر ورولوی

بچوں کی عادتیں

(جالینوس کے اقوال زریں سے)

بچوں کی یہ چار عادتیں پیدا بڑوں میں ہوں اگر
بیشک ولی کا مرتبہ حاصل کریں وہ باخبر

ایک

بچوں کو کھانے پینے کی ہوتی نہیں ہے فکر ہی

دو

جو چیز آج ان کو ملے رکھتے نہیں کل کے لیے

تین

آپس میں وہ لڑتے تو ہیں باہم الجھ پڑتے تو ہیں
لیکن نہیں رکھتے کبھی بغض و عناد باہمی

چار

پہنچے کسی سے بھی اگر تکلیف ان کو سربسر
کرتے نہیں شکوہ کبھی شیوہ ہے بچوں کا یہی

ہر قول جالینوس کا
ہے مہر کتنا بے بہا

ہنڈکلھیا

عزیزہ شاہدہ خاتون

مسالے دار بھنڈی

پہلے تھوڑی سی مرچیں پیس لیجئے۔ تھوڑا سا لہسن باریک کتر لیجئے۔ یہ دونوں الگ الگ آدھی آدھی املی کے پانی میں ملا دیجئے۔ پھر دیگچی میں تیل یا گھی کرکرا کر بھنڈی اس میں بھون لیجئے۔ بھنڈیاں نرم ہو جائیں تو انھیں دیگچی میں نکال لیجئے۔ اور دیگچی کے بچے ہوئے تیل یا گھی میں پیاز بھون لیجئے۔ پیاز سرخی مائل ہو جائے تو پسی ہوئی سرخ اور باقی لہسن ڈال کر بھونئے۔ اور پھر تھوڑا انتظار کرنے کے بعد باقی پسی ہوئی مرچ اور اس کے علاوہ ہلدی اور دھنیا ڈال کر بھونئے۔ یہ دونوں بھی پسے ہوئے ہوں یہ سب مسالہ اچھی طرح بھن جائے تو اس میں املی کا پانی یا املی کا رس ڈال دیجئے اور ایک دو ابال آ جائیں تو تھوڑی دیر تک بھنڈی ڈال دیجئے اور دھیمی دھیمی آنچ پر پکنے دیجئے۔ ہاں پسا ہوا ناریل بھی پانی میں ملا کر پکتی ہوئی بھنڈی میں ڈال دیجئے اور چمچے سے چلا کر دیگچی اتار لیجئے اب تیل یا گھی گرم کرکے اس میں تھوڑی سی رائی ڈال دیجئے۔ یہ رائی چیخ جائے تو بھنڈی کو بگھار دیجئے اور مزے سے کھائیے کھاتے وقت ہمیں بھی یاد کر لیجئے گا اس طرح کی بھنڈی۔ خاص طور پر مہاراشٹر میں پکائی جاتی ہیں۔

مسالے دار بھنڈی کا سامان

بھنڈی	دھنیا پسا ہوا	ہلدی پسی ہوئی	ادرک
۲۵۰ گرام	چائے کے دو چمچے	چائے کا ایک چمچہ	پیاز کا گانٹھ باریک کاٹئے

پیاز بڑی گانٹھ۔ لہسن۔ دس یا پندرہ جوئے چھیل کر باریک کاٹئے۔ سرخ مرچ پسی ہوئی۔ حسب منشا

املی۔ ۵۰ گرام ۲۵۰ گرام پانی میں بھگو دیجئے۔

ناریل۔ ۵۰ گرام۔ باریک پیس لیجئے۔

نمک۔ حسب منشا۔ روغن تیل یا ڈالڈا حسب منشا۔

بھنڈی کی کڑھی

اس کا رواج بھی یو پی یا شمالی ہند میں نہیں ہے یا بہت کم ہے جنوبی ہند میں ہے۔

بھنڈیوں کو دھو لیجئے ان کا پچھلا حصہ کاٹ کر بیچ سے چیر دیجئے۔ دیگچی میں گھی یا تیل ڈال کر دھیمی آنچ میں کرکرائیے اور بھنڈیاں دیگچی میں ڈال کر بھونئے بس اتنا بھونئے کہ بھنڈیاں نرم ہو جائیں۔ اب دہی یا چھاچھ کو خوب متھیے اور اس میں کوئی سو گرام پانی ملا دیجئے بس اتنا پتلا کیجئے کہ دودھ کی طرح ہو جائے۔ اس دہی میں پسی ہلدی پسی مرچیں اور بیسن ملا کر بھنی ہوئی بھنڈیاں ڈال دیجئے۔ دو چار ابال آ جائیں تو چلا کر اتار لیجئے۔ کڑھی تیار ہے اس میں ادرک، ہری مرچیں، ہرا دھنیا باریک کتر کر ملا دیجئے۔

سامان

بھنڈی: ۲۵۰ گرام دہی یا چھاچھ (مٹھا) ۲۵۰ گرام

پسی ہلدی: چائے کا ایک چمچہ پسی مرچ: چائے کے دو چمچے

بیسن: ۲۰ گرام

ادرک: درمیانی گانٹھ

ہرا دھنیا: اپنی پسند کے مطابق

ہری مرچ: " " " "

**

آدھی ملاقات

پیام ملا میری فرمائش اس زور و شور سے پوری کی آپ نے جب مجھ کو میرا پیام تعلیم ملا تو پوری طرح سے بھیگا ہوا تھا۔ بمشکل تمام اس کو خشک کیا اور جب مطالعہ کیا تو بہت ہی مزہ آیا۔ اپنی فرمائش کی چیزیں بارش کیسے ہوتی ہے۔ برسات کا موسم، اور کب ورشا آئے گی "پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہمارا قومی جھنڈا بہت اچھا مضمون رہا مگر اس میں اس جگہ کمی محسوس ہوئی جہاں طالب علموں کی جان دینے کی بات لکھی ہے، کاش ـــ ان جان بازوں کے نام بھی دیئے ہوتے کہانی پتھر پھوڑ بھی بہت اچھی رہی۔ ان کے خیال کے پیچ کی داد دیتا ہوں۔ "میلے کی سیر" بھی خوب رہی "ایلسن بھئی کی حیرت انگیز ذہانت" بھی قابلِ تعریف ہے۔ اس ماہ کے "مونگے کا جزیرہ" بہت ہی سادا بے مزہ تھا۔ "انوکھی عدالت" میں پہنچتے ہی واقعی ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے۔ بہت ہی مزہ آیا۔

پیام تعلیم کو پاکر اور اس کو پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ خوشی مجھے پیام تعلیم کا خریدار دے کر ہوئی۔ ایک بوجھ دل سے اتر گیا۔ جو پیام تعلیم کا کوئی خریدار نہ دینے سے دل پر تھا۔ دل کو سکون محسوس ہوا۔ میں آپ کی نصیحت آمیز کہانی سنا کر اور پیام تعلیم کا نمونہ دکھا کر ایک اور خریدار بنالیا ہے۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میں پیام تعلیم میں اب دوسرا خریدار بھی دینے والا۔ ایک کا سلسلہ جولائی سے چلا ہے تو دوسرے کا اگست سے چلے گا۔ انشاء اللہ جلد ہی دوسرے خریدار کا منی آرڈر بھی آپ کو مل جائے گا

محمد انوار علی تنہا، نارہ، بہار

امید کہ ذکری پابندی سے مل رہا ہوگا الحمدللہ پیام تعلیم برابر مل رہا ہے اور خوب ہے۔

محمد یوسف اصلاحی ایڈیٹر ذکری، رامپور

جولائی کا پیام تعلیم موصول ہوا۔ جناب خلیق انجم اشرفی کا قسط وار ناول اب دلچسپ ہوتا جا رہا ہے وہ بڑی خوبی سے ترجمہ کرتے ہیں۔ کہانی گنہگار خچر" اور شرارتی بچی بہت پسند آئیں۔ شوکت پردیسی کی نظم قابلِ تعریف ہے حافظ صاحب کی نظم اردو بھی بہت پسند آئی۔ ادھر ادھر سے کا کالم معلوماتی اور دلچسپ ہے شفیع الدین نیر صاحب کی نظمیں ہمیں بہت اچھی لگیں۔ ٹائٹل بھی ٹھیک تھا۔ اگر ہر ماہ ایسا ہی ٹائیٹل بنایا کریں تو پیام تعلیم کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوگا۔ ایک بات کی کمی کھٹکتی ہے۔ اس کی طباعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تصویروں کی بھی کمی ہے۔ میں برابر پیام تعلیم کے خریداروں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اپنے قلمی دوستوں سے بھی اس کا چرچا کرتا رہتا ہوں۔

فیروز بخت احمد، دلّی

پیام تعلیم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے خاص کر اس کا ٹائٹل بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ پیام تعلیم کی ترقی کے لیے میری نیک دعائیں ہیں۔

محمد فاضل کھتری بمبئی

- ★ محنت فرض ہے کامیابی کی ضمانت نہیں۔۔
- ★ دکھی انسان دراصل مایوس ہوتا ہے۔

اِدھر اُدھر سے

جمّی کی موت کا ماتم

پچھلے مہینے لاہور کے چڑیا گھر میں ایک بڑا حادثہ ہو گیا۔ ایک بن مانس "جمی" اس دُنیا سے گزر گیا۔ یہ بیس سال سے چڑیا گھر کا باسی تھا۔ اور بچّوں کا دل بہلاتا تھا۔ بچّے بھی اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی موت کی خبر ملتے ہی لاہور کے ہزاروں ہزار بچّے چڑیا گھر پہنچ گئے۔

اب سنو اس کی موت کیسے ہوئی۔ جمی کی ایک مادہ بھی تھی اور دونوں ہنسی خوشی بہت محبت اور پیار سے اپنے پنجرے میں یا کمرے میں رہتے تھے۔ اور یہ دونوں کنیا (افریقہ) کے جنگلوں سے آئے تھے۔ مگر بے چاروں کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنی ہی نسل کی بچّی کو گود لے لیا۔ چڑیا گھر والوں نے اس کا نام گلوری رکھا تھا۔ دونوں میاں بیوی سگی اولاد کی طرح اس سے محبت کرتے تھے۔

چڑیا گھر میں ایک اور بن مانس تھا۔ اس کا نام بشیر تھا۔ یہ بھی گلوری کو بہت چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں جمّی اور اس کی مادہ کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ دونوں بشیر سے خار کھانے لگے۔ موقع کی تلاش میں رہے۔

آخر ایک بار جمی کو موقع مل گیا۔ وہ پنجرے سے نکل آیا۔ سیدھا بشیر کے پاس پہنچا اور اسے لہولہان کر دیا۔ چڑیا گھر والوں نے بشیر کو اس سے چھڑایا تو جمّی بھاگ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ درخت پر شہد کی مکھیوں کا چھتا تھا۔ مکھیوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ جمّی اپنی جان بچانے کے لیے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگاتا رہا۔ کئی بار گرا۔ چوٹیں آئیں۔ آخر ایک غسل خانے میں جا گھسا۔

چڑیا گھر والے اسے پکڑ کر اس کے پنجرے میں لے گئے۔ مگر رات کے وقت وہ اپنی بیوی (ننھی) کو سوگوار اور لاہور کے ہزاروں بچّوں کو اداس چھوڑ کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

جمّی کی بیوی بڑی چونچال تھی۔ کھلنڈری تھی۔ پر آج تو وہ نڈھال۔ گم سم۔ ماتم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ جمی کی تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ اس تصویر کو بار بار سینے سے لگا لیتی تھی۔ جمی بچّوں پر بہت ہی مہربان تھا۔ ایک بار کسی بچّی نے گنّے کا ایک ٹکڑا پیش کیا۔ جمّی نے بڑی نفاست سے گنّا چھیلا۔ گنڈیریاں کیں اور ہتھیلی پر رکھ کر بڑی محبت سے بچّی کے سامنے پیش کیں۔ غرض بہت ہی شائستہ اور خوش اخلاق بن مانس تھا۔ خدا جمی کی بیوی کو صبر اور بچّوں کو اور چڑیا گھر والوں کو نعم البدل عطا فرمائے۔

(سب ساتھ شفقت والی)

Regd No. D. 1457. OCTOBER 1973

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025


پیام تعلیم

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی

جلد ۱۰ شمارہ ۱۱

اڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

نومبر ۱۹۷۳ء

قیمت :- ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ :- چھ روپے

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دِلّی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵ سے شایع کیا

فہرست مضامین

بچوّں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
اُن حضرت	الیاس احمد مجیبی (اُردو)	-/۶۵
پاک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۲۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۲/۱۵
رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسول	" " "	۱/۶۵
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اُردو -/۷۵ ہندی -/۴۰	
سرکارِ دوعالم		۲/۷۵

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۷۵
الو کھا عجائب خانہ	محمد حسین حسّان (چار حصے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
پڑدادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/۵۶
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل)	نجمہ سلطان	-/۸۰
" " " (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/-
" " " (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
" " " (چہارم)	" " "	-/۹۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	-/۸۵
دُنیا کے بچے	محمد حسین حسان	۱/-
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۸۰
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی (اوّل)	احمد شبلی و غلام ابرار	-/۵۶
" " (دوم)	" " "	-/۸۱
" " (سوم)	" " "	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
" " نیچے	" "	۲/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	-/۶۳
میر انیس	محمد حسین حسّان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے۔ ناول

بن حسن عبدالرحمٰن (ناول) (دو حصے)		۴/-
اس نے کیا کرتہ جاتا (کہانیاں)	آصفہ مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	-/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسّان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (")	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (")	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	-/۴۰
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
چنبیلی	محمد حسین حسان	-/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوسے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے (")	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۳۵
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/۹۵
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	-/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دِلّی ۲۵

بچّوں سے باتیں

پیامیوں کو عید مبارک! یہ پرچہ آپ کو عید سے پہلے یا ٹھیک عید کے دن مل جائے۔ (خدا کی ذات اور چھاپے خانے والوں کی نوازش سے امید تو یہی ہے۔

یہ عید عام طور پر چھوٹی عید کہلاتی ہے۔ مگر یہ عید رمضان شریف کے بعد آتی ہے اس لیے کیا بچّے کیا بڑے سبھی کو ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ لفظوں میں اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ رمضان کی ۲۹۔ کو مغرب سے پہلے ہی بچّوں اور بڑوں کی سب کی نظریں آسمان میں ہلالِ عید کو ڈھونڈتی ہیں۔ ادھر ریڈیو کی خبر دل پر کان لگے رہتے ہیں۔ غرض خوب چہل پہل رہتی ہے اور اگر چاند ہو جائے تو کیا کہنا! اس وقت ایک بات نہ بھولنا۔ عرب کے مسلمانوں نے یہودیوں سے اپنے چھنے ہوئے علاقے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ ان کی کامیابی کی دعا ضرور مانگنا۔

ہم محترم شفیع الدین نیّر کے بہت احسان مند ہیں۔ انھوں نے ہماری درخواست پر ایک اچھی سی نظم فرشتہ صفت بچّی ایک نظم راغب نعیم صاحب کی ہے یہ بھی بہت خوب چیز وقت کا تحفہ ہے مزہ دے جائے گی۔

پچھلے پرچے میں ہم نے لکھا تھا کہ اس مہینے ہمارے بہت ہی محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب اپنے عہدے سے سبک دوش ہو جائیں گے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی جگہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پیامِ تعلیم کے لیے نئے نہیں ہیں " ایڈیٹر کے ٹیڑھی" نام سے (۴۷ سے پہلے) ان کے کئی مضمون شایع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جامعہ کے لیے بھی نئے نہیں ہیں نہ جامعہ ان کے لیے نئی ہے۔ مرحوم و مغفور قبلہ ذاکر صاحب کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ ابتدائی تعلیم یہیں جامعہ میں پائی۔ دہلی یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ علی گڑھ سے اُردو میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، پھر پیرس سے لسانیات (زبانوں کے علم) میں ڈی لٹ کیا وہاں سے واپس آکر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اُردو شعبے سے تعلق ہو گیا۔ علی گڑھ سے اُردو کے پروفیسر اور اُردو ڈپارٹمنٹ کے صدر کی حیثیت سے عثمانیہ یونی ورسٹی تشریف لے گئے اور جب علی گڑھ میں لسانیات کا شعبہ قایم ہوا تو اس شعبے کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے علی گڑھ واپس آ گئے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں ایسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز امریکہ کے سینیر ریسرچ فیلو اور کیلی فورنیا یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں۔ آج کل ساہتیہ اکادمی (دہلی) کے ممبر اور جامعہ اُردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ ہیں۔ علی گڑھ سے ایک اعلیٰ تحقیقی رسالہ "فکر و نظر" نکلتا ہے ڈاکٹر صاحب آج کل اس کے ایڈیٹر ہیں انجمن ترقی اُردو سے خاص تعلق ہے۔

ہم ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ انھیں اس قومی ادارے سے بہت قریبی بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ جامعہ ایک قومی میراث ہے۔ ان کے بزرگوں کی یادگار ہے۔ قبلہ ذاکر صاحب نے اور ان کے بعد قبلہ مجیب صاحب نے خونِ دل سے اس پودے کی آبیاری کی ہے۔ ہمیں یقین ہے ان کے انتظام ان کی رہنمائی میں اس کا ہر قدم آگے کی طرف ہوگا۔ جامعہ خوب پھولے پھلے گی ایک تناور درخت بن جائے گی۔ ہمیں اُن کے آنے کی اتنی ہی خوشی ہے جیسے کسی قریبی عزیز کے بہت دنوں کے بعد اپنے گھر آنے کی۔

ایک عرصے سے پیام تعلیم کی چاروں طرف سے تعریف ہو رہی ہے۔ اس کے مضمون کہانیاں، نظمیں وغیرہ سبھی چیزیں پسند کی جا رہی ہیں۔ بس دو باتوں کی طرف سبھی توجہ دلا رہے ہیں۔ ایک تو اس کی چھپائی کی طرف۔ دوسری اس کی ضخامت کی طرف اور دونوں باتیں توجہ کے قابل ہیں۔

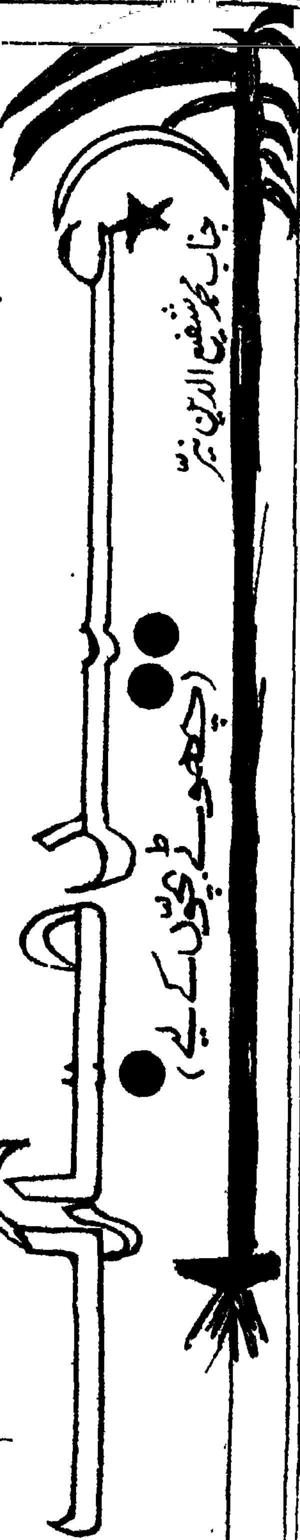
جہاں تک چھپائی کا سوال ہے۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ جس پریس میں یہ چھپتا ہے۔ اس کا نام جمال پریس ہے۔ دہلی کا بہترین لیتھو پریس ہے۔ اس لیے کام کی کثرت ہے اس کے مہتمم یا منیجر ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ رسالہ بہتر سے بہتر چھپے تاکہ ان کی ساکھ بھی قائم رہے اور ہمارے پیاموں کی آنکھوں میں بھی اسے دیکھ کر کھٹک نہ پیدا ہو۔ مگر کبھی کبھی کام کی کثرت کے سبب ادھر پوری توجہ نہیں کر پاتے۔

رہی ضخامت کی یا صفحوں کے کم ہونے کی بات تو بھی آپ جانتے ہیں بہت دنوں سے کھانے پینے کی چیزوں کی طرح کاغذ بھی قحط کا شکار ہو گیا ہے۔ کاغذ کی قیمت آسمان پر پہنچ گئی ہے۔ دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے آج کچھ تو کل کچھ ہے۔ اچھے اچھے اخباروں اور رسالوں کے ہوش اُڑے جا رہے ہیں۔ بہت سے اخبار اپنے صفحے کم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بھلا ہماری کیا حقیقت ہے۔

صفحوں کی کمی کو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں لیکن اس مہنگائی میں اتنی ضخامت ہی میں پرچہ نکالنا مشکل ہو رہا ہے بہت سے رسالوں نے اس مہنگائی کی وجہ سے قیمتیں بھی بڑھا دی ہیں۔ مگر ہمارا ایسا ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ رسالے کے خریدار قابل لحاظ تک بڑھ جائیں اور مہنگائی میں بھی کچھ ٹھہراؤ پیدا ہو تو کم سے کم آٹھ صفحے تو بڑھا دیں۔

اور یہ خریدار بڑھانے کی بات تو آپ ہی کے ہاتھ میں ہے ہم کتنے دنوں سے آپ سے درخواستیں کر رہے ہیں۔ مگر سوائے چند مخلص اور ہمدرد بزرگوں کے کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔ خریدار زیادہ ہونے پر ہمارے لیے اور بھی راستے کھل جائیں سب سے بڑی بات تو یہ کہ قیمتی اشتہار ہمیں آسانی سے ملنے لگیں۔ اُردو کی ترقی کے لیے ہم سب کو بڑی لگن ہے۔ ہمارے بزرگ اس کے لیے تقریریں بھی کرتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے عالمانہ مضمون بھی لکھتے ہیں۔ اکثر اپنی سرکار کو بھی اس کی بے توجہی پر للکارتے ہیں۔ مگر جب تک ہم خود اس کے لیے ایثار نہیں کریں گے قربانی نہیں کریں گے۔ اُردو کے رسالے نہیں خریدیں گے کتابیں نہیں خریدیں گے۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ نہیں چڑھے گی

★★



جناب محمد شفیع الدین نیر
(چھوٹے بچوں کے لیے)

لو پھر ہماری عید آگئی ہے ہر ایک خوش ہے گھر گھر خوشی ہے
کیسی کلی ہر دل کی کھلی ہے باغ جہاں میں شادی رچی ہے
عید آگئی ہے عید آگئی ہے

بچے اٹھیں گے تڑکے سویرے جھٹ پٹ نہا کر پہنیں گے کپڑے
کپڑے بھی اپنے اچھے سے اچھے موزے ٹسر کے باٹا کے جوتے
عید آگئی ہے، عید آگئی ہے

پھر چھوٹے بچے اپنے بڑوں سے مانگیں گے اپنی عیدی کے پیسے
امی بھی دیں گی ابا بھی دیں گے خوش ہوں گے بچے پیسے یہ پا کے
عید آگئی ہے عید آگئی ہے

پھر عید گہ کو جائیں گے گھر سے سب ساتھ ہو کر تکبیر[1] پڑھتے
واجب دوگانہ مل کے پڑھیں گے خطبہ سنیں گے خاموش بیٹھے
عید آگئی ہے، عید آگئی ہے

پھر سب گلے سے باہم ملیں گے الفت کے غنچے دل میں کھلیں گے
میلے میں جا کر آئیں گے واپس لے کر مٹھائی لے کر کھلونے
عید آگئی ہے عید آگئی ہے

گھر اپنے آکر پھر ساتھ سب کے دودھ اور سوئیاں کھائیں گے ڈٹ کے
کھا پی کے بچے کھیلیں گے مل کے ۔ گزرے گا یہ دن لطف و خوشی سے
عید آگئی ہے، عید آگئی ہے

نیر مبارک یہ عید سب کو ہو اس خوشی کی پھر دید سب کو
پھر عید آئے خوشیاں دکھائے گائیں یہ نغمہ بچے خوشی سے
عید آگئی ہے، عید آگئی ہے
عید آگئی ہے، عید آگئی ہے

---

[1] اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے ہوئے۔

ڈاکٹر شریمتی سوتیا جاجودیا
ترجمہ
جناب روشن علی قاضی کھیمٹری

ہندسوں کی ہڑتال

منّی کو حساب سے ہمیشہ سے نفرت تھی جمع تفریق، ضرب تقسیم! یا خدا! کس قدر جھنجٹ ہے اس میں روز روز پہاڑے یاد کرو۔ سوال حل کرو۔ کہیں غلطی ہو جائے تو گھر میں ابا کی امی کی اور مدرسہ میں استانی کی باتیں سنو۔

اور کبھی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے میں، رنگ برنگی تصویریں دیکھنے میں کتنا لطف آتا ہے نظمیں پڑھتے وقت کتنی خوشی ہوتی ہے۔ کھیلنے میں کتنا مزہ ملتا ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کھیل کبھی ختم ہی نہ ہو۔ مگر ان ہندسوں نے تو سب گڑبڑ کر کے رکھ دیا ہے۔ جب سے مدرسہ میں داخلہ ہوا ہے۔ کمبخت ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰ ہندسوں نے ستانا شروع کر دیا ہے کبھی عددوں کی شکل میں تو کبھی رقم کی صورت میں۔

یہ کم بخت تو کسی صورت میں پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں۔ منّی نے ان ہندسوں کو جی بھر کے برا بھلا کہا۔ یہ ہندسے ہیں اس لیے حساب بھی ہے۔ کمبخت ہندسے دنیا میں نہ ہوتے تو دنیا کا کیا بگڑ جاتا۔

اور جناب منّی کی اس دلی آرزو کا ہندسوں کو پتہ چل چل گیا۔ ہندسوں کو غصہ آیا وہ روٹھ گئے سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم کو بھی ہڑتال کرنی چاہیے۔ تمام ہندسے بہت دور چلے گیے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔

صبح ہوئی۔ رات خواب میں منّی نے ایک خوبصورت شہر دیکھا تھا۔ تمام گھر چاکلیٹ کے بنے ہوئے تھے۔ منّی کا دل وہاں سے واپس آنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر امی نے زبردستی جگا دیا تھا۔ منّی! ارے او منّی اٹھ مدرسہ جانے کو دیر ہو جائے گی! منّی اٹھ بیٹھی۔

وقت دیکھنے کے لیے منّی نے بڑی گھڑی پر نظر ڈالی ارے یہ کیا؟ گھڑی میں صرف کانٹے ہی نظر آ رہے ہیں۔ ہندسوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ منّی نے خوب آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ مگر ہندسے گھڑی سے بھاگ گئے تھے وقت کس طرح معلوم کیا جائے۔ مدرسے دیر سے پہنچی تو استانی بینچ پر کھڑا کر دیں گی۔ منّی جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو دھلا کر تیار ہو گئی۔ نوکر پہلے ہی موٹر لیے کھڑا تھا منّی موٹر میں بیٹھ کر مدرسے پہنچی گھنٹی بج چکی تھی۔ بھاگ کر دوڑتے منّی کلاس میں پہنچی ابھی استانی جی کلاس میں نہیں آئی تھیں۔ سزا سے بچ گئی اس کی منّی کو خوشی ہوئی۔

اردو کا گھنٹہ ہوا۔ نظم کا گھنٹہ ہوا۔ اور اب آیا حساب کا گھنٹہ۔ منّی کا ناپسندیدہ گھنٹہ۔ پیشانی پر بل ڈال کر منّی نے حساب کی کاپی نکالی اور استانی کو پیش کی۔

استانی (چیخ کر) منّی یہ جغرافیہ کی کاپی کیوں دی؟ منّی گھبرا کر سوچنے لگتی ہے تمام کاپیوں پر اسکول کے گھنٹوں کے مطابق ۱-۲-۳-۴ نمبر لکھے تھے۔ آج نمبر کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ بستے میں تلاش کر رہی ہے۔ مگر ۳ نمبر کی کاپی نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔

مُنّی سوچنے لگی نمبر تو میں نے خود لکھے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے گھنٹوں کے مطابق تمام کاپیاں بستہ میں رکھی تھیں پھر نمبر کیوں نظر نہیں آرہے ہیں۔

اُستانی : (غصّہ ہوکر) "بہت کھلکڑ ہے یہ لڑکی۔ خیر آج معاف کرتی ہوں لیکن کل کاپی بھولی تو گھر بھیج کر منگواؤں گی"

کاپی بستے میں رکھنا مُنّی کو یاد تھا۔ سب کاپیاں بستے سے باہر نکالیں۔ حساب کا نام لکھی کاپی مُنّی نے جھٹ اُستانی کو دی۔ استانی نے کاپی کھول کر دیکھا ارے یہ کیا؟ کاپی کوری تھی۔ صرف جمع و تفریق ضرب و تقسیم کی علامتیں تھیں۔ عدد اور رقمیں غائب تھیں۔

ارے بے وقوف لڑکی! کیا یہ حساب کی کاپی ہے؟ اِدھر آ دیکھ ذرا۔ اُستانی اور زیادہ غصّہ ہوئیں مُنّی نے اُستانی کے قریب جاکر دیکھا تو سچ مچ کاپی کوری تھی۔ مُنّی بہت پریشان ہوگئی رونی صورت بنالی۔ یہ ہوا کیا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کلاس کی تمام لڑکیاں مُنّی کی ان حرکتوں اور بوکھلاہٹوں پر زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ مُنّی نے کوری کاپی استانی کو جو دی تو وہ اور غصّہ ہورہی تھیں۔ مُنّی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جوں توں کرکے آگے کے تین گھنٹے پورے ہوگئے۔

چھٹّی ہوئی تو مُنّی کلاس سے باہر آئی۔ اس وقت موٹر ڈرائیور ابّا کو لینے موٹر کو آفس لے جاتا تھا۔ اس لیے مُنّی بس سے گھر واپس جاتی تھی ہمیشہ کی طرح مُنّی بس اسٹاپ پر جاکر کھڑی ہوگئی۔ ایک کے بعد ایک بس آتی اور گذر جاتی۔ مُنّی کو ۲ نمبر کی بس چاہیے تھی۔ مگر بس پر نمبر ہی نظر نہ آرہے تھے۔ بہت دیر ہوگئی آخر اکتا کر جو بس سامنے آئی اسی پر چڑھ گئی۔

بس دوڑنے لگی۔ مُنّی باہر دیکھنے لگی لیکن یہ کیا... یہ راستے، یہ گھر روزانہ کی طرح تو نظر نہیں آرہے تھے۔ سب نئے نئے دکھائی دے رہے تھے "بچی کہاں جانا ہے؟" کنڈیکٹر نے نزدیک آکر پوچھا۔ "ٹھاکر دوار" مُنّی نے جواب دیا

"لیکن یہ بس ٹھاکر دوار نہیں جاتی۔ دادر جارہی ہے۔ تم ایسا کرو اگلے اسٹاپ پر اتر کر ۱ نمبر کی بس سے ٹھاکر دوار چلی جاؤ۔" مُنّی خاموشی سے اگلے اسٹاپ پر اُتر گئی اور ۱ نمبر بس کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر میں بس آئی مگر بس پر نمبر نہیں تھا — مُنّی نے پاس کھڑی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا۔ اس کو بھی نمبر نہیں آیا۔ لیکن اس نے اپنی کمزوری چھپانے کے لیے کہہ دیا ہاں یہی بس ہے۔ مُنّی جلدی جلدی بس میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔

بس دوڑنے لگی۔ کنڈکٹر نے پوچھا کہاں جانا ہے "یہ بس گرگام نہیں کھار کی طرف جانے والی ہے۔"

مُنّی پھر اگلے اسٹاپ پر اُتر گئی۔ گرگام کے بدلے وہ کھار کی طرف بہت دور آچکی تھی۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔

مُنّی کو یاد آیا اسی کھار میں اپنی خالہ بھی تو رہتی ہیں۔ اُن کے پاس جانا چاہیے۔ لیکن خالہ کا گھر کس طرح ڈھونڈا جائے۔ ان کے گھر کا اور راستے کا نمبر تو مُنّی کو معلوم نہیں تھا۔

امّی کے ساتھ مُنّی کئی مرتبہ خالہ کے گھر آئی تھی بس میں سے اُتر کر سامنے تھوڑی دور چل کر ہی خالہ کا گھر آجاتا تھا۔ اس وقت بھی ویسا ہی کرنا چاہیے۔ مُنّی کو بڑے زور کی پیاس اور شدّت کی بھوک لگی تھی — گرمی اور دھوپ سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

منّی بہت دیر تک چلتی رہی مگر خالہ کا گھر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کسی سے پوچھے بھی تو کس طرح گھر کا نمبر تو معلوم ہی نہیں تھا۔ منّی رونے کے قریب آگئی۔

ایک شریف عورت اُسی راستے سے گزر رہی تھی منّی کی رونی صورت دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ لڑکی راستہ بھٹک گئی ہے اور پریشان ہے قریب جا کر محبت سے اُس عورت نے پوچھا: بیٹی کہاں جا رہی ہے؟

منّی: خالہ کے گھر

عورت: کون سے راستے پر رہتی ہیں تمھاری خالہ

منّی: یہی تو معلوم نہیں (رونی آواز میں)

عورت: اُن کے گھر کے قریب کی نشانی یاد ہے۔

منّی کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ ہاں ہاں معلوم ہے خالہ کے گھر کے قریب پوسٹ آفس ہے۔

عورت: میں پوسٹ آفس کے پاس چھوڑ دوں تو تم کو گھر مل جائے گا؟

منّی: ہاں۔ ہاں یقیناً مل جائے گا۔

عورت: چلو میں چھوڑ دیتی ہوں تم کو پوسٹ آفس تک۔

منّی اس عورت کے ساتھ پوسٹ آفس تک آئی (خوشی سے) وہ کیا ہے نیلے رنگ کا خالہ کا گھر۔

منّی نے اس عورت کا شکریہ بھی ادا کیا اور خالہ کے گھر کی طرف دوڑنے لگی اور کھلے ہوئے دروازے سے ایک دم اندر جا کر بستہ ایک طرف پھینک صوفہ پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

"ارے منّی یہ کیا۔ اس طرح بھاگتی ہوئی کیوں آئی کیا شیر پیچھے لگا ہے؟"

"اکیلی اتنی دور کیسے آئی اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

خالہ نے منّی کو دیکھتے ہی سوالات کی بوچھار کر دی۔

منّی: (منہ بسور کر) خالہ جان میں آج راہ بھٹک گئی ہوں۔ غلطی سے غلط بس میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کو چھوڑا دوسری بس میں بیٹھی وہ بھی غلط نکلی۔ اس طرح بھٹکتے بھٹکتے یہاں تک پہنچ گئی۔

خالہ: تو کیسی بے وقوف لڑکی ہے نمبر دیکھ کر بیٹھنا چاہیے نا بس میں!

منّی: ابھی خالہ اماں مجھے نمبر ہی نظر نہ آیا۔

خالہ: اندھی کہیں کی نمبر غور سے دیکھا ہی نہ ہوگا۔ اچھا اب ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا، بھوک لگی ہوگی۔ خالہ نے محبت سے پوچھا۔

منّی اندر جانے لگی تو خالہ نے کہا:۔ دیکھ تیرے ماں باپ گھر پر پریشان ہوں گے۔ وہاں ٹیلی فون کر دے۔ منّی کو فون کے نمبر یاد نہیں آ رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اگر خالہ سے کہا جائے کہ نمبر یاد نہیں آ رہے ہیں تو دو چار باتیں اور سنا دیں گی۔ منّی نے بات بنائی۔ خالہ بڑے زور کی بھوک لگی ہے پہلے کھانے کو دو۔ فون بعد میں کر لیں گے۔

خالہ:۔ اچھا۔ اچھا کھانا کھالے۔

کھانے کے بعد منّی نے خالہ سے کہا۔ میں ابھی گھر جانا چاہتی ہوں۔ فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں گھر تو جا رہی ہوں۔

خالہ: جیسے تمھاری مرضی۔ لیکن ذرا سنبھال کر جانا ۲۷ نمبر کی بس تجھے گھر گام پہنچا دے گی۔

منّی: بس اسٹاپ پر آئی۔ تھوڑی دیر بعد بس آئی اس وقت منّی نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ بس میں بیٹھنے سے پہلے کنڈکٹر سے پوچھا یہ بس کہاں جائے گی۔

کنڈیکٹر: گڑگاؤں تک۔ تب منّی بس میں بیٹھی۔ ٹکٹ، ٹکٹ" کنڈیکٹر ٹکٹ دینے کے لیے آیا۔
"ٹھاکر دوارے کے کتنے پیسے ہیں؟" "۶۵ پیسے" منّی نے بستہ کھول کر چھوٹا سا بٹوا نکالا۔ اس میں پیسے تھے۔ مگر یہ کیا تمام سکّوں پر سے ہندسے غائب۔ اب ۶۵ پیسے کس طرح گن کر دیے جائیں۔ منّی پریشان ہو گئی۔ کنڈیکٹر کو کس طرح بتایا جائے۔ سب لوگ ہنسیں گے۔ مذاق اڑائیں گے، پاگل کہیں گے۔ منّی نے اندازے سے پیسے نکالے اور کنڈیکٹر کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ کنڈیکٹر نے گنے تو وہ پیسے کم تھے۔ اس نے ۵ پیسے اور مانگے منّی نے ایک اور دیا تو وہ تین پیسے والا تھا۔ ایک ہی لڑکی کے پاس اتنا وقت لگا اس لیے کنڈیکٹر کو غصّہ آنے لگا۔ آنکھیں نکال کر منّی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی غصّیلی آنکھیں دیکھ کر منّی ڈر گئی اس نے جھٹ ایک اور سکّہ نکال کر کنڈیکٹر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب پیسے پورے ہو گئے تھے کنڈیکٹر نے ٹکٹ دیا اور آگے بڑھ گیا۔
"ٹھاکر دوارہ، ٹھاکر دوارہ" کنڈیکٹر نے ہانک لگائی۔ بس رُکی منّی بستہ سنبھالتی ہوئی نیچے اُتری جب گھر آئی تو دیکھا امّی دروازے میں کھڑی ہیں اور پریشان و بیقرار نظر آ رہی ہیں۔ منّی کو دیکھتے ہی دوڑ کر سینے سے لگا لیا، پیار کیا اور کہا "اتنی دیر کیوں ہو گئی ہماری تو پریشانی سے جان پر بنی ہے۔ تمھارے ابّا پولیس اسٹیشن گئے ہیں تمھارے گم ہونے کی رپورٹ لکھوانے"
منّی: "غلطی سے میں دوسری بس میں بیٹھ گئی تھی۔ سیدھی خالہ کے گھر سے ہو کر آ رہی ہوں"

ماں: (تعجّب سے) خالہ کے گھر! اتنی دور۔ اگر کوئی پکڑ کر لے جاتا تو؟ کیا اندھی تھی بے وقوف اچھی طرح نمبر دیکھ کر بس میں بیٹھنا تھا۔" بہن کی یہ حالت دیکھ کر منّے میاں خوب زور زور سے ہنس رہے تھے "مجھ سے لڑتی ہے نا۔ آج کیسی سزا ملی اچھا ہوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے"
"آج تو سبھی نے مجھے بدّھو، پاگل، اندھی اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ مدرسہ میں اُستانی غصّہ ہوئیں۔ خالہ نے سخت سُست کہا۔ کنڈیکٹر نے آنکھیں دکھائیں۔ گھر میں امّاں غصّہ ہوئیں اور بھائی چڑانے لگا۔ منّی کو رونا آنے لگا۔ منّی کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی——
اچانک اسے دھکا لگا اور منّی دیکھنے لگی تو سامنے ایک بڑی گیند تھی۔ مگر یہ گیند ہے کیسی۔ صرف گول دکھائی دیتی ہے اندر سے خالی ہے۔
کہیں اسے دیکھا ہے کہاں دیکھا؟ منّی سوچ میں پڑ گئی۔
"نہیں پہچانا، نہیں پہچانا، نہیں پہچانا، وہ گیند بولنے لگی منّی آنکھیں پھاڑے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔
پاگل کہیں کی میں کون ہوں تیرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے۔ پہلی جماعت میں جان پہچان ہوئی تھی۔ گیند گول گول گھومنے لگی اور منّی کو چڑھانے لگی۔ تھوڑی دیر میں اور زیادہ گڑبڑ اور شور سنائی دینے لگا۔ منّی نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ گیند کے اور بھی ساتھی جمع ہو گئے ہیں اور سب مل کر اُس کے آس پاس ناچ رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور اُسے بدّھو، پاگل اور بیوقوف کہہ کہہ کر چڑھا رہے ہیں۔
منّی نے غصّہ ہو کر پوچھا۔ "کون ہو تم"

منی کو غصّے میں دیکھ کر وہ اور بھی زور زور سے ہنسنے اور ناچنے لگے "ارے بدھو ہم کون ہیں؟ ابھی تک تیرے دماغ میں نہیں آیا۔ اچھی طرح دیکھ۔ ہم ہیں اس گیند کے دوست ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹- اور گیند صفر پہچانا تو نے؟"

منی نے غور سے دیکھا ارے یہ تو سچ مچ ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹ ہیں سب پہچان میں آ گئے۔ سچ سے ان ہی کی تو پہچان بھول گئی تھی۔

منی نے گال پھلا کر کہا "ہاں پہچان لیا۔ مگر تم صبح سے کہاں بھاگ گئے تھے؟"

"ہم بہت دور بھاگ گئے تھے۔ تجھ کو ہم سے نفرت ہے نا۔ اس لیے ہم بھی تجھ سے ناراض ہو کر دور چلے گئے تھے ہم نے ہڑتال کی تھی۔"

"نفرت نہ ہو گی تو کیا ہو گا۔ تمھاری وجہ سے مجھے کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ کتنا دکھ سہنا پڑا۔ کتنی پریشانی جھیلنی پڑی۔"

نہیں! ہماری وجہ سے کبھی پریشانی نہیں ہو گی۔ بلکہ مدد ملے گی۔ دیکھا نہیں ہم نہیں تھے تو دن بھر تجھے کتنی مصیبت اٹھانی پڑی۔"

"ہاں یہ تو سمجھ میں آ گیا۔ یہ بات تم نے ٹھیک ہی کہی" منی نے سچے دل سے اقرار کیا۔

"پھر ہم سے نفرت کیوں، ہم تو تیرے دوست ہیں۔ ہماری وجہ سے کتنے ہی بھید کھل جاتے ہیں نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ زمین سے چاند کا فاصلہ کتنے کلومیٹر ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں کتنے دن لگ سکتے ہیں۔ یہ سب ہماری بدولت ممکن ہوگا۔ ہر جگہ، ہر کام میں ہماری ضرورت پڑتی ہے۔ سمجھدار لوگ کبھی ہم سے ناراض نہیں ہوتے۔ ہم پر غصّہ نہیں کرتے۔ تیرے جیسے ہی کام چور، سست بچے ہم سے ناراض رہتے ہیں۔"

"لیکن ....."

"لیکن کیا! تو کیا کہنا چاہتی ہے ہم کو معلوم ہے۔ یہی نا کہ ہمارا کام خشک ہے۔ ہم میں دلچسپی نہیں۔ دل لگی نہیں کسی کا دل بہلا نہیں سکتے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ دیکھ وہ ہندسے آگے پیچھے آنے جانے لگے۔ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کر کے کتنا مزہ دینے لگے" منی ہنسنے لگی۔

"ارے یہ نیند میں کیوں ہنس رہی ہے معلوم ہوتا ہے کوئی دلچسپ خواب دیکھ رہی ہے۔"

ماں نے منی کو جگایا۔ منی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہ سب کہاں چلے گئے ماں نے تعجب سے پوچھا کون؟

منی: وہ ۱-۲-۳...... وہ سب کیسے کہیں جائیں گے وہ تو ہمیشہ اپنے دماغ میں رہتے ہیں۔ دیکھ تیرے ذہن میں ہے کہ نہیں ماں نے ہنس کر پوچھا۔

منی دہرانے لگی ۱-۲-۳......

اور کیسے تعجب کی بات ہے کہ سب نمبر اس کو یاد ہیں۔ ہندسے آگے پیچھے کر کے حساب حل کرنے لگی۔ اس کے بعد منی نے ہندسوں سے بیزاری ظاہر نہ کی۔ دل پر غصّہ آیا۔ سب منی کو ذہین ہوشیار اور ہونہار کہنے لگے۔

(مراٹھی سے)

★

عید کے دن ایک یتیم بچّے سے....

راغب نعیم رہزاری باغ

عید کا دن ہے خوشی آج مناؤ گڈّو

میں نے مانا کہ تمھارے نہیں امی ابا
میں نے مانا کہ زمانے میں ہو تنہا تنہا
میں تمھارا ہوں گلے ہم کو لگاؤ گڈّو
عید کا دن ہے خوشی آج مناؤ گڈّو!!

زندگی یوں تو مسرت بھی ہے آلام بھی ہے
زندگی درد کو سہنے کا مگر نام بھی ہے
مسکراتے ہوئے غم فخر سے کھاؤ گڈّو
عید کا دن ہے خوشی آج مناؤ گڈّو!!

ہیں تمھاری ہی طرح اور بھی کتنے بچّے
تم سے پہلے بھی زمانے میں یتیم اور بھی تھے
غمِ حالات پہ روکر نہ رلاؤ گڈّو
عید کا دن ہے خوشی آج مناؤ گڈّو!!

سخت حالات میں رونے سے بھی کیا ہوتا ہے
جس کا کوئی نہ ہو بس اس کا خدا ہوتا ہے
ضبط کی ایک نئی شمع جلاؤ گڈّو
عید کا دن ہے خوشی آج مناؤ گڈّو!!

محترمہ آصفہ مجیب

چند دن کشمیر میں

(۲)

صبح کو مظفر صاحب بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے آکر پوچھ جاتے ہیں ”کوئی تکلیف تو نہیں؟“ مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے پورا سٹاف بہت مستوا ضع ہے۔ ملازم بہت مستعد اور مہربان — خاص کر بوڑھے غنی، سفید اُجلی وردی پہنے سر پر پگڑی باندھے ہر کام خوش دلی سے کرتے ہیں۔ ہر بات کا اتنا خیال ہے۔ جیسے کوئی اپنا پرانا ملازم ہو۔ کھانا بڑے اصرار سے پلیٹ میں نکالنے لگتے ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ ”ہاں ہاں جناب اور کھائیے۔ ابھی کیا کھایا ہے اور دے گا۔ چاول بھی دے گا۔“ صاحب کو ان کی بات ٹالنا مشکل ہو گئی ان کی صورت دیکھتے ہی جس پر مہربانی برستی ہے۔ مجبور ہو کر کہتے ہیں۔ ”اچھا بھائی دے دیجیے آپ کی خوشی“ کبھی چمکار کر کہتے ہیں ”بس بس اب میں نہیں کھا سکتا“ گیارہ بجے میرے لیے لیمو کا پانی اور صاحب کے لیے چائے کمرے میں لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔“

کاٹیج میں مہمان ٹھیرے ہیں۔ حیدر آباد کا ایک شاہی خاندان ہم سے پہلے سے ٹھیرا ہے۔ رات کو کھانے پر ملاقات ہوئی نظام حیدر آباد کی بیگم ان کی بیٹی داماد (جو نظام کے بھتیجے ہیں) نواسی نظام کی ایک بیٹی جو شہزادی کہلاتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور بیٹی اور نواسی نے حیدر آباد کے طریقے سے سلام کیا۔

بیگم صاحبہ بہت اخلاق سے ملیں، صاحب کی صحت کے لیے دعائیہ الفاظ کہے۔ سنا ہے ان کے ساتھ چودہ آدمی ہیں دو چھوٹے بچے، ان کی آیا، گورنس، خانساماں، ایک ملازمہ لڑکی اور ملازم۔ شائد دو تین کمرے ہیں ان کے پاس۔

دوسرے دن حبہ خاتون کا مزار (جو یہاں سے پانچ میل ہے) دیکھنے گئے۔ وہ کشمیر کی ایک صوفی شاعرہ تھیں ان کے مزار سے کچھ نیچے مشہور شاعر مہجور کا مزار ہے۔ کول صاحب نے اپنے ایک باغ کی سیر کرائی۔ انھوں نے بہت باغات لگائے ہیں ”پہاڑ اور دامن کوہ“ پہاڑ کے دامن کو پھولوں سے سجا دیا ہے۔ وہ کشمیر میں باغات لگوانے کا کام کر رہے ہیں۔

پری محل۔ صدیق ڈرائیور صاحب دس بجے سرکاری موٹر (جو صاحب کی سواری کے لیے مخصوص ہے) لے کر آئے۔ آج ہم لوگ پری محل دیکھنے گئے۔ ڈل کے راستے سے پہلے ایک باغ میں آئے طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ کچھ بلندی پر پری محل ہے۔ یہ عمارت شاہجہان کے بیٹے دارا شکوہ نے بنوائی تھی۔ تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کھولا تھا۔ عمارت مغل طرز کی ہے۔ سامنے پھاٹک ہے دونوں طرف بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مدرسے کے آثار ہیں جنھیں درست کرایا گیا ہے۔ اصل عمارت ٹوٹی پھوٹی ہے مگر

ٹوٹے در و دیوار سے بھی گزشتہ شان و شوکت ٹپکتی ہے۔ مغلیہ دور کی ایک یادگار ہے۔

شالی مار باغ۔ عجیب ہی سماں ہے باغ کی کاریگری میں قدرتی حسن سمویا ہوا ہے۔ سات منزلیں ہیں اس کے ساتھ لمبے لمبے حوضوں کی قطاریں اور فوارے! اوپر کی منزل تک ہیں جو پہاڑ کے دامن میں ہے۔ ہر منزل پر بیچ میں ایک بارہ دری ہے۔ اور تخت ہے یہ تخت بہت خوبصورت ہیں اور یہاں سے چاروں طرف کا نظارا بہت پیارا ہے۔ فوارے چھوٹتے ہیں تو ان کا ہلکا ہلکا راگ دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔

نشاط باغ اور بھی بلندی پہ ہے۔ وہاں سے ڈل جھیل کا نظارہ شام کو بہت پر کیف ہے۔ سورج کا سنہرا عکس پانی پر پڑتا ہے تو عجیب ہی منظر ہوتا ہے۔

صاحب کے سری نگر آنے کی اطلاع پاکر ٹیلی وژن کے ڈائرکٹر شنکر صاحب اور ریڈیو اسٹیشن سے کچھ لوگ صاحب سے ملنے آئے۔ انس صاحب نے صاحب کی بیماری کے بارے میں ان کو بتایا دو تین دن بعد کشمیر کے گورنر بھگوان سہائے صاحب کا فون آیا کہ وہ دس اور گیارہ کے درمیان آرہے ہیں۔ جیسے ہی وہ تشریف لائے صاحب نے زینوں سے نیچے اتر کر ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے فرمایا "آپ نے کیوں تکلیف کی میں تو اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کو زحمت نہ ہو"

صاحب نے اوپر آتے ہوئے کہا "مجھے بس یہ دشواری ہے کہ بولنے میں غلطی کرتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا "آپ کی غلط بات بھی دوسروں کی صحیح باتوں سے زیادہ صحیح ہوتی ہے۔"

میں اور انس صاحب بھی ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھے کافی دیر تک مختلف عنوانوں پر باتیں کرتے رہے اور ان کے اخلاق اور اپنائیت سے بہت خوشی ہوئی۔

دوپہر کو کھانے پر نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پارتھا سارتھی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ سرکاری کام سے چند روز کے لیے آئے ہیں۔

صبح صبح کشمیر کے وزیر اعلیٰ قاسم صاحب ازراہِ عنایت صاحب سے ملنے تشریف لائے۔ ہم لوگ ناشتے کے لیے جس وقت اٹھے، اطلاع ملی کہ وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ فوراً پہنچے تھوڑی دیر بیٹھ کر انھوں نے صاحب سے کہا۔ "اچھا آپ آپ ناشتہ کیجیے دیر ہو رہی ہے" اس کے بعد پارتھا سارتھی صاحب سے ملنے اوپر تشریف لے گئے۔

خوبصورت چڑیاں، بلبلیں، مینائیں چہچہاتی کتنی اچھی لگتی ہیں۔ کمرے میں کھڑکی کے پاس لکھنے کی میز ہے وہاں صاحب انس صاحب کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام صبح شام تھوڑی دیر کرتے ہیں نیچے لان ہے کھانے کے بچے کھچے ٹکڑے میں نے نیچے ڈالے ایک ایک کرکے کئی مینائیں اور چڑیاں آکر کھانے لگیں۔ بلبل بھی ہے وہ جھٹ سے آجاتی ہے اس کا گھر پاس ہی دیوار پر جو بیل چڑھی ہے اس میں بنا ہے۔

چڑیاں گردن موڑ موڑ کر اوپر دیکھتی بھی جاتی ہیں۔ کچھ پھدک کر دور ہٹ جاتی ہیں پھر آجاتی ہیں۔ مینائیں منہ میں نوالے بھر بھر کر بچوں کو جاکر کھلا آتی ہیں تھوڑے دنوں میں وقت پہچان گئیں اور ناشتے اور کھانے سے ذرا پہلے انتظار میں آکر ٹہلنے لگیں۔

ایک دن کھانے کے کمرے سے آتے ہوئے انس صاحب

اِدھر چڑیوں کو دیکھ کر کہا "وہ دیکھئے روٹی کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کھڑکی کے نیچے روٹی ڈالی پھر اور مانوس ہوئیں۔ اب کسی کسی وقت کھڑکیوں پر آ کر بیٹھتیں اور اپنا سریلا نغمہ چھیڑ دیتیں۔

انھیں دیکھ کر مجھے اپنے باغ کی چڑیوں کی یاد آتی ہے۔ بلبلیں۔ مینائیں کئی طرح کی ہیں۔ کوئل، پپیہا، ہدہد بہت پیاری پیاری چڑیاں ہیں۔ سب کے گھر نے ہیں۔ اور میٹھے سریلے راگ الاپتی رہتی ہیں۔ پاس جاؤ تو بھاگتی نہیں معلوم ہوتا ہے پلی ہوئی ہیں۔

یکم جون۔ صبح کو ہم لوگ ہاروَن گئے۔ یہاں ایک چشمہ پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ میلوں تک پتھروں سے ٹکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔ صاف شفاف برف سا پانی ہے۔ اس کی نغمہ ریز آواز رُوح میں تازگی پیدا کرتی ہے۔ دھانوں کے بہت سے کھیت لہلہا رہے ہیں ان کا رنگ آنکھوں میں کھبتا ہے۔ سینچائی ہو رہی ہے۔ ہر طرف مرد، عورتیں کام میں لگی ہیں۔

ایک جھیل بہت اونچائی پر ہے اور راستہ بھی ٹھیک نہیں انس صاحب سے ہم نے کہا آپ دیکھ آئیے۔ وہ اُوپر جا کر دیکھ آئے وہاں پر ایک طرف پر فضا باغ ہے اس کی سیر کر کے ہم لوگ ایک بجے کے قریب لوٹے۔

اسی وقت سعید انصاری صاحب دو ٹیچروں کے ساتھ صاحب سے ملنے آئے۔ سعید انصاری صاحب حال ہی میں سوپور میں ایک پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل مقرر ہوئے ہیں برآمدے میں کرسیوں پر ہم سب بیٹھ گئے۔

شام کو صاحب کی طبیعت بہت بجھی بجھی معلوم ہوئی کبھی کبھی ان پر مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں " یہ زندگی کیا جس میں آرام ہی آرام ہو کام نہ ہو۔ اس سے کیا فائدہ "، ٹھیک بھی ہے، جس انسان نے بغیر کام کے کبھی چین نہ لیا ہو اس کے لیے یہ بیماری اور بیکاری بار نہ ہو تو کیا ہو۔ اس کے دکھ کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ میں اور انس صاحب ہر طرح سمجھاتے اور تسلی کی باتیں کرتے۔

نگین لیک: ان کا دل بہلانے کے خیال سے نگین لیک (جھیل) گئے اور شکارے پر بیٹھے۔ پانی کی لہروں پر اس کی نرم نرم روانی، سورج کا عکس پانی پر پڑتا تو ایسا لگتا کہ سونا پگھلا ہوا ہے۔ کتنا دلکش لگتا ہے۔ جابجا کنول کے پتوں پر پانی کے قطرے ایسے جیسے ہیرے چمکتے ہوں۔ منہ بند کلیاں جو ابھی کھلی نہیں ہیں اور پر سر اٹھائے ہوئے گویا قدرت کا نظارہ کر رہی ہیں۔ سب کچھ ہے مگر صاحب کا دل شگفتہ نہیں ہوا اور ان کی کیفیت دیکھ اپنا دل بھی پژمردہ ہو گیا۔ مرجھا گیا۔

چشمہ شاہی ۲۔ جون۔ صبح دس بجے کے بعد چشمہ شاہی گئے وہاں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا ذرا دیر وہاں ٹھہر کر واپس آئے۔

شام کو صاحب انس صاحب کے ساتھ اپنے لیے ایک کتاب لینے بازار گئے۔ اتنے میں ملازم نے آ کر شیخ عبداللہ صاحب کے آنے کی اطلاع۔ وہ پیارتھا سارتھی صاحب کے ساتھ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ صاحب کا حال پوچھا اور کہا "کل تو میں بہت مصروف ہوں پرسوں صبح کو ملنے آؤں گا"۔ میں نے تھوڑی دیر لکھنے کا کام کیا۔ اس کے بعد بند ھ پر ٹہلنے گئی۔

ایک خوبصورت چھوٹے سے بچے نے دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ساتھ چلنے لگا۔ جیسے میرے خاندان

کے بچے" بچیاں باغ میں ٹہلتی ہوں تو آکر ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ مجھے اس وقت بہت اچھا لگا۔

ایک لڑکے نے پیسہ مانگا میں نے اسے منع کیا پیسہ نہیں مانگنا چاہیے"۔ اور میرے پاس پیسہ تو ہے بھی نہیں تین بچیاں ایک طرف تھیں ان کے نام پوچھے ایک نے بتایا "بے بی" ایک نے "گڈی"، چھوٹی نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک آدمی پاس کھڑا تھا مسکرا کر بولا "اس کا نام مقصودہ ہے۔ یہاں بچوں کی صورتیں پیاری پیاری ہیں۔ لیکن افسوس صاف ستھرے نہیں رہتے۔

عورتوں کا ایک خاص لباس ہے جسے "پھرن" کہتے ہیں لمبا کرتا سا خوب ڈھیلا ڈھالا۔ دوپٹہ رومال کی طرح سر پر باندھتی ہیں سر کے پیچھے ایک گرہ لگا لیتی ہیں۔ ایک عورت روز صبح ملتی، ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ لیے، سلام کرتی۔ مغرب کی اذان ہوئی تو میں گسٹ ہاؤس واپس آئی۔

رات کو کھانے پر جب آئے تو ایک صاحب جو پہلے سے بیٹھے تھے ذرا دور تھے۔ اپنی پلیٹ لے کر ہم لوگوں کے قریب آ بیٹھے۔ اپنا تعارف کرایا کر ان کا نام قریشی ہے منسٹری آف ایگریکلچر کے سکریٹری ہیں اور یہاں زراعت کی ترقی کے سلسلے میں کام کرنے آئے ہیں۔ صاحب کا مزاج پوچھا اور بتایا کہ وہ پروفیسر حبیب صاحب کے شاگرد تھے۔

قریشی صاحب کو ٹراوٹ مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے۔ اس کے لیے ایک روز خاص کر ویری ناگ گئے بہت خوش خوش واپس آئے ان کو تھوڑی سی دیر میں بہت مچھلیاں مل گئیں ہم لوگوں کو بھی پکوا کر کھلائیں۔ کہتے ہیں۔ یہ مچھلی بہت مزیدار ہوتی ہے۔ ہم نے بھی کھائی واقعی بہت لذیذ تھی۔

دوسرے دن کول صاحب باغات دکھانے لے گئے۔ انھوں نے بہت محنت اور شوق سے لگائے ہیں۔ قسم قسم کے گلابوں کے تختے کھلے ہیں۔ ڈائیلیا کے کئی رنگ کے زرد، نارنجی اور کئی طرح کے پھول اور درخت ہیں۔

(باقی دلچسپ حالات اگلے پرچے میں پڑھیے)

کتابوں کی باتیں

الف لیلہ کی کہانیاں (بچوں کے لیے)

از جناب اختر انصاری علی گڑھ نمبر ۱-۲-۳-۴ ضخامت ہر ایک کی سولہ صفحے۔ ناشر ادارہ شعر و ادب علی گڑھ۔

ملنے کا پتہ: ۱۵۸۷- نہال بک ڈپو۔ سوئیوالان دہلی۔

الف لیلہ و لیلہ (ایک ہزار ایک کہانیاں) کا شمار دنیا کی مشہور کتابوں میں ہے اصل کتاب عربی میں تھی اور دنیا کی شاید ہی کوئی مستند زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ خود اردو میں اس کے کئی کئی ترجمے موجود ہے۔ الف لیلہ بہت ضخیم کتاب ہے جناب اختر انصاری صاحب نے دلچسپ کہانیاں چنی ہیں جن میں اخلاقی سبق ملتا ہو اور پھر انھیں بچوں کے لیے بہت ہی سادہ اور آسان زبان میں لکھا ہے پہلی کتاب میں سوداگر اور جن کی کہانی ہے کس طرح ان جانے میں سوداگر نے جن کا بچہ مار دیا اور جن سوداگر کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا اور کیسے سوداگر کی جان چھوٹی۔ دوسری کتاب میں شاہ یونان اور حکیم دعیان کی کہانی ہے۔ بیمار بادشاہ حکیم کا علاج سے اچھا ہو گیا مگر اس کے بدلے میں اس نے وزیر کے کہنے میں آکر قتل کر دیا۔ اور پھر؟ تیسری کتاب میں ایک ماہی گیر کی کہانی ہے۔ چوتھی میں تین بہنوں کا عجیب و غریب قصہ ہے۔ قیمت ہر ایک کی چالیس چالیس پیسے ہے۔

جناب شوکت پردیسی

نیا زمانہ

موجِ مسرت جب آئی تو فکر کے لمحے دور ہوئے
شوق کی منزل تک پہنچے تو اور بھی دل مسرور ہوئے
رنگ بدلتی دنیا لے کر آئی ہے سوغات نئی
چاند کی دھرتی پر جا کر اپنا پرچم لہرایا ہے
نیا زمانہ آیا ہے

سورج نکلا، تارے ڈوبے، گزری شب کی تاریکی
پھولوں کے پتوں پر چمکی موتی بن کر شبنم بھی
شوق نے ہر ذرّے سے کی ہے حاصل معلومات نئی
ہر گوشہ سے دُنیا کے لوگوں نے سب کچھ پایا ہے
نیا زمانہ آیا ہے

نئی امنگیں، نئی ترنگیں، نئے ارادے جاگے ہیں
نئے زمانے کی کروٹ سے نئے تقاضے جاگے ہیں
نئی نگاہوں میں ہے شوکتؔ، اب تو ہر ہر بات نئی
نئے تصور کی دنیا ہے، نیا تخیل چھایا ہے
نیا زمانہ آیا ہے



جیتئے

32,50,000 روپے

کے انعامات

ڈاکخانے کے سیونگز بینک کے ذریعے

جن کھاتوں میں
جمع شدہ رقم یکم نومبر 1973ء
سے 31 مارچ 1974ء تک
دو سو روپے
یا اس سے زیادہ رہے گی،
وہ کھاتے انعامات کی
لاٹری میں شامل کئے جائیں گے۔

یہ فائدہ آپ کو اپنے سیونگز
کھاتہ پر ملنے والے سود کے
علاوہ ہوگا۔

اپنے لئے انعام جیتنے کے مواقع بڑھانے
کے لئے آپ جتنے کھاتے چاہیں کھول
سکتے ہیں لیکن ایک ڈاکخانے میں
ایک سے زیادہ کھاتہ نہیں کھولا
جا سکتا۔ تمام کھاتوں میں کل جمع شدہ
رقم 25,000 روپے سے زیادہ
نہیں ہونی چاہیئے۔ کسی نابالغ کے نام پر
بھی کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔
پہلی لاٹری جنوری 1974 میں نکالی جائیگی۔
جلدی کیجئے۔ اپنے کنبے کے ہر فرد کیلئے
فوراً کھاتہ کھول دیجئے۔

پہلا انعام 2,50,000 روپے

دوسرے نمبر کے	5 انعامات	1,00,000	روپے ہر ایک
تیسرے نمبر کے	10 انعامات	50,000	روپے ہر ایک
چوتھے نمبر کے	100 انعامات	10,000	روپے ہر ایک
پانچویں نمبر کے	1,000 انعامات	500	روپے ہر ایک
چھٹے نمبر کے	10,000 انعامات	50	روپے ہر ایک

تفصیلات اس پتہ پر معلوم کی جا سکتی ہیں:
نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس 96، ناگپور

Sno 73/877

نہرو بال پُستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اِس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگیں تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

(۱) باپو حصّہ اوّل مصنف: سی فری ماس مترجم: صالحہ عابد حسین
(۲) باپو 〃 دوم 〃 〃 〃 〃 : 〃 〃
(۳) کشمیر مصنف: مالا سنگھ مترجم: خدیجہ سلیم: تصویر: پرمانند
(۴) پرندوں کی دنیا 〃 : جمال آرا 〃 : محمد شفیع الدین نیرّ
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر 〃 : بریگیڈیر گیان سنگھ مترجم: محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی 〃 : لیلا مجمدار 〃 : رضیہ سجاد ظہیر
(۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں 〃 : لیلا کھاگوت 〃 : 〃 〃
(۸) رسیلی کہانیاں 〃 : منوج داس 〃 : صغرا مہدی
(۹) آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) 〃 : وشنو پربھاکر 〃 : انور کمال حسینی
(۱۰) ہماری ریلیں مصنف: جگ جیت سنگھ 〃 : عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح 〃 : کے سی کھنہ تصاویر: کرشن کھنّہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں 〃 : اوماٍ نند مترجم: رفیعہ منظور الامین
(۱۳) ھاربل کا خاندان 〃 : منوہر داس چترویدی 〃 : محمد شفیع الدین نیّر
(۱۴) بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) 〃 : چوکسی بی ام جوشی 〃 : رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) بہادروں کی کہانیاں 〃 : راجندر راو سنگھی 〃 : انور کمال حسینی
(۱۶) روہنت و نندیہ مصنف کرشن چینیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں 〃 : شانتا رنگا چاری 〃 : 〃 〃
(۱۸) ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی 〃 : میر نجابت علی 〃 : سیّد احسان
(۱۹) 〃 〃 (دوم) 〃 : 〃 〃 〃 〃 : 〃 〃
(۲۰) بڑا پانی 〃 : لیلا مجمدار 〃 : صالحہ عابد حسین
(۲۱) سویرا 〃 : ملک راج آنند : انور کمال حسینی
(۲۲) ہاکی کا کھیل 〃 : سرویندر سانیال 〃 : پریتم لال

ذاکر حسین سیریز

(۲۳) ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۳/-
(۲۴) انوکھی دکان 〃 : قدسیہ زیدی 〃 ۲/۵۰
(۲۵) گلا بو چیونٹیاں اور پری زاد 〃 : 〃 〃 〃 ۲/-
(۲۶) دنیا کے جانور 〃 : 〃 〃 〃 : ۲/۵۰
(۲۷) راجہ رام موہن رائے 〃 : عرش ملسیانی (زیرِ طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵ - اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۳) پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ب غلام ربانی

گھڑی کی کہانی

سورج اور چاند خدا کی بنائی ہوئی دو گھڑیاں ہیں، ی خوبصورت اور چمکدار ہیں، جن سے وقت کا ازہ کیا جاتا تھا۔

ہزاروں برس لوگ ان سے کام لیتے رہے۔ زمین ں میں سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ چاند ایک مہینے زمین کے گرد گھوم جاتا ہے۔ سورج ہر روز مشرق سے تا ہے اور جنوب میں چھپ جاتا ہے۔ غرض سال مہینے دن کا حساب کرنے کے لیے خدا نے سورج اور چاند گھڑیاں آسمان میں لگا دی تھیں گھنٹے اور منٹ کا ساب انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا۔

قدیم زمانے میں دنیا کی آبادی زیادہ نہیں تھی کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ وقت کی کچھ زیادہ قدر نہیں ی۔ جوں جوں انسان نے ترقی کی اس کی زندگی کی ضروری یں بڑھتی چلی گئیں اور ہر آدمی کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ب وقت کی قدر ہوئی اور گھنٹے اور منٹ کے ساتھ سکنڈ کی بھی اہمیت ہو گئی۔ چنانچہ گھڑی کا ایجاد ہوئی مگر گھڑی تک پہنچنے کے لیے انسان کو کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کی کہانی دلچسپ ہے۔ اس موقع پر اس کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے۔

بعض لوگ سن کی ایک لمبی سی رسی بٹتے تھے اس میں برابر برابر فاصلے پر گرہیں لگا دیتے تھے۔ اس کے بعد رسی کو آگ لگا دیتے تھے، اس کے بعد رسی کو کسی مکان چھت یا درخت پر لٹکا دیتے تھے، پھر اس کے نچلے سرے کو آگ لگاتے جب شعلہ پیدا ہوتا تو اسے بجھا دیتے مگر اس طرح کہ رسی آہستہ آہستہ سلگتی رہے۔ جب رسی پہلی گرہ تک جل جاتی تو سمجھتے کہ ایک گھنٹہ ہو گیا۔ اسی طرح جتنی گانٹھیں جلتیں اتنے ہی گھنٹے گن لیتے تھے۔

اس کے بعد ایک دوسری ترکیب سوجھی اور لوگوں نے موم بتی سے گھڑی گھڑی کا کام لینا شروع کر دیا۔ ایک لمبی سی موم بتی پر برابر برابر فاصلے پر نشان بنا دیتے تھے پھر اس کو روشن کرتے جب اس کا ایک حصہ جل جاتا تو سمجھتے کہ ایک گھنٹا ہو گیا۔ اسی طرح بتی کے نشانوں سے گھنٹے شمار کر لیتے تھے۔ بہت دن بعد ایک اور طریقہ معلوم کیا۔ ایک ناند میں پانی بھر ایک کٹورا ڈال دیتے تھے اس کے پیندے میں باریک سوراخ ہوتا جب کٹورا بھر کر ڈوب جاتا تو سمجھتے کہ ایک گھنٹا ہو گیا۔ اس کے بعد خالی کٹورے کو نکال کر پھر ناند میں ڈال دیتے اور دوسرے گھنٹے کا انتظار کرتے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے تک پولس کے تھانوں میں یہی انتظام تھا۔ کٹورا ڈوبنے پر پہرے کا سپاہی گھنٹا بجا دیتا تھا۔

انہی دنوں ریت گھڑی ایجاد ہوئی دو چھوٹی چھوٹی شیشیاں صراحیوں کی شکل کی ہوتی تھیں، ان کے منہ ایک دوسری سے ملا کر اوپر تلے رکھ دیتے۔ اوپر کی صراحی میں ریت بھر دیتے تھے جو آہستہ آہستہ بیچ کے سوراخ سے نیچے کی شیشی میں گرتی رہتی تھی جب ساری ریت گر جاتی تو سمجھتے ایک گھنٹا ہو گیا پھر اسے الٹا کر کے

رکھ دیتے تاکہ ریت والی شیشی اوپر اور خالی شیشی نیچے ہوجائے۔ ریت پھر گرنے لگتی اور دوسرے گھنٹے کا عمل شروع ہوجاتا۔

اس کے بعد دھوپ گھڑی ایجاد ہوئی کھلے میدان میں یا کسی مکان کی چھت پر، جہاں کسی درخت کا سایہ نہ پڑے، ایک چوکور سا فرش تیار کرتے۔ اس پر ایک دائرہ کھینچتے، اس دائرہ کو گھڑی کے ڈائل کی طرح مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جاتا اور ان پر گھنٹوں کے نشان بنادئے جاتے تھے۔ اس کے بعد دائرے کے بیچ میں لوہے یا پیتل کی ایک سلاخ کسی قدر ترچھی گاڑ دیتے اس طرح کہ اس کا سایہ نشانوں پر پڑے۔ اب جوں جوں سورج مشرق سے مغرب کی طرف جاتا سلاخ کا سایہ بھی ہٹتا جاتا تھا اور اس سے وقت معلوم کر لیتے تھے۔

اب تک جتنی گھڑیاں ایجاد ہوئیں۔ ان میں بعض خرابیاں تھیں، کوئی شخص، رسّی، موم بتی، کٹورے یا دھوپ گھڑی کو دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ کیا بجا ہے۔ دھوپ گھڑی اچھی تھی مگر رات کے وقت اس کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اور دن کو بھی اگر ذرا سا بادل آسمان پر آجاتا تو گھڑی بے کار ہوجاتی تھی۔

آخر کار کلاک بنایا گیا اور ساری خرابیاں دور ہوگئیں۔ کلاک مختلف قسم کے ہوتے ہیں بعض ایسے ہیں جن کو ایک دفعہ کوک دیا جائے تو برسوں چلتے ہیں بعض کو آٹھویں دن چابی دی جاتی ہے اور [illegible] کیے جاتے ہیں۔ کلاک صرف وقت ہی نہیں بتاتے بلکہ گھنٹہ بھی بجاتے ہیں۔

بعض ایسے ہیں کہ گھنٹا ختم ہونے پر میٹھے سُروں میں باجا بجاتے ہیں۔

حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جب گھنٹا پورا ہوتا ہے تو اس میں سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا آدمی نکلتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں موگری ہوتی ہے اور وہ موگری سے ٹن ٹن ٹھیک گھنٹا بجاتا ہے۔ پھر وہ اندر چلا جاتا ہے اور دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

امیر آدمی فضول خرچی کرے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن غریب فضول خرچی پر اتر آئے تو بری بات ہے۔ وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے اس کو غریب بھی بے کار کھو دیتے ہیں۔

یہ فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے؟ سمجھدار آدمی وقت کا حساب رکھتے ہیں، وہ جو وقت خرچ کرتے ہیں اس کی قیمت کام کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ آجکل گھڑی کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ گھڑی لباس میں شامل ہوگئی ہے جسے دیکھو گھڑی ہاتھ پر بندھی ہوئی ہے۔

گھڑی اپنے پاس رکھنا برا نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو وقت خرچ ہو اس کی قیمت کام کی صورت میں وصول ہونی چاہیے۔

بقیہ کتابوں کی باتیں ص ۳۷ سے

پیاری میں مثلاً چینی کی گڑیا، منّی کی بلی، گڑیا کا بیاہ، گڈّے میاں کا سہرا، پریوں کا ناچ۔ دہی بڑوں کی چاٹ۔ منی اور تتلی وغیرہ۔ ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی ہے بچوں کے لیے تو بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں بچیوں اور لڑکیوں کی طرف توجہ کم کی ہے نیّر صاحب کو اس معاملے میں اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ ان نظموں پر بھی نظرثانی کی گئی، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۶۴ صفحے

قیمت ۷۵/-

دونوں کتابیں نیّر کتاب گھر جامعہ نگر ۲۵

مراٹھی کہانی

مصنف : رمیش مہال
مترجم : خلیق انجم اشرفی

چوہے کا محنتانہ

قصہ بہت پرانا ہے۔ اس زمانے کا ہے جب آدمی کے پاس کھانے کے لیے اناج نہیں تھا۔ سب سے پہلے آدمی نے اناج کا ایک پودا ایک تالاب میں دیکھا۔ اسے ایسا لگا گویا وہ پودا اسے اشارہ کر رہا ہو "آؤ اور مجھے توڑ لو"۔ پانی بہت گہرا تھا۔ پودے تک پہنچنا مشکل تھا۔

آدمی بیٹھے بیٹھے وہاں تک پہنچنے کی بات سوچ رہا تھا اتنے میں اسے ایک چوہا آتا دکھائی دیا۔ فوراً چوہے کو پاس بلایا اور کہا "چوہے دادا۔ تالاب کا وہ پودا دیکھو اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے پر کیا کروں پانی کافی گہرا ہے۔ تم وہ پودا لا دو تو میں تمھیں اس کا پورا محنتانہ دوں گا۔"

چوہا فوراً تیار ہو گیا۔ اس کے لیے پانی میں اترنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ جھٹ پٹ پانی میں تیرتا پودے کے پاس جا پہنچا اور کتر کتر کر اناج کی بالیاں کنارے لانے لگا۔ تھوڑی دیر میں کنارے پر اناج کی بالیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ آدمی نے خوش ہو کر کہا "چوہے دادا اب تم اپنا حصّہ لے لو"

چوہا بولا "بھیّا۔ میں ٹھہرا چھوٹا۔ میرا سر بھی چھوٹا ہے۔ اپنا حصّہ میں اس چھوٹے سے سر پر کیسے لے جاؤں گا۔ تم یہ سارا اناج گھر لے جاؤ میں تمھارے گھر آ کر تھوڑا تھوڑا کھاتا رہوں گا۔"

آدمی نے یہ بات مان لی بس جبھی سے چوہے دادا آدمی کے گھر اناج کھاتے رہے ہیں اور اب بھی کھائے جا رہے ہیں۔

***



سیّد کاعلوان چشتی

لوری

(چندا کا پلنا)

سوئے گا مُنّا راجا ننديا انکھیوں میں آجا
پریوں نے چھیڑا راجا میٹھے سروں کا باجا
چندہ کا پلنا آیا نیلے گگن سے
حوروں نے لوری گائی من کی لگن سے
لالی پونیا آجا پھولوں کی سیج لگا جا
سوئے گا منّا راجا ننديا انکھیوں میں آجا

... کا ... یہ من کا ...
... جیون سے پیارا مجھے مکھڑا تمھارا
جگ مگ جیسے تو راجا لمبی عمریا پا جا
سوئے گا منّا راجہ ننديا انکھیوں میں آجا

آسمان ... آنچل کی چھاؤں ڈالوں تجھ پہ ...
آ ... اری میں جاؤں ...
... گئیں ... نگری ...
... سوئے گا منّا راجا ...

جناب وقار خلیل

اُردو شعر کے چندا ماما

(کئی سال ہوئے محترم شفیع الدین نیّر صاحب حیدر آباد تشریف لائے گئے تھے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا گیا اس جلسے میں وقار خلیل صاحب نے یہ نظم پڑھی تھی)۔

(بچوں کے ادیب و شاعر جناب شفیع الدین نیّر کی نذر)

اُردو شعر کے چندا ماما!
"بال بھون" کے سارے بچے
تم سے مل کر
تم کو خوش کر
... لگتا ہے ایسے خوش ہیں
... نیل گگن سے چندا
... بھون کے باغیچے میں
... کے سنگ کھیل رہا ہو
اُردو میں بول رہا ہو
... کے نغمے گھول رہا ہو
... شعر کے چندا ماما!
... کی پھلواری میں تم
... من موہنا لگتے ہو
...
... نیّر کتاب گھر ...

ناوک حمزہ پوری

ہمارا قومی نشان

اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے ہمارے دیس ہندوستان میں کلنگ کی خوفناک اور دل دہلا دینے والی لڑائی کے بعد اشوک نے بودھ دھرم (مذہب) قبول کر لیا تو اس مذہب کو پھیلانے کے لیے اس نے جہاں اور کئی طریقے اپنائے۔ وہیں ملک کی مختلف جگہوں پر بڑے اونچے اونچے مینار بھی بنوائے۔ ان میناروں پر بودھ دھرم کی اچھی اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے اہم اور تاریخی واقعات بھی لکھوائے گئے عام طور پر ان میناروں کو اشوک کی لاٹ کہتے ہیں۔ ایسے مینار اس نے لوریا نندن گڑھ، لوریا اراراج، الہ آباد، لمبنی، پہلادپور، امراوتی، بھرہوت، سانچی، باکھرا، رام پوردا، دِلّی اور سانکسا وغیرہ متعدد مقامات پر بنوائے۔ ان میناروں پر شیر، ہاتھی، گھوڑے اور سانڈ کی مورتیاں بھی بنائی گئی تھیں۔

سارناتھ کی لاٹ (مینار) تیسری صدی قبل مسیح ... ۱۹۰۵ء میں محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کا ... ہیونگ سانگ جس زمانہ میں ... تھا اس وقت اس نے سارناتھ ... تھی۔ اس کے لکھنے کے مطابق اس وقت اس مینار کی اونچائی ستّر فٹ تھی۔۔ اس پر بنی ہوئی چار شیروں کی مورت (جو آج بھی محفوظ ہے اور جسے ہندوستان کے قومی نشان ہونے کا فخر حاصل ہے) کی اونچائی سات فٹ ہے۔

سارناتھ ہی وہ پہلی جگہ ہے جہاں سے مہاتما بدھ نے بودھ دھرم کی تعلیمات کے پرچار کا آغاز کیا۔ بودھ دھرم کی تاریخ میں اس واقعہ کی بڑی اہمیت ہے۔ گوتم بدھ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بودھ لوگ سارناتھ کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔

آپ اپنے سکّوں پر تین شیروں کی تصویر دیکھتے ہیں۔ یہ تصویر سارناتھ ہی کے مینار سے لی گئی ہے۔ یہ دراصل چار شیروں کی تصویر ہے۔ یہ چار شیر چاروں طرف منہ کئے ہوئے ایک دوسرے سے اپنی پیٹھ ملائے کھڑے ہیں سامنے اور اغل بغل کے شیر تصویر میں آ گئے ہیں لیکن چوتھا شیر پیچھے کی طرف ہونے سے چھپ جاتا ہے۔

سکّوں پر ہمارا قومی نشان پورے کا پورا نہیں آ سکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آزادی کے فوراً بعد یہ سوال سامنے آیا کہ سکّوں پر بادشاہ کی تصویر کی جگہ کونسا

نشان یا تصویر بنائی جائے۔ اس وقت یہی شیروں والی تصویر اپنائی گئی۔ بعد میں اتفاق سے یہ ہمارے قومی نشان کا جزو بھی بن گئی۔

ہم نے ۲۶- جنوری ۱۹۵۰ء کو اسے اپنا قومی نشان منتخب کیا۔

قومی نشان میں شیروں کی مورت کے نیچے سل کی پٹی ہے۔ پٹی کے بیچ میں ایک "چکر" ہے۔ اس چکر کو ہم نے اپنے قومی جھنڈے کے بیچ میں بھی رکھا ہے۔ پتھر کی اس سل پر چکر کے دائیں طرف سانڈ کی تصویر ہے اور بائیں طرف گھوڑے کی۔ یہ سل گھنٹی کی شکل کے کنول کے ایک پھول پر رکھی ہے۔ کنول قومی نشان میں دکھائی نہیں دیتا۔

پٹی کے نیچے دیوناگری رسم الخط میں "ستیہ میو جیتے" لکھا ہے اس کے معنی ہیں کہ سدا حق ہی کی فتح ہوتی ہے۔ خیال ہے کہ اس مینار پر شیروں کی مورت کے اوپر بھی ایک چکر تھا جو گردش زمانہ کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ گیا۔

کہتے ہیں، قومی نشان میں چاروں طرف منہ کیے ہوئے چاروں شیر دنیا میں پھیلی ہوئی حرص و ہوس کی علامت ہیں۔ کنول عیش و عشرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دھرم چکر یہ بتاتا ہے کہ دھرم کے اصولوں پر عمل کرکے ان برائیوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

سانڈ اس لگن کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں سدھارتھ پیدا ہوئے تھے۔ گھوڑا اس گھوڑے کی یاد دلاتا ہے۔ جس پر سوار ہو کر گوتم عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ "ستیہ میو جیتے" اپنشد (ہندوؤں کی مذہبی کتاب) سے اس اعلان کو دہراتا ہے کہ فتح ہمیشہ حق ہی کی ہوتی ہے باطل سدا منہ کی کھاتا ہے۔

ہمارا قومی نشان نہ صرف یہ کہ ہمارے ملک کی سرکاری مہر ہے بلکہ اس کی اہمیت اس سے کہیں بہت زیادہ ہے۔ یہ ہمارے اونچے اور نیک ارادوں اور اعلیٰ قدروں کی علامت ہے۔ اشوک سے اس کا تعلق ہونے کی وجہ سے یہ امن شانتی صلح کل اور بین الاقوامی بھائی چارے کی علامت ہے۔

قومی نشان کا استعمال صرف حکومت کے کام کاج میں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے صدر، مرکزی سرکار کے وزیر، غیر ملکوں میں ہمارے سفیر۔ ریاستوں کے گورنر، چیف کمشنر اور وزیر اس نشان کو بطور مہر استعمال کرتے ہیں۔

لوک سبھا اور راج سبھا کے ممبروں کے پیڈ پر بھی یہ نشان بالترتیب ہرے اور لال رنگ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس پیڈ پر ممبروں کا نام نہیں چھپنا چاہیے۔ سرکاری اشاعتوں۔ سرکاری فلموں۔ بیرونی ملکوں میں ہمارے سفارت خانوں میں استعمال ہونے والے برتنوں۔ ان سفارت خانوں کے چوتھے درجے کے ملازموں کی وردیوں پر بھی یہ نشان رہتا ہے۔ یہ نشان راشٹرپتی بھون اور راج بھون کی گاڑیوں پر بھی لگایا جاتا ہے۔ سکریٹریٹ اور پارلیمنٹ کے دیوان پر بھی قومی نشان لگایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کسی بھی نجی کام کے لیے کسی آدمی کو قومی نشان کا استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

- علم شریفوں کو متواضع بناتا ہے اور رذیلوں کو متکبر۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- اپنے ظاہر اور باطن کو یکساں رکھو۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

وعدہ

جناب شہلا قدوائی۔ مسولی

آئیے تاریخ اسلام کا ایک مشہور واقعہ آج آپ کو سنائیں۔

ایک قاضی کی عدالت سے ایک نوجوان کو قتل کے الزام میں موت کی سزا ہوئی۔ ملزم نے قاضی سے زبانی درخواست کی۔ "میرے پاس ایک یتیم بچے کی امانت ہے۔ اور وہ ایک ایسی جگہ دفن ہے۔ جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں اگر میں وہ امانت واپس نہ کر سکا تو ایک یتیم کا مال اپنے ذمے لے کر مر جاؤں گا۔ مجھے صرف چار دن کی مہلت دی جائے امانت واپس کر کے حاضر ہو جاؤں گا۔"

یہ ایک ایسے ملزم کی درخواست تھی جسے قتل کے الزام میں موت کا حکم سنایا جا چکا تھا۔ قاضی نے اس کی بات سنی، غور کیا اور کہا "کوئی ضامن پیش کرو"

اب بھلا ایک اجنبی قاتل اور موت کی سزا پانے والے کی ضمانت کون دیتا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک بزرگ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـ

"یہ میرے ضامن ہیں"

قاضی نے ان بزرگ سے پوچھا۔ تو انھوں نے بھی کہہ دیا "ہاں میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔" تو جناب قاتل کو اجازت مل گئی اور وہ چلا گیا۔

چوتھے روز قاضی کے دربار میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہر شخص بے چینی کے ساتھ اس نوجوان کا منتظر تھا۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی مدعی قاضی سے شکایت کرتا کہ آپ نے ناحق اس ظالم کو مہلت دی۔ بھلا وہ موت کی سزا پانے کے لیے اپنا وعدہ کیسے پورا کر سکتا ہے؟"

مگر قاضی جانتا تھا کہ اگر قاتل واپس نہ آیا تو اس کا ضامن سزا بھگتے گا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قریب قریب سب ناامید ہو گئے تھے کہ اچانک لوگ حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ وہی نوجوان ہانپتا کانپتا قاضی کی عدالت کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے آتے ہی قاضی صاحب سے بلند آواز میں کہا "جلاد کو جلدی بلوائیے!" امانت ادا کر آیا ہوں اب مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے دیا جائے۔"

سب لوگ اس نوجوان کی سچائی اور وعدے کی پابندی دیکھ کر حیران ہو گئے۔

قاضی نے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا اس بزرگ آدمی سے تمھارا کوئی رشتہ ہے؟"

قاتل ہنسا اور بولا "ہرگز نہیں! میں نے اس عدالت سے پہلے انھیں دیکھا تک نہیں۔ لیکن یہ مجھے سب سے زیادہ بوڑھے نظر آئے میں نے خیال کیا کہ انھوں نے ضرور رسول اللہ صلعم کا زمانہ دیکھا ہوگا اور ضرور اسی بیکسی میں میری مدد کریں گے۔

اور جب ان بزرگ سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:-

"میں نے اس نوجوان کی ضمانت صرف اس لیے دی کہ یہ مسلمان ہے اور مسلمان کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔"

یہ سن کر جتنے لوگ بھی وہاں موجود تھے سب نے

باقی ص ۳۲

سلطان احمد ساحل نہر گانوی

سنہرا خواب

ہوڈ نام کا ایک امریکن ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ اس کارخانے میں بے چارے کو بہت محنت کرنا پڑتی اور مزدوری بہت ہی کم ملتی تھی۔ اس کی بیوی گھر کے کام کاج کرنے کے علاوہ اپنے بچوں کے کپڑے بھی اپنے ہاتھ سے سیا کرتی۔ اس زمانے میں کپڑا سینے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

ہوڈ کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی نوکر گھر میں رکھ سکتا۔ جب وہ دن بھر کی محنت کے بعد اپنی بیوی کو رات میں اس طرح بچوں کے کپڑے سیتا دیکھتا تو اسے بہت کڑھن ہوتی۔ ایک دن اس نے سوچا اگر وہ کپڑے سینے کی مشین ایجاد کرے تو اس کی بیوی کو اس روز روز کی مصیبت سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔

اب ہوڈ پر کپڑے سینے کی مشین ایجاد کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ ہوڈ نے اپنے مطلب کی ایک مشین کا ڈھانچہ بہت سوچ وچار کے بعد تیار کر لیا۔ مشین تو ہر طرح سے بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن اس کے لیے کوئی مناسب سوئی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

آخر کار ہوڈ نے ایک سوئی ایجاد کی جس کا سوراخ ہاتھ سے کپڑا سینے والی سوئی کی طرح سر پر تھا۔ مگر جب اس میں دھاگہ ڈال کر مشین کو چلایا جاتا تھا تو مشین کام نہ کرتی۔ ہوڈ نے بہت سوچ وچار کیا۔ دماغ پر بہت زور دیا۔ لیکن سوئی ایجاد نہ ہوئی۔ آخر کار اسی پریشانی میں اس کی صحت بگڑنے لگی اور تنگ آ کر اس نے اس کام کو نامکمل ہی چھوڑ دیا۔

مگر جس کام کو اس نے بہت ہی لگن اور بڑی محنت کے ساتھ شروع کیا تھا اس کی یاد وہ کسی طرح دل سے نکال نہ سکا۔ ایک رات ہوڈ تھکا ماندا سو رہا تھا، اچانک خواب میں دیکھتا ہے کہ اپنے ملک سے دور —— بہت دور ایک بادشاہ نے اسے قید کر رکھا ہے —— اور حکم دیا ہے کہ وہ کپڑا سینے کی مشین دو دن کے اندر اندر ایجاد کر کے دکھائے ورنہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

یہ نرالا اور انوکھا حکم پا کر ہوڈ کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اس نے پھر مشین تیار کر لی لیکن وہ سوئی تیار نہ کر سکا۔ دو دن بعد بادشاہ کے سپاہی ہوڈ کے پاس پہنچے اور اسے پھانسی پر لٹکانے لے چلے۔ ان سپاہیوں کے پاس ایک خاص قسم کے بھالے تھے۔ ہوڈ نے جب بھالوں کو غور سے دیکھا تو اسی وقت اس کی سمجھ میں بات

آگئی — اس نے سپاہیوں سے کہا " مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو — میں اب اپنی ایجاد مکمل کر سکتا ہوں ۔"

سپاہیوں نے اس کی بات نہ مانی اور اُسے لے جا کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا ۔ مارے دہشت کے ہوڈ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی .... اور وہ گھبرا کر ایک دم کھڑا ہو گیا ۔ لیکن کپڑا سینے کی مشین کی سوئی کا نقشہ ذہن میں جم چکا تھا ۔ ہوڈ نے پھر ایک سوئی بنائی اس بار اس نے سوئی کا سوراخ نیچے کی طرف رکھا ۔ جب سوئی میں دھاگا ڈال کر مشین چلائی گئی تو بالکل ٹھیک کام کرنے لگی ۔ اس طرح کپڑے سینے کی مشین کی ایجاد ہوڈ کے خواب کی بدولت ہوئی ۔ حکومت کو اس نئی ایجاد کا پتہ چلا تو سرکاری خزانے سے ہوڈ کو بہت بڑی رقم ملی ۔ جس سے اس کی غریبی دور ہو گئی اور اس کے اس کارنامے کی بدولت اس کی بیوی کو ہاتھ سے کپڑے سینے کی تکلیف سے نجات مل گئی ۔



ڈاکٹر سید حامد حسن

اچھی اردو

اردو میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ ایسے الفاظ میں زیادہ تعداد عربی اور فارسی الفاظ کی ہے۔ اچھی اردو لکھنے اور سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کو عربی اور فارسی الفاظ سے اچھی واقفیت ہو، جو اردو میں اکثر استعمال ہوتے ہیں۔

دو یا زیادہ لفظوں کو ملا کر نئے لفظ بنانے میں فارسی زبان کے الفاظ سے اکثر مدد لی جاتی ہے۔ اس مضمون میں کچھ ایسے لفظ پیش کئے گئے ہیں جو فارسی میں مختلف کاموں کا اظہار کرنے والے الفاظ (جنھیں مصادر کہتے ہیں) (جو مصدر کی جڑ ہیں) سے بنائے جاتے ہیں۔ مضمون میں نمونے کے لئے تھوڑے تھوڑے الفاظ بنا کر پیش کئے گئے ہیں۔

ان نمونوں پر دوسرے الفاظ بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ ان الفاظ کو پڑھیے اور ان کے معنی یاد رکھیے۔ یہ الفاظ آپ کو کتابیں اور اخبار پڑھنے میں اور سمجھنے میں بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

آموز

(۱) آموختن سیکھنا سکھانا
آموز کی اصل یہی مصدر ہے

آموختہ ۔ سیکھا ہوا سبق ۔

آموز ۔ سکھانے والا، سیکھنے والا ۔

سبق آموز ۔ سبق سکھانے والا

عبرت آموز ۔ عبرت دینے والا

نصیحت آموز ۔ نصیحت دینے والا

صبر آموز ۔ صبر سکھانے والا

ادب آموز ۔ ادب سکھانے والا

نو آموز ۔ نیا سیکھنے والا

بد آموز ۔ جس کی تعلیم ناقص ہو

آموزگار ۔ سکھانے والا، سیکھنے والا

گزیدہ

(۱) گزیدن ۔ کاٹ کھانا ۔ اسی سے "گزیدہ" بنا ہے

(۲) گزیدہ ۔ کاٹا ہوا

سگ گزیدہ ۔ کتے کا کاٹا ہوا

مار گزیدہ ۔ سانپ کا کاٹا ہوا

زنبور گزیدہ ۔ بھڑ کا کاٹا ہوا ۔

عقرب گزیدہ ۔ بچھو کا کاٹا ہوا

مردم گزیدہ ۔ انسان کا کاٹا ہوا

طلب

(۱) طلبیدن ۔ بلانا ۔ طلب کرنا ۔ چاہنا

اسی مصدر کی شکل طلب ہے

طلبگار ۔ آرزومند

طلبگاری ۔ آرزومندی

طلبیدہ ۔ بلایا ہوا ۔ چاہا ہوا

طالب ۔ چاہنے والا ۔ ڈھونڈنے والا

طالب علم ۔ علم کا آرزومند

مطلوب
مطلوبہ } وہ چیز جو چاہی جائے

مطلب ۔ ڈھونڈنے کی جگہ ۔ مراد، معنی

(۲) دقت طلب ۔ مشکل پسند، جس کام کے کرنے میں دشواری ہو

جواب طلب ۔ جس کا جواب چاہا جائے

وضاحت طلب ۔ جس کی وضاحت چاہی جائے

تحقیق طلب ۔ جس کی کھوج چاہی جائے ۔

تفتیش طلب ۔ جس کی چھان بین چاہی جائے

وصول طلب ۔ جس کی وصولی چاہی جائے

حل طلب ۔ جس کا حل چاہا جائے

تصفیہ طلب ۔ جس کا فیصلہ چاہا جائے

محنت طلب ۔ جو محنت چاہے

اندیش

(۱) اندیشیدن ۔ سوچنا ۔ اس مصدر سے "اندیشہ" بنا ہے

اندیشہ ۔ سوچ ۔ کھٹکا

اندیشہ ناک ۔ جس میں کوئی کھٹکا ہو ۔

(۲) اندیش ۔ سوچنے والا

دور اندیش ۔ دور کی بات سوچنے والا

مصلحت اندیش ۔ مصلحت سوچنے والا

خیر اندیش ۔ اچھا سوچنے والا

نیک اندیش ۔ بھلا سوچنے والا ۔

بد اندیش ۔ برا سوچنے والا ۔

غلط اندیش ۔ غلط سوچنے والا

عاقبت اندیش ۔ بعد کی سوچنے والا

بُر

(۱) بُردن ۔ لے جانا۔ اسی مصدر سے "بر" نکلا ہے۔
بُرد ۔ لے آیا۔
دست برد ۔ لوٹ کھسوٹ، چھینا جھپٹی
خورد برد ۔ کھایا اور اٹھا لے گئے، [illegible]
ہو جانا۔ ادھر ادھر ہو گئے۔

(۲) بر ۔ لے جانے والا۔
نامہ بر ۔ خط لے جانے والا۔
دل بر ۔ دل لے جانے والا۔
راہ بر ۔ راہ پر لے چلنے والا۔
پیامبر / پیغامبر ۔ جو پیام لے جانے والا

گرد

(۱) گردیدن ۔ پھرنا۔ گرد اسی مصدر سے بنا ہے۔
گردش ۔ [illegible] پھرنا، چکر۔

(۲) گرد ۔ پھرنے والا۔
[illegible] گرد ۔ ملکوں میں پھرنے والا۔
آوارہ گرد ۔ آوارہ پھرنے والا۔
گردان ۔ پھرتا ہوا۔
سرگردانی ۔ سر پھرنا، پریشانی۔
روگردانی ۔ منہ پھیرنا۔
ورق گردانی ۔ ورق پلٹنا۔

ران

(۱) راندن ۔ ہانکنا، چلانا۔ اسی مصدر سے "ران" بنا ہے۔
رانده ۔ ہانکا ہوا، نکالا ہوا۔

(۲) ران ۔ چلانے والا، ہانکنے والا۔
حکمران ۔ حکم چلانے والا۔
جہاز رانی ۔ جہاز چلانا۔
کشتی رانی ۔ کشتی چلانا۔
ستم رانی ۔ ستم چلانا، ظلم کرنا۔

افزا

(۱) افزودن ۔ بڑھنا، بڑھانا۔
اسی مصدر سے "افزا" بنایا گیا ہے۔
افزوده ۔ بڑھا ہوا۔
افزوں ۔ [illegible] بڑھنے والا
افزونی ۔ [illegible]
افزائش ۔ بڑھوتری، [illegible]
افزائش [illegible]

(۲) افزا ۔ بڑھانے والا
صحت افزا ۔ صحت بڑھانے والا۔
حوصلہ افزائی / ہمت افزائی ۔ ہمت بڑھانا
فرحت افزا ۔ خوشی بڑھانے والا۔
عزت افزائی ۔ عزت بڑھانا۔
راحت افزا ۔ آرام بڑھانے والا۔
روح افزا ۔ روح کو بڑھانے والا۔

پاشی

(۱) پاشیدن ۔ چھڑکنا، بکھیرنا ۔ اسی مصدر سے "پاشی" بنایا گیا ہے ۔

(۲) پاشی ۔ چھڑکنا ۔

آبپاشی ۔ پانی چھڑکنا ۔

عطرپاشی ۔ عطر چھڑکنا ۔

گلپاشی ۔ پھول بکھیرنا ۔

گہرپاشی ۔ موتی بکھیرنا

تخم پاشی ۔ بیج بکھیرنا ۔

نمک پاشی ۔ نمک چھڑکنا ۔

فروش

(۱) فروختن ۔ بیچنا ۔ اسی مصدر سے "فروش" بنا ہے ۔

فروخت ۔ بکری

فروختہ ۔ بیچا ہوا ۔

(۲) فروش ۔ بیچنے والا ۔

کتب فروش ۔ کتابیں بیچنے والا ۔

میوہ فروش ۔ میوہ بیچنے والا ۔

مے فروش ۔ شراب بیچنے والا ۔

دل فروش ۔ دل بیچنے والا ۔

دوا فروش ۔ دوا بیچنے والا ۔

تھوک فروش ۔ اکٹھا مال بیچنے والا ۔

خوردہ فروش ۔ تھوڑی تھوڑی چیز بیچنے والا

گل فروش ۔ پھول بیچنے والا ۔

سبزی فروش ۔ سبزی بیچنے والا

حلوہ فروش ۔ حلوہ بیچنے والا ۔

بردہ فروش ۔ غلام بیچنے والا ۔

آور

(۱) آوردن ۔ لانا ۔ یہی مصدر "آور" کی اصل ہے

آورد ۔ لایا ہوا ۔ پیدا کیا ہوا خیال ۔

آوردہ ۔ کسی کے ذریعہ لایا ہوا ۔

(۲) آور ۔ لانے والا

خواب آور ۔ نیند لانے والا ۔

نشہ آور ۔ نشہ لانے والا ۔

دست آور ۔ دست لانے والا ۔

حملہ آور ۔ چڑھائی کر کے آنے والا ۔

بار آور ۔ پھل لانے والا ۔

دلاور ۔ دل والا ۔

زور آور ۔ زور والا

یاد آوری ۔ یاد لانا

تشریف آوری ۔ تشریف لانا

بجا آوری ۔ بجا لانا ۔

نام آوری ۔ نام پیدا کرنا ۔

نوش

(۱) نوشیدن ۔ پینا ۔ اسی مصدر سے "نوش" متعلق ہے

خورد و نوش ۔ کھانا پینا ۔

(۲) نوش ۔ پینے والا ۔

مے نوش ۔ شراب پینے والا ۔

چائے نوشی ۔ چائے پینا ۔

بادہ نوشی ۔ شراب پینا ۔

سگریٹ نوشی ۔ سگریٹ پینا ۔
حقہ نوشی ۔ حقہ پینا

گزیں

(۱) گزیدن ۔ چن لینا ۔ پسند کرلینا ۔ اختیار کرلینا
اسی مصدر سے "گزیں" کا تعلق ہے
برگزیدہ ۔ چنا ہوا ۔ منتخب ۔
(۲) گزیں ۔ پسند کرلینے والا ۔ اختیار کرنے والا
پناہ گزیں ۔ پناہ اختیار کرلینے والا
خلوت گزیں ۔ تنہائی پسند کرنے والا
جاگزیں ۔ جگہ پسند کرنے والا
گوشہ گزیں ۔ گوشہ اختیار کرلینے والا

ربا

(۱) ربودن ۔ لے جانا ۔ اچک لینا ۔ یہی مصدر "ربا" کی اصل ہے
ربودگی ۔ اچکاپن ۔
(۲) ربا ۔ لے جانے والا
دل ربا ۔ دل لے جانے والا
ہوش ربا ۔ ہوش لے جانے والا ۔

بقیہ وعدہ صفحہ ۲۵ سے

نعرہ تکبیر بلند کیا اور قاضی سے درخواست کی کہ اس نوجوان کی جاں بخشی کردیں ۔ مدعی قتل کا جو تاوان یا خون بہا چاہے ہم ادا کریں گے ۔ مگر مدعی نے تاوان لینے سے انکار کیا ۔ اور معلوم ہے؟

کیا کیا؟

اس نے کہا "جو شخص اس قدر سچا اور وعدے کا پکا ہے میں اسے معاف کرتا ہوں"

کاش اس زمانے کے مسلمان بھی ایسے ہی سچے اور وعدے کے پکے ہوتے ۔

مسعودہ صباحت - ایم - اے - بی - ٹی

جشنِ سیمیں

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں
نئی صنعتوں کے نمونے دکھائیں
ضرورت کی ہر چیز خود ہی بنائیں
جو خود جانتے ہیں وہ سب کو سکھائیں

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں
غریبوں پہ اپنے ذخیرے لٹادیں
بگڑتی ہوئی زندگی کو سجادیں
زمینِ وطن سے غریبی مٹادیں

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں
ہر اک چیز کی بڑھ رہی ہے جو قیمت
وطن کے لیے بن گئی ہے مصیبت
بدل دیں ہم اپنے گلستاں کی قسمت

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں

تعصب پرستی مٹادیں وطن سے
نہ اب حرفِ تخریب نکلے دہن سے
اُٹھے آج بوئے وفا ہر چمن سے

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں
اگر چاہتے ہیں وطن کو سجانا
تو ہے فرض ہم پر جہالت مٹانا
حقیقت میں انساں کو انساں بنانا

اٹھو آج یوں جشن سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اجالا بڑھائیں
نہ اب جنگ ہو، کوئی مرنے نہ پائے
کوئی زخم سے آہ بھرنے نہ پائے
کسی پر کوئی ظلم کرنے نہ پائے

اُٹھو آج یوں جشنِ سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں
کریں بنت[ل] نہرو کی سب ہمنوائی
کہ اس دیس کی اس نے عظمت بڑھائی
سیاست کی قائل ہے ساری خدائی
اٹھو آج یوں جشن سیمیں منائیں
اندھیرا مٹائیں اُجالا بڑھائیں

ل - بنت یعنی لڑکی یعنی جواہر لال نہرو کی لڑکی اندرا گاندھی

ترجمہ: مہر و ردولوی

جانے پہچانے تین ڈاکٹر

یورپ میں جانسن نامی ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان میں مخلوق کی خدمت کا بڑا جذبہ تھا وہ بڑے ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی کسی مریض سے مسکرا کر حال پوچھتے تو ان کی ہمدردی اور میٹھی مسکراہٹ سے ہی مریض کی آدھی بیماری دور ہو جاتی تھی

ڈاکٹر جانسن ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے۔ بیماری بڑی مہلک تھی۔ تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور ایک زبان ہو کر جواب دیا کہ اب جانسن کے جینے کی امید نہیں ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر جانسن کے چاہنے والے جمع ہو گئے۔

جو بھی ان سے ملنے جاتا وہ دیر تک ان کے پاس بیٹھ کر ان کی میٹھی باتوں سے ایسا متاثر ہوتا کہ وہاں سے آنسو پونچھتا باہر آتا۔ سب کو ڈاکٹر سے محبت تھی۔ اور سب ہی ڈاکٹر کے دکھ میں رو رہے تھے۔ آخر ڈاکٹر نے لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "بھائیو! میں جانتا ہوں کہ تمھیں مجھ سے بڑی محبت ہے۔ مگر اب میں تمھارے ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکوں گا۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے پریم کیا۔ اس کا شکریہ"

لوگوں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم ہی میں سے کسی کی زندگی لے لے مگر آپ کو زندہ رکھے۔"

ڈاکٹر نے آخری وصیت کے بعد لوگوں سے کہا "میرے مرنے کا غم نہ کرو تم اپنے جانے پہچانے تین ڈاکٹروں سے ہر دم جنہیں ہیں تمھارے ساتھ چھوڑ جانا ہوتا"

سب لوگ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کہ وہ ڈاکٹر کون ہیں۔ ان کی حیرانی کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تینوں ڈاکٹر تمھارے پاس ہی رہتے ہیں۔ مگر تم ان سے اکثر بے خبر رہتے ہو۔ سنو۔ وہ تین ڈاکٹر ہیں۔

"صاف ہوا"۔ "صاف اور تازہ پانی" اور "مناسب اور متوازن غذا" ان تینوں ڈاکٹروں سے ہمیشہ ملتے رہو تو اور کسی ڈاکٹر کی زندگی بھر ضرورت نہ پڑے گی۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر جانسن نے سلام کر کے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

(گجراتی سے ترجمہ)

ہنڈکلھیا

لال کدو

اسے سیتا پھل، گول کدو اور پورب کے علاقے میں کوہنڈا بھی کہتے ہیں۔

سامان:

لال کدو یا سیتا پھل	۲۵۰ گرام
مرچ پسی	چار کا آدھا چمچہ
دہی	۱۰۰ گرام
ناریل	۵۰ گرام
نمک	اپنے ذائقے کے مطابق
پانی	۵۰۰ گرام
چنے کی دال	۵۰ گرام
ارد کی دھلی دال	۵۰ گرام
رائی	چائے کے دو چمچے

ترکیب:- کدو کے چھوٹے چھوٹے قتلے کر لیجیے اور پانی میں نمک ملا کر ابالیے آدھا کچا ہو جائے تو آگ پر سے اتار لیجیے اور پانی پھینک دیجیے۔

اب ناریل اور رائی کو اچھی طرح پیس کر دہی میں ملا دیجیے۔ ارد کی دھلی دال اور چنے کی دال تھوڑے تیل یا ڈالڈا گھی میں بھونیے دالیں گل جائیں تو دہی میں لال کدو اور دالیں ملا دیجیے اور مزے سے کھائیے۔

بھری شملہ مرچ

سامان

مرچ بڑی	۸ عدد
دال چنا	۲۵ گرام
پیاز بڑی گانٹھ	۱ عدد
لہسن	۶ جوے یا کلیاں
ادرک	ایک درمیانی گانٹھ
ہری مرچ	حسب منشا
ہرا دھنیا	" "
پسی مرچ	" "
نمک پسا	" "
پسی ہلدی	چار کا آدھا چمچہ
تیل یا ڈالڈا	دو بڑے چمچے

ترکیب:- مرچوں کو چاقو سے چیر لیجیے چنے کی دال ایک گھنٹے تک بھگوئے رکھیے پھر پیس لیجیے پیاز باریک کر لیجیے چار سے کر دیں نمک سب مسالوں کو ایک ساتھ پیس لیجیے۔ یہ پسا ہوا مسالہ پسی ہوئی دال میں ملا لیجیے اسے تھوڑے سے تیل یا ڈالڈا گھی میں بھون لیجیے حسب منشا بھن جائے تو ٹھنڈا کر کے مرچوں میں بھر دیجیے۔

اور پھر دیگچی میں باقی تیل یا گھی ڈال کر دھیمی آنچ پر چڑھا دیجیے۔ روغن اچھی طرح ہو جائے تو بھری مرچوں کو اس میں رکھ دیجیے اور ڈھانک دیجیے تھوڑی دیر کے بعد مرچوں کو پلٹ دیجیے۔ ضرورت ہو تو پانی کا چھینٹا دے دیجیے۔ پھر اتار کر استعمال کیجیے۔

★ جو عمل بغیر علم کے ہو اسے بیمار جانو اور جو علم بغیر عمل کے ہو اسے بیکار گردانو

حضرت ابو بکر صدیقؓ

کتابوں کی باتیں

مورا۔ لکھنے والے (مصنف) جناب ملک راج آنند۔ ترجمہ کرنے والے (مترجم) جناب انور کمال حسینی آرٹسٹ (مصوّر) رو پرٹ ہیلر۔ ضخامت ۳۶ صفحے سائز پیام تعلیم کا $\frac{20 \times 30}{8}$ قیمت ۱/۵۰

یہ ایک ہاتھی کے بچّے کی کہانی ہے۔ مورا نام ہے ماں باپ کس طرح اسے پالتے پوستے ہیں۔ اسے کھانا پینا سکھاتے ہیں۔ دشمنوں سے اپنی حفاظت کے طریقے بتاتے ہیں۔ اس پر اچانک افتاد پڑ جائے کسی مشکل میں پھنس جائے تو کس طرح اسے اس مشکل سے نکالتے ہیں۔ پھر جب مورا ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اپنے ساتھی بچّوں کے ساتھ خوب کھیلتا کودتا ہے چہلیں کرتا ہے اور پھر ذرا اور بڑا ہو جاتا ہے تو بے چارہ آفتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ شکاری اس کے باپ کو گولی سے مار ڈالتے ہیں۔ دکھیا ماں دوڑتی بھاگتی، مصیبتیں اٹھاتی اُسے محفوظ جگہ لے جاتی ہے پھر ایک دن وہ خود شکاریوں کے پنجے میں پھنس جاتی ہے۔ اس نازک وقت میں اس کا ماموں توشی اُسے اپنی نگرانی میں لے لیتا ہے۔ خدا کا کرنا ایک بار توشی بھی کھائی میں گر پڑتا ہے اور مورا کی عقل مندی اور سوجھ بوجھ کی بدولت اس کھائی سے بڑی مشکل سے نکل پاتا ہے پر اب مورا جوان ہو گیا ہے۔ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ اس لیے توشی سے جدا ہو کر ایک طرف نکل جاتا ہے۔ غرض دلچسپ کہانی ہے بڑی ہی دلچسپ مزے کی یہ بات کہ کہانی کہانی میں آپ کو ہاتھی کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ کہانی مشہور مصنف ملک راج نے لکھی ہے ترجمہ انور کمال حسینی صاحب نے کیا ہے اور سچ مچ کمال کر دیا ہے۔ ایسی سہل زبان ہے ایسا سلیس نکھرا ستھرا اندازِ بیان ہے کہ ترجمہ کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ تصویروں کا کیا پوچھنا، بہت شاندار تصویریں ہیں ہر صفحے پر کئی کئی رنگوں کی بس یوں سمجھیے کہ اتنی کم قیمت (۱/۵۰ روپے) میں یہ کتاب بالکل مفت ہے۔

مکتبہ جامعہ نگر نئی دہلی سے مل سکتی ہے

منّی کا تحفہ از جناب محمد شفیع الدین نیّر

یہ پیاری پیاری آسان نظمیں مولانا شفیع الدین نے چھ سے نو برس تک کے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ اسی لیے ان کی زبان بہت سادہ ہے لکھائی بھی کافی جلی یا موٹی موٹی ہے۔ نظمیں بھی ایسے ایسے عنوانوں پر لکھی گئی ہیں کہ بچیاں انھیں دیکھتے ہی پڑھنے لگیں۔ جیسے کاش ہی گڑیا ہوتی ہے۔ منی کی مرغی۔ کھوئی ہوئی روئی۔ سہیلیوں کی پک نک۔ گڑیا اور بریانی، میٹھی لوری۔ بڑھیا بدل گئی وغیرہ " یہ نظمیں اپنی جگہ خود بڑی دلچسپ ہیں۔ نظموں کا یہ مجموعہ اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے۔ دوسری دفعہ چھاپنے سے پہلے نیّر صاحب نے ان پر نظرِ ثانی کی ہے انھیں اور بھی نکھارا ہے لکھائی کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں کاغذ بھی بہت اچھا لگایا ہے۔

پوری کتاب ۹۶ صفحے میں آئی ہے اور قیمت ۱/۴۰ ہے

منّی کے گیت۔ از جناب شفیع الدین نیّر صاحب

نیّر صاحب کی نظموں کا یہ مجموعہ ذرا بڑی یعنی نو سے چودہ سال تک کی بچیوں کے لیے ہے زبان بھی ان کی استعداد کے مطابق ہے۔ نظمیں اس مجموعے سب بھی بہت پیاری

باقی صفحہ ۹ پر

اِدھر اُدھر سے

سیلاب سے گھرے ہوئے ڈیڑھ سو آدمیوں کو ایک لڑکی نے بچالیا

بھوپال ۱۱ ستمبر۔ دریائے نربدا کی سطح ہوشنگ آباد ضلع میں خوفناک حد تک بلند ہوگئی۔ سیلاب اور طغیانی نے انتہائی خوفناک شکل اختیار کرلی۔ اور گاؤں والے پانی میں گھر گئے ایسے نازک وقت میں ملاحوں نے بھی کشتی کھینے سے انکار کردیا مگر انھی ملاحوں کی برادری کی ایک سولہ سالہ لڑکی نے جان کی بازی لگا کر ان ڈیڑھ سو آدمیوں کی جان بچالی۔ اس لڑکی کا نام سرسوتی بائی ہے۔ وہ تیر کر اپنی کشتی تک گئی۔ اسے پانی کے کنارے پہ لائی اور ان سب چارے گھرے ہوئے لوگوں کو ایک ایک کرکے محفوظ جگہوں پر پہنچادیا۔ اس لڑکی کی ہمت، جرأت اور انسانی ہمدردی کی سارے ملک میں تعریف ہو رہی ہے۔

شیر علی مسلوف اللہ کو پیارے ہوئے

مشہور روسی مسلمان مشیر علی کا ذکر انھی صفحوں میں بار بار آیا ہے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ پچھلے ستمبر کے پہلے ہفتے (۲ ستمبر) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اسی سال مئی (۱۹۷۳ء) میں انھوں نے اپنی ۱۶۸ ویں سالگرہ منائی تھی۔ ایک سال پہلے ان کا طبی معائنہ ہوا تھا۔ اس وقت ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔

شیر علی مسلوف بہت چاق و چوبند، زندہ دل، توانا اور تن درست آدمی تھے۔ بے شمار لوگ ان سے ملنے آتے تھے ہر ایک ان کی اتنی لمبی عمر کا بھید جاننا چاہتا تھا۔ اور وہ ان سب کا جواب ایک ہی انداز سے دیتے تھے" میری اتنی لمبی عمر کا بھید صرف " کام " ہے۔ یہ کام ہی ہے جس کی بدولت خون میری رگوں میں دوڑتا ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے شیر علی مرحوم کی زندگی کا " کام " سے کام رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے غذا کا بھی خاص خیال رکھا۔ بس دودھ، دہی سبزیاں اور پھل استعمال کرتے تھے عمر بھر نشے کی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔ سگرٹ کو بھی ہاتھ نہ لگایا وقت کے پابند رہے۔ صبح کو بلا ناغہ گھوڑے پر یا پیدل ٹہلنے جاتے تھے۔ اپنے سیب کے باغ کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے۔ ویسے اس علاقے کے لوگوں کی یوں بھی عمریں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہر ایک لاکھ کی آبادی میں کم سے کم ۸۱ لوگوں کی عمریں سو یا سو سے زیادہ ہیں۔ (سب ساتھ)

چڑیاں بھی لوک گیت گاتی ہیں۔

جی ہاں — چڑیاں بھی — اور یہ خبر ہے مغربی جرمنی کی — وہاں کے سائنس دانوں اور حیوانات کے علم کے ماہروں نے لوک گیتوں کی دھنیں سکھائی ہیں۔ حیوانات کے علم کے ماہر ایک ڈاکٹر نے کئی چڑیاں پال رکھی ہیں۔ یہ چڑیاں مقامی گانے والوں سے کہیں اچھی دھن میں لوگ گیت گا سکتی ہیں۔ (الجمعیۃ)

دہلی کے چڑیا گھر میں زرافہ! ہمارے دیس میں زرافہ صرف حیدر آباد میں تھا۔ پر اب یہ دہلی کے چڑیا گھر میں بھی آجائے گا اس کو یہاں تک لانے میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں تو انشاء اللہ جلد ہی آجائے گا۔ اس وقت تو اسے بھیجنے والے پریشان ہیں کہ کیسے بھیجیں۔ یہ اتنا اونچا ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز میں نہیں سما سکتا۔ اور دوسرے ذریعوں کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔

Regd. No. D. 1457.

NOVEMBER 1973

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم



ماہنامہ پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۰ شمارہ ۱۲

اڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

دسمبر ۱۹۷۳ء

قیمت ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر
جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شایع کیا

فہرست مضامین

بچّوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
آں حضرت	الیاس احمد مجیبی (اردو)	/۶۵
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۲/۳۵
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
خلفائے اربعہ رضؓ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۲/۲۵
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحی فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسول	〃 〃 〃	۱/۶۵
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی اردو -/۷۵ ہندی -/۴۰	
سرکارِ دوعالم	محمد حسین حسّان	۲/۷۵

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۱/۷۵
الف لیلہٰ عجائب خانہ	محمد حسین حسان (چار حصّے)	۱/۸۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
بڑے دادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	-/۵۱
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	نجمہ سلطان	-/۸۰
〃 〃 دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/-
〃 〃 سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۸۰
〃 〃 چہارم	〃 〃	-/۹۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	-/۸۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسّان	۱/-
دہلی	ڈاکٹر سید محمد حسین رضوی	۱/۸۰

رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
سماجی زندگی اوّل	احمد ٹیل و غلام ابرار	-/۵۶
〃 〃 دوم	〃 〃 〃	-/۸۱
〃 〃 سوم	〃 〃 〃	-/۸۱
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
〃 〃 نیچے	〃 〃 〃	۲/-
قدرت کے کرشمے	ادارہ	-/۶۲
میر انیس	محمد حسین حسّان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے۔ ناول

جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے		۴/-
اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	-/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	-/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان	-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (〃)	عصمت چغتائی	۱/۴۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی)	برکت علی فراق	-/۴۰
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
چنبیلی	محمد حسین حسان	-/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۱/۷۵
کوسے دادا (سچا ناول)	مجیب احمد خاں	۱/۷۵
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۳۵
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں)	محمود علی خاں	-/۶۵
ننھا ظلم (کہانی)	خورشید سلطان	-/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

بچّوں سے باتیں

یہ دسمبر کا پرچہ ہے۔ دسویں سال کا آخری پرچہ۔ یہ سال پچھلے سالوں سے ایک لحاظ سے بہت اچھا رہا۔ ہر مہینے نیا ٹائیٹل پیامیوں کی آنکھیں روشن کرتا رہا۔ بہت اچھا آرٹ پیپر کئی کئی رنگوں کی چھپائی بعض بعض ٹائٹل تو اتنے خوبصورت کہ بچّے دیکھ کر پھڑک گئے۔ دعا کیجیے کہ یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہے اور ہمارے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کی یہی توجہ رہی تو انشاءاللہ ضرور چلتا رہے گا۔

جہاں تک مضامین کا تعلق ہے۔ پیامیوں نے کیا کہانیاں، کیا نظمیں، کیا مضمون سبھی پسند کیے گئے۔ خدا کا شکر ہے۔ لکھائی چھپائی کی پریشانیاں بھی انشاءاللہ دھیرے دھیرے دور ہو جائیں گی۔ کوششیں برابر جاری ہیں۔

یہ سال ہمارے دیس کے لیے خاص طور پر خوش گوار نہیں رہا۔ اناج اور دوسری چیزوں کی مہنگائی اور ان کے ملنے میں دقتیں، پریشانیاں اور سب سے آخر میں کاغذ کی کم یابی بلکہ نایابی غرض یہ سال کچھ ایسی پریشانیوں میں گزرا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ ہم آپ بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا ان مصیبتوں سے جلد نجات دے۔ آمین

اکتوبر کی آخری تاریخوں میں ہماری جامعہ برادری میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا۔ جناب رشید نعمانی صاحب کی بیگم صاحبہ نے عین جوانی میں انتقال کیا۔ مرض کینسر کا تھا جو جان لیوا ہوتا ہے۔ مرحومہ بہت نیک شریف، ہمدرد، غم خوار اور غم گسار تھیں وقت پر ہر کسی کے کام آتی تھیں۔ رشید نعمانی صاحب کا نام تو آپ کو یاد ہو گا مجاہدین آزادی کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ پر بہت اچھا مضمون لکھ چکے ہیں۔ ہمارے دوسرے رسالے کتاب نما میں تو اکثر لکھتے رہتے ہیں، ہمیں ان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا مرحومہ کو جنّت نصیب کرے اور رشید صاحب اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے آمین!

ہمارے عزیز خلیق انجم اشرفی صاحب کی پچھلے دنوں غیر معمولی طور پر مصروف رہے۔ اپنی کہانی "ننھے کا جزیرہ" کی قسط بہت دیر میں بھیج سکے۔ اسی لیے یہ نومبر کے پرچے میں شامل نہ ہو سکی۔ کہانی کا یہ حصہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ پنگوئن کا حال لکھنے والے نے بہت ہی انوکھے انداز سے لکھا ہے۔ اور کہانی کہانی میں اس پرندے کے بارے میں بہت سی باتیں بتا دی ہیں۔ یہ آپ کو اور کہیں مشکل سے ملیں گی۔ کہانی کی اگلی قسط اور بھی دلچسپ ہے۔

دوسرا اہم مضمون ہے۔ ہالینڈ کے بچّوں کا تیوہار ہمارے عزیز دوست جمیل قریشی صاحب نے لکھا ہے۔ قریشی صاحب لائبریری سائنس کی مزید تعلیم کے لیے ہالینڈ تشریف لے گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی آپ کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ ہالینڈ جاتے وقت ہماری درخواست پر اس ملک کے بچّوں کی

سرگرمیوں، دلچسپیوں اور مشغلوں وغیرہ پر لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور ہالینڈ سے واپسی پر یہ اچھا سا مضمون مرحمت فرمایا۔ یہ بھی پچھلے مہینے کے لیے تھا مگر دیر میں ملنے سے اس پرچے میں شایع ہو رہا ہے۔ بچوّں کا یہ تیوہار دسمبر میں منایا جاتا ہے اس لیے دسمبر کے پرچے کے لیے زیادہ موزوں بھی ہے۔

جمیل قریشی صاحب نے ہالینڈ کے بارے میں چند اور اچھّے اچھّے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے یہ اگلے پرچوں میں پڑھیے گا۔ جمیل قریشی صاحب اور محترم شہاب الدین انصاری ہمارے لیے ایک اور بھی اچھا کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پیام تعلیم کے پرچے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکلوا رہے ہیں۔ ان پرچوں میں محترم پروفیسر مجیب صاحب کی کہانیاں چھپی ہیں۔ بڑوں کے لیے محترم مجیب صاحب قبلہ کے ان مضامین کا مجموعہ شایع کیا جا رہا ہے جو رسالہ جامعہ میں شایع ہو چکے ہیں۔ مکتبہ پیام تعلیم کہانیوں کا مجموعہ چھاپنا چاہتا ہے جو شروع سے وقتاً فوقتاً پیام تعلیم میں چھپ چکی ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا ۱۹۶۷ء میں قبلہ ذاکر صاحب مرحوم پر پیام نے ذاکر نمبر کے نام سے ایک خاص نمبر نکالا تھا۔ ذاکر صاحب کے صدر جمہوریہ ہند ہونے کی تقریب پہ شان دار نمبر نکالا گیا تھا۔ یہ بہت مقبول ہوا۔ بعد میں اُردو میں یا ہندی میں جن جن پرچوں نے ذاکر نمبر نکالے بھی نے اس نمبر سے فائدہ اُٹھایا۔ بلکہ ذاکر صاحب پر کتابیں لکھنے والے بزرگوں نے بھی اس نمبر سے استفادہ کیا ہے۔

اسی انداز کا ایک خاص نمبر مجیب صاحب قبلہ پر نکالنے کا خیال ہمارے دماغ میں چکّر لگا رہا تھا۔ ابھی چند دنوں پہلے ہمارے ذاکر امروہی صاحب نے اسی طرح کی تجویز پیش کی۔ ہمارے محترم جنرل منیجر صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ محترم جنرل منیجر صاحب کو یہ بہت پسند آئی۔ محترم شاہد صاحب کا خیال ہے کہ یہ نمبر جنوری میں نکالا جائے۔ خواہش ہماری بھی یہی ہے لیکن وقت کم ہے۔ اور بھرپور تیاری کرنا ہے۔ اس لیے اس عرصے میں اچھے اچھے مضمون مل گئے تو خیر۔ ورنہ فروری یا پھر مارچ تک نکال پائیں گے۔ کامیابی کی دعا کیجیے۔

پچھلے پرچے میں محترم شفیع الدین نیّر صاحب کی دو کتابوں "مُنّی کے گیت" اور "مُنّی کا تحفہ" پر تبصرے شایع ہوئے تھے۔ ان میں بڑی دلچسپ غلطی ہوگئی۔ مُنّی کے گیت پر جو تبصرہ شایع ہوا ہے اس کی سرخی غلطی سے "مُنّی کا تحفہ" لکھ دی گئی اور "مُنّی کا تحفہ" پر جو تبصرہ ہوا ہے اس کا عنوان "مُنّی کے گیت" لکھ دیا ـــ اس غلطی پر ہمیں افسوس ہے پیامی تصحیح کر لیں۔

نومبر کے شروع کے ہفتے میں ایک ہونہار ایک سعادت مند نوجوان اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مولوی عبد المنان تمن ندوی کینسر کا موذی مرض کا شکار ہوگئے۔ مرحوم نے ندوۃ العلما لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ پھر خوش نویسی کا شوق ہوا۔ دہلی میں بڑے بھائی عرفان نوری صاحب کے ہاں تشریف لائے اور کتابت شروع کر دی اور اتنی ترقی کر لی کہ بہت اچھے کاتبوں میں شمار ہونے لگا۔ پھر اسی فن کو روزی کا ذریعہ بنا لیا اور اتنی فراغت حاصل کر لی کہ جامعہ نگر میں ایک چھوٹا سا مکان بھی بنا لیا۔ مرحوم بہت نیک، شریف، مرنجان مرنج تھے۔ بہت سعادت مند تھے۔ ابھی تین برس ہوئے شادی ہوئی تھی۔ دو بچیاں یادگار ہیں۔ مرحوم شاعر بھی تھے۔ پیام تعلیم میں اُن کی کئی نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اُن کے عزیزوں خصوصاً سوگوار بیوہ کو صبر کی توفیق عطا ہو۔

ناظم میواتی سہرامی

اہلِ وطن سے

قفس[۱] کو گلستاں بنا کر دکھا دو بہار اپنے گلشن میں لا کر دکھا دو
اٹھو سینچو آنسو سے تنکے قفس کے کلی تیلیوں میں کھلا کر دکھا دو
لگی آگ نفرت کی سارے چمن میں اسے چشمِ تر سے بجھا کر دکھا دو
ذرا حسنِ احساس سے خود سنور کر ہر اک خار[۲] کو گل بنا کر دکھا دو
محبت کے پھولوں کی رنگینیوں سے وطن کے چمن کو سجا کر دکھا دو
ہے پیاسوں کے ہونٹوں صدیوں کی تشنگی شرابِ محبت پلا کر دکھا دو
طلسمِ فرنگی سے جھگڑا ہے گھر میں محبت کا جادو جگا کر دکھا دو
وطن سے ہو تم اور تم سے وطن ہے نظیر اس کی خود کو بنا کر دکھا دو
جہاں عظمتِ ہند کو ہو ضرورت وہاں خون اپنا بہا کر دکھا دو
وطن کے لیے مال و زر کیا؟ جوانو! جوانی بھی اپنی لٹا کر دکھا دو

کھنڈر ہی سہی گھر یہ اپنا ہے ناظم
اسے رشکِ جنت بنا کر دکھا دو

---

۱ پنجرہ ۲ کانٹا

جناب جمیل احمد قریشی

ہالینڈ کے بچّوں کا تیوہار



یورپ کے شمالی مغربی ساحل پر ایک چھوٹا سا ملک ہے ہالینڈ۔ اسے ہندرلینڈ بھی کہتے ہیں۔ اس ملک کے بارے میں ایک بات مشہور ہے بہت دلچسپ "خدا نے دنیا بنائی ہے لیکن ہالینڈ والوں نے اپنا ملک بنایا ہے"

یہ لوگ سمندر کے ہونے کی وجہ سے بہت سی زمین سمندر سے حاصل کرکے اپنے چھوٹے ملک کو بڑا کرنے میں مصروف ہیں۔ دنیا کا یہی ایسا علاقہ ہے جس کا بہت حصّہ سمندر کی سطح سے نیچا ہے۔

یہاں لوگ بہت محنتی اور تندرست ہیں۔ خوش رہتے ہیں اور خوش رہنے کا سبق دوسروں کو سکھاتے ہیں

کبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں

ہالینڈ بہت صاف ستھرا بہت خوبصورت ملک ہے۔ سب لوگ صاف رہتے ہیں اور اپنے شہر، سڑکیں، دکانیں، گھر بغرض ہر چیز صاف دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

پھولوں کے بہت شوقین ہیں۔ گھروں کے اندر اور باہر پھول ضرور ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر جب ملنے جاتے ہیں تو پھولوں کا گلدستہ ضرور لے کر جاتے ہیں۔ پھولوں کی دوتین دکانیں ہر محلے میں ہوتی ہیں۔ اپنے مذہبی اور سماجی تیوہار بھی خوب مل جل کر اور جوش وخروش سے مناتے ہیں۔

اچھا آئیے آج آپ کو یہاں کے ایک تیوہار کا بچوں کے مشہور تیوہار کا دلچسپ حال سنائیں۔

سینٹ نکولاس

صرف ہالینڈ ہی میں اس قدر دھوم سے منایا جاتا ہے

یہ یہاں کے بچوں کا تیوہار سمجھا جاتا ہے، لیکن بچے تو بچے بڑے بھی اسے مناتے ہیں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے ہیں۔

یہ تیوہار ہر سال ۵ ر دسمبر کو سارے ملک میں خوب دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اس کی تیاریاں ہفتوں پہلے شروع کر دی جاتی ہیں۔ اس موقع کے گانے ہر جگہ سننے کو ملتے ہیں۔ یہ گانے بچے بڑے اچھے انداز سے مل کر گاتے ہیں۔ اور یعنی سچ مچ یہ گانے جب ہم سنتے تھے تو ہمارا بھی جی چاہتا تھا کہ جھوم جھوم کر ان بچوں کے ساتھ گائیں۔

کہتے ہیں کہ ترکستان میں ایک جگہ "مائیرا" تھی۔ اس کے قریب کے جنگل میں ایک بہت نیک اور شریف انسان رہتا تھا۔ اس کا نام بشپ نکولاس تھا۔ قریب ہی ایک بہت خراب آدمی رہتا تھا۔ یہ بچوں کو پکڑ لاتا تھا۔ انھیں خوب پیٹتا تھا اور مار ڈالتا تھا۔ صندوق میں بند کرکے نمک لگا کر رکھتا تھا۔

ایک روز بشپ (نکولاس) کی نظر اس آدمی پر پڑی اس کے بچوں کو اس طرح دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اس نے سب بچوں کو اس سے لے لیا اور خدا کے حکم سے سب کو زندہ کر دیا۔ بس جبھی سے یہ مشہور ہے کہ بشپ نکولاس بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھیں برائی سے روکتے ہیں۔ جو بچے شرارت کرتے ہیں ان کو تحفے نہیں دیتے۔ بلکہ پکڑ کر تھیلے میں بند کرکے لے جاتے ہیں۔

ہالینڈ میں والدین اپنے چار پانچ سال کے بچوں کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ بشپ نکولاس اب بھی زندہ ہیں۔ اسپین میں رہتے ہیں اور ہر سال پانی کے جہاز میں بیٹھ کر آتے ہیں ۵ ر دسمبر ان کا یوم پیدائش ہوتا ہے۔ یہ سب بچوں کے لئے تحفے لاتے ہیں۔

ان کے ساتھ سینٹ پیٹر بھی آتے ہیں جو کالے رنگ کے ہوتے ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے یہ شریر بچوں کو مارتے ہیں اور بہت خراب بچوں کو پکڑ کر لے بھی جاتے ہیں ان کے پاس سنہرے رنگ کی کتاب ہوتی ہے پورے سال بچوں نے جو بھی اچھے اور برے کام کئے ہیں وہ سب اس میں لکھے ہوتے ہیں۔

یہ ہر گھر میں آتے ہیں۔ بچوں کو ان کے پچھلے سال کی باتیں بتاتے ہیں۔ اچھی باتوں پر انعام دیتے ہیں مگر برے بچوں کو کچھ نہیں دیتے۔

چار پانچ سال کے بچے یہ سب باتیں صحیح سمجھتے ہیں اور انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ سینٹ نکولاس کو معلوم ہو جاتا ہے وہ اگلے سال آئیں گے تو نہ تو تحفے دیں گے بلکہ سینٹ پیٹر سے مار بھی لگوائیں گے۔ اس کا اثر بہت اچھا ہوتا ہے۔ والدین کو بھی بچوں کو ڈرانے

میں آسانی رہتی ہے۔ دوسرے، بچے خود بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح بچے شروع سے اچھا بننے کی کوشش کرتے ہیں،

ہر گھر میں والدین اپنے چھوٹے بچوں کی اچھی اور بری باتیں اس سنہری کتاب میں لکھتے ہیں، مثلاً کبھی کوئی چیز چرا کر کھائی ہے۔ کھیل کر آئے لیکن صفائی نہیں کی۔ آپس میں کیسے ہو۔ بڑوں کا ادب کرو، اپنا کمرا اور دوسری چیزیں کیسے صاف رکھو انھی چیزوں پر توجہ زیادہ ہوتی ہے پڑھائی کی باتیں کم ہوتی ہیں۔

اور مقررہ تاریخ پر سینٹ نکولاس آتے ہیں تو میونسپل کمشنران کا استقبال کرتے ہیں جلوس نکلتا ہے خوب باجے بجائے جاتے ہیں۔ یہ بگھی پر سوار ہوتے ہیں سفید گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ سینٹ نکولاس کی ڈاڑھی سفید ہوتی ہے۔ بال بالکل سفید ہوتے ہیں سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوتے ہیں سر پر ایک کونے دار سرخ ٹوپی ہوتی ہے ایک ہاتھ میں چھڑی، دوسرے ہاتھ میں ایک موٹی سی سنہری کتاب ہوتی ہے، برابر میں سینٹ پیٹر ہوتے ہیں بالکل کالے رنگ کے، ہاتھ میں مارنے والی چھڑی پکڑے ہوتے ہیں۔ ان کا منہ بھی کالا ہوتا ہے جلوس نکلتے وقت یہ مٹھائی تقسیم کرتے جاتے ہیں۔

ہفتوں پہلے بچے ان کے آنے کا انتظار کرتے ہیں بچے اچھی اچھی ڈرائنگ بناتے ہیں ان کے والدین کہتے ہیں آتش دان پر رکھ دو رات کو سینٹ نکولاس آئیں گے اچھی لگے گی تو لے جائیں گے اور تمھارے لیے مٹھائی رکھ جائیں گے۔ یہ ڈرائنگ ان کی امی یا ڈیڈی اٹھا کر رکھ لیتے ہیں اور مٹھائی چھوڑ دیتے ہیں بچے صبح اٹھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اکثر بچوں کو میں نے دیکھا کہ وہ سینٹ نکولاس کی تصویر گھوڑے پر بیٹھے ہوتے بناتے ہیں۔

یہاں کے بچے ڈرائنگ کے بھی بہت شوقین ہیں۔ کچھ بچے سونے سے پہلے اپنے جوتوں میں گاجر، شکر قند وغیرہ بھی رکھ لیتے ہیں ان کے گھوڑے کے کھانے کیلئے۔

۵ دسمبر کو ہر گھر میں یہ آتے ہیں ہر محلے میں بڑی رونق رہتی ہے، بڑے لڑکے، اور لڑکیاں وہی لباس پہن کر سفید ڈاڑھی لگا کر ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے ہیں، بیٹھ کر اس گھر کے بچوں کو جمع کرتے ہیں، ان کے پورے سال کے واقعات بتاتے ہیں۔ بچے سن سن کر حیرت میں رہ جاتے ہیں کچھ ڈرتے ہیں۔ کچھ خوش ہوتے ہیں بڑی رونق ہوتی ہے۔ تحفے دیتے ہیں، اور نصیحت کرکے چلے جاتے ہیں بچے ایک دوسرے کو خوب شوق سے اپنے تحفے دکھاتے پھرتے ہیں تحفوں میں کھلونے، گڑیاں، چاکلیٹ، مٹھائی اور ان کی پسند کی چیزیں ہوتی ہیں کیونکہ یہ آخر لانے والے تو ان کے والدین ہی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ واقعی اس کا بڑا اچھا اثر ہوتا ہے، تیوہار بھی ہو گیا اور بچوں کی تربیت بھی۔ زیادہ تر بچے یہ سب باتیں سچ ہی سمجھتے ہیں۔ کچھ والدین یا بچوں کے بڑے بہن، بھائی انھیں بتا بھی دیتے ہیں کہ یہ سچ مچ کے سینٹ نکولاس نہیں ہیں۔ پھر بھی ان کے آنے کی خوشی سب بچے مناتے ہیں۔

یہی تیوہار اسی رات کو جب بچے سو جاتے ہیں بڑے بھی مناتے ہیں، سب کو تحفے ملتے ہیں۔ خوب مٹھائی کھائی جاتی ہے، ہر شخص کے لیے ایک تحفہ ہوتا ہے جو بڑے اچھے طریقے سے پیک کیا ہوتا ہے۔ کبھی تو بڑا سا ڈبہ پیک کیا ہوتا ہے لیکن کھولتے رہیے کھولتے رہیے اور آخر میں ایک چھوٹی سی ڈبیا نکلتی ہے ہر تحفے کے ساتھ چند لائنیں نظم کی بھی ہوتی ہیں جو اس شخص سے متعلق ہوتی ہیں جس کو تحفہ دیا جاتا ہے اس کی اچھی

باقی صـ۲۶ پر

آزاد نوحی توڈیلوی

کھیل لینے دو

چمن کو اور ابھی دورِ خزاں سے کھیل لینے دو
چمکتی بجلیوں کو آشیاں سے کھیل لینے دو

نہ گھبراؤ کسی دن مشکلوں کا خاتمہ ہوگا
وطن والوں کو جورِ آسماں سے کھیل لینے دو

پرستارانِ آزادی تمھاری آزمایش ہے
غم و آلام کو اہلِ جہاں سے کھیل لینے دو

تمنّا کیوں ہے ساحل کی ابھی سے ناخُدا بن کر
سفینے کو ذرا موجِ رواں سے کھیل لینے دو

ہزاروں آندھیاں آئیں تو آئیں غم نہیں اُن کا
جہاں والو ہمیں دورِ زماں سے کھیل لینے دو

بڑھو آگے قدم چومے گی جُھک کر خود بخود منزل
غبارِ راہ کو بھی کارواں سے کھیل لینے دو

وطن کو سرفروشوں کی ضرورت ہے زمانے میں
جوانوں کو ابھی تیر و کماں سے کھیل لینے دو

ضیا باری کرے گا ملک پر خورشیدِ آزادی
اندھیری رات کو ہندوستان سے کھیل لینے دو

پئے اہلِ وطن تارے فلک سے توڑ لائیں گے
زمیں والو ہمیں بھی کہکشاں سے کھیل لینے دو

مصیبت میں تڑپنا بھی تو ہے توہینِ آزادی
دلِ ناشاد کو دردِ نہاں سے کھیل لینے دو

اسیری میں اگر کھیلے ہیں ہم لطف و مسرت سے
تو آزادی میں اب تیغ و سناں سے کھیل لینے دو

نہیں معلوم آئندہ مصیبت اس پہ کیا آئے
زمانے کو ابھی امن و اماں سے کھیل لینے دو

ضرورت ہے رہے آفاق میں مذہب کی آزادی
غرض یہ ہے کہ ناقوس و اذاں سے کھیل لینے دو

رہے گا دور دورہ سرزمینِ ہند پر اس کا
تعصب کو ابھی اردو زباں سے کھیل لینے دو

مرادؔ ہن رسا آزاد اکثر مجھ سے کہتا ہے
مجھے حسنِ سخن لطفِ بیاں سے کھیل لینے دو

'ایتھوپیا کی سرزمین سے'　　　　جناب محمد امین ایم۔ اے

بکریوں نے چیتے کو مارا

کھانی ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک چیتے کا بچہ گھومتا پھرتا اپنے گھر سے نکل کر گھاس کے میدان کی طرف چلا گیا۔ اس میدان میں ہاتھی اکثر آتے رہتے تھے۔ بچہ نا سمجھ تھا اور خطرے سے بالکل بے خبر۔ ہاتھی گھاس کھا رہے تھے کہ ان میں سے ایک کے پیر کے نیچے اتفاق سے چیتے کا بچہ آگیا اور دب کر مر گیا۔ دوسرے چیتوں نے جب اسے مرا ہوا دیکھا تو وہ دوڑ کر اس کے باپ کے پاس گئے اور اس حادثے کا اس سے ذکر کیا۔

"تمھارا لڑکا مرا پڑا ہے" انھوں نے اسے اطلاع دی "وادی میں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

بڑے چیتے کا غم کے مارے بُرا حال ہوگیا۔

"ہائے میرے لاڈلے کو کس نے مار دیا؟ پتہ لگاؤ اور مجھے بتاؤ۔ میں بدلہ لیے بغیر نہ مانوں گا۔"

"اسے ہاتھیوں نے مارا ہے" دوسرے چیتوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"ہاں ہاتھیوں نے" سب نے دہرایا۔

وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔

"نہیں، ہاتھیوں نے نہیں۔ یہ بکریوں کی حرکت ہے۔ بالکل۔ بکریوں کے علاوہ کوئی اور ایسا نہیں کر سکتا۔"

بڑا چیتا غصے سے کانپنے لگا اور جھلاتا ہوا باہر نکلا۔ پہاڑیوں کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ بکریوں کا ایک گلہ وہاں چر رہا ہے۔ یکے بعد دیگرے اس نے کئی ایک کو دبوچا اور انتقام لینے کے لیے اس نے ان کو رگڑ دیا۔

ایسا لگتا ہے کہ تب سے دنیا کی یہی ریت بن گئی ہے۔ اگر کوئی طاقت ور آدمی کسی کو دھوکا دیتا ہے اس پر زیادتی کرتا ہے۔ تو بجائے اسے سزا دینے کے غریب اور کمزور کو لوگ ستاتے ہیں۔

آپ کا کام

یہ ہے کہ اپنے پیام تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے۔ جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں موجود نہیں ہے تو ہمیں لکھیے۔ ہم آپ کے مشوروں پر غور کریں گے۔ ان مشوروں کی روشنی میں پیام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

اپنے دوست احباب میں پیام تعلیم کا چرچا کیجیے۔ ایسے دوستوں کے پتے بھیجیے جنھیں پیام تعلیم سے دلچسپی ہو۔ پیام تعلیم کے خریدار بنا کر ہماری مدد کیجیے اور اس طرح پرچے کو زیادہ شان دار زیادہ خوبصورت اور زیادہ کار آمد بنانے میں ہماری مدد کیجیے۔ (منیجر)

محترمہ آصفہ مجیب

چند دن کشمیر میں

(۳)

شیخ صاحب کی آمد

۵ رجون۔ صبح کو شیخ عبداللہ کا فون آیا دس اور گیارہ کے بیچ میں مجیب صاحب سے ملنے آرہے ہیں اس خبر سے وہاں سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ چہل پہل شروع ہوگئی۔ غنی ناشتے پر میرے پاس آکر خوشی کے لہجہ میں بولے "جناب آج شیخ صاحب آرہا ہے۔ ہاں شیخ صاحب آرہا ہے"

شیخ عبداللہ صاحب ملک اور قوم کے سچّے خادم ہیں انھوں نے اس خدمت کے سلسلے میں تکلیفیں بھی بہت جھیلی ہیں یہاں سب کے دلوں میں ان کی بڑی قدر ہے۔

آنے میں ذرا دیر ہوئی تو صاحب نے کہا۔ ان کو کوئی چھوڑتا نہ ہوگا سب گھیرے رہتے ہیں انس صاحب فون کیجئے میں خود چلا جاؤں" انس صاحب نے فون کیا تو جواب آیا کہ موٹر کہیں گیا ہے ابھی آتا ہوگا اور وہ جلد آرہے ہیں۔

جیسے ہی ان کی موٹر آئی صاحب نے نیچے آکر استقبال کیا دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ افضل بیگ صاحب بھی ساتھ آئے یہ بھی قومی لیڈر ہیں شیخ صاحب کے ساتھ کام کرتے ہیں سب ڈرائنگ روم میں آئے صاحب نے اپنا کچھ حال کہا تو انھوں نے فرمایا "آپ کی بیماری کے بارے میں مجھے سب کچھ تفصیل سے معلوم ہے برابر حال پوچھتا رہا ہوں" میں نے کہا "یہ پریشان رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ کام کیسے کریں گے اور کام نہ ہو تو زندگی کیا؟"

شیخ صاحب نے کہا "آپ نے بہت کام کیا ہے۔ کچھ آرام کر لیجئے کام کیلئے صحت بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں ہو سکتا"۔ مجھ سے اور انس سے کہا "ان کو خوب گھمایئے اور ادھر ادھر لے جایئے کہ انہیں سوچنے اور فکر کرنے کا موقع نہ ملے اور دل بہلے پھر کھانے وغیرہ کے متعلق تفصیل سے سب باتیں معلوم کیں۔

اسٹاف کے سبھی لوگ ادھر ادھر کھڑے، دروازوں میں لگے، کچھ سامنے، کچھ پیچھے کھڑے، شیخ صاحب کی باتیں سن رہے تھے اور ان کو دیکھ رہے تھے انھوں نے آواز دی "ارے بھئی ادھر آؤ" دو تین آدمی اندر آئے غنی نے بڑھکر ہاتھ ملایا انھوں نے پوچھا" کوئی کشمیری کھانا گوشتابہ وغیرہ کھلایا ہے؟ اور کشمیری زبان میں باتیں ہونے لگیں۔

داچی گام پھر داچی گام جانے کی اسکیم بنائی صاحب سے کہا کل ہم وہاں پہنچ جائیں گے اور آپ کو وہ جگہ پسند آئے تو دو چار دن ٹھہر جایئے گا۔ کچھ دن پہلگام میں رہیئے گا۔ صاحب نے کہا "کھانے کا انتظام کس طرح ہوگا؟"

انھوں نے مسکرا کر فرمایا "آپ کو معلوم ہے من وسلویٰ اترا تھا" اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ ہمیں یہ سب نعمتیں اور بخششیں خدا نے عطا کیں اور وہی سب سامان کرتا ہے"۔

سب انتظام اسی طرح ہوگیا کہ ہمیں پتہ ہی نہ چلا وہ جانے لگے تو سب نے موٹر کو گھیر لیا۔ پھول اور گلدستے

دیئے۔ ہم لوگوں سے انھوں نے کہا کہ "صبح نو بجے میں یہیں آجاؤں گا اور سب ساتھ چلیں گے"۔

۶ر جون۔ دس بجے کے قریب شیخ صاحب کے ساتھ ان کی موٹر میں ہم دونوں داچی گام روانہ ہوئے۔ داچی گام یہاں سے ۱۶ میل ہے۔ راستہ میں ہارون پڑا، چشمہ زور و شور سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ دھانوں کی سینچائی ہو رہی ہے۔

راستے میں کئی گاؤں پڑے۔ شیخ صاحب کو دیکھ کر سب کھڑے ہو جاتے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکا موٹر کے ساتھ دوڑنے لگا اور اسے پکڑ کر شیخ صاحب سے کہا "مجھے بھی ساتھ لے چلیئے"۔ انھوں نے ہنس کر کشمیری میں کچھ کہا تب ہٹا۔

داچی گام کے پھاٹک کے پاس پہنچے تو دوڑ کر ایک آدمی نے پھاٹک کھولا، یہاں آنے کیلئے لوگوں کو سرکار سے خاص پرمٹ لینا پڑتا ہے، لیکن شیخ صاحب کیلئے یہ سوال نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حکومت ہے، اصل میں وہ عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں اور یہ سب سے بڑی طاقت اور سعادت ہے،

جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ

انھوں نے اس آدمی سے کہا "ابھی ایک اور موٹر آرہا ہے۔ ہماری موٹر پر انس صاحب، غنی صاحب مع سامان کے پہنچے۔ پھاٹک سے کچھ دور بہت پرفضا مقام پر مہاراجہ نے اپنے لئے ایک عمارت بنوائی تھی، سرسبز پہاڑوں کے دامن میں بڑا سا سبزے کا میدان ہے اس کے قریب چشمہ ہے، پہلی عمارت جل گئی تھی اب نئی ہے دو منزل کی۔ ایک ملازم نے (جو غنی کا رشتہ دار ہے) بڑھ کر فوراً سب کمرے کھول دیئے یہ کمرے تمام آرام کے سامان سے تیار بہت سلیقے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے ہیں۔ بہترین فرنیچر ہے باہر لان پر اخروٹ کے پیڑ کے نیچے کرسیوں پر ہم لوگ بیٹھے اور چاروں طرف کا منظر دیکھنے لگے جس سے طبیعت میں فرحت اور خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ وہیں کافی پی۔

سنا ہے یہاں پہاڑوں میں بھالو رہتے ہیں جو رات کو نکلتے ہیں کسی کو پہاڑوں پر تنہا نہیں جانا چاہئیے نہ رات کو باہر نکلنا چاہئیے۔ ایک دو آدمیوں کی اس طرح جان گئی بھالو نے پکڑ لیا اور ہڑپ کر لیا۔

کافی پی کر تازہ دم ہوئے اور موٹر میں تراوٹ مچھلیاں دیکھنے گئے جو یہاں خاص طور پر پالی جاتی ہیں یہاں چشمے کا پانی خاص طور سے بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اور یہ ٹھنڈے پانی میں پرورش پاتی ہیں کئی بڑے بڑے حوضوں کا سلسلہ ہے خوب تیرتی رہتی ہیں۔ ان کے کھانے کے لیے دوسری قسم کی مچھلیاں ڈالی جاتی ہیں اس وقت مچھلیاں ڈالی گئیں تو تراوٹ مچھلیاں پانی کے اوپر آگئیں اور دوڑ دوڑ کر کھانے لگیں۔ چاند کی طرح چمکتی ہیں۔ ان کے ننھے ننھے بچوں کے لیے الگ کمرہ ہے جس میں بھرے حوض ہیں بالکل سوت جیسے بچے تیرتے رہتے ہیں جب بڑے ہوتے ہیں تو باہر بڑے حوضوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ذرا دور پر زو (چڑیا گھر) ہے وہاں بارہ سنگھے ہیں۔ نافہ ایک جانور ہے جس سے نافہ نکلتا ہے کچھ ہرن کی طرح کا ہے یہ میں نے پہلی بار یہاں دیکھا خرگوش ہیں۔

شیخ صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا کہ بہت برس گذرے کشمیر میں شاہ ہمدان سات سو سیدوں کے ساتھ آئے اور یہیں رہ گئے۔ وہ سب گرد و نواح میں پھیل گئے ہر جگہ جا کر لوگوں کو نیک کام اور اچھے اخلاق کی باتیں سکھائیں۔ ہندو مسلمان سب مل جل کر بھائیوں کی طرح رہے اور آپس میں بڑا میل ملاپ رہا۔ شاہ ہمدان کا نام یہاں بہت سنا جاتا ہے ماں جی جب کشتی چلاتے ہیں "یا شاہ ہمدان" پکارتے ہیں۔

وہاں سے واپس آئے تو ڈرائنگ روم میں شیخ صاحب

باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں لنچ کا وقت آگیا۔ غنی نے اطلاع دی کہ لنچ تیار ہے، لوگ کھانے کے کمرے میں آگئے۔ آج خاص طور سے ہم لوگوں کے لیے شیخ صاحب نے کشمیری کھانا تیار کروایا۔ یخنی گوشت، گوشتابہ۔ کوفتے سیخ کے کباب، مرغ کے کٹلس وغیرہ بھی۔ کھانا بہت اچھا لگا۔

کھانے کے بعد شیخ صاحب نے ظہر کی نماز پڑھی اور ہم سے رخصت ہوئے کیونکہ ان کو بہت کام تھا، انھوں نے کہا "آپ کا جی چاہے تو چار دن یہاں ٹھہریئے۔"

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کی اتنی مہربانی اور ضیافت کا کس طرح شکریہ ادا کریں۔ چلتے وقت میں نے کہا "شیخ صاحب آج کا دن یاد رہے گا۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا "نہیں اور بھی بہت دن، ایسے آئیں گے"

۷ رجون کو معلوم ہوا کہ صوفیہ اشرف کی طبیعت کچھ ناساز ہے ہم لوگ وہاں گئے ہیں صوفیہ کے پاس گئی آج انھیں کچھ معدے کی شکایت ہوگئی اس لیے گرلز کالج کام کرنے نہ جاسکیں۔ صاحب ان کے بیٹے بھتیا سے باتیں کرتے اور اس کے اشعار سنتے رہے۔ اچھا وقت گذرا۔

۹ رجون۔ پروفیسر محب الحسن کے بیٹے کی شادی کی تقریب۔ میں شام کو نگین کلب میں عصرانے میں شرکت کی۔ کشمیری دلہن بہت خوبصورت ہے۔ بھاری غرارہ اور زیور پہنے پاس آئی اور سلام کیا۔ میں بیگم محب الحسن صاحب کے ساتھ آگے بڑھی اور ایک طرف جہاں کئی خواتین اور لڑکیاں تھیں۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لمبی میزیں لگی ہیں لوگ آرہے ہیں۔ سامنے نگین لیک (جھیل) ہے سرسبز لان ہیں۔ چاروں طرف پرلطف نظارہ ہے ذرا دیر میں کشمیر کے گورنر بھگوان سہائے صاحب تشریف لائے اور چائے شروع ہوئی۔

چلتے وقت صاحب نے چشتی صاحب سے پوچھا پچھلے سال جو لڑکی چشمے میں ڈوب گئی تھی اور اس کو بچانے کیلئے جو دو لڑکے گئے تھے وہ بھی ڈوب گئے تھے اس کی یادگار ابھی قائم نہیں ہوئی؟

شاید آپ کو یاد ہو پچھلے سال یہ دردناک حادثہ ہوا تھا کالج کی لڑکیاں پکنک کرنے گئیں ایک کشمیری لڑکی چشمہ میں برتن دھونے لگی دھار بہت تیز تھی وہ گری اور ڈوبنے لگی یہ دیکھ کر اس کو بچانے کے لیے ایک کشمیری مسلمان لڑکا گیا وہ بھی ڈوب گیا اس کے بعد ایک سکھ لڑکا ان دونوں کو بچانے کیلئے گیا اور ڈوب گیا یہ خبر اخباروں میں چھپی تھی)

صاحب کو بہت فکر اور اصرار تھا کہ اس کی یادگار جلد قائم کی جائے۔ اور اب تک کیوں یہ اتنا اہم اور ضروری کام کیوں ملتوی رہا۔ چشتی صاحب نے جواب دیا "جی ہاں ضرور قائم کی جائے گی"

صاحب نے پھر پوچھا "کیا یہاں میری موجودگی میں ہو جائے گی"، انھوں نے اطمینان دلایا کہ وہ جلد کروائیں گے۔ ان کی موجودگی میں ہوگی۔

۱۱ رجون۔ آج صبح کو آغا صاحب کے یہاں گئے اتوار ہے اس لئے سب موجود تھے۔ یہ تو اپنا گھر سا معلوم ہوتا ہے، جی بہل جاتا ہے۔

آغا صاحب نے صاحب کی کچھ کتابیں اور پرانے مضمون جنھیں وہ بہت قدر سے رکھتے ہیں صاحب کو دکھلائے اور کچھ اقتباس سنائے۔ کچھ چیزیں ڈاکٹر صاحب کی موجود تھیں وہ دکھائیں۔ کتابوں پر گفتگو اور لکھنے پڑھنے کا تذکرہ رہا۔

شام کو کچھ دور موٹر پر کچھ دور پیدل گئے اور ریسٹورنٹ میں چائے پی۔ کچھ ہندوستانی اور کچھ باہر کے سیاح تھے، کافی

باقی [illegible] پر

جناب آزاد بارانوی

قطعہ

جس قوم کو جینے کا سلیقہ نہ ہو معلوم
وہ قوم کہیں ڈوب کے مرجائے تو اچھا
مخلوق کی خدمت ہے بڑی سب سے عبادت
یہ عمر عبادت میں گذر جائے تو اچھا
اوروں کی برائی سے تمھیں کچھ نہ ملے گا
ہاں اپنی بُرائی پہ نظر جائے تو اچھا
انسان کی انسان سے نفرت، ہے بُری چیز
کھائی یہ، خطرناک ہے بھر جائے تو اچھا
جو شخص کہ پہنچاتا نہیں فیض کسی کو
اک ریت کا ٹیلہ ہے، بکھر جائے تو اچھا
اس عمر کو آزاد گذرنا ہے بہرحال
با عزّت و ایمان گذر جائے تو اچھا

جناب شفیع تمنّا کلکتہ

افسوس کے آنسو

جب مرے سامنے پڑھتا ہے کوئی بھی اخبار
میری آنکھوں سے رواں ہوتی ہے اشکوں کی قطار
یا وہ پڑھتا ہے رسالے میں کہانی کوئی
کتنی ہو جاتی ہے غمگین طبیعت میری
خط چچا جان کا آتا ہے تو گھبراتی ہوں
علم حاصل نہ کیا سوچ کے شرماتی ہوں
رنج ہوتا ہے بہت دل کو پہنچتا ہے ملال
کاش کرتی میں کبھی علم کی عظمت کا خیال
آج افسوس کے آنسو نہ بہانے پڑتے
نامرادی کے فسانے نہ سنانے پڑتے
علم کی اب تو دیوانی بنوں گی دل سے
علم کے واسطے ٹکراؤں گی ہر مشکل سے

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچّوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہو چکی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

- باپو حصّہ اوّل مصنف: سی فرنچ ماس : مترجم : صالحہ عابد حسین
- باپو 〃 دوم 〃 : 〃 〃 : 〃 〃 : 〃
- کشمیر 〃 : مالا سنگھ : 〃 : خدیجہ بیگم تصویر : برائنہ
- (۴) پرندوں کی دنیا 〃 : جمال آرا 〃 : محمد شفیع الدین نیّر
- (۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر 〃 : برگیڈیر گیان سنگھ 〃 : محمد ذاکر
- (۶) ہماری ندیوں کی کہانی 〃 : لیلا مجمدار : رضیہ سجاد ظہیر
- (۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں 〃 : لیلا بھاگوت 〃 : 〃 〃 〃
- (۸) رسیلی کہانیاں 〃 : منوج داس 〃 : صغرا مہدی
- (۹) آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) 〃 : وشنو پربھاکر 〃 : انور کمال حسینی
- (۱۰) ہماری ریلیں 〃 : جگجیت سنگھ 〃 : عرش ملسیانی
- (۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح 〃 : کے سی کھنّہ نقاویر کرشن کھنہ
- (۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں 〃 : اوما آنند مترجم : رفیعہ منظور الامین
- (۱۳) خار پلی کا خاندان 〃 : منوہر داس چترویدی 〃 : محمد شفیع الدین نیّر
- (۱۴) بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) 〃 : چوکسی بی ام جوشی 〃 : رضیہ سجاد ظہیر
- (۱۵) بہادروں کی کہانیاں 〃 : راجندر اوستھی 〃 : انور کمال حسینی
- (۱۶) روہنت و نندیہ مصنف : کرشن چینیہ مترجم : انور کمال حسینی
- (۱۷) سدا بہار کہانیاں 〃 : شانتا رنگا چاری 〃 : 〃 〃
- (۱۸) ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی 〃 : میر نجابت علی 〃 : سیّد احسان
- (۱۹) 〃 〃 (دوم) 〃 : 〃 〃 〃 : 〃 〃
- (۲۰) بڑا پانی 〃 : لیلا مجمدار 〃 : صالحہ عابد حسین
- (۲۱) مورا 〃 : ملک راج آنند 〃 : انور کمال حسینی
- (۲۲) ہاکی کا کھیل 〃 : سروندر سانیال 〃 : پریتم لال

ذاکر حسین سیریز

- (۲۳) ابو خاں کی بکری مصنف : ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت -/۲
- (۲۴) انوکھی دکان 〃 : قدسیہ زیدی 〃 ۲/۵۰
- (۲۵) گلابو چوہیا اور پریزاد 〃 : 〃 〃 〃 -/۲
- (۲۶) دنیا کے جانور 〃 : 〃 〃 〃 ۲/۵۰
- (۲۷) راجہ رام موہن رائے 〃 : عرش ملسیانی (زیرِ طبع)

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۳) پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

سولھویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن ٹائن
تلخیص وترجمہ: خلیق انجم اشرفی



مونگے کا جزیرہ

کشتی کی تیاری کے چند روز بعد ایک دن ہم ہیروں کے غار پر بنی ہوئی چٹانوں پر بیٹھے، جزیرۂ پنگوئن کے سفر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے

"دیکھو بھئی" پیٹرکن نے کہا۔

"جہاں تک میرا سوال ہے میں اگر یہاں اسی طرح رہوں اور پنگوئنوں کو ان کے حال پر چھوڑ دوں تو ایک بات بھی ہے لیکن تم جیسے چست وچالاک لوگوں کا اِن عجیب پرندوں کی عادات و اطوار کے بارے میں جانے بغیر چین سے بیٹھے رہنا تمھاری فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے جتنا جلد ہم اس سفر پر روانہ ہوجائیں اتنا ہی بہتر ہے"

"بالکل ٹھیک" میں بولا "اس وقت میری بھی دِلی تمنا یہی ہے کہ میں ان عجیب پرندوں کو قریب سے دیکھوں"

"اور میرا خیال ہے پیٹرکن" جیک نے کہا "کہ تم یہیں ٹھہرو"

"یہیں ٹھہروں!" پیٹرکن نے چلاّ کر کہا "میرے عزیز دوست۔ اگر میں تم لوگوں کی دیکھ بھال اور رہنمائی کے لئے ساتھ نہ رہا تو یا تو تم راستے سے بھٹک جاؤگے یا پھر کشتی الٹ لوگے"

"ٹھیک کہتے ہو،" جیک مصنوعی سنجیدگی سے بولا "یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا"

"تمھیں تو ضرور چلنا چاہیے۔ ہماری کشتی میں وزن کی ضرورت ہے اور تمھاری بات میں اتنا وزن ہے کہ اگر تم ساتھ چلو تو ہمیں اس کے لیے پتھروں کی ضرورت ہی نہ پڑے گی"

کھانے پینے کا کافی سامان اکٹھا کیا گیا۔ ہمارا ارادہ گھر سے ایک یا دو رات یا اس سے زیادہ عرصہ دور رہنے کا تھا۔ اس کام میں ہمیں کچھ وقت لگا تھا۔ باقی بچے میں اور پیٹرکن۔ پیٹرکن کو جنگلوں میں شکار کے لیے روانہ کردیا جاتا تھا اور کبھی کبھی شکار ملنے سے پہلے اس کی تلاش ہی خاصا وقت لے لیتی تھی۔

ویسے کبھی ہم پیٹرکن کو اسی وقت شکار پر بھیجتے تھے جب ہمیں سوروں کی ضرورت ہوتی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اتنا تیز دوڑتا تھا کہ اسے سوّروں کو پکڑنے میں بالکل بھی دقّت نہ ہوتی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ساتھ ہی وہ اتنا لاپروا بھی تھا کہ ہمیشہ اس اندھا دھند دوڑ میں پتھروں پر گر پڑتا اور پھر اس طرح واپس آتا کہ ٹانگوں کی کھال اُدھڑی ہوتی۔ لیکن پیٹرکن گرنے کے معاملے میں جتنا بد قسمت تھا شکار کے معاملے میں اتنا ہی خوش قسمت بھی تھا۔ آج کی شام بھی جب واپس آیا تو تین بہترین چھوٹے سور اس کے ساتھ تھے۔

میں بھی اپنی شکارگاہ سے کامیاب لوٹا۔ شکار کی ہوئی ڈھیروں بطخیں میرے ساتھ تھیں اور اس طرح دوسرے دن جب ہم نے صبح تڑکے اپنی ننھی سی کشتی میں یہ سامان بھرا تو وہ ضرورت سے زیادہ محسوس ہوا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ یہ کھانا کئی دن چلے گا۔ لیکن بعد کے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ ہماری تمام ضرورتوں سے زیادہ تھا خاص طور سے ناریل۔ ہم جہاں جہاں گئے ناریل کے ڈھیروں درخت ملے۔ بہرحال بقول پیٹرکن بہت کم ہونے سے بہت زیادہ ہونا بہتر تھا۔ کیونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ سفر میں کیا واقعات پیش آئیں۔

بڑی پرسکون اور دھوپیلی صبح تھی جب ہم نے سفر شروع کیا اور لیگون میں کشتی کھیتے ہوئے چٹان میں بنی ہوئی گزرگاہ کی طرف چلے۔ جلد ہی ہم ان دونوں سرسبز جزیروں کے بیچ سے گزر رہے تھے جو گزرگاہ کے دونوں طرف تھے۔ چٹان کے باہر زبردست موجوں سے گزرنے میں ہمیں خاصی دقّت اٹھانی پڑی اور کبھی کبھی خطرہ بھی محسوس ہوا۔ ہمیں خاصی قوّت سے کشتی چلانی پڑی لیکن ایک بار ان موجوں کی زد سے باہر نکلنے کے بعد ہماری کشتی بڑے سکون سے ساکن سمندر کے بیکراں سینے پر بہنے لگی۔

جزیرۂ پینگوئن ہمارے جزیرے کی مخالف سمت میں تھا۔ باہر چٹان سے کوئی ایک میل دور۔ اور ہمارا خیال تھا کہ ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے کھلے سمندر میں بیس میل تک کشتی چلانی پڑے گی۔ ہم اپنے ہی جزیرے کا چکر لگا کر جزیرۂ پینگوئن کے مخالف سمت والی گزرگاہ سے نکل کر مختصر راستے سے بھی وہاں پہنچ سکتے تھے لیکن ہم نے کھلے سمندر سے وہاں پہنچنے کو دو وجوہات سے ترجیح دی پہلی بات تو یہ کہ کھلے سمندر میں کشتی کھینا بڑی جراءت اور بہادری کا کام تھا اور دوسرے ہم کھلے سمندر کے فرحت بخش ماحول کا لطف بھی اٹھانا چاہتے تھے۔ ہمیں اس ماحول سے عشق سا تھا اور کیوں نہ ہوتا آخر ہم ملّاح لڑکے تھے۔

"کاش اس وقت ہوا چل رہی ہوتی!" جیک بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" پیٹرکن اپنے چپو پر جھک کر ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا چلّایا "کشتی کھینا خاصا دشوار کام ہے

Sunny al

کاش، ہم ان سمندری پرندوں میں سے سو دو سو کو
پکڑ کر اپنی کشتی میں لمبی رسیوں سے جکڑ سکیں اور انھیں اپنی
مرضی کے مطابق اڑنے پر مجبور کر سکیں سچ مچ کبھی کتنا مزا آئے
اگر ایسا ہو جائے۔"

"یا پھر کسی شارک کی دُم میں سوراخ کر کے اس میں سے
ایک رسی گزار دیں۔ ایں؟" جیک نے تبصرہ کیا۔ "لیکن میرا خیال
ہے کہ میری تمنا پوری ہونے والی ہے۔ دیکھو وہ آیا ایک جھونکا۔
پیٹرکن۔ اپنا چپو چلانا شروع کرو۔ رالف۔ تم ذرا مستول کو
دیکھو۔ میں بادبان کا دھیان رکھتا ہوں۔ اوہو! شاید
طوفان آنے والا ہے!"

یہ آخری جملہ اس نے افق پر ایک سیاہی مائل نیلی لکیر
دیکھ کر کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لکیر دور دور تک پھیل گئی
اور سمندر میں اونچی اونچی موجیں اٹھنے لگیں۔ طوفان کا پہلا
دھکا ہماری کشتی سے پشت پر لگا لیکن جلد ہی یہ طوفان
تیز ہواؤں میں بدل گیا۔ ہم نے بادبان پھیلا دیئے۔ کشتی تیزی
سے موجوں پر تیرنے لگی۔ اگرچہ فوراً بعد ہی یہ ہوا بھی
دم توڑ گئی لیکن یہی جھونکا اتنا تیز تھا کہ چند لمحوں میں ہم
اپنے سفر کا بیشتر حصہ طے کر چکے تھے اور جب بادبان
کا مشکل سے پتہ چلنے لگا کہ دوبارہ چپو سنبھالنے کا وقت آگیا
ہے تو ہم جزیرۂ پینگوئن سے مشکل سے ایک میل دور تھے۔

"وہ رہے سپاہی" پینگوئنوں کو دیکھتے ہی پیٹرکن
چلّایا "آج ان کے سفید پاجامے کیسے صاف لگ رہے
ہیں! مجھے حیرت ہوگی اگر انھوں نے خوش دلی سے ہمارا
استقبال کیا۔ کیوں جیک؟ تمھارا کیا خیال ہے؟ یہ چڑیاں
نیک دل ہیں یا نہیں؟"

"باتیں مت بناؤ پیٹرکن" "بس چپو چلاتے رہو اور
تمھیں جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

جیسے جیسے ہم جزیرے کے نزدیک پہنچتے گیے ان
عجیب پرندوں کی ہیئت اور حرکتیں ہمارے لیے ہنسی کا
سامان بنتی گئیں۔ جزیرے سے چند گز دور رہ گئے تو ہم
نے چپوّ ایک طرف رکھ دیئے اور ان عجیب پرندوں کو
حیرت اور دلچسپی سے تکنے لگے۔ یہ جزیرہ دراصل ایک
مسطح چٹان تھی اور چند جھاڑیوں کے علاوہ اس پر کہیں کوئی
درخت نظر نہیں آتا تھا۔ یہ دیکھ کر ہماری دلچسپی بڑھ گئی
کہ جتنی حیرت اور دلچسپی سے ہم ان چڑیوں کو تک رہے تھے
———— اتنی ہی دلچسپی سے وہ بھی ہمیں گھور
رہی تھیں۔

اتنا قریب پہنچنے پر ہمیں پتہ چلا کہ ان پرندوں کی
سپاہیوں جیسی ہیئت اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر
تن کر سیدھا کھڑا رہنے کی وجہ سے تھی۔ ان کے سر سیاہ
تھے۔ چونچیں لمبی اور تیز۔ سینے سفید اور پشت گہری نیلی۔
پر بہت چھوٹے تھے اور جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ پر
وہ پانی کے اندر تیرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ ان
کے بازوؤں پر باقاعدہ پر نہیں تھے بلکہ ایک قسم کے
سفنے تھے۔ ایسے ہی سفنوں سے ان کا پورا جسم بھی
ڈھکا ہوا تھا۔ ان کی ٹانگیں چھوٹی اور دُم کے اتنا قریب
تھیں کہ زمین پر اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے انھیں بالکل
سیدھا کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ ہاں پانی میں البتہ وہ دوسری
سمندری چڑیوں کی (جو ہزاروں کی تعداد میں اس چٹانی
جزیرے پر موجود تھیں) تیز آوازیں سن کر اتنا کھو چکے
ہوئے کہ دیر تک یہی فیصلہ نہ کر سکے کہ کدھر دیکھیں اور
کدھر نہ دیکھیں۔ لیکن چند لمحوں کے

بعد جب ہم نے غور سے ایک طرف دیکھنا شروع کیا تو ہمیں پنگوئنوں کے درمیان کچھ چار پیروں والے عجیب سے جانور بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔

" ذرا کشتی آگے بڑھانا " پیٹرکن چلایا۔" ذرا دیکھیں تو سہی کہ یہ ہیں کیا ؟ ایک بات تو پکی ہے کہ یہ جانور شور شرابا پسند کرتے ہیں تبھی تو پنگوئنوں جیسے شور مچانے والے پرندوں کے ساتھ رہ رہے ہیں "۔

لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ یہ چار پیروں والے " جانور"، کوئی اور نہیں خود پنگوئنیں تھیں جو اپنے دونوں پیروں اور دونوں پیروں کی مدد سے جھاڑیوں میں چل پھر رہی تھیں۔ اچانک ایک بہت بڑی اور بوڑھی سی چڑیا نے جو ہمارے بہت قریب بیٹھی خاموشی سے ہمیں گھور رہی تھی کچھ خطرہ محسوس کیا چٹانوں پر گرتی پڑتی سمندر کی طرف دوڑ پڑی چٹان کے سرے سے چھلانگ لگا دی اور چند لمحوں بعد سمندر میں کافی دور جا کر نکلی۔ یہ ایسی عجیب چھلانگ اور اتنا حیرت انگیز غوطہ تھا کہ ہم بمشکل تمام خود کو یقین دلا سکے کہ یہ پنگوئن ہی تھی کوئی مچھلی نہیں۔

" یہ تو سارا معاملہ ہی غلط ہو گیا " پیٹرکن اپنی ناک مسلتے ہوئے چہرے پر حیرت اور غصے کے آثار لا کر بولا " میں نے اس چیز کے بارے میں تو سنا ہے جو نہ مچھلی ہے نہ پرندہ نہ جانور لیکن مجھے یہ امید نہ تھی کہ میں خود ایک ایسی چیز دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ جو ایک ہی وقت میں تینوں ہو۔ لیکن ذرا ادھر تو دیکھو ! " اس نے ساحل کی طرف ٹکٹکی سے انداز میں دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی " ان کی حرکتوں کی کوئی حد بھی ہے ! ذرا دیکھنا ! اس چڑیا کی دم کے نیچے کیا ہے ؟ "

ہم اس طرف مڑے جدھر پیٹرکن نے اشارہ کیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پنگوئن اپنی دم کے نیچے ایک انڈا دبائے آہستہ آہستہ ساحل پر چل رہی ہے ہم نے غور سے دیکھا تو بہت سی دوسری پنگوئنیں بھی یہی حرکت کر رہی تھیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ پنگوئنوں کی ایک قسم تھی جو ہمیشہ اپنے انڈے اسی طرح لے کر چلتی ہے۔ قدرت نے ان کی دم اور ٹانگوں کے درمیان اس کام کے لیے ایک تھیلی یا جیب بنا رکھی ہے۔ اور یہ اسی میں اپنے انڈے رکھ لیتی ہیں۔

ہم پنگوئنوں کی اس آبادی کا نظم و ضبط دیکھ کر بھی بڑے حیران ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا جزیرہ باقاعدہ بہت سے چھوٹے چھوٹے مربعوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر مربعے پر ایک پنگوئن کا قبضہ ہے۔ اپنے مربعے کے بیچ میں پنگوئن یا تو انتہائی سنجیدگی سے بیٹھی رہتی تھی یا خالی جگہوں میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہتی تھی۔ چند پنگوئنیں اپنے اپنے انڈوں پر بیٹھی تھیں اور کچھ بڑے عجیب اور مضحکہ خیز انداز میں اپنے بچوں کو دانہ بھرا رہی تھیں۔ ماں ایک اٹھی ہوئی چٹان پر کھڑی تھی اور بچہ اس کے نیچے زمین پر بڑے صبر سے کھڑا تھا۔ اچانک ماں نے سر اٹھایا اور کئی تیز اور ناخوش گوار آوازیں نکالیں۔

" یہ بیمار ہونے والی ہے۔" پیٹرکن چلایا۔

معلوم تو کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ چند سیکنڈ میں اس نے اپنا سر جھکایا اور منہ کھول دیا بچے نے جھٹ اس میں اپنی چونچ ڈال دی اور ایسا لگا گویا وہ ماں کے حلق سے کوئی چیز نکال رہا ہو۔ ماں نے دوبارہ آواز نکالی۔ بچے نے دوبارہ اس کے منہ میں

اپنی چونچ ڈال اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک بچے کا پیٹ بھر نہیں گیا۔ لیکن اس نے اپنے بچے کو کیا کھلایا یہ ہم نہیں دیکھ سکے اور اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔

"ارے اب ذرا ادھر تو دیکھو!" پیٹرکن نے بڑی دلچسپی سے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو ماں کے برتاؤ کی بہترین مثال ہے۔ ذرا دیکھنا اس کم بخت بوڑھی پنگوئن کو۔ اس نے ابھی ابھی اپنے بچے کو سمندر میں دھکیل دیا ہے اور اب دیکھو وہ دوسری بڑی بی بھی اس کی تقلید کر رہی ہیں۔"

اور واقعی ہمیں بھی کچھ ایسا ہی لگا کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ایک چٹانی ڈھلوان کے ایک سرے پر کھڑی ایک پنگوئن اپنے بچے کو سمندر کے قریب لے جانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بچہ ہچکچا رہا تھا اور مرے مرے قدموں سے وہ دھیرے دھیرے چٹان کے دوسرے سرے کی طرف کھسک رہا تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کی مرضی پانی میں جانے کی بالکل نہ تھی۔ ماں نے جب اپنی ساری کوششیں ناکام ہوتے دیکھیں تو وہ بچے کی پشت پر گئی اور اسے پانی کی طرف دھکیلا لیکن بڑی آہستگی و نرمی سے۔ گویا کہہ رہی ہو۔ "ڈرو مت پیارو۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی میرے بچے"، لیکن جیسے ہی بچہ ڈھلوان کے سرے تک پہنچا اور ڈری ڈری نظروں سے پانی کو تکنے لگا، ماں نے اچانک اسے ایک زوردار دھکا دیا اور وہ ڈھلوان پر تیزی سے لڑھکتا ہوا سر کے بل پانی میں جا گرا۔ ماں نے یہ بات اس پر چھوڑ دی کہ اب وہ جس طرح چاہے تیر کر دوبارہ ساحل تک پہنچے۔ ہم نے بہت دوسری پنگوئنوں کو یہی حرکت کرتے دیکھا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بوڑھی مائیں اس طرح اپنے بچوں کو تیرنا سکھاتی ہیں۔

ہم نے بمشکل اس منظر کا مشاہدہ ختم کیا ہوگا کہ اچانک ایک اور عجیب منظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کوئی ایک درجن بوڑھی پنگوئنیں عجیب غیر محفوظ اور مضحکہ خیز انداز میں سمندر میں کود رہی تھیں۔ اس جگہ ساحل ایک ڈھلوان چٹان تھی۔ ان میں کچھ تو اس چٹان سے باقاعدہ سمندر میں چھلانگ لگا رہی تھیں لیکن کچھ اس پر آ کر جیسے اپنا توازن کھو دیتی تھیں اور ڈھلوان پر تیزی سے لڑھکتی ہوئی بے بسی کے عالم میں سمندر میں جا پڑتی تھیں البتہ پانی میں پہنچ کر وہ باقاعدہ چھلانگ لگانے والوں کی طرح باقاعدگی اختیار کر لیتی تھیں وہ پانی میں غوطہ لگاتیں اور پھر بڑی آسانی سے چھلانگ کر اس سے باہر نکل آتیں اور اس طرح غوطہ لگانے اور اچھل کر پانی سے باہر آنے کا یہ سلسلہ چلتا رہا اس منظر کو دیکھ کر ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ پنگوئنیں ذرا بھینچ مٹر اڑ جاتی تھیں۔

پیٹرکن جو بڑے غور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اچانک بڑا سنجیدہ چہرہ بنائے ہماری طرف مڑا اور بولا "میرا خیال ہے کہ یہ تمام چڑیاں بالکل پاگل ہیں۔ اور یہ جادو کا جزیرہ ہے اس لیے میری رائے ہے کہ یا تو ہم فوراً اپنی کشتی موڑ کر واپس بھاگ چلیں اور یا پھر بہادری سے کام لیتے ہوئے اس جزیرے پر اتر پڑیں اور جتنی سخت لڑائی لڑ سکتے ہوں لڑیں۔"

"میں اترنے کے حق میں ہوں"، جیک چپو کے ایک دھکے سے کشتی کا رخ بدلتے ہوئے بولا — "چلو لڑاکو"

چند ہی لمحوں میں ہم نے اپنی ننھی سی کشتی ایک چھوٹی سی کھاڑی میں داخل کر دی، وہاں اسے مونگے کی

چٹان کے ایک نوکیلے ٹکڑے سے باندھ دیا اور پھر اپنی ڈنڈیاں اور بھالا سنبھالے ساحل پر دوڑتے ہوئے پنگوئنوں کی قطاروں میں داخل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر ہم سخت حیران ہوئے ہمیں دیکھ کر وہ نہ تو خوف زدہ ہوئیں اور نہ ہم پر حملہ کیا۔

وہ عجیب چڑیاں تو اپنی جگہ سے اس وقت تک ہلیں بھی نہیں جب تک ہم نے انھیں پکڑ کر ایک طرف نہ کر دیا۔ وہ بس حیران حیران سی نظروں سے ہمیں اپنے درمیان سے گزرتے دیکھتی رہیں۔

ہاں ایک بوڑھی پنگوئن نے ضرور آہستہ آہستہ سمندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر پیٹرکن کی شرارت کی رگ پھڑکی اس نے سوچا کسی طرح اسے سمندر میں چھلانگ لگانے سے روکا جائے یہ سوچ کر وہ دوڑا اور اس کا راستہ روک کر اپنی لاٹھی اس کے چہرے کے سامنے گھمانے لگا لیکن صاحب وہ چڑیا بھی بڑی مستقل مزاج نکلی نہ تو ہراساں ہوئی نہ اس نے سمندر کی طرف بڑھنا بند کیا۔ اُلٹے اس وقت تک بڑی بہادری سے پیٹرکن سے لڑتی رہی جب تک سمندر میں نہ پہنچ گئی۔ اگر پیٹرکن نے اپنی لاٹھی استعمال کی ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے اس چڑیا کو ختم کر سکتا تھا لیکن وہ تو محض تفریحاً یہ حرکت کر رہا تھا اس لیے اس نے یہ ظالمانہ کام نہیں کیا اور چڑیا کو جانے دیا۔

ہم نے اس جزیرے پر مکمل تین گھنٹے ان عجیب وغریب چڑیوں کے مشاہدے میں گزارے اور جب ہم ان سے جدا ہوئے تو بہت سی باتیں کرنے کے بعد ہم یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ آج تک ہم نے جتنے بھی پرندے دیکھے ان میں پنگوئن سب سے حیرت انگیز ہیں۔ ہم ان کی عجیب و دلچسپ حرکتوں سے اتنا متاثر تھے کہ ہم نے یہ تک سوچا کہ شاید یہ دنیا کی حیرت انگیز ترین چڑیا ہیں۔

(پھر کیا ہوا؟ کیا تینوں دوست بخیریت گھر واپس لوٹ سکے؟ یہ جاننے کے لیے اس دلچسپ ناول کی سترھویں قسط جنوری کے پیام تعلیم میں پڑھیے گا۔ یہ قسط سنسنی خیز واقعات سے لبریز ہے)

محترمہ مسعودہ حیات ایم۔ اے

جشنِ باپو

ہم آج کس جوش و سرخوشی سے
یہ جشنِ باپو منا رہے ہیں
پڑھا رہے ہیں ہم اس کے قصّے
ہم اس کی باتیں سنا رہے ہیں

ہم ایک اک گوشۂ وطن میں
اسی کی محفل سجا رہے ہیں
مگر دلوں کو خبر نہیں ہے
زباں سے گیت اس کے گا رہے ہیں

زبان و دل میں ہو ربط صادق
تو جشن باپو منائیں ہم تم
جو نورِ ایماں ہو آج دل میں
تو اس کی باتیں سنائیں ہم تم

اگر کریں اُس کی پیروی ہم
تو آج ہم اُس کے گیت گائیں
بنیں تو پہلے عمل کا پیکر
پھر اُس کی تعریف لب پہ لائیں

ہم آج اس جشن سرخوشی میں
وطن کو جنت نما بنا دیں
ہم آج اس رہنما کی خاطر
فضا کو راحت فزا بنادیں

مصیبتوں اور جہالتوں کو
ہم آج بھارت سے دور کر دیں
غموں کی تاریکیاں مٹا کر
دلوں میں خوشیوں کا نور بھر دیں

شکوک و شبہات کو مٹا کر
دلوں میں نورِ یقین بھر دیں
خراب رسموں کو دفن کر کے
وطن میں پیدا بہار کر دیں

وگرنہ اس جشن و سرخوشی سے
مہاتما کو خوشی نہ ہو گی
وطن کا عالم یہی رہے گا
وہ روحِ اقدس سکھی نہ ہو گی

جناب سلطان احمد ساحل ہرگانوی

اسکائی لیب

SKYLAB

اسکائی لیب (SKYLAB) سائنسی معلومات میں ایک حیرت ناک اضافہ ہے۔ دراصل یہ ایک ایسی لیبوریٹری معمل یا دارالتجربہ ہے جسے مکمل رہائشی گاہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بالکل مکان کی طرح اس میں سونے کے لیے تین کمرے ہیں۔ ایک باورچی خانہ، ایک غسل خانہ، اسٹور اور تفریح کھیل کود کے لئے سامان بھی مہیا کیا گیا ہے، یہ پورا مکمل مکان آسمان میں بھیج دیا گیا ہے اور اسی کا نام اسکائی لیب (SKYLAB) رکھا گیا ہے۔ یعنی آسمانی دارالتجربہ۔

یہ اسکائی لیب ۱۴ مئی ۱۹۷۳ء کو ہندوستان کے وقت کے مطابق رات کے گیارہ بجے راس کینڈی سے روانہ ہوا۔ راس (کیپ) کینیڈی امریکہ کی فلوریڈا ریاست کے ساحل پر واقع ہے۔ یہیں سے چاند کے سفر پر جانے والے اپولو جہاز بھی چھوڑے جا چکے ہیں اسکائی لیب بھی خلاء میں پرواز کرنے والا ایک طرح کا جہاز ہی ہے۔ خیال ہے کہ اتنا بڑا خلاء میں اڑنے والا جہاز اس سے پہلے کبھی نہیں چھوڑا گیا۔ اس کا وزن ۸۸ ٹن یعنی ۸۸۰۰۰ کیلوگرام ہے۔ اب تک سائنسدانوں نے اس میں جتنے بھی آلات لگائے ہیں اتنے آج تک خلائی پرواز میں نہیں لگائے گئے ہیں۔

آسمان میں زمین کے گرد چاروں طرف چکر لگانے والا یہ دارالتجربہ یا اسکائی لیب ۴ جنوری ۱۹۷۴ء یعنی ۸ مہینے تک اوپر آسمان میں چکر لگاتا رہے گا۔ اسکائی لیب ہماری زمین سے ۴۳۵ کیلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، یہ ان سبھی مقاموں سے گذرے گا جو برقی نشان سے ۵۰ ڈگری اتر اور ۵۰ ڈگری دکھن تک واقع ہیں۔ جن میں امریکہ، افریقہ، مشرقی ایشیا، آسٹریلیا، اور ایشیا کے دوسرے حصے بحر اوقیانوس، بحر الکاہل اور بحر ہند وغیرہ بھی اس کے دائرے کے اندر آتے ہیں۔ اس دارالتجربہ کو زمین سے بغیر کسی دوربین کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ اگر اسکائی لیب کے راستے کے ٹھیک نیچے ہیں تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک اسے دیکھ سکیں گے، آپ نے قطب تارہ تو دیکھا ہی ہوگا اسکائی لیب بھی قطب تارہ کی طرح چمکدار دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی کسی تارے کی طرح ۳۶ میٹر لمبا ہے اور کسی خاص حصے میں زیادہ سے زیادہ حجم ۶٫۷ میٹر ہے لیکن تاروں کے مقابلے میں اس کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس لئے آسمان میں تیزی سے دوڑتا ہوا کوئی تارہ دکھائی دے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسکائی لیب ہی ہو۔

اپنی گردش کے دوران اسکائی لیب تقریباً ۲۰۰ مقاموں کے اوپر سے گذر رہا ہے۔ اسکائی لیب میں ۲۷۰ قسم کے سائنسی عمل کیے جائیں گے تین تین خلا بازوں کی تین ٹولیاں بھیجی جائیں گی پہلی ٹولی ۲۴ مئی کو ہاؤسٹن کے خلائی مقام سے اپولو جہاز سے اڑی تھی اس میں ایک طبیب ڈاکٹر جوسف کرون کے علاوہ کمانڈر چالس کونراڈ (جونیر) اور ڈرائیور پال جے۔ ویٹس بھیجے گئے تھے ان لوگوں نے خلاء میں گردش کرتے ہوئے دارالتجربہ کا پیچھا کیا تھا اور ساڑھے سات گھنٹے کے بعد اسکائی لیب کو پکڑ

سکے تھے جبکہ ان لوگوں کی رفتار ۲۷۰۰۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ تھی، انہوں نے اوپر سائنسی عمل کئے۔ یہ لوگ ۲۸ دن تک اسکائی لیب میں مقیم رہے اور ۲۲ جون کو بخیر و خوبی زمین پر واپس لوٹ آئے۔ ان لوگوں کے بعد تین، تین خلاء بازوں کی دو، دو، ٹولیاں اور بھیجی جائیں گی۔ دوسری ٹولی ۲۸ جولائی کو بھیجی گئی تھی۔ ان خلا بازوں نے اسکائی لیب میں سے زمین کے تین چوتھائی حصّے کو دیکھا جس حصّے کے اوپر سے دار التجربہ گذرا تھا وہاں کی زمین پر اگتی فصل، جنگل، ندی نہر، چٹانوں اور پہاڑوں وغیرہ کی تصویریں اس نے لیں، یہ کام چھ آلوں والا ایک آلہ برابر کرتا رہا۔ اس طرح پہلی بار زمین پر بدلتے موسم پر بھی نظر رکھنے میں سہولت ہوئی، تین خلا باز ۵۹ دن تک اسکائی لیب میں چکر لگا کر آئے ہیں۔ انہوں نے سورج کی بھی بہت ساری تصویریں کھینچی ہیں یا سورج کی سطح پر وقتاً فوقتاً آگ جو تیز ہوتی رہتی ہے یا جو طوفان آتے ہیں ان کی بھی تصویریں اور نئے اعداد و شمار لائے ہیں۔ ان فوٹوؤں اور اعداد و شمار کی مدد سے سائنس داں یہ معلوم کر سکیں گے کہ سورج کا زمین کے ماحول اور زندگی پر جو اثر پڑتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے۔ زمین کی قدیم تاریخ جو چٹانوں میں لپٹی پڑی ہے اس کا جائزہ لینے میں بھی آسانی ہوگی۔

اب آپ پوچھیں گے کہ ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین کے متعلق اور زیادہ جانکاری حاصل کرنے کیلئے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم قریب سے زمین کا چھوٹا سا حصّہ ہی دیکھ پاتے ہیں، دور سے ہم پورے زمین کو اکائی کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں——!!

بقیہ ہالینڈ کے بچوں کا تیوہار صفحہ سے

باتیں اس کی بری عادتیں بھی اس نظم میں ظاہر کر دی جاتی ہے۔ جی ہاں ہمیں بھی سینٹ نکولاس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی اور ہالینڈ کے شہروں کے نقشے اور کتابیں دی تھیں ایک نظم بھی تھی جس میں ہماری اور ہمارے ہندوستان کی تعریف کی گئی تھی،

یہ تیوہار اسکولوں اور فیکٹریوں میں بھی اکثر منایا جاتا ہے لوگ اپنے بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں، وہاں بھی اچھے بچوں کو تحفے ملتے ہیں شریر اور برے بچوں کو کچھ نہیں ملتا۔ آئندہ کیلئے ہدایت ملتی ہے واقعی یہ بڑا اصلاحی اور تربیتی تیوہار ہے اور اس کو وہاں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس موقع کے گانوں کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے،

بقیہ کشمیر صفحہ ۱۲ سے

شربت وغیرہ پی رہے تھے۔

ایک تو گرمی سے پناہ لینے دوسرے کشمیر دیکھنے کا شوق کتنے لوگوں کو یہاں کھینچ لاتا ہے، مگر سنا ہے اس سال سیّاح کم آئے ہیں۔ اور مہنگائی تو اتنی ہے کہ دلی سے زیادہ سوائے کنٹرول کے سامان کے جو راشن سے ملتا ہے۔ اور یہی چند مہینے کشمیریوں کی کمائی کے ہیں سردیوں میں تو پرندہ پر بھی نہیں مارتا۔ پھر آج کل بازار میں رونق ہے

پیام تعلیم کا چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجئے۔ وی پی سے منگانے میں ایک روپے سے زیادہ کا نقصان ہے،

بے بی

جناب مضطر داؤدنگری

مدھ بھری آنکھ ہے کیا خوب سجیلی بے بی
پھول سی شکل ہے چمپا ہے چنبیلی بے بی

ماں کی پیاری ہے تو بابا کی دلاری بے بی
نانا صدقے ہیں تو نانی بھی ہیں واری بے بی

کیا درخشاں ہیں ترے دانت یہ پیارے پیارے
نیلے آکاش پہ ہوں جیسے کہ بکھرے تارے

کس طرح شوخیٔ فطرت نے سنوارا ہے تجھے
اک پری زاد کی صورت میں اتارا ہے تجھے

اس طرح ہونٹوں پہ ہے کھیلتی معصوم ہنسی
جیسے گلشن میں کھلی ہو کوئی نوخیز کلی

پیار بھائی سے ہے بہنوں سے محبت ہے تجھے
رونے والوں کو ہنسانے کی بھی عادت ہے تجھے

نام پیارا ہے بڑا پیارا ودیعت تیرا
چہرہ مہتاب سا ہے اے مہ طلعت تیرا

تاقیامت نہ ملے تو کبھی روتی بے بی
اشک آنکھوں سے جو ٹپکے وہ ہو موتی بے بی

یوں شگفتہ رہو تم ہے یہ دعائے مضطر
جیسے کھلتے ہیں چمن میں گلِ تر شام و سحر

کشیدہ کاری کا نمونہ



ضروری ہدایت: شروع شروع میں تاگا ٹسر کا استعمال کیجئے ڈنٹھل گہرے ہرے رنگ کے ہوں پتیاں ہلکے ہرے رنگ کی۔

(طارق افتخار)

جناب ناوک حمزہ پوری

ہمارا قومی پرندہ مور

کہتے ہیں سکندر اعظم ہندوستان سے یونان کو واپسی کے وقت دو سو مور اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ آج سے لگ بھگ دو ہزار سال سے بھی زیادہ کی بات ہے۔ یونان سے ہی یہ پرندہ یورپ امریکہ اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں پھیل گیا۔ اس سے قبل ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں مور ناپید تھا۔

اس طرح طاؤس (مور) ایک خالص ہندوستانی پرندہ ہے۔ اسے ہندوستان کا قومی پرندہ ہونے کا اعزاز بجا طور پر بخشا گیا ہے۔

سچ پوچھیے تو یہ حسین پرندہ جو طرح طرح کے دل کش رنگوں کا خوب صورت میل اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک طرح سے ہندوستان کی رنگا رنگ قومی زندگی کا آئینہ دار ہے۔

ہندوستانی مذہب آرٹ اور ادب میں اس کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ جنگل کے حسن کو دلکش اور دوبالا کرنے والا طاؤس ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

سنسکرت کے مشہور زمانہ شاعر کالی داس نے بھی دل کھول کر اس کی تعریف کی ہے۔ اس کے حسن، ساون کی ابر آلود فضا میں اس کی مستی اور اس کے والہانہ رقص (ناچ) کے تذکرے ہمارے ادب میں بکھرے پڑے ہیں۔

یجروید میں بھی مور کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ یجروید ہندوؤں کی بہت ہی پرانی اور مقدس کتاب ہے۔ ہندو بھائیوں کے اعتقاد کے مطابق علم کی دیوی سرسوتی اور جنگ کے دیوتا کارتک کی سواری ہے۔ یہی نہیں شاستروں کے مطابق تو کارتک جی نے مور کی پیٹھ پر سوار ہو کر دُنیا کے چاروں طرف ایک چکر بھی لگایا تھا۔

یہ پرندہ اپنی خوب صورتی کے لیے مشہور ہے۔ اس کے چلن پر اُس کی خوش نما دُم اس کے سر کا سُندر تاج اس کی چمکیلی لمبی گردن کس قدر پرکشش معلوم ہوتی ہے۔

اس کی دوسری خوبیوں میں اس کی تیز قوت بینائی بھی شامل ہے۔ کوئی شیر چیتا یا تیندوا کتنا ہی چھپ کر شکار کی ٹوہ میں کیوں نہ نکلا ہو۔ اس کی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ ادھر وہ نکلا ادھر اس نے خطرے کی آواز لگا کر جنگل کے دوسرے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا۔

مور کے پر جنھیں عام طور پر "مور چھل" یا "مرچھل" کہتے ہیں پرانے زمانے میں شان و شوکت کا نشان سمجھا جاتا تھا جلوس کے موقع پر یا دربار میں راجاؤں اور بادشاہوں کے سر پر "مرچھل" کا سایہ کیا جاتا تھا۔ تقدس و پاکیزگی کے جذبات بھی مرچھل سے وابستہ رہے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں پر جھلنے کے لیے اور مقدس مقامات پر جھاڑو دینے کے لیے بھی اسے ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی یہ بازاروں میں خاص طور سے مندروں مسجدوں کے نزدیک فروخت ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مور کا

پر کئی طرح کی دواؤں میں بھی کام آتا ہے۔

مغل شہنشاہوں کو بھی مور کے حسن نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ شاہجہاں کا مشہور تخت طاؤس اس کا شاہد ہے۔ اس سے پہلے دوسرے راجاؤں مہاراجوں نے بھی مور کو عزت کا مقام عطا کیا تھا کشان خاندان کے راجا کنشک کے سکوں پر مور کی تصویر پائی گئی ہے۔ گپت خاندان کے راجاؤں کے زمانے میں بھی جو کُلاہ شجاعت کے سب سے بڑے اعزاز کے طور پر عطا کی جاتی تھی اس پر مور کی تصویر ہوتی تھی۔

مور جنگل کا چھلاوا ہے۔ کسی جنگل میں سے گزرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ یہ آپ کے آگے ایک طرف سے طوفان جیسی تیزی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف بجلی کی سی رفتار سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لمبی آواز نکالتا ہے۔ "آؤ"، کچھ من چلوں کا خیال ہے کہ یہ "می آؤ"، نہیں بلکہ "میت آؤ"، کہتا ہے یعنی اس طرح اپنے جوڑے کو بلاتا ہے۔

مور گھنا جنگل پسند کرتا ہے اور عموماً جھنڈ ہی میں رہنے کا عادی ہوتا ہے کبھی کبھی دیہی علاقوں میں جنگلوں کے کنارے جھاڑیوں میں یا میدانوں میں بھی نظر آجاتا ہے شہروں میں بھی پالتو مور دیکھنے کو ملتے ہیں سانپ سپولیے مور کی مرغوب غذا ہیں۔ اور جب بادل گھر کے آتا ہے تو اس پر مستی سوار ہو جاتی ہے۔ یہ اپنے منقش جھلملی پنکھ پسار کر رقص میں کھو جاتا ہے۔ لیکن مشہور ہے کہ ناچتے ناچتے جب مور کی نگاہ اپنے پاؤں کی طرف جاتی ہے تو وہ بہت اداس ہو جاتا ہے۔ خوبصورت پنکھ سے پیدا ہونے والے غرور کے توڑ کے لیے بدصورت پاؤں بنانا شاید قدرت نے ضروری سمجھا ہوگا۔

★

(مالوی لوک کہانی)

محترمہ سلطانہ خوشنود جبیں ام۔اے

توتلی بیویاں

ایک زمیندار تھا۔ اس نے سات شادیاں کی تھیں لیکن ساتوں کی ساتوں توتلی نکلیں۔

ایک دن زمیندار نے اپنے ایک دوست کو کھانے کی دعوت دی۔ اتفاق کی بات اسی دن اسے ایک ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی بیویوں سے کہا "آج میرا دوست کھانے پر آئے گا۔ تم میں سے کوئی بھی اس سے بات نہ کرنا۔ ورنہ وہ کیا سوچے گا کہ میری بیویاں توتلی ہیں"

بیویوں نے "ہاں" میں سر ہلا کر اس کی بات مان لی۔

ٹھیک وقت پر زمیندار کا دوست کھانے پر آیا۔ وہ کھانا کھاتا رہا اور زمیندار کی بیویاں کھانا لگاتی رہیں۔ انھوں نے نوکروں سے مدد نہیں لی۔ سبھی بیویاں زمیندار کے دوست کو کھاتے ہوئے دیکھتی رہیں اور منتظر رہیں کہ اب وہ تعریف کرے گا کہ اتنا اچھا کھانا میں نے کہیں نہیں کھایا تھا۔ لیکن وہ تو "مٹھس" ثابت ہوا۔ صرف کھائے جا رہا تھا۔ بولنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ آخر ایک بیوی صاحبہ سے نہیں رہا گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پکائے ہوئے کھانے کی تعریف چاہتی تھی۔ بولیں "گھی تی تپوری تھاتے میٹھی لادی تیٔ؟" (گھی کی پکوڑی آپ کو میٹھی لگی کہ نہیں؟)

دوسری بیوی نے سوچا، جب بڑی نے حکم عدولی کر دی ہے تو مجھے کیا ڈر؟ جلدی سے بولی "بیتھن تو ہمن ہی پیستیوں تھو" (بیسن تو میں نے ہی پیسا تھا)

تیسری بھی بول پڑی "تے کھٹ کھٹ کھٹ بیتھن تو ہمن تریاں تھوں" (کھٹکے سے بیسن تو میں نے چلنی میں نکالا تھا)

چوتھی نے سوچا۔ سب اپنی ہی اہمیت جتا رہی ہیں۔ میں اپنی تعریف کیوں نہ بیان کروں۔ بس، وہ بھی بول پڑی "تے نون مرچا تو ہمن ای لاتا تھا" (نمک مرچ تو میں نے ہی ڈالا تھا)۔

پانچویں بیوی جلدی سے بولی "تے پانی تو ہمن ای ملایا تو" (پانی تو میں نے ہی ملایا تھا)

چھٹی بیوی کو غصہ آ رہا تھا کہ زمیندار صاحب کے منع کرنے کے باوجود سب بولے جا رہی ہیں۔ وہ سب کو ڈانٹتی ہوئی بولی "تے او او او نے برجی تی۔ تو بولی تو تیوں؟" (انھوں نے ان کے سامنے بولنے سے منع کیا تھا، پھر کیوں بولی؟)

ساتویں کیسے چپ بیٹھتی، بولی "اے۔ بی بی ای، بولیں نہ تالو ہمارے ایتھاری تو بے تھی او" (ارے بیوی، ناراض کیوں ہوتی ہو؟ مجھے ہی دیکھو۔ ذرا بھی نہیں بولتی ہوں۔ میں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی ہوں)

زمیندار کا دوست دل میں ہنستا رہا۔ اور کھانے کے بعد چپ چاپ چلا گیا۔ واپسی پر زمیندار نے جب سارا حال سنا تو سر پیٹ کر رہ گیا۔

••

جناب محمد فاضل کھتری

سچّائی

پیارے بچّے یہ ٹھان لے دل میں
بات سے پہلے بات تولے گا
آج وعدہ یہ کرلے تو مجھ سے
جب بھی بولے گا سچ ہی بولے گا

سچ نے دنیا کا دل بھی جیتا ہے
سچ ہی راما ہے سچ ہی سیتا ہے
جام سچّائی کا تو پی کے دیکھ
جھوٹ کا زہر کیوں تو پیتا ہے

سچ کے موتی لٹائے ہیں جس نے
اُس نے دنیا میں سکھ ہی پائے ہیں
سچ کے آگے چلا نہیں کچھ زور
سچ نے شاہوں کے سر جھکائے ہیں

سچ کا اس جگ میں بول بالا ہے
جھوٹ کا منہ تو خوب کالا ہے
تو حقیقت کو اب بیاں کردے
کس لیے تیرے مُنہ پہ تالا ہے

آج ہم سچ سے دوستی کرلیں
جو ملے غم اسے خوشی کرلیں
سچ کی جے جے کہا کرو فاضل
ہاں بسر یوں ہی زندگی کرلیں

☆

شہیل عظیم آبادی

(کہانی)

سچائی

لگ بھگ ہزار سال پرانی کہانی ہے۔ یہاں سے بہت دور ایک شہر جیلان میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ ماں باپ نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا پڑھنے کے لائق ہوا تو پاس کے مدرسے میں پڑھنے کو بٹھا دیا۔

یہ لڑکا بہت ہی ہونہار اور ذہین تھا چودہ برس کی عمر میں ہی ساری پڑھائی ختم کر دی اور پڑھانے والوں نے رائے دی کہ اب بغداد کے بڑے مدرسے میں جا کر پڑھو۔ بغداد اس وقت بہت ترقی یافتہ جگہ تھی اور دور دور سے لوگ وہاں پڑھنے آتے تھے۔

اس زمانے میں کہیں آنا جانا آج کل کی طرح آسان نہ تھا۔ جیلان سے بغداد کئی دن کا راستہ تھا۔ یہ راستہ ریگستان سے ہو کر گذرتا تھا۔ سواری اونٹ کی ہوتی تھی۔ گرمی اور لو تو معمولی بات تھی۔ اس کے علاوہ سارا راستہ کڑھب اور خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تو ڈاکوؤں کا ہوتا تھا جو راستہ میں مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔

لڑکے نے جب بغداد جانے کی اجازت چاہی تو ماں نے ان ساری باتوں کو جانتے پر بھی بیٹے کو روکا نہیں اور خوشی خوشی بغداد جانے کی اجازت دے دی۔ لڑکے کے باپ پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں تاجروں کا ایک قافلہ بغداد جانے لگا تو ماں نے اپنے پیارے بیٹے کو اس قافلے کے ساتھ کر دیا۔ چلتے وقت ضرورت کے لائق رقم دے دی۔ یہ چالیس اشرفیاں تھیں یہ اشرفیاں انھوں نے کرتے کے اندر سی دیں۔

جب لڑکا گھر سے نکل کر قافلے والوں میں جانے لگا تو ماں نے دعائیں دیں اور کہا۔ "بیٹا برابر سچ بولنا۔ کچھ بھی ہو جائے جھوٹ نہ بولنا"

لڑکے نے ماں کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "ماں میں وعدہ کرتا ہوں کہ سدا سچ بولوں گا۔ اپنی جان بچانے کے لیے بھی جھوٹ نہ بولوں گا"

ماں نے بڑے پیار سے پھر اپنے بیٹے کو چوما اور رخصت کیا۔ لڑکا اپنے گھر سے رخصت ہو کر قافلے والوں میں مل گیا اور قافلہ بغداد کے لیے چل پڑا۔ دو رات قافلہ چلتا رہا۔ تیسرے دن ریگستان میں قافلہ بڑھنے لگا۔

دھوپ گرمی اور لو کی وجہ سے لوگ رات کو چلتے تھے۔ اور دن کو کہیں چھاؤں کی جگہ دیکھ کر ٹھہر جاتے تھے۔ تیسرے دن جب دھوپ میں گرمی ہوئی تو سارے لوگ کھجوروں کے ایک جھنڈ میں ٹھہر گیے۔ اس جگہ پانی بھی تھا لوگ کھانے پینے کا سامان کرنے لگے۔

ابھی بہت دیر نہ ہونے پائی تھی کہ ڈاکوؤں کی ایک ٹولی نے سبھوں پر حملہ کر دیا۔ اور لوٹ مار مچادی۔ سارے

قافلے میں ایک ہل چل مچ گئی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ اور کئی ایک مارے بھی گئے۔ بچے ہوئے لوگوں کو ڈاکوؤں نے پکڑ لیا۔ اور ایک ایک سے ہر چیز چھین لی۔

لڑکے کو بھی ایک ڈاکو نے پکڑا اور پوچھا "لڑکے سچ سچ بتا تیرے پاس کیا ہے" لڑکے نے کہا "میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں" ڈاکوؤں نے سارا بدن ٹٹولا اشرفیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈاکوؤں نے بگڑ کر کہا "تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟"

لڑکے نے بھولے پن سے کہا "بالکل نہیں! میں سچ کہہ رہا ہوں" ڈاکوؤں کو لڑکے کی بات پر اب بھی یقین نہ آیا! وہ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے آئے اور ساری باتیں کر دیں۔

سردار نے پوچھا "سچ سچ بتاؤ تمھارے پاس کیا کیا چیزیں ہیں؟"

لڑکے نے پھر کہا "میرے پاس کپڑے ہیں، کتابیں ہیں اور چالیس اشرفیاں ہیں"

سردار نے پھر تلاشی لی۔ لیکن اشرفیاں نہیں ملیں۔ تو اس نے پوچھا "اشرفیاں کہاں ہیں؟"

لڑکے نے صاف صاف بتا دیا کہ سلے ہوئے کرتے کے اندر ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے سلائی توڑ دی تو چالیس اشرفیاں گر پڑیں اور سارے ڈاکو دنگ ہو کر لڑکے کا منھ دیکھنے لگے۔

ڈاکوؤں کے سردار نے کہا "تم کیسے لڑکے ہو؟ کیا تم نے نہیں سوچا تھا کہ ہم سب اشرفیاں چھین لیں گے!

"کیا تم کو اشرفیوں کی ضرورت نہیں؟"

لڑکے نے کہا "ضرورت تو بہت زیادہ ہے۔ میں پڑھنے کے لیے پردیس جا رہا ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جھوٹ بول لوں"

سردار نے پھر کہا "اگر میں اشرفیوں کو چھین لوں تو تم کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اگر تم جھوٹ بول دیتے تو تو اشرفیاں بچ جاتیں"

لڑکے نے جواب دیا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایک تو خدا کا حکم ہے کہ سچ بولو
پھر میری ماں نے بچپن سے یہی تعلیم دی ہے کہ سچ بولو اور چلتے وقت عہد بھی کروایا تھا۔ اشرفیاں تو الگ اگر میری جان بھی لے لی جائے تو جھوٹ نہیں بولوں گا"

ڈاکوؤں کا سردار لڑکے کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر چپ چاپ ساری اشرفیاں واپس کر دیں۔ قافلے کا جو سامان لوٹا گیا تھا۔ وہ سب قافلے والوں کو واپس کر دیا۔ پھر اس نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ڈاکا نہ ڈالوں گا اور زندگی بھر اچھے کام کروں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"

ایک لڑکے کے پاک کردار نے ڈاکوؤں کو پھر سے اچھا آدمی بنا دیا۔ ڈاکوؤں نے اسی جگہ ٹولی توڑ دی اور پھر کبھی کوئی ڈاکا نہ ڈالا۔

اس لڑکے کا نام "عبدالقادر تھا" وہ لڑکا پڑھ لکھ کر بہت بڑا عالم ہوا اور بعد میں شیخ محی الدین جیلانی" کے لقب سے شہرت پائی۔ آج بھی بغداد میں ان کا مزار موجود ہے۔ جہاں دنیا کے کونے کونے سے لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

جناب حافظ عبدالحیٔ خاں حافظ

ہندوستانی بچے

بات کے پکّے قول کے سچّے
ہم ہیں ہندوستانی بچّے

اپنے وطن کی دولت ہم ہیں
اپنے وطن کی عزّت ہم ہیں
اس گلشن کی نکہت ہم ہیں
خوشبو ہم ہیں رنگت ہم ہیں

بات کے پکّے قول کے سچّے
ہم ہیں ہندوستانی بچّے

ہم آگے ہی بڑھتے جائیں
اوروں کو بھی آگے بڑھائیں
جب ہم اپنی آئی پہ آئیں
مات کبھی دشمن کھا جائیں

بات کے پکّے قول کے سچّے
ہم ہیں ہندستانی بچّے

ہندو، مسلم، گورے، کالے
بچّے ہیں سب ہمّت والے
بھارت ماں کی گود کے پالے
آزادی کے ہیں رکھ والے

بات کے پکّے قول کے سچّے
ہم ہیں ہندوستانی بچّے

فٹ پاتھ پر چلو

محترمہ سلمیٰ جاوید

ہم اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے چوڑی سڑک تک پہنچتے ہیں تو ہمیں جگہ جگہ لوہے کی تختیوں پر لکھا ہوا یہ جملہ ملتا ہے۔ "فٹ پاتھ پر چلو" یا "سڑک پر چلنا خطرناک ہے"، اس پر یہ جملے ہمارے بچاؤ کے لیے میونسپلٹی، کارپوریشن، میٹروپولیٹن۔ نوٹیفائڈ ایریا اور کنٹونمنٹ ایریا والے لکھوا کر سڑکوں پر لگواتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم جب تک گھروں اور تپلی پتلی گلیوں سے نکل کر کھلی ہوئی اور چوڑی سڑکوں پر آتے ہیں تو ہمارے دلوں میں ایک امنگ بھر جاتی ہے کھلی سڑک پر ہوا صاف ستھری اور زیادہ مقدار میں ہمیں ملتی ہے — ہمارے جی کو خوش کرتی ہے۔ اور یہ خوشی ہمیں اکساتی ہے کہ ہم دوڑیں، بھاگیں —— اور ایسا اکثر ہوتا ہے ہم میں سے بعض بچے "بڑی تیزی سے دوڑ کر سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی حالت میں کبھی کبھی کسی آدمی یا کسی سواری سے ٹکرا جاتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں ایسی بات اگر ہو جائے تو اس کو حادثہ " کہتے ہیں۔

ایسے حادثے شہروں میں روزمرہ ہوتے رہتے ہیں شہروں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور بڑھتی ہی جارہی ہے اب تو شہروں کو ایک طرح سے "آدمیوں کا جنگل" کہنا چاہیے جیسے جنگل میں پیڑوں کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ انھیں جلدی جلدی گننا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح شہروں میں آدمی اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ انھیں شمار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

پھر ان آدمیوں کو اپنے اپنے آفسوں، کارخانوں اور دوسری جگہوں میں لے جانے کے لیے طرح طرح کی سواریاں، رکشے، کاریں، ٹم ٹم، بسیں، منی بسیں، سائیکلیں۔ موٹر سائیکلیں۔ اسکوٹر رکشا۔ اور بعض بڑے شہروں میں دو منزلہ بسیں، ٹرام گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔

ایسی حالت میں، دوطرفہ آنا جانا ہوتا ہے۔ چلنے والے ایک طرف سے جاتے ہیں اور آنے والے ایک طرف سے آتے ہیں۔ بڑے شہروں میں 'اپ، اور ڈاؤن' کے نام سے سڑکوں کو دو حصّوں میں الگ الگ بانٹ دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں سڑک بہت زیادہ چوڑی نہیں ہوتی اس کو دو حصّوں میں کرنا مشکل ہے اور اس کے بیچ میں کوئی الگ کرنے والی دیوار یا مینڈ (پارٹیشن) بنانا مشکل ہوتا ہے۔ تمام چلنے والے خود ہی ہمیشہ اپنے بائیں ہاتھ کی جانب چلتے ہیں تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو۔

تو دیکھیے جب سڑک پر چلنا ہو تو ہمیشہ "فٹ پاتھ پر چلیے۔ سڑک کے دونوں جانب چار پانچ فیٹ چوڑی اور کچھ اونچی پکی راہیں، بنا دی جاتی ہیں تاکہ پیدل چلنے والے انھی پر چلیں تاکہ کسی قسم کے حادثہ کا شکار نہ ہوں۔ انھی کو فٹ پاتھ کہتے ہیں۔

بچے زیادہ تر اپنی غلطی سے چوٹ کھا جاتے ہیں کہ ان کے ذہن سے "فٹ پاتھ" اتر جاتا ہے۔ اور وہ غلط راستے پر جا پڑتے ہیں۔ ہاں سڑک پار کرنا۔ البتہ ایک مشکل بات ہے اور ہر جگہ سے سڑک پار کرنا بھی نہ چاہیے کیونکہ اس طرح ہم بڑی آسانی سے کسی کی زد میں آجاتے ہیں اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ زیادہ چلتی ہوئی سڑک پر جگہ جگہ "ٹریفک پولس" انتظام کے لیے موجود رہتی ہے۔ خاص طور سے چوراہوں پر تو ضرور ہی کئی ایک ٹریفک پولس کے آدمی رہتے ہیں۔ اور وہ راستے کو ہاتھ کے اشارے سے کھولتے اور بند کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ ہر طرف کے چلنے والے آسانی سے اور بغیر کسی حادثہ کا شکار ہوئے چل سکیں۔ بڑے شہروں میں رات کے وقت "آٹو میٹک لائیٹ" سے "ہری" اور "لال" بتیاں جلا کر روشنی کی جاتی ہے۔ "ہری بتی" کے معنی ہیں کہ راستہ صاف ہے اور چلنے والے اس جانب چل سکتے ہیں اور "لال بتی" کے معنی ہیں کہ راستے میں خطرہ موجود ہے اس لیے چلنے والے رکے رہیں۔ جب "ہری بتی" دے دی جائے گی تو راستہ چلنے کے قابل ہوگا "روڈ کراس" کرنے یعنی سڑک پار کرنے میں بہت ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے "اپ" "ڈاؤن" دونوں سڑکوں پر نظر رکھ کر راستہ چلنا چاہیے۔ تاکہ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔ سڑک پار کر لینے کے بعد فوراً "فٹ پاتھ" پر آجانا چاہیے اور اس پر چلنا چاہیے۔ "فٹ پاتھ" کے معنی ایک طرح سے سلامتی کا راستہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس پر چلنے والے کی جان سلامت رہتی ہے اور کوئی خطرہ یا حادثہ پیش نہیں آتا۔

★

محترمہ فاطمہ فریدی

ہنڈ کُلھیا

لوکی کباب

سامان

لوکی	آدھا کلو	لوکی کو چھیل کر قتلے کر لیجئے اُسے
بھُنے ہوئے چنے	۱۰۰ گرام	اُبال لیجئے بھُنے ہوئے چنے
پیاز	ایک گانٹھ	اور گرم مسالہ سوکھا پیس
ہری مرچ	۵ عدد	لیجئے۔ پیاز، ہری مرچیں
ادرک	ایک ٹکڑا	ادرک تینوں کو باریک باریک
گرم مسالہ تیل یا گھی	حسب منشاء	کاٹ لیجئے۔ لوکی کا پانی نچوڑ کر
		اسے پیس لیجئے۔ اب کٹی ہوئی

پیاز، ہری مرچ، ادرک، چنے، گرم مسالہ، پسی ہوئی لوکی میں ملا کر ٹکیاں بنا لیجئے۔ اور تیل یا گھی گرم کرکے تل لیجئے۔ بہت مزیدار کباب ہوں گے۔

ٹنڈے کی پکوڑیاں

سامان

ٹنڈے	آدھا کلو	ٹنڈے چھیل کر اُبال
انڈا	ایک عدد	لیجئے اور پانی نچوڑ کر
بیسن	۱۰۰ گرام	انھیں پیس لیجیے ان
ہری مرچ، پیاز، تیل گھی		میں ہری مرچیں، پیاز،
نمک حسب منشاء		باریک باریک کاٹ کر
		ملا لیجیے۔ اس میں انڈا

اور بیسن ملا کر خوب پھینٹ لیجے کڑھائی میں گھی گرم کرکے پکوڑیاں بنا کر ڈالتی جایئے۔

آلو کے کٹلس

سامان

آلو بڑے بڑے	آدھا کلو	آلو چھیل کر باریک باریک
گھی یا تیل	۲۰۰ گرام	گول گول قتلے کر لیجیے۔ فرائی
نمک مرچ	حسب منشاء	پان میں آدھا گھی ڈال کر
		آلو بچھا دیجیے۔ اوپر سے

پسی ہوئی نمک مرچ چھڑک دیجئے۔ آلو تھوڑے سے گل جائیں تو اُنھیں پلٹ دیجیے اور باقی ادرک مرچیں اور نمک ڈال دیجیے پانچ منٹ بعد اُتار لیجئے۔

عزیزہ شہناز سلّمہا

چٹنی

سامان

کھٹائی	۵۰ گرام	کھٹائی اتنے پانی میں اُبال لیں کہ کچھ
گڑ	۱۰۰ گرام	پانی بچ رہے۔ ٹھنڈا ہونے پر پیس
سرخ مرچ پسی	حسب منشا	لیجیے یا ہاتھ سے مل کر خوب باریک
زیرہ سفید	چائے کے دو چمچے	کر لیجیے اور چھلنی میں چھان لیجیے۔ گڑ
سونٹھ	دس گرام	خوب کوٹ کر کھٹائی میں ملا دیجیے اور
کالا نمک	" "	تھوڑا سا پانی ملا کر آگ پر رکھ دیجیے گڑ
کھانے کا نمک	" "	

اور کھٹائی دونوں ایک جان ہو جائیں تو سب چیزیں ملا دیجیے بہترین چٹنی تیار ہے چاٹ والے اسی طرح بناتے ہیں۔ اسی آپ کسی چیز کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔

آدھی ملاقات

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق میں بے انتہا دل کشی ہے۔ بچّوں اور بڑوں دونوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ تمام مضامین، نظمیں قابلِ قدر ہیں۔ محترم شفیع الدین نیر کی نظم بہت دل کش ہے البتہ طباعت اور کتابت دونوں توجہ کی محتاج ہیں۔ اس پر بھی توجہ کی جائے تو پیام تعلیم کے حسن میں چار چاند لگ جائیں۔

شوکت پردیسی

میں نے اسکول کے طالب علموں میں یہ بیداری پیدا کی ہے کہ وہ اس رسالے کو خریدیں اور اس میں شایع شدہ مضامین پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔

محمد حسین اعظمی ہاشمیہ ہائی اسکول بمبئی

آج کل پیام تعلیم کی خوب صورتی میں اس کا خوب صورت اور دیدہ زیب سرورق چار چاند لگا رہا ہے۔ خدا کرے زورِ حسن اور نکھار اور زیادہ۔

فخر الدین عارفی پٹنہ

پیام تعلیم کا رنگ روپ اور نکھار دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کافی دنوں بعد محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون پڑھا۔ کوئی خاص کشش نہ ہونے پر بھی بہت اچھا لگا۔ اظہار صاحب کا چالاک شکاری بہت اچھا لگا۔ نیر صاحب کا کمھار بھی قابلِ تعریف ہے۔ مونگے کے جزیرے میں پھر سے کشش آرہی ہے۔ کہانی سمندر کا پانی نمکین کیوں چھوٹی ہونے پر بھی اچھی رہی۔ وہ میں ہوں والی کہانی بھی بہت اچھی رہی۔ آپ کے نئے سلسلے کی وجہ سے پیام تعلیم کی مقبولیت ہماری بہنوں اور ان کی سہیلیوں میں اور بڑھ گئی ہے۔ اور وہ ہے "ہنڈ کلھیا"۔ پچھلے کئی ماہ سے پیام تعلیم کا سرورق بھی بہت شان دار آرہا ہے۔

محمد انوار علی نان پارہ

ستمبر کے پیام تعلیم کا ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ بہت ہی دل کش اور حسین ہے۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ کاغذ بھی اس کا نہایت عمدہ اور چمکیلا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت ٹائیٹل دیکھنے کو ملے گا۔ اور ٹائٹل کے ساتھ ہی اندر کا مواد بھی زیادہ سے زیادہ دل چسپ ہو جائے گا۔

شان الرحمن پٹنہ

گئے مہینے کا پیام تعلیم بہت پسند آیا۔ خاص کر دنیا کا طویل ترین سورج گرہن۔ پیسا کا ٹیڑھا مینار۔ ڈولفن کا سرکس نوری شکار سے والی۔ نظموں کا حصّہ بہت خوب ہے۔ اس مہینے کا سرورق بھی بہت خوب صورت ہے۔ اگر آپ پورے پرچے کو آفسیٹ پر لانے کی کوشش کریں تو بہت اچھا ہوگا۔

جمال الدین عمر بمبئی

ستمبر کے پرچے کا سرورق دیکھ کر میری طرح بڑے بھائی ہنسی نہ روک سکے۔ پرچہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور پورا پڑھ کر واپس کیا مجھے پیام تعلیم میں کئی چیزوں کی کمی محسوس ہوئی (۱) سوال و جواب کا کالم نہیں ہے (۲) قلمی دوستی کا کالم نہیں ہے (۳) ذہنی ورزش کا کالم نہیں ہے۔ آپ پیام تعلیم ہنڈ کلھیا کے عنوان سے کھانے پکانے کے اچھے طریقے شایع کرنے لگے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اسے جاری رکھیں گے۔ مجھے مضمون "عقل مند لوگ" بہت ہی اچھا لگا نظموں میں اپنا گیت نظم اچھی تھی۔ اکتوبر کے پرچے کا ٹائٹل بھی بہت دل کش تھا۔

باقی صفحہ

اِدھر اُدھر سے

دُنیا کی ایک انوکھی لائبریری

کیلی فورنیا کی ایک لائبریری میں. بچوں کے شعبے میں پالتو جانوروں کی ایک لائبریری کھولی گئی ہے اس عجیب و غریب اور انوکھی لائبریری میں بیس جانور ہیں۔ لائبریری کے ممبر بچے ان پالتو جانوروں میں سے کسی ایک کو ایک ہفتے کے لیے اپنے گھر لے جا سکتے ہیں۔ لائبریری کی طرف سے اس جانور کے کھانے کے لیے ایک ہفتے کا راشن بھی بچوں کے شعبے کی ڈائرکٹر کو افسوس ہے کہ لائبریری کے دو سو ممبر بچوں کو خوش نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ان کے پاس کل بیس ہی جانور ہیں۔ لائبریری اور زیادہ جانور حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جس سے زیادہ سے زیادہ بچے فائدہ اٹھا سکیں۔ جانوروں سے پیار کرنا اور ان کے ساتھ رہنا سیکھ سکیں۔ یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بچوں کی ذہنی نشوونما کی ترقی کے لیے پالتو جانوروں کی اہمیت ہمیشہ سے تسلیم کی گئی ہے۔

(الجمیعۃ روزانہ)

ٹیلی ویژن کی مقبولیت

(سوویت جائزہ)

ٹیلی ویژن نے دیکھتے دیکھتے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی ہے رسل و رسائل کا کوئی اور ذریعہ ٹیلی ویژن کی مقبولیت کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتا۔ یہاں تک کہ سینما بھی جو اتنا مقبول ہے اور ساری دنیا میں تماشائیوں تک پہنچنے کا اتنا کارگر ذریعہ ہے۔ اب ٹیلی ویژن سے پیچھے رہ گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق پندرہ ارب لوگوں نے سینما دیکھا تو دو کھرب نے ٹیلی ویژن اور اب روس میں رنگین ٹیلی ویژن کا رواج ہوگیا ہے۔ یہ رنگین پروگرام اب اسّی شہروں میں دکھائے جاتے ہیں جو بحر بالٹک سے بحر الکاہل تک پھیلے ہوئے ہیں۔

جوناگڑھ جنگل کے شیر اب آرام کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں

ایک شیرنی جوناگڑھ کے چڑیا گھر کے قریب آزادی کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی شاید اب اس کا دل آرام کی زندگی بسر کرنے کو للچا اٹھا ہوگا۔ چڑیا گھر والوں نے اسے پکڑ کر چڑیا گھر کا باسی بنالیا اور آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ یہ دسویں شیرنی ہے جو اس طرح چڑیا گھر میں آئی ہے۔

(الجمعیۃ)

عالمگیر کے زمانے کے عجیب واقعات

رات کو چار گھڑی گزرنے کے بعد ایک ستارہ پورب کی طرف آسمان سے جدا ہوکر مغرب کے سمت گرا۔ اس کی روشنی چاندنی کی طرح پھیل گئی اور اس کے بعد گرج کی آواز سنائی دی۔

ایک آئینہ تھا جس کی خاصیت یہ تھی کہ تر لوزا اس کے سامنے رکھنے سے خشک ہو جاتا تھا اور خشک پھل سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ایک عجیب و غریب صندوق تھا جس کے ایک طرف ہاتھی بندھا تھا اور دوسری جانب بکرا۔ ہاتھی اس صندوق کو نہ کھینچ سکتا تھا اور بکرا صندوق

ہاتھی سمیت کھینچ لے جاتا تھا۔

ایک زمیندار کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے سر پر دو سینگ تھے۔ ایک عورت کے ہاں ایسی لڑکی پیدا ہوئی جس کے سر اور منہ سیاہ اور ناک سفید و سرخ تھی۔

ایک گھوڑی نے تین پاؤں کا بچہ جنا۔ تیسرا پاؤں سینہ سے متصل تھا۔ اور بچہ تینوں پاؤں سے چلتا تھا۔

مآثر عالمگیری

محمد خلیل الرحمن صاحب ہیڈ ماسٹر
باقیات اسکول دیلور

ہمدردی کا جذبہ بندروں میں بھی ہے!

جنید کے علاقے میں کہیں ایک ویران کنواں تھا۔ کوئی ظالم آدمی ایک بچے کو اس ویران کنویں میں پھینک گیا۔ پاس کے ایک پیڑ پر ایک بندر بیٹھا تھا وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً نیچے اترا اور اس آدمی کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آدمی جان بچا کر بھاگا۔ اور بندر رات بھر کنویں کے من پر بیٹھا رہا۔ صبح کو ایک کسان ادھر سے گذرنے لگا تو بندر اس کی دھوتی پکڑ کر کنویں کے پاس لے گیا اور لڑکے کو کنویں میں سے نکالنے میں مدد دی۔

آٹھ سال کی لڑکی نے ۱۹۳۴۰ فٹ اونچی چوٹی سر کرلی

ایک آٹھ سال کی امریکی لڑکی نے افریقہ کے پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی سر کرلی۔ اس کے ماں باپ بھی ساتھ تھے۔ ایک گائڈ بھی تھا۔ ماں باپ تو بیچ ہی میں ہمت ہار گئے۔ مگر بچی نے چوٹی پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

(الجمعیتہ)

غالب کا کلام جرمن زبان میں

دیس کے نامور اور مشہور شاعر مرزا غالب کے اردو فارسی کلام کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ دس مہینے کے اندر ساری کتابیں بک گئیں اور اب دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔ جرمنی میں کسی باہر کے شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

بقیہ آدھی ملاقات ص۳۸ سے

اسے کھولتے ہی کئی مضمون بہت پسند آئے۔ چند دن کشمیر میں، قومی ترانہ، سمندر کا پانی وغیرہ بہت ہی دل کش انداز میں لکھے تھے۔ ان مضمونوں کے پڑھنے میں میں اس طرح کھو گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں۔

محمد سلیم قریشی گنج ڈنڈوارہ

پیام تعلیم کے گذشتہ اور تازہ ترین شمارے کے ٹائٹل بہت ہی خوبصورت ہیں اور فوٹو گرافی فنی اعتبار سے بہت غیر معمولی ہے۔ تخلیقات بھی پیام تعلیم کے معیار کی تائید کرتی ہیں۔ میری طرف سے تمام قلم کاروں کو مبارک باد دیجیے گا۔

سعید احمد رفاعی۔ بمبئی۔

پیام تعلیم پریس جارہا تھا کہ ہمارے ایک بہت پرانے کارکن کے انتقال کی خبر آئی۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ مرحوم شوکت علی خاں صاحب۔ فرشتہ صورت فرشتہ سیرت بزرگ تھے۔ مکتبہ سے بہت دنوں تک متعلق رہے۔ انہوں نے بہت عمر پائی۔ بہت محبوب سچے انسان۔ بڑے حلیم و بردبار۔ بات چیت کا انداز ایسا کہ ہر شخص عزت [illegible] کرنے پر مجبور۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔